معاشری و علمی تاریخ

(اسلامی ہند پاکستان ۷۱۱ - ۱۷۰۷ع)

از

ڈاکٹر سیّد معین الحق

حق نشان، ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵

Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

ہدیہ از طرف سید معین الحق
برائے جناب محمد اقبال مجددی

سید معین الحق
۳۰ اگست
کراچی

معاشری و علمی تاریخ

(اسلامی ہند پاکستان: ۷۱۱-۱۷۰۷ء)

از

ڈاکٹر سید معین الحق

سلمان اکیڈمی
حق نشان ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی
کراچی - ۵

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

انتساب

پیش لفظ

باب اول

اسلام کا ورود ہند پاکستان میں ۱

اسلامی فتوحات کا پہلا دور، محمد بن قاسم ۲

محمد بن قاسم کا کارنامہ ۴

سندھ:- برصغیر میں اسلامی
علوم کا پہلا گہوارہ ۶

باب دوم

اسلامی فتوحات کا دوسرا دور

سلطان محمود غزنوی ۱۰

دوآبہ کی فتوحات ۱۳

فتح سومنات ۱۰۲۵ء ۱۴

Marfat.com

135570

سنہ طباعت ۱۹۶۵
تعداد ۱۰۰۰
قیمت چھ روپیہ پچھتر پیسے
مطبوعہ مشہور آفسٹ پریس کراچی

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

انتساب

پیش لفظ

باب اول

اسلام کا ورود ہند پاکستان میں ۱

اسلامی فتوحات کا پہلا دور، محمد بن قاسم ۲

محمد بن قاسم کا کارنامہ ۴

سندھ:۔ برصغیر میں اسلامی
علوم کا پہلا گہوارہ ۶

باب دوم

اسلامی فتوحات کا دوسرا دور

سلطان محمود غزنوی ۱۰

دوآبہ کی فتوحات ۱۳

فتح سومنات ۲۵-۱۰۲۶ ۱۴

Marfat.com

محمود کے کارنامے ۱۷
اس دور کی تبلیغی کوششیں ۱۹
حضرت داتا گنج بخش رح ۲۰
حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح ۲۲

باب سوم
اسلامی فتوحات کا تیسرا دور

سلطنت دہلی کا قیام ۲۷
قطب الدین ایبک ۳۱
سلطان شمس الدین التتمش ۳۱
سلطان غیاث الدین بلبن ۳۵
رہزنی کا استیصال ۳۷
منگولوں کے خلاف
دفاعی انتظامات ۳۹

باب چہارم
سلطنت دہلی کا عروج وزوال

سلطان علاؤ الدین خلجی ٠
منگولوں کے حملے ۲

Marfat.com

انتظامی اصلاحات ۴۳
سلطان محمد بن تغلق ۴۹
دو دارالحکومت ۵۱
تانبے کا سکّہ ۵۳
سلطان کا کردار ۵۶
سلطان فیروز شاہ ۵۷
فیروز شاہ کی اصلاحات ۵۸
امیر تیمور کا حملہ ۶۱
سید اور لودی خاندان ۶۲

باب پنجم

عہد سلطنت میں معاشرہ و ادب ۶۵

اسلام اور ہندو تہذیب ۶۶
اسلامی معاشرہ ۶۷
سندھ میں ابتدائی دور کے
علماء اور صوفیائے کرام ۶۹
ایلتمش اور مشائخ ۷۱
بلبن کے عہد میں دینی و علمی زندگی ۷۶
مشائخ سہروردیہ ۸۱
شیخ رکن عالم ۸۳

Marfat.com

مخدوم جہانیاں جہاں گشت ۸۶

بابا فرید شکر گنجؒ اور چشتیہ سلسلہ کی اشاعت ۸۹

شیخ علاؤالدین صابرؒ اور ان کا سلسلہ ۹۱

شیخ نظام الدین اولیاءؒ ۹۴

علوم و فنون علائی عہد میں ۱۰۰

امیر خسرو اور امیر حسن سجزی ۱۰۱

تغلق سلاطین کے عہد میں معاشرہ و ادب ۱۰۳

علوم و فنون کی ترقی کے لئے فیروز شاہ کی کوششیں ۱۰۷

سکندر لودی ۱۰۹

اردو زبان کی ابتداء ۱۱۰

باب ششم
علاقائی سلطنتیں

علاقائیت اور اسلامی معاشرہ ۲

بنگال، بہار و جونپور ۵

Marfat.com

شیخ سراج الدین عثمانؒ	۱۱۸
المشہور بہ اخی سراج	
نور قطب عالم صاحبؒ	۱۱۸
نور قطب عالم صاحب کا	
اثر بنگال کے باہر	۱۲۱
شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ	۱۲۴
سید شاہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ	۱۲۷
لطائف اشرفی	۱۳۰
قاضی شہاب الدین دولت آبادی	۱۳۱
دکن و جنوبی ہند	۱۳۲
شیخ برہان الدین غریبؒ	۱۳۳
سید محمد گیسو درازؒ	۱۳۵
خواجہ گیسو دراز دکن میں	۱۳۶
تصانیف	۱۳۸
دکنی اردو	۱۳۸

باب ہفتم

مغلیہ سلطنت کا قیام و استحکام	۱۴۱
بابر، ہمایوں، شیر شاہ و اکبر	
بابر بادشاہ کی فتوحات	۱۴۱

Marfat.com

بابر کا کردار اور کارنامہ	۱۴۴
ہمایوں	۱۴۵
ہمایوں اور شیر شاہ	۱۴۵
بہادر شاہ کی موت	۱۴۸
ہمایوں کی جلاوطنی	۱۴۹
شیر شاہ کی حکومت	۱۵۱
شیر شاہ کی اصلاحات	۱۵۲
ہمایوں کی واپسی	۱۵۴
پانی پت کی دوسری لڑائی	۱۵۶
اکبر کی فتوحات	۱۵۸

باب ہشتم

معاشرہ و ادب مغلوں کے ابتدائی دور میں

مغل بادشاہ اور علمی و ادبی زندگی	۱۶۱
بابر کا علم و ادب سے شغف	۱۶۲
ہمایوں	۱۶۵
مذہبی و سماجی حالت	۱۷۰
شیخ عبدالحق ردولویؒ	۱۷۱
شیخ عبدالقدوس، مکتوبات قدوسیہ	۱۷۲

Marfat.com

باب نہم

عہدِ اکبری میں
ترقیِ علم و ادب ۱۷۹

فیضی ۱۸۰
تراجم و تصانیف ۱۸۲
تاریخ نویسی: ابوالفضل ۱۸۴
نظام الدین احمد،
ملّا عبدالقادر ۱۸۵

باب دہم

عہدِ اکبری میں
معاشرہ و مذہب ۱۹۰

اکبر پر حرم کا اثر ۱۹۲
مطلق العنانی ۱۹۴
مہدوی تحریک ۱۹۶
بھگتی ۲۰۲
وحدت الوجود کی اشاعت ۲۰۳
بادشاہ پر
تقدس کا ملمع ۲۰۴

Marfat.com

عبادت خانہ ۲۰۸

امام عادل کا رتبہ
مجتہد سے زیادہ قرار دیا گیا ۲۱۱

اکبر بحیثیت دینی پیشوا،
آئینِ رہنمائی ۲۱۳

آگ اور سورج کی
پرستش، بادشاہ کو سجدہ ۲۱۶

ایک نئے دین کا قیام ۲۱۸

باب یازدہم

دینِ الٰہی کا ردِّ عمل ۲۲۲

بنگال و بہار میں بغاوت ۲۲۴

علماء و مشائخ پر سختیاں ۲۲۶

شیخ مبارک اور
مخدوم الملک ۲۳۱

فیضی و ابو الفضل
دربارِ اکبری میں ۲۳۲

باب دوازدہم

جہانگیر و شاہ جہاں ۲۴۰

Marfat.com

جہانگیر کی تخت نشینی ۲۴۰

عہد جہانگیر،
میواڑ کی فتح ۲۴۳

مغل فتوحات کا
راجپوتوں پر اثر ۲۴۵

قندھار و دکن ۲۴۹

شاہ جہاں کی
تخت نشینی ۲۴۹

دکن میں فتوحات ۲۵۲

بلخ و بدخشاں
اور قندھار ۲۵۴

قندھار پر ایرانیوں کا قبضہ ۲۵۶

باب سیزدہم
علمی و ادبی زندگی، جہانگیر و
شاہ جہاں کے عہد میں ۲۵۸

علمی و ادبی سرگرمیاں، عہد جہانگیر میں
توزک جہانگیری ۲۵۸

مرزا عبدالرحیم خانخاناں ۲۶۴

عرفی ۲۶۶

Marfat.com

فضلاء ۲۶۹

شاہ جہاں کے
درباری شعراء
قدسی، کلیم، صائب ۲۷۰

فضلاء ۲۷۶

باب چہاردہم
تبلیغی و اصلاحی
کوشش (۱) ۲۷۸

شہباز خاں کمبوہ ۲۸۱

حضرت خواجہ باقی باللہؒ ۲۸۴

شیخ فرید نواب
مرتضیٰ خاں بخاری ۲۸۶

شیخ عبد الحق
محدث دہلویؒ ۲۸۸

ضمیمہ۔ برصغیر میں علم
حدیث کی اشاعت و ترویج ۳۰۸

امام صغانیؒ ۳۰۹

تصنیفات شیخ عبد الحقؒ ۳۱۳

Marfat.com

باب پانزدہم
تبلیغی و اصلاحی
کوشش (۲)

شیخ احمد سرہندی
المعروف بہ مجدّد الف ثانیؒ ۳۱۷
قید سلطانی ۳۲۵
رہائی کے بعد ۳۳۲
مزار خواجہ معین الدین
چشتیؒ پر حاضری ۳۳۳
اصلاحی کارنامہ ۳۳۴
ترویج شریعت ۳۳۴
دو قومیں ۳۳۷

باب شانزدہم
شمال مغربی اور دکن و گجرات
کے علاقوں میں اصلاحی کوششیں

روشنیہ تحریک ۳۴۱
اخوند بابا درویزہ پشاوریؒ ۳۴۲
اخوند درویزہ بحیثیت مصنف ۳۴۶

Marfat.com

مالوہ، گجرات، دکن	۳۴۴
شیخ علی متقی رح	۳۴۷
شیخ عبدالوہاب متقی رح	۳۴۸
شیخ وجیہہ الدین رح	۳۴۹
شیخ طاہر پٹنی رح	
بوہروں کی اصلاح	۳۵۰
شاہ جہاں اور	
اصلاحی تحریک	۳۵۲
شاہ جہاں کے علماء اور	
مشائخ سے تعلقات	۳۵۶
شیخ محب اللہ الہ آبادی رح	۳۶۰
ملا عبدالحکیم	
سیالکوٹی	۳۶۱

باب ہفدہم
مغلیہ سلطنت
وسعت و ترقی کے بام عروج پر
(عہد عالمگیر)

(عہد عالمگیر)	۳۶۲
جنگ تخت نشینی	۳۶۲
عہد عالمگیر کا نصف اول	۳۶۳

Marfat.com

فتح دکن ۳۶۵
شیواجی ۳۶۶
شیواجی کی بغاوت
اور گرفتاری ۳۶۷
شیواجی مغل دربار میں ۳۶۹
"سوراجیہ" ۳۷۰
دکنی سیاست کا
نقشہ ۱۶۸۰ء میں ۳۷۱
صفوی حکمراں اور
مغلیہ سلطنت ۳۷۲
بیجاپور کا الحاق ۳۷۳
گول کنڈہ کا الحاق ۳۷۵
عالمگیر کی فتوحات
اور سنبھاجی کی گرفتاری ۳۸۰

باب بیجدہم
ادب و معاشرت
عہدِ عالمگیر میں ۳۸۴

اورنگ زیب کی تعلیم
اور اس کے اساتذہ ۳۰۴

Marfat.com

شیخ عبدالقوی
سرمد کا قتل ۳۸۵
عہد عالمگیری کے
علماء اور فقہاء ۳۸۶
عالمگیر کا ادبی ذوق ۳۸۹
عالمگیر کے
دربار کے شعراء ۳۹۱
امرائے عالمگیری کا
ادبی ذوق ۳۹۶
عہد عالمگیری میں
فن تاریخ نویسی ۳۹۹
فتاوائے عالمگیری ۴۰۳
شریعت کا اقتدار ۴۱۰
دارا کا قتل ۴۱۵

باب نوزدہم
تعلیم

ابتدائی دور: سندھ ۴۲۳
سلطان محمود غزنوی ۴۲۵
سلطان محمود کے بعد ۴۲۸

Marfat.com

سلطان معزالدین
محمد بن سام ۔۔۔ ۴۲۹
سلطنت دہلی کا
ابتدائی دور ۔۔۔ ۴۳۰
سلطان شمس الدین التمش ۔۔۔ ۴۳۱
خلجی عہد
شیخ نظام الدین اولیاء کا
حصہ تعلیمی ترقی میں ۔۔۔ ۴۳۴
فیروز شاہ تغلق ۔۔۔ ۴۳۷
جونپور ۔۔۔ ۴۴۲
بنگال ۔۔۔ ۴۴۳
کشمیر ۔۔۔ ۴۴۴
گجرات و مالوہ ۔۔۔ ۴۴۵
دکن ۔۔۔ ۴۴۸
مدرسہ محمود گاواں ۔۔۔ ۴۵۰
مغلیہ حکومت کا
ابتدائی دور ۔۔۔ ۴۵۳
اکبر کے عہد
میں تعلیمی ترقی ۔۔۔ ۴۵۴
جہانگیر ۔۔۔ ۴۵۶
شاہجہاں ۔۔۔ ۴۵۷

Marfat.com

عالمگیر ۴۶۰

عالمگیر کے بعد ۴۶۴

Marfat.com

انتساب

اپنے والد مرحوم

سیّد شاہ مجیب الحق چشتی صابری رح

کے نام

جن کے اخلاقِ حسنہ، عبادات و ریاضت اور درویشانہ زندگی میں بزرگانِ سلف کے کردار کی جھلک دیکھنے کا موقع ملا، اور جن کے فیضِ صحبت کا اثر تھا کہ تصوّف اور صوفیہ کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

قرونِ وسطیٰ میں تہذیب و تمدن کے نقشے پر نظر ڈالنے، یورپ کی اقوام جہل و تعصب کے تاریک پردوں میں چھپی ہوئی ملیں گی، لیکن مشرق بالخصوص اسلامی دنیا میں ہر طرف علم کا چراغ جلتا ہوا نظر آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں جو مغربی اقوام کی تاریخ میں خود ان کے قول کے مطابق تاریک عہد تھا، اگر مسلمان علم و تحقیق کی شمع روشن نہ رکھتے تو نہیں کہا جا سکتا کہ دورِ جدید کی [illegible] ہوتا۔ عالمِ اسلام کے کسی حصے کی بھی تاریخ اٹھا کر اس کا مطالعہ کیجیے، آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں نے ذہنی اور مادی زندگی کے ہر شعبہ کو سنوارا اور وہاں کی تمدنی تاریخ کے بہترین ابواب لکھے [illegible]

کم وبیش ایک ہزار سال تک سیاسی اقتدار ہی نہیں بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی زندگی کی قیادت بھی ان ہی کے پاس رہی، اس زمانے کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی مواد موجود ہے، کیوں کہ فنِ تاریخ نویسی سے مسلمانوں کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور واقعات کو محفوظ اور منضبط کرنے کی وہ برابر کوشش کرتے رہے ہے، تاریخ کا شوق اور اس فن کو سائنس کا درجہ عطا کرنے کے لئے جو اقدامات علمائے اسلام نے کیے، ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب کہ ہم ان کی کوششوں کو جدید تصورات کے معیار پر جانچیں، تاریخ کے طلباء یہ جانتے ہیں کہ ابتدائی دور کے محدثین و مورخینِ اسلام نے "تاریخی شہادت" کے معیار کو کس طرح اور کس حد تک بلند کیا، اور اس سلسلے میں ان کی کاوشوں کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلم مورخین نے تاریخ کے بعض گوشوں، مثلاً سوانح اور حربی فتوحات پر زیادہ زور دیا۔ اور شخصی حکومتیں قائم ہو جانے کے بعد حکمرانوں کے کارناموں کی طرف ان کی توجہ زیادہ رہی، لیکن پھر بھی انہوں نے واقعات اور تفصیلات جس انداز سے جمع کی ہیں، اور ان کی صحت کا جو التزام کیا ہے اس کا بغور مطالعہ کرنے سے ہم کو تہذیب و تمدن کی رفتار کے ہر پہلو پر مفید معلومات مل سکتی ہیں، فنِ تاریخ کی وسعت اور اس کے بنیادی تصورات ہر زمانہ میں بدلتے رہے ہیں، اور ان ہی تصورات کی بنیاد پر ہر عہد کے لکھنے والے اپنی تصانیف مرتب کرتے رہے ہیں۔ دورِ جدید کے مورخ کو اکثر سخت مایوسی ہوتی ہے جبکہ اس کو تاریخی تصانیف کے سیکڑوں ورق الٹنے پر بھی وہ مواد نہیں ملتا جس کی

135570

Marfat.com

اس کو ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر زندگی کے معاشرتی، ادبی، ثقافتی اور اقتصادی پہلوؤں پر اس کو وہ معلومات دستیاب نہیں ہوتیں جن کی بنیاد پر وہ کچھ نتائج اخذ کر سکے، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ تاریخ نویسی کے جدید تصورات کا تقاضا ہے کہ ان پہلوؤں پر تفصیلی مواد جمع کیا جائے اور اس کی روشنی میں اس دور کی زندگی کا خاکہ مرتب کیا جائے۔

ہند پاکستان کی تاریخ میں معاشرتی تشکیل و تہذیب میں مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا ہے اس کے آثار نہ امتدادِ زمانہ سے محو ہو سکتے ہیں اور نہ تعصب اور جہل کی قوتیں ان کو ختم کر سکتی ہیں۔ پتھر اور چونہ سے تیار کی ہوئی عمارتیں تو ختم ہو سکتی ہیں، لیکن تاریخ کے صفحات میں ہمارے سلاطین اور دیگر رہنمایانِ ملت کے جن کارناموں کو محفوظ کر لیا گیا ہے یا آئندہ کر لیا جائے گا ان کو دوامی شہرت مل جائے گی اور تاریخ کے طلباء کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ اس دور کی زندگی کا صحیح خاکہ تیار کر سکیں۔

ابتداء ہی سے برِ صغیر میں مسلمانوں کی دفتری اور علمی زبان فارسی تھی چنانچہ یہاں کی اکثر تاریخیں اسی زبان میں لکھی گئی ہیں، ان مورخین نے (باستثنائے چند) ہمیشہ تاریخ کے سیاسی، سوانحی اور حربی پہلوؤں پر زور دیا اور ان ہی سے متعلق مسائل پر تفصیلی بحثیں کیں، انہوں نے معاشرتی، علمی، ثقافتی اور اقتصادی زندگی کو تقریباً نظر انداز کیا ہے، پھر بھی نمونتاً وہ بہت سی چیزیں پیش کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں مفید اور ضروری ہیں، لیکن تاریخی تصانیف کے علاوہ دوسرے موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ہم کو کافی مواد مل جاتا ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ متعلقہ معلومات حاصل کرنے کے لئے سخت

Marfat.com

کاوش کی ضرورت ہے، بہر حال یہ کام بہت ضروری ہے اور ہمارے مورخین کو ان مسائل کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ ہماری یہ کتاب "معاشری و علمی تاریخ" اسی سلسلہ کی ایک محدود کوشش کا نتیجہ ہے۔

اسلامی معاشرہ کی بنیادیں ابتداء ہی سے دینی تعلیمات و تصورات پر رکھی گئیں اسلام کے ضابطۂ حیات میں مادی اور روحانی زندگی پر یکساں زور دیا گیا ہے اور دینی و دنیوی امور کو علیحدہ علیحدہ حجروں میں رکھنے کی اجازت نہیں، جس طرح راہبانہ زندگی کو مذموم کہا گیا ہے، اسی طرح حصول دولت و اقبال کو مقصد حیات بنانے کی مذمت کی گئی ہے، احکام شریعت کی پابندی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر قدم پر ضروری تھی، اس کی خلاف ورزی بغاوت کے مترادف تھی۔ معاشرہ کی اس تنظیم میں یہ ظاہر تھا کہ قیادت کی تمام تر ذمہ داری دینی رہنماؤں پر رہی شرعی احکامات کی تعلیم کے لئے علماء اور فقہا کی رہنمائی اور اخلاقی و روحانی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے مشائخ و صوفیہ کی توجہ ضروری خیال کی جاتی تھی، ایک مدت تک علماء اور مشائخ علیحدہ نہیں تھے، کم از کم اکابر صوفیہ میں سب ہی عالم تھے لیکن رفتہ رفتہ معاشرہ کی تنظیمی پیچیدگیاں اتنی بڑھ گئیں کہ علماء و فقہاء میں سے اکثر کی کوشش صرف تصنیف و تالیف اور درس و تدریس تک محدود ہو کر رہ گئی، صوفیہ روحانی تربیت اور دینی و اخلاقی زندگی کی اصلاح میں مصروف ہو گئے چونکہ یہ لوگ مال و دولت اور جاہ پرستی سے کنارہ کش ہو کر فقر و توکل کی زندگی بسر کرتے تھے، ان کا اثر معاشرہ پر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، حضرت

Marfat.com

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ورود اور اجمیر میں سکونت اختیار کرنے کے
بعد صوفیہ کا اثر خاص طور پر زیادہ بڑھنے لگا، اس کے بعد دوسرے
سلاسل طریقت کے بزرگوں نے بھی تربیتی مراکز قایم کئے چنانچہ روحانی
تعلیم اور معاشرہ کو اسلامی تعلیمات کی بنیادوں پر
منظم و مستحکم کرنے کا کام وسیع پیمانہ پر ہونے لگا۔

شخصی حکومتوں میں سلاطین اور امراء کو خاص اہمیت حاصل
ہوتی ہے۔ ان کے خیالات، اخلاق اور اعمال کا اثر امور سلطنت
تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بلکہ کسی حد تک معاشرہ کے ہر پہلو پر حاوی
ہو جاتا ہے۔ صوفیہ نے اس حقیقت کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا
چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ملت کے ان رہنماؤں کو صحیح
راستے پر چلنے کی ہدایت کرتے رہیں۔ عام طور پر صوفیہ دنیوی
امور، بالخصوص سیاسیات سے دور رہتے تھے۔ ان کے اصول میں
(کم از کم ابتدائی دور میں) شاہی دربار سے وابستگی نامناسب تھی بلکہ حکمران
وقت سے بھی ملاقات کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ شیخ نظام الدین
اولیا کا سلطان علاؤ الدین خلجی سے اس کی خواہش اور کوشش کے
باوجود ملاقات نہ کرنا۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی کا شاہجہاں سے یہ
کہہ کر معذرت کرنا کہ جو شخص مرتبہ اولی و ثانی یعنی اطیعوا اللہ و اطیعوا
الرسول سے عہدہ برآ نہ ہوا ہو وہ تیسرے مرتبہ یعنی اولی الامر تک
کس طرح پہونچ سکتا ہے۔ یا شاہ عبد الرحیم (والد شاہ ولی اللہ) کا
عالمگیر کی درخواست پر یہ کہنا "میں اللہ کا فقیر ہو کر کسی امیر کے
دروازے پر جاؤں" ایسے واقعات ہیں جن سے ان حضرات کے خیالات کا

Marfat.com

اندازہ لگانے میں ہم کو مدد ملتی ہے، اس طرح کی اور متعدد مثالیں تاریخ کے صفحات میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ ساتھ ہی ہم کو ایسی مثالیں بھی ملیں گی کہ بعض صوفیہ، نے سلاطین و امراء سے تعلقات قایم کئے اور اس طریقہ سے ان کے اخلاق کی اصلاح کی، مثلاً سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں کا ملجی اور تغلق سلاطین سے ملنا اور ان کو ہدایت کرنا۔ تاریخ کے صفحات میں متعدد واقعات ایسے بھی موجود ہیں کہ امراء کے علاوہ خود سلاطین اور حکمراں بعض بزرگوں کی خانقاہوں میں حاضر ہو کر ان کی تعلیمات سے مستفیض ہوئے ہیں۔

ان بزرگوں نے فقر و توکل پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھ کر اپنے کردار کو اتنا بلند کر لیا تھا کہ ان کو دبدبہ شاہی کی قطعاً پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اور حکمرانوں کے سامنے یہ لوگ وہ باتیں کہہ دیتے تھے، جن کے ادا کرنے کی دوسرے رہنماؤں کو ہمت نہ ہوتی۔ مثال کے طور پر، عالمگیر کے سلسلہ میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر خافی خان نے منتخب اللباب (جلد دوم صفحہ ۵۵۲) میں کیا ہے، بادشاہ ادائے نماز کے لئے جامع مسجد میں گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات اس عہد کے ایک بزرگ شیخ بایزید سے ہوئی، انہوں نے "بطریق وعظ" اس سے کہا کہ تم ایک دین دار بادشاہ ہو، پھر یہ بتلاؤ کہ اپنی لڑکیوں کے نکاح کیوں نہیں کرتے، جب کہ تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادیوں کی شادیاں کیں، مورخ نے یہ نہیں بتلایا کہ عالمگیر پر اس کا کیا اثر ہوا، لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، اور اس کا خاموش رہنا

Marfat.com

اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ نادم تھا اور بہ زبان حال اپنے قصور کا اعتراف کر رہا تھا۔ اس قسم کے واقعات کو جن کا تذکرہ اولیں تاریخوں میں کہیں کہیں ذکر کیا گیا ہے، یکجا جمع کر کے، ہم ان کے دور رس نتائج پہ غور کر سکتے ہیں، اس وقت یہ صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ سلاطین و امراء کے ذریعہ ان بزرگوں نے مسلم معاشرہ کو اسلامی تعلیمات اور اصولوں پر کس طرح منظم کیا۔ یہ ہماری تاریخ کا بہت اہم باب ہے۔ اور اس کا مطالعہ تاریخ کے طلباء کے لئے نہایت ضروری ہے۔

تعمیر و تہذیب معاشرہ کے علاوہ صوفیہ نے تبلیغی خدمات بھی انجام دیں، ابتدائی دور میں ہر مسلمان اپنے دین کا مبلغ تھا حتیٰ کہ سپاہی اور تاجر بھی اسلام کا پیغام دوسروں تک پہونچاتا تھا۔ تاریخ کے صفحات میں اس کی شہادت موجود ہے کہ مسلمان تاجروں ہی کی کوشش کے نتیجہ میں لوگوں نے اسلام قبول کیا، لیکن زمانہ گزرنے کے بعد تبلیغ کا جوش کم ہو گیا ان حالات میں ملت اسلامیہ کی توسیع میں تعطل پیدا ہو جاتا اگر صوفیہ اس ذمہ داری کو نہ سنبھال لیتے، چونکہ سلاطین اور حکمرانوں کا خیال تھا کہ حکومت کی طرف سے تبلیغی کوششوں کی عملی طور پر حوصلہ افزائی مذہبی رواداری کے خلاف ہے، اس لئے وہ اس مسئلہ میں خاموش رہے، یہاں ہم یہ بحث کرنا نہیں چاہتے کہ تبلیغ کا کام حکومت کی رواداری کے اصول پہ اثر انداز ہوتا یا نہیں، لیکن اس مسئلہ کا یہ پہلو نہایت اہم ہے کہ اسلامی حکومت کی یہ پالیسی ملت اسلامیہ کی توسیع میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ سلاطین کے علاوہ امراء، جاگیردار اور دوسرے بااثر طبقے بھی تبلیغ اسلام سے دلچسپی نہیں رکھتے

Marfat.com

تھے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ وہ با اقتدار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور غیر مسلموں کی اکثریت ان کی محکوم ہے ان لوگوں میں سے جو بھی اسلام قبول کر لیتا ہے وہ چاہے جاہل اور غریب ہی کیوں نہ ہوتا خود کو بڑے سے بڑے امیر کے برابر سمجھنے لگتا تھا۔ چنانچہ امراء اور جاگیرداروں کا طبقہ ڈرتا تھا کہ ان نچلے لوگوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد ان کے اقتدار کو صدمہ پہونچے گا۔ اور اس کے مظاہرہ کا دائرہ تنگ ہوتا چلا جائے گا اشاعت اسلام کے نقطہ نظر سے ہماری معاشرتی تاریخ کا یہ باب قابل افسوس ہے لیکن اس کی تلافی بڑی حد تک صوفیہ کی تبلیغی کوشش سے ہو گئی اس سلسلہ میں صوفیہ کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہ تھا کہ وہ بظاہر خود کو مبلغ یا مشنری کی حیثیت سے پیش نہیں کرتے تھے، وہ اخلاقی اور روحانی تربیت اور مذہب کے بنیادی اصولوں پر زور دیتے تھے ان کا کردار بلند ہوتا تھا، حصول دولت کو وہ مذموم سمجھتے تھے اور کسی سے ان کی اغراض وابستہ نہیں ہوتی تھیں، ہر ایک کے ساتھ انتہائی نرمی اور رواداری کا برتاؤ کرتے۔ باوجودیکہ اقتدار اور حکومت ان کے ہم مذہبوں کے ہاتھ میں تھی وہ دوسری اقوام کی طرف ہر طرح جھکنے کو تیار رہتے ان کو فارسی و عربی سیکھنے پر مجبور کرنے کے بجائے خود ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے۔ ابتداء ہی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پنجاب کے علاقہ میں مقامی زبان سیکھی ایک صدی کی گزرنے کے بعد تو مقامی زبان سے صوفیہ کی دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ خسرو جیسا شاعر پیدا کر سکے۔ یہ چند اسباب تھے جن کی وجہ سے غیر مسلم ان کی مجالس میں شریک ہوتے اور ان کے خیالات و اعمال سے متاثر ہو جاتے، صوفیہ کو اپنی تبلیغی کوششوں میں کم حد تک کامیابی

Marfat.com

ہوتی اس کا مفصل حال ہم کو بآسانی نہ مل سکے گا۔ کیوں کہ اس مسئلہ پہ ہم عصر مورخین نے زیادہ توجہ نہیں دی، پھر بھی کہیں کہیں ضمناً اس کا ذکر مل جاتا ہے۔ ان ہی بیانات کی بنیاد پر کچھ مواد اکٹھا ہوسکتا ہے۔

تاریخ کے اس باب یعنے ہمارے دینی رہنماؤں کی بالخصوص مشائخ وصوفیہ کی تبلیغی و اصلاحی کوششوں پر تحقیق و مطالعہ کے سلسلہ میں ہم عصر و نیم ہم عصر ماخذ کا ذکر ضروری ہے، جیساکہ اوپر اشارۃً کہا گیا ہے، تاریخی تصانیف میں ہم کو ان مسائل پر مفید معلومات بہت کم ملتی ہیں، تذکروں میں اور ان سے بھی زیادہ مشائخ وصوفیہ کے ملفوظات میں کچھ مواد موجود ہے، لیکن یہاں تاریخ کے طالب علم کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، صوفیہ کے حالات میں اس قدر کثیر تعداد میں غلط اور ناقابلِ اعتبار روایتیں اور خاص طور پر اُن کی کرامات کے قصے شامل کردیے گئے ہیں کہ صحیح اور مستند واقعات کو ان سے علیحدہ کرنا انتہائی مشکل ہوگیا ہے اس کے لیے تاریخ کے وسیع مطالعے اور درایت کے اصولوں سے کام لینے کی ضرورت ہے، تب سخت محنت اور کاوش کے بعد صحیح واقعات کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مشائخ چشت کے بعض ملفوظات کو چند جدید مورخوں نے قطعی طور پر جعلی لکھا ہے اور ان کے دلائل میں اندرونی شہادتیں نمایاں نظر آتی ہیں، یہ تو یقیناً صحیح ہے کہ بعض واقعات کو جن کا ذکر ان مجموعوں میں ملتا ہے کسی صورت سے وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن چند مثالوں کی بنیاد پر سارے مجموعے کو فرضی اور جعلی قرار دینا

Marfat.com

بھی حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے، ملفوظات کے جن مجموعوں کو جعلی قرار دے کر نظر انداز کیا گیا ہے، ان کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسے محقق نے بطور سند پیش کیا ہے، یہ صاف دلیل ہے اس امر کی کہ یہ مجموعے کلیۃً جعلی نہیں ہو سکتے۔ ہاں بہت سی غلط روایتیں اور جھوٹے قصے ان میں داخل کر دئے گئے ہیں۔ تحقیق کے دوران اس قسم کی اور بھی مشکلات کا سامنا ہو گا۔ بہر حال ان کا مقابلہ ضروری ہے۔ ورنہ معاشری تاریخ کے ایک نہایت اہم باب کا مطالعہ تشنہ رہے گا۔ اور ہماری تہذیب کی نامکمل تصویر ہی تاریخ کے صفحات میں پیش کی جاتی رہے گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ تاریخ کا عظیم المیہ ہو گا۔

معاشری تاریخ کے علاوہ اس کتاب میں علمی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر بھی بحث کی گئی ہے علمی تاریخ کا یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی، مختلف ادوار کے معاشری رجحانات اور ان کے اثرات کا اندازہ لگانے اور ان کی اہمیت کو سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملے گی۔ آخر میں ایک باب "تعلیم" پر ہے، یہ بھی حقیقتاً ایک مختصر جائزہ ہے، لیکن علمی زندگی کی تصویر مکمل کرنے میں یقیناً وہ مفید ثابت ہو گا۔

عربی و فارسی کی عبارتیں اردو ہی کے لباس میں پیش کی گئی ہیں، لیکن کہیں کہیں مختصر اقتباسات بغیر ترجمہ کے شامل کر دیے گئے ہیں، اصل عبارت اور ترجمہ دونوں کو شامل کرنے سے کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا اس کے علاوہ یہ بھی خیال تھا کہ تاریخ کے ہر اس طالبِ علم کو جو ان مسائل پر تحقیق اور مطالعہ کا خواہش مند ہے، کم از کم فارسی سے تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے۔ اعلیٰ معیاری تحقیق کے لئے ہم عصر اور بنیادی ماخذ کا تجزیاتی

Marfat.com

مطالعہ اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ اہم ہے جتنا کہ حاصل کردہ معلومات کی بنیاد پر نظریات کا مرتب کرنا۔

میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ برادر محترم سید احسان الحق کا شکریہ ادا کروں، تصوف سے ان کی گہری دلچسپی اور اس کے مسائل میں غیر معمولی درک اس مطالعہ کے سلسلہ میں اکثر مشعل راہ ثابت ہوئے بعض نایاب کتابیں اور رسالے جو بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود نہیں ان کے مختصر ذخیرہ میں ملے صوفیہ کے بعض مسائل و اقوال کی اہمیت اور صحیح مطالب کا اندازہ لگانے میں ان ہی سے مدد ملی۔

سید معین الحق

مارچ ۱۹۶۵ء

Marfat.com

Marfat.com

باب اوّل

اسلام کا ورود ہند پاکستان میں

محمد بن قاسم کی فتوحات

عہد رسالت کے آخری دس سال اور رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور میں اسلام نے جس تیز رفتاری سے ترقی کی، وہ تہذیب و تمدن کی تاریخ کا ایک عظیم ترین معجزہ ہے۔ فتوحات اور تبلیغ کا سلسلہ بنو امیہ کے عہد اقتدار (۴۱ تا ۱۳۲ھ) میں بھی جاری رہا اور پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پیشتر عالم اسلام کی حدود مشرق میں دریائے سندھ اور مغرب میں سپین سے آگے بڑھ چکی تھیں۔ ہند پاکستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ ہجرت نبوی ﷺ کے پندرھویں سال یعنی ۶۳۶ء میں شروع ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے بمبئی کے قریب تھانہ کی بندرگاہ اور اس کے بعد بھروچ (بھڑوچ) اور سندھ کے علاقہ پر فوج کشی کی۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں ایک بحری دستہ دیکھ بھال کی غرض سے آیا اور بالآخر حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ان علاقوں کی باقاعدہ نگرانی کی جانے لگی۔ امیر معاویہ نے اپنے ایک سردار مہلب کو سرحدی نگرانی کا کام سپرد کیا۔ اس طرح اسلامی حکومت میں سندھ کے گورنر کا ایک مستقل عہدہ قائم ہوگیا۔ عرب اور ایرانی جہاز رانوں نے اسلام سے قبل بھی ہند پاکستان سے تجارتی تعلقات بہت زیادہ بڑھا لئے تھے۔ برصغیر کے مشرقی ساحل اور لنکا کی بندرگاہوں میں ان کی نو آبادیاں

Marfat.com

قائم ہو گئی تھیں، سندھ کے راجہ داہر کی سلطنت میں تو ایک باغی عرب سردار نے بھی پناہ لی تھی اور فوجی خدمت انجام دے کر راجہ پر اپنا کافی اثر قائم کر لیا تھا۔

اسلامی فتوحات کا پہلا دور
محمد بن قاسم

آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں اموی خلافت کی طرف سے مشرقی علاقہ پر جو مکران تک پہنچا تھا، حجاج بن یوسف کو حکمراں بنا کر بھیجا گیا، اسی زمانہ میں لنکا میں ایک مسلمان تاجر کا انتقال ہوا تو وہاں کے راجہ نے اس تاجر کے بچوں کو کچھ تحائف کے ساتھ بغداد روانہ کر دیا، سندھ کے ساحل پر دیبل کے قریب بحری قزاقوں نے اس جہاز کو لوٹ لیا، حجاج نے سندھ کے راجہ داہر[1] کے پاس پیغام بھیجا کہ مسلمان قیدیوں کو واپس کیا جائے اور نقصان کی تلافی کی جائے، داہر نے کہا کہ جن قزاقوں نے

---

[1] راجہ داہر نے اپنی بہن کے ساتھ شادی کی تھی، چچ نامہ میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:۔

داہر کے نجومیوں نے بتلایا کہ جو شخص راجہ کی بہن سے شادی کرے گا وہ ہی سندھ کا راجہ ہو گا۔ اس پر اس کے وزیر نے مشورہ دیا کہ راجہ خود اپنی بہن سے شادی کر لے، داہر سخت پریشان ہوا لیکن وزیر نے یہ تدبیر کی کہ ایک بکری کے بالوں میں رائی کا پودا لگا دیا، جب یہ بکری بازار میں آئی تو لوگوں نے بہت تعجب کیا اور کثیر تعداد میں جمع ہو گئے، بکری کو تین دن تک روزانہ گشت کرائی گئی چنانچہ لوگوں کی دلچسپی ختم ہو گئی اور اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتا تھا، وزیر نے راجہ سے کہا کہ ٹھیک اسی طرح آپ کی بہن سے شادی کا چرچا چند روز رہے گا اور اس کے بعد کوئی بھی فکر نہ کرے گا، راجہ یہ دیکھ کر راضی ہو گیا اور اپنی بہن سے شادی کر لی، لیکن وہ آپس میں ملے نہیں بلکہ رانی کو علیحدہ رکھ دیا گیا۔

دیکھو چچ نامہ ص ۲۷

Marfat.com

جہاز لوٹا تھا ان پر مجھ کو اختیار نہیں، حجاج کو یہ جواب مطمئن نہیں کر سکتا تھا، اس نے راجہ کو سزا دینے کے لئے دو سردار یکے بعد دیگرے بھیجے، لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی، تیسری مرتبہ حجاج نے اپنے نوجوان عزیز اور سردار محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی۔ یہ فوج خشکی کے راستہ سے مکران ہوتی ہوئی سندھ پہنچی، بھاری سامان اور اسلحہ بحری بیڑے کے ساتھ دیبل آیا، محمد بن قاسم نے دیبل کا باقاعدہ محاصرہ کرکے اس کو فتح کیا[1] اس کے بعد مسلمان دریائے سندھ کو عبور کرکے آگے بڑھے اور حیدرآباد پر جو اس زمانہ میں نیرون کہلاتا تھا قبضہ کرکے شمال کی طرف روانہ ہوئے، سیوہان کے لوگوں نے مقابلہ کیا لیکن جلد ہی ان پر قابو پالیا گیا۔ اپنی فوج کے ایک حصے کو سیوہان کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر محمد بن قاسم سیسم یعنی سیبی کی طرف روانہ ہوا، وہاں جاٹوں نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔

یہاں محمد بن قاسم کو معلوم ہوا کہ راجہ داہر برہمن آباد میں مقابلہ کی تیاری کر رہا ہے اور تقریباً پچاس ہزار فوج اس نے جمع کرلی ہے، چنانچہ وہ بھی نیرون واپس آیا فوج کے لئے ضروری سامان جنگ مہیا کیا اور تیاری کے بعد راوڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راوڑ کی لڑائی سندھ کے حملہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، داہر کو شکست ہوئی اور وہ خود لڑائی میں مارا گیا محمد بن قاسم برہمن آباد آگیا اور وہاں پہنچ کر اس نے مفتوحہ علاقے کی حکومت کے لئے ضروری انتظامات کئے یہاں سے مسلمانوں کی فاتح افواج شمال کی طرف روانہ ہوئیں اور ملتان میں

---

[1] دیبل کے سب سے بڑے مندر پر ایک جھنڈا لگا تھا، شہر کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک یہ جھنڈا قائم ہے کوئی حملہ آور دیبل فتح نہیں کر سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم نے منجنیق عروس کے ذریعہ اس جھنڈے پر سنگباری کی اور بالآخر اس کو گرا دیا، سندھی بے ہمت ہوگئے اور قلعہ سے باہر آگئے۔ طرفین میں زبردست جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں نے فتح پائی اور دیبل پر قبضہ کرلیا۔

Marfat.com

جو مقامات ملے ان کو فتح کرتی ہوئی ملتان تک پہنچ گئیں۔ شہر کے ہندوؤں نے باہر آکر میدان میں مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور شہر میں پناہ لی، مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ ملتان کی فتح کے بعد سندھ کا سارا علاقہ محمد بن قاسم کے زیر نگین آگیا لیکن یہ اس کی آخری فتح تھی، یہاں سے اس کو واپس لوٹنا پڑا کیونکہ اس عرصہ میں حجاج کا انتقال ہو چکا تھا۔ ۷۱۵ء میں خلیفہ ولید نے وفات پائی اور اس کا بھائی سلیمان تخت خلافت پر بیٹھا، سلیمان نے حجاج کے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو سخت سزائیں دینی شروع کیں، چنانچہ محمد بن قاسم بھی اس پالیسی کا شکار ہوا۔ بغداد کے نئے گورنر کے حکم سے اس کو واسط میں قید کر دیا گیا۔ گرفتاری کے وقت محمد بن قاسم نے یہ شعر پڑھا[1]

اضاعونی وای فتی اضاعوا ؎ لیوم کریهة وسداد ثغر

(ترجمہ:۔ لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کس جوان کو × جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کی مضبوطی کے لئے نہایت مناسب ہو)

جیل خانہ میں اس کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں، آخر کار تکالیف اور مصائب کے صدموں سے وہ جیل خانہ ہی میں وفات پا گیا۔

محمد بن قاسم کا کارنامہ

باوجود کم عمری کے محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں پر اپنی ہمت اور بہادری کا سکہ بٹھا دیا تھا، انتظامی معاملات میں اس نے ثبات، دور اندیشی اور رواداری سے کام لیا، اس کی رواداری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کے غیر مسلموں کے لئے اس نے علمائے دمشق سے فتویٰ لیا کہ ان کے ساتھ وہی مراعات برتی جائیں جو دوسرے علاقوں میں اہل کتاب یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کو حاصل تھیں۔ اسلامی حکومت میں بہت سے عہدوں پر غیر مسلم ہی فائز

---

[1] بلاذری بحوالہ تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر ندوی ص ۱۲۱

Marfat.com

رہے، چنانچہ راجہ داہر کے وزیر مالیات کو بھی اس کے عہدہ پر قائم رکھا گیا۔[۱] محمد بن قاسم کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا لیکن جو علاقہ فتح ہو چکا تھا اس کا اکثر حصہ اسلامی مملکت کا مستقل حصہ بن گیا۔ محمد بن قاسم کی فتوحات ہند پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں، پہلی مرتبہ برصغیر کا اسلامی دنیا سے براہ راست تعلق پیدا ہوا اس کے علاوہ تبلیغی کوششوں کے نتائج میں یہاں کی آبادی کے بڑے حصے نے اسلام قبول کیا بعض مسلمان سردار جو فوج کے ساتھ آئے تھے یہیں بس گئے، گویا کہ اسلام جو نئی تہذیب لایا تھا وہ اس خطہ ارض میں داخل ہوئی اور یہاں کے تمدن کو اس نے بڑی حد تک بدل دیا سب سے زیادہ اہم تبدیلی زبان میں ہوئی، سندھی زبان اور رسم الخط میں عربی و فارسی زبان کا اثر آج بھی نمایاں ہے۔

اسلامی فتوحات کا دوسرا دور سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے شروع ہوتا ہے لیکن ان حملوں سے پہلے اسلامی معاشرہ اور سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں، جن کی طرف مختصراً اشارہ کیا جا سکتا ہے، اموی حکمرانوں نے بہت جلد اسلامی خلافت کو مملکت میں تبدیل کر دیا، اس کے بعد جہاں تک حکمرانوں کا تعلق تھا ان میں سے اکثر تبلیغ اسلام اور مسلمانوں کی روحانی زندگی کی طرف سے کم و بیش غیر متعلق سے رہے اور ان کی فتوحات اور پالیسیوں میں اسلامی عنصر زمانہ کے ساتھ کم ہوتا گیا، اگرچہ اسلامی حکومت کا نظم و نسق شریعت کی بنیادوں پر قائم رہا، مگر پھر بھی حکمران اور نظم و نسق چلانے والے طبقوں اور مسلمانوں کی اکثریت کے مقاصد کے مقابلہ میں دینی جذبہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ اس کمی کو علماء اور ان سے بھی زیادہ صوفیاء نے پورا کیا۔ موخر الذکر حضرات نے دنیوی مفاد اور نفسانی خواہشات سے پیدا ہونے والے

---

[۱] مفتوحہ علاقوں کے رہنے والوں کو محمد بن قاسم کی موت سے سخت رنج ہوا، بلاذری نے لکھا ہے کہ کیرج یعنی کچھ کے لوگوں نے یادگار کے طور پر اس کی مورتی بنائی۔

Marfat.com

جھگڑوں کو ختم کرنے کی غرض سے خدا کی محبت اور اس دنیا کو متاع قلیل سمجھنے پر زور دیا۔ صوفیاء کے مختلف سلاسل کی اشاعت اور تنظیم امام حسن بصری (م ۶۴۲ء) کے زمانہ سے شروع ہوئی، یہاں ان کے تبلیغی کارناموں کو اختصار کے ساتھ بھی بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ سندھ پاکستان میں اسلام کی تاریخ اور یہاں کے تمدن کی تعمیر میں ان بزرگوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہمارے برصغیر میں مسلم حکمرانوں کی پالیسی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اگر صوفیاء کے مختلف سلسلوں کے بزرگ تبلیغ کی طرف پوری توجہ نہ دیتے تو شاید مسلمانوں کی تعداد یہاں بہت قلیل رہتی۔ یہ کہنا آسان نہیں کہ برصغیر میں صوفیاء میں سب سے پہلے کون بزرگ آئے میر غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں ابو حفص ربیع بن صبیح الاسدی البصری کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے ۱۶۰ھ میں سندھ میں وفات پائی[1]

ابتدائی دور کے ان بزرگوں کے متعلق معلومات اس قدر محدود اور کمیاب ہیں کہ صحیح طور پر نتائج اخذ نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن یہ ایک اہم موضوع ہے اور تاریخ کے طلباء کو اس پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

سندھ۔ برصغیر میں اسلامی علوم کا پہلا گہوارہ

محمد بن قاسم کی فتوحات کے بعد سندھ اور ملتان کا علاقہ مسلمانوں کے زیر حکومت رہا خواہ بحیثیت خلافت بغداد کے ایک حصے کے خواہ بحیثیت خود مختار حکومت کے، اسلامی اقتدار کے قیام کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقہ میں اسلامی علوم کا رواج ہو گیا۔ سیاسی اور تاریخی تصنیفات

---

[1] مآثر الکرام ص ٦ دوسرے مآخذ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو حفص کبھی سندھ میں نہیں آئے بلکہ گجرات کے علاقہ ہی میں مقیم رہے اور وہیں انتقال کیا۔ دیکھو رسالہ معارف۔ مارچ ۱۹۶۰ء۔

Marfat.com

اور سفرناموں وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے بعض علماء نے اسلامی دنیا میں بہت جلد ایک بلند مقام حاصل کر لیا، سندھی علماء میں سب سے پہلے مولانا اسلامی کا ذکر ملتا ہے، یہ دیبل کے رہنے والے تھے اور اسلام سے مشرف ہونے کے بعد محمد بن قاسم کے معتمدوں میں شامل ہو گئے تھے کیونکہ راجہ داہر کے پاس مسلم فاتح کی طرف سے پیغام صلح لے کر یہی گئے تھے، داہر کو وہ اپنی ہٹ دھرمی چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکے، دوسری قابل ذکر ہستی موسیٰ بن یعقوب ثقفی، قاضی القضاۃ سندھ اور قاضی ارور کی ہے، یہ سندھی الاصل تو نہ تھے بلکہ عرب تھے لیکن یہاں اس قدر مدت تک رہے کہ ان کو سندھی علماء ہی میں شمار کیا گیا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے ایک اور بزرگ اسرائیل بن موسیٰ البصری ہیں جنہوں نے حضرت امام حسن بصری، ابن سیرین اور وہب بن منبہ سے روایت کی ہے، ایک اور بزرگ جو عراق سے تیسری صدی ہجری کے آخر میں یہاں آ کر آباد ہوئے اور منصورہ کے قاضی مقرر ہوئے محمد بن ابی الشوارب تھے، ان کے بعد ان کے بیٹے علی بن محمد بھی منصورہ میں قاضی کے عہدہ پر فائز ہوئے، عجائب الہند میں ایک اور عالم کا ذکر ہے جو منصورہ کے حاکم کی طرف سے ارور کے راجہ کے پاس اسلام کی حقیقت سمجھانے کے لئے گئے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ راجہ کی خواہش پر انہوں نے قرآن شریف کا ترجمہ سندھی میں کیا۔[1] سمعانی نے ابو نصر سندھی کا ذکر کیا ہے جو حدیث کے بڑے عالم تھے اور آل حکم کے غلام رہ چکے تھے، ایک مرتبہ راستہ میں جا رہے تھے، ایک عرب نشہ میں بدمست پڑا تھا۔ اس نے کہا اے غلام میں تو زمین پر پڑا ہوں اور تو اس شان سے جا رہا ہے، ابو نصر نے جواب دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تمہارے بزرگوں کے اق

---

[1] حوالہ کے لئے دیکھو تاریخ سندھ ص ۳۵۷۔ اگر ترجمہ کے متعلق روایت صحیح ہے تو کلام اللہ کے قدیم ترین ترجموں میں سندھی کا ترجمہ ہوا اور سندھی زبان کی یہ خصوصیت یقیناً قابل فخر ہے۔

Marfat.com

نہ میرے بزرگوں کے طریقوں پر عمل پیرا ہو۔

منصورہ کے علاوہ دیبل اور ملتان بھی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے مراکز تھے، یہاں کے متعدد علماء اور شعراء کا ذکر تاریخی کتابوں میں موجود ہے، یہ سلسلہ کئی صدی تک جاری رہا۔ اسماء الرجال کی مشہور کتابوں میں سندھ کے علماء حدیث کے تراجم ملتے ہیں۔ دوسری تیسری اور چوتھی ہجری کے بعض علمائے حدیث کا ذکر مولانا عبدالحئی نے نزہتہ الخواطر میں کیا ہے[1] علمائے حدیث و سیر کے علاوہ کچھ شعراء اور ادباء کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ملتان میں ہارون بن عبد اللہ کے خاندان نے سکونت اختیار کرلی تھی چنانچہ ان کے نام کے ساتھ ملتانی لکھا جاتا ہے، اہل علم کا ایک اور خاندان جس کا تعلق قبیلہ ہباری اسدی سے تھا پہلے ارور اور بعد میں سکھر کے علاقہ میں سکونت پذیر تھا، پانچویں صدی کے شروع میں یہ منتقل ہوکر ملتان آگیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہ خاندان حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا اور ان کے پوتے شیخ رکن عالم صاحبؒ کی بدولت عزت و شرف کی معراج پر پہنچا۔ ادباء و شعراء میں ابو العطاء سندھی قابل ذکر ہیں۔ ان کا نام افلح بن یسار تھا، ان کے آقا نے ان کو آزادی دیدی تھی لیکن آزاد ہونے کے بعد جب شاعری کی بدولت ان کی مالی حالت بہتر ہوگئی تو اس نے آزادی کی قیمت چار ہزار درہم وصول کرلی۔ ابو العطاء نے اس کے جواب میں اس کے متعلق ہجو آمیز اشعار کہے۔ ابو العطاء عربی الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کرسکتے تھے چنانچہ انہوں نے ایک غلام کو متبنیٰ کرکے اس کا نام عطاء رکھا اور اپنی کنیت ابو العطاء رکھی، ان کے لکھے ہوئے اشعار وہی پڑھتا تھا، ایک اور شاعر ابو ضلع کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست میں کیا ہے، انہوں نے برصغیر کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا۔

---

[1] نزہتہ الخواطر میں متعدد علماء کا تذکرہ موجود ہے۔

Marfat.com

یہاں سندھ کی تاریخ کے اس دور کی تمام علمی و ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں لیکن اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ سیاسی طور پر مرکز خلافت سے دربار بغداد میں منقطع ہو جانے کے باوجود سندھ کو وہاں کی علمی و ادبی کوششوں نے اسلامی دنیا کے دوسرے علاقوں سے متصل بلکہ ملحق رکھا۔ تاریخ میں ہم کو بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثقافتی اور دینی تعلقات سیاسی انقلابات اور مصلحتوں سے بلند تر ہو سکتے ہیں۔ اس نظریہ کا بہت واضح ثبوت سندھ کی تاریخ ہے۔

Marfat.com

بابِ دوم

اسلامی فتوحات کا دوسرا دَور

سلطان محمود غزنوی

اسلامی فتوحات کا دوسرا دور دسویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوا۔ اب عالمِ اسلام میں سیاسی انقلاب آچکا تھا خلیفہ کی طاقت تقریباً ختم ہو چکی تھی اگرچہ برائے نام اب بھی عباسی خلیفہ کی حکومت ساری اسلامی دنیا پہ قائم تھی، لیکن حقیقی اختیارات علاقائی حکمران خاندانوں کے ہاتھ میں تھے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کے بانی ترک تھے۔ ان ہی ترک خاندانوں میں ایک سامانیہ خاندان تھا جس کا دارالحکومت بخارا تھا، سامانیوں کے ایک غلام الپتگین نے غزنین میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی تھی، الپتگین کا غلام سبکتگین اپنے مالک کے بعد تخت نشین ہوا، ریاست غزنین کی حد شرقی جانب ہند پاکستان میں راجہ جے پال کے علاقے سے ملتی تھی، جے پال نے سبکتگین کو کمزور تصور کرکے اس کے علاقہ پہ حملہ کیا، دونوں میں جنگ ہوئی، جے پال نے شکست کھائی اور کچھ علاقہ دے کر صلح کرلی، سبکتگین کا لڑکا محمود ۹۹۹ء میں تخت پر بیٹھا۔

سبکتگین کی خواہش پہ اس کے چھوٹے بیٹے اسمٰعیل کو تخت پر بٹھایا گیا تھا لیکن محمود جو اس سے کہیں زیادہ قابل اور بہادر تھا اس انتظام کو کسی طریقے سے منظور نہیں کر سکتا تھا، اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ اس کو تخت دیدے اور خود صوبائی حکومت لے لے، اسمٰعیل اس پہ راضی نہ ہوا، دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی جس میں محمود کامیاب ہوا اور بآسانی اس کو سلطان تسلیم کر لیا گیا۔

Marfat.com

سلطان محمود نے غزنین کی مختصر سی ریاست کو اپنی فتوحات اور قابلیت سے ایک عظیم الشان سلطنت بنا دیا۔ اکتیس سال (۹۹۹ تا ۱۰۳۰ء) کے عرصہ میں اس نے برصغیر ہند پاکستان پر سترہ حملے کئے اور اسی زمانہ میں کم و بیش دس مرتبہ شمال و مغرب کے علاقوں پر حملہ آور ہوا۔ ہند پاکستان میں اس کی فوجوں نے ایک طرف تو قنوج تک اور جنوب کی جانب گجرات میں سومنات تک نہایت شاندار فتوحات حاصل کیں۔ شمال میں اس کی سلطنت سمرقند تک اور دوسری جانب بغداد کے غرب و جوار کے علاقہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس کا شمار دنیا کی عظیم الشان مملکتوں میں ہونے لگا تھا۔

یہاں سلطان محمود کی فتوحات کا مختصر سا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ہند پاکستانی فتوحات کا سلسلہ جے پال سے لڑائی کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ۱۰۰۱ء میں سلطان پہلی مرتبہ برصغیر کی حدود میں داخل ہوا۔ جے پال کی فوج نے جس میں بارہ ہزار سوار، تیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی شامل تھے مقابلہ کیا۔ غزنوی فوج تعداد میں بہت کم تھی، لیکن پھر بھی اس نے ہندوؤں کو شکست فاش دی اور جے پال کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں اس کو رہا کر دیا گیا، مگر شرم کے مارے اس نے خودکشی کر لی۔ چار سال بعد سلطان نے بھٹنڈہ پر حملہ کیا۔ وہاں کے راجہ نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی وہ بھی شرم کی وجہ سے جنگل کی طرف بھاگ گیا اور خود کو ہلاک کر لیا۔ اس حملہ کے دوران ملتان کے قرمطی حکمران ابو الفتح داؤد نے سلطان کو بہت پریشان کیا تھا، چنانچہ اگلے سال وہ داؤد کو سزا دینے کی غرض سے ملتان پر حملہ آور ہوا۔ راستہ میں پشاور کے قریب جے پال کے لڑکے انند پال نے اس کا مقابلہ کیا۔ سلطان نے اس کو شکست دی اور ملتان کی طرف بڑھا۔ داؤد خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا۔ سلطان نے شہر پر قبضہ کر کے قرامطہ کو سخت سزائیں دیں۔ اب اس نے یہ بھی طے کیا کہ برصغیر کے مفتوحہ علاقہ پر باقاعدہ حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ جے پال کے نواسے کو جو مسلمان ہو چکا تھا اور نواسہ شاہ کہلانے لگا تھا یہاں کا حاکم مقرر کیا اور خود واپس چلا گیا۔ سلطان کی واپسی کے بعد نواسہ شاہ نے مرتد ہو کر علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان فوراً ایک فوج لے کر آیا اور اس کو

Marfat.com

شکست دے کر گرفتار کرلیا اور قید خانہ میں ڈال دیا۔

سلطان محمود کے ابتدائی دور کا سب سے بڑا حملہ ۱۰۰۸ء میں ہوا۔ جیپال کے لڑکے انند پال نے اس عرصہ میں شمالی ہند کے راجاؤں اور سرداروں سے اپیل کی کہ ان سب کو متحد ہو کر سلطان محمود کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس کی اپیل کے جواب میں بہت سے ہندو راجہ اور سردار اس کی مدد کے لئے آئے۔ اس طرح ایک زبردست فوج تیار ہوگئی، سلطان کو جب یہ خبر ملی تو وہ بھی اپنی فوج لے کر غزنین سے روانہ ہوا۔ ویہنڈ کے قریب دونوں فوجیں سپر آزما ہوئیں، باوجودیکہ ہندو فوج کثیر التعداد تھی اور مسلمان اس کے مقابلہ میں کم تھے، جنگ میں ان ہی کو فتح ہوئی۔ ہندوؤں کی شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لڑائی کے دوران میں انند پال کا ہاتھی خوفزدہ ہو کر پیچھے کو بھاگ پڑا جس سے ساری فوج منتشر ہوگئی، مفرور ہندو فوج کا تعاقب کرتے ہوئے سلطانی لشکر نگر کوٹ آیا، یہ ہندوؤں کا نہایت مقدس مقام تھا اور یہاں کے مندروں میں بے حساب دولت اور قیمتی سامان تھا، فاتح فوج نے مندروں میں جمع شدہ دولت کا کچھ حصہ اپنے قبضہ میں کرلیا اس سلسلہ میں کچھ بتوں کو بھی توڑ ڈالا گیا، یہ حملہ سلطان کی فتوحات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اس سے پہلے سلطان نے کسی ایک راجہ یا سردار کو شکست دی تھی، لیکن اس موقع پر اس کو شمالی ہند کے متعدد راجاؤں کی متحدہ افواج سے لڑنا پڑا، یہ لوگ تعداد ہی میں زیادہ نہ تھے بلکہ ان کے اندر قومی جوش بھی تھا، باوجود ان باتوں کے سلطان نے ان پر کامیابی حاصل کی، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ایشیا میں سلطان کی شہرت بحیثیت ایک فاتح کے بہت زیادہ پھیل گئی، بالخصوص اسلامی دنیا میں اس کو ایک بلند اور مخصوص مقام حاصل ہوگیا اس کے بعد مختلف ممالک سے مسلمان مجاہدین آکر اس کی فوج میں بھرتی ہونے لگے، مفتوحہ علاقوں پر سلطان نے اپنا حاکم مقرر کیا اور مسجدیں تعمیر کرانے کا انتظام کیا، تاکہ اسلام کی تبلیغ کا کام ترقی کرسکے۔

Marfat.com

دوآبہ کی فتوحات

۱۰۱۴ء میں سلطان نے تھانیسر پر حملہ کیا اور وہاں کا مشہور بت چکرا سوامی اپنے ساتھ غزنین لے گیا، چار سال بعد اس کی فوجوں نے گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں کئی ریاستوں کو شکست دی، جمنا کو عبور کر کے سلطانی افواج نے برن (یعنی بلند شہر) پر حملہ کیا۔ وہاں کے راجہ ہردت نامی نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی اور مسلمان ہو گیا۔ یہاں سے غزنوی افواج کا مقدمۃ الجیش بندرابن کی طرف بڑھا، راجہ کلچند نے مقابلہ کی کوشش کی لیکن شکست کھائی اور خود کشی کر لی، متھرا پر بھی سلطانی افواج نے قبضہ کر لیا اور یہاں بھی مندروں میں اس کو کثیر دولت ملی۔ متھرا سے سلطان اپنی فوج کے ساتھ قنوج آیا اور اس کو فتح کیا۔ واپسی میں بھی اس نے کئی مشہور اور مضبوط قلعے فتح کئے غزنین پہنچ کر سلطان نے ایک عظیم الشان مسجد بنوائی جو عروس فلک کہلاتی تھی کچھ عرصہ بعد سلطان کو خبر ملی کہ دوآبہ کے راجہ اس کے مقابلہ کے لئے بڑے پیمانہ پہ تیاریاں کر رہے ہیں، چنانچہ اکتوبر ۱۰۱۹ء میں وہ غزنین سے روانہ ہوا اور تیزی کے ساتھ طویل راستہ طے کر کے دوبارہ دوآبہ میں داخل ہوا، کالنجر کا راجہ گنڈا جو متحدہ افواج کا سردار تھا مقابلہ کے لئے تیار تھا، اگرچہ اس کے پاس اس قدر کثیر التعداد فوج تھی کہ ایک موقع پہ خود سلطان کو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اس نے حملہ کرنے میں عجلہ بازی کی لیکن پھر بھی اس میں مقابلہ کی ہمت نہ تھی اور وہ رات میں اپنے کیمپ کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس وقت تو سلطان واپس چلا گیا مگر اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ دوآبہ اور وسط ہند کے راجاؤں کو ضرور شکست دے گا لہٰذا ۱۰۲۲ء میں وہ پھر غزنین سے روانہ ہو کر یہاں پہنچا اور گوالیار کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کیا اس کے بعد کالنجر کی طرف بڑھا۔ یہ قلعہ سارے برصغیر میں اتنی مضبوطی کے لئے مشہور تھا راجہ گنڈا نے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا لیکن زیادہ عرصہ تک اس کو جاری نہ رکھ سکا۔ اس نے صلح کی درخواست کے ساتھ خراج گذار کی حیثیت قبول کرنے کی پیشکش کی سلطان نے یہ درخواست منظور کر لی اور یہیں سے واپس ہو گیا۔ دوآبہ کی وسیع فتوحات اور وسطی کالنجر ...

Marfat.com

نے سلطان محمود کی شہرت میں زبردست اضافہ کیا اور اس کی ہمت بہت بڑھ گئی۔

فتح سومنات ۱۰۲۵ء

بائیس سال کے عرصہ میں سلطان محمود نے شمالی ہند پاکستان کا بہت وسیع علاقہ فتح کر لیا تھا، شمال اور مغرب کی جانب بھی اس کی سلطنت کی حدود سینکڑوں میل آگے بڑھ چکی تھیں، حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں اب اس کا شمار عظیم ترین شخصیتوں میں ہونے لگا تھا، خلیفۃ المسلمین خود اس کی فتوحات پر فخر کرتے تھے، بغداد میں اس کی شاندار کامیابیوں پر جشن منائے جاتے تھے، لیکن ابھی اس کی سب سے زیادہ مشہور مہم باقی تھی، گجرات میں سومنات کا مندر ایک خاص اور نمایاں حیثیت رکھتا تھا، ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد ہر انسان کی روح سومنات آتی ہے اور وہیں دیوتا یہ طے کرتا ہے کہ دوسری زندگی میں اس کو کس شکل میں رہنا ہے، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سمندر میں جوار بھاٹا اس لئے آتا ہے کہ لہریں سومنات کی پوجا کر سکیں، سومنات دیوتا، دوسرے دیوتاؤں کا سردار تھا، محمود کے حملہ کی خبر سن کر انہوں نے اس کی بہت دلچسپ تاویل کی، چونکہ سلطان نے بعض بتوں کو توڑ ڈالا تھا اس لئے اس کا ارادہ سومنات پر حملے کا خود دیوتاؤں کی تدبیر کے تحت ہوا ہے کہ وہ یہاں پہنچ جائے اور سومنات کا دیوتا اس کو واقعی سزا دے سکے، سومنات کی شہرت، دولت اور اثر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دس ہزار گاؤں اس کے لئے وقف تھے، ایک ہزار برہمن اور تین سو گانے اور ناچنے والی عورتیں وہاں رہتی تھیں، لاتعداد ملازم اور خدمت گار اس سے متعلق تھے، ہر روز صبح کو گنگا کا تازہ پانی آتا تھا تاکہ سومنات کو جو مخروطی شکل کا لنگ تھا، دھویا جا سکے، غالباً سلطان محمود کو سومنات کی حیثیت اور اس کے وسائل کا کچھ اندازہ تھا۔ اس لئے اس نے بھی ایک زبردست فوج تیار کی جس میں تیس ہزار سوار شامل تھے نومبر ۱۰۲۵ء میں محمود ملتان میں آکر مقیم ہوا اور وسیع ریگستانی سفر کی تیاریاں کیں ہر سوار کو دو اونٹ صرف پانی لے جانے کے لئے دے گئے، اس کے علاوہ بیس ہزار اونٹوں

Marfat.com

پر ہنگامی ضرورتوں کے لئے پانی لادا گیا، بمشکل تمام ریگستان کا سفر طے کر کے غزنوی افواج شروع جنوری ۱۰۲۶ء میں گجرات پہنچیں، انہلوڑہ کا راجہ بھیم دیو یہ خبر سنتے ہی اپنا دارالحکومت چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، چنانچہ سلطانی فوج بغیر کسی رکاوٹ کے سومنات آگئی، یہاں دیوتا پر قربان ہونے اور اس کی حفاظت کی غرض سے بہت سے راجہ اور سردار اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ آ چکے تھے۔ پہلے روز کی لڑائی میں مسلمانوں کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی بلکہ حالت ایک حد تک تشویشناک ہی نظر آتی تھی۔ سلطان کی دوسری کوشش بہت کامیاب رہی، ہندو جم کر لڑے لیکن آخر میں ان کو شکست ہوئی، ہزاروں کی تعداد میں نہ کام آئے اور باقی جان بچانے کی غرض سے بھاگ گئے۔ محمود سومنات کے مشہور مندر میں داخل ہوا اور بت کو توڑ ڈالا یہاں اس کو بے شمار دولت ملی۔

پہلی جنگ کے بعد چونکہ حالت نازک ہو گئی تھی، محمود کو بھی فکر ہو گئی تھی اس نے ایک موقع پر ایک بڑے صوفی بزرگ شیخ ابوالحسن خرقانی کی خدمت میں حاضری دی تھی تو انہوں نے اس کو اپنا خرقہ عطا کیا تھا اور کہا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کو پہن کر وہ اللہ تعالے سے دعا کر سکتا ہے۔ محمود کو خیال ہوا کہ یہ وقت یقیناً مصیبت کا ہے، چنانچہ اس نے خرقہ پہن کر بہت گریہ وزاری کے ساتھ دعا مانگی، اس کی دعا قبول ہوئی اور دوسرے روز جنگ میں اس کو زبردست کامیابی ہوئی، مشہور مورخ فرشتہ نے اس روایت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

شب کو سلطان نے ابوالحسن خرقانی کو خواب میں دیکھا تو آپ فرماتے تھے کہ اے سلطان "آبروئے خرقۂ ما بردی، اگر اسلام ہمہ کفار می خواستی حاجت شد ے"

سلطان کی شیخ ابوالحسن سے ابتدائی ملاقات کا واقعہ دلچسپ بھی ہے اور یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان کے کردار نے محمود پر یقیناً اثر کیا ہوگا جس سال اس نے خراسان پر حملہ کیا تو دل میں خیال

Marfat.com

آیا کہ شیخ کی زیارت کرے، لیکن اس کو سوءِ ادبی سمجھ کر ارادہ ترک کر دیا اور طے کیا کہ وہ صرف ملاقات شیخ کے لئے غزنین سے آئے گا، آئندہ سال اس نے ایسا ہی کیا، وہ خرقان پہنچا تو ایک شخص کو شیخ کے پاس پیغام دے کر بھیجا کہ میں غزنین سے آپ کی ملاقات کے لئے آیا ہوں، آپ اپنی خانقاہ سے یہاں تک آئیے، شیخ نے انکار کیا تو قاصد نے کلام اللہ کی آیت یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ پڑھی، شیخ نے جواب دیا کہ سلطان کی خدمت میں میری طرف سے معذرت کر کے یہ کہنا کہ میں ابھی اطیعوا اللہ میں اس قدر غرق ہوں کہ "از اطیعوا الرسول خجالت می برم" اور "با اولی الامر منکم نمی پردازم"! سلطان یہ سن کر رونے لگا اور شیخ کی خدمت میں خود حاضر ہونے کا ارادہ کیا، لیکن اپنے کپڑے ایاز غلام کو پہنا کر آگے کیا اور خود غلام کے کپڑے پہن کر پیچھے رہا، ساتھ میں دس کنیزوں کو غلاموں کے کپڑے پہنا کر لے گیا، شیخ نے سلام کا جواب تو دیا لیکن تعظیم کے لئے کھڑے نہیں ہوئے، اس پر محمود نے کہا حضرت آپ نے سلطان کی تعظیم نہیں کی، شاید یہ سب جال ہے، شیخ نے کہا جال تو ہے لیکن اس میں پھنسنے والا مرغ تو (ایاز کی طرف اشارہ کر کے کہا) نہیں۔ تم آگے آؤ، سلطان شرمندہ ہوا اور شیخ نے کہا کہ نامحرم کو یہاں سے ہٹاؤ، چنانچہ کنیزوں کو جو مردانے لباس میں تھیں ہٹا یا گیا، تب شیخ سے سلطان نے کہا کہ بایزید بسطامی کے متعلق کچھ ارشاد کیجئے، شیخ نے کہا ان کا قول ہے کہ جس نے مجھے دیکھ لیا شقاوت سے امن میں رہا، محمود نے کہا کہ یہ بے ادبی ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلعم کو ابو جہل اور ابو سفیان نے دیکھا اور شقی رہے۔ شیخ نے کہا اے محمود ادب کر رسول اللہ صلعم کو چار خلفاء اور صحابہ نے دیکھا، سب نے نہیں اور دلیل میں یہ آیت پڑھی:۔ تراهم ینظرون الیک وھم لا یبصرون پھر سلطان نے نصیحت کے لئے درخواست کی، شیخ نے کہا چار چیزیں اختیار کرو، پرہیزگاری، نماز باجماعت، سخاوت، شفقت بر خلق، سلطان نے پھر دعا کے لئے کہا تو شیخ نے جواب دیا کہ میں پنجوقتہ نماز میں جملہ مومنین و مومنات کے لئے دعا کرتا ہوں، پھر سلطان نے کہا میرے لئے خاص دعا کیجئے۔ شیخ نے کہا عاقبت محمود باد، اس پر سلطان نے ایک تھیلی اشرفیوں کی نذر

Marfat.com

کی شیخ نے ایک روٹی کا ٹکڑا دیا، محمود نے چبانے کی کوشش کی اور کہا کہ میرے گلے میں اٹکتا ہے شیخ نے کہا۔ اسی طرح تمہاری اشرفیاں میرے گلے میں اٹکتی ہیں، ہم نے اس کو ترک کر دیا ہے۔

سلطان نے کہا کہ مجھے کوئی یادگار کے طور پر چیز دیجئے تو شیخ نے اپنا وہ پیرہن دیا جس کا ذکر اوپر ہوا اور رخصت کے وقت شیخ نے تعظیم دی تو محمود نے کہا، پہلے آپ کھڑے نہ ہوئے تھے اب کیوں ہوئے۔ شیخ نے جواب دیا۔ اول در رعونت بادشاہی و نخوت امتحان در آمدی اکنون در انکسار و درویشی می روی، اس ملاقات سے سلطان پر جو اثر ہوا ہو گا وہ ظاہر ہے یہ واقعات تاریخ فرشتہ سے لئے گئے ہیں۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔ سومنات کا سفر بہت سخت اور تکلیف دہ تھا، یہاں جو لڑائی ہوئی اس میں بھی مسلمانوں کو بہت بڑی قربانی دینی پڑی لیکن آخر میں ان کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ نہایت شاندار تھی، سلطان کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی اور اس کا شمار تاریخ عالم کی عظیم ترین شخصیتوں میں ہونے لگا۔ واپسی میں سلطان محمود سندھ کے علاقہ میں سے گذرا، یہاں جاٹوں نے اس کو بہت پریشان کیا، اس وقت تو وہ سیدھا واپس چلا گیا لیکن اگلے سال یعنی ۱۰۲۷ء میں وہ صرف اسی غرض سے آیا کہ شریر جاٹوں کو ان کی حرکات کی سزا دے، جاٹوں نے مقابلہ کیا مگر ان کو زبردست شکست ہوئی، سزا کے طور پر بڑی تعداد میں ان کو قتل کیا گیا۔

محمود کے کارنامے

یہ سلطان محمود کا آخری حملہ تھا۔ تین سال بعد یعنی ۱۰۳۰ء میں اس نے وفات پائی۔ سلطان محمود کی شخصیت ہندوستان کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ ایک بہادر سپاہی، ایک قابل جرنیل اور بلند حوصلہ فاتح تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ اس کی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے اور یہ فتوحات ان علاقوں میں حاصل ہوں جہاں اسلام ابھی نہیں پہنچا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چاہتا تھا کہ اسلامی دنیا میں اس کی سلطنت کا شمار سب سے بڑی سلطنتوں میں ہو۔ ان

Marfat.com

دونوں مقاصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا، اس میں ذرا شک نہیں کہ اس کی فتوحات کے سامنے لوگ سکندر کی فتوحات کو بھول گئے۔ اس کے حقیقی کارنامے سہراب و رستم کے فرضی واقعات سے زیادہ حیرت انگیز ہیں۔

اکثر وہ ایک سال کے اندر دو حملے کرتا تھا، سردیوں میں ہند پاکستانی میدانوں میں ہم اس کو راجاؤں کے مقابلہ میں دیکھتے ہیں اور گرما میں وسط ایشیا کے پہاڑی علاقوں کو فتح کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بتیس سال کے اندر جو وسیع علاقے اس نے فتح کئے ان پہ شریعت کے اصولوں پہ اپنا نظام مملکت قائم کیا، وہ نہایت منصف مزاج اور بہادر حکمراں تھا لیکن جس خصوصیت نے اس کو ایشیا کے صف اول کے حکمرانوں میں جگہ دلوائی ہے وہ علوم و فنون کی سرپرستی تھی۔ وہ خود بھی پڑھا لکھا تھا اور دوسرے لوگوں کی قدر افزائی کرتا تھا۔

اس نے ہند پاکستان کا وہ علاقہ جو آج کل مغربی پاکستان کہلاتا ہے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ گویا کہ یہ عالم اسلامی کا مستقل ایک حصہ ہو گیا تھا۔ یہ محمود کی دوراندیشی اور حقیقت پسندی کا نتیجہ تھا۔ اس نے مفتوحہ علاقے میں سے صرف اتنا ہی ملک اپنی سلطنت میں شامل کیا، جس پہ بہ آسانی حکومت قائم کی جا سکتی تھی، بعض مورخوں نے اس کے مقاصد اور کارناموں کی غلط تاویل کی ہے اور ان کے غلط اسباب بیان کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بذریعہ بت شکنی وہ اسلام پھیلانا چاہتا تھا۔ تاریخ اس کے خلاف شہادت پیش کرتی ہے، جن علاقوں میں اس نے مندروں پہ حملے کئے اور ان کے بت توڑے وہاں بہت کم لوگ مسلمان ہوئے اور بعض مقامات پر تو کسی نے بھی اسلام قبول نہیں کیا حقیقت یہ ہے کہ سلطان جانتا تھا کہ تلوار کے ذریعہ سے مذہب پھیلانے کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ لہذا وہ یہ طریقہ کار کسی صورت میں بھی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مفتوحہ علاقوں سے اس نے دولت حاصل کی اور اس دولت کو تہذیب و تمدن کی ترقی اور تعمیر میں صرف کیا جن علاقوں پہ وہ حکومت کرتا تھا وہ بہت غریب تھے اور ہندوستان کی دولت مندروں میں بیکار پڑی

Marfat.com

ہوئی تھی جس کا کوئی مصرف یہاں نہیں تھا، انسانی تہذیب کو ترقی دینے کے لئے وہ یہاں کی بیکار پڑی ہوئی دولت لے گیا اور اس کو جائز طریقہ سے صرف کیا، نگرکوٹ اور سومنات کے مندروں میں ہیرے جواہرات مٹی کے ڈھیر کی طرح بے کار تھے، غزنین میں علم دفن کی عمارات کو ان سے مزین کیا گیا۔ سلطان محمود کا یہ زندہ کارنامہ ہے جس نے اس کے لئے مشاہیر عالم کی صفوں میں مقام پیدا کیا۔

اس دور کی تبلیغی کوششیں

سلطان محمود کے بعد غزنوی حکومت کا زوال شروع ہو گیا، لیکن پھر بھی تقریباً پونے دو سو سال تک یہ خاندان مغربی پاکستان کے شمالی علاقوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ سیاسی انحطاط کے باوجود اس زمانہ میں برصغیر کا یہ حصہ اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بن رہا۔ غزنوی حکومت کے قیام کے بعد علماء اور مشائخ نے درس و تدریس اور تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ غزنوی دور کے علماء اور محققین میں سب سے زیادہ شہرت البیرونی نے پائی۔ وہ ۹۷۳ء میں خوارزم کے ایک قصبہ بیرون میں پیدا ہوا اور اسی نسبت سے البیرونی کہلایا۔ اس علاقہ کو سلطان محمود نے فتح کیا تو وہاں کے علماء اور دیگر مشاہیر کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ان ہی میں ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی بھی تھا۔ محمود کے زمانہ میں البیرونی کو بہت زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس کے بیٹے مسعود کے عہد میں اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی سب سے ضخیم کتاب قانون مسعودی کا نام اسی سلطان کے نام پر رکھا گیا تھا۔ طلبائے تاریخ کے لئے اس کی کتاب الہند بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ہندی علوم و فنون سے مسلمانوں کی دلچسپی کا آغاز تو خلیفہ منصور کے زمانہ میں ہو گیا تھا لیکن البیرونی سب سے پہلا مسلمان محقق ہے جس نے ہندی علوم کو ان کے خود اس برصغیر میں آ کر لیا۔ اور ان کی مشہور کتابیں یہیں کے پنڈتوں کی مدد سے پڑھیں۔ ان علوم کے مطالعہ میں جو محنت اور جانفشانی البیرونی نے کی وہ اس موقع پر تفصیل سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس کا کچھ اندازہ کتاب الہند کے جرمن مترجم پروفیسر سخاؤ کے مقدمے کے ان الفاظ سے

Marfat.com

ہے لیکن یہ چیز یہاں غور کرنے کے قابل ہے کہ البیرونی نے کتاب الہند لکھ کر مسلمانوں میں ہندی علوم اور یہاں کی زبان سے دلچسپی پیدا کردی۔

شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عالم اسلام اور ہند پاکستان کے علمی اور ثقافتی روابط کے ابتدائی دور میں البیرونی نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ البیرونی کے علاوہ اس دور کے دوسرے ادباء اور شعراء کی تصنیفات اور کلام میں بھی ہند پاکستانی الفاظ نظر آتے ہیں، مثلاً سلطان محمود کے درباری شاعر مسعود بن سعد سلمان نے لنگھن (بہ معنی روزہ) کا لفظ استعمال کیا ہے[۱]

الاتا مومناں دارند روزہ
الا تا ہندواں گیرند لنگھن

اس قسم کی اور مثالیں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش

معاشرہ کی تہذیب و تشکیل میں ادباء و شعراء سے کہیں زیادہ اہم کردار صوفیائے کرام نے ادا کیا، ان بزرگوں نے دین کی تبلیغ کی اور بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر اسلام لائے، اس کے علاوہ یہ لوگ مسلمانوں کو بھی اخلاقی و دینی تعلیم دیتے تھے، غزنوی فتوحات کے ساتھ جو بزرگ یہاں آئے، ان میں شیخ اسمٰعیل بخاری کو شرف تقدم ہے، یہ گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں تشریف لائے اور پچاس سال سے زائد اسلام کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے رہے[۲]۔ ان کے آخر زمانہ میں خواجہ حسین زنجانی لاہور میں ان کے معاصر تھے، یہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے پیر بھائی تھے، میر حسن سجزی نے فوائد الفواد میں ان دونوں بزرگوں کے متعلق اپنے پیر طریقت شیخ نظام الدین اولیاء کی روایت نقل کی ہے:۔

---

[۱] دیکھو ایم۔ اے غنی: اے ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر اٹ دی مغل کورٹ حصہ اول ص ۲۴۵۔

[۲] دیکھو آرنلڈ۔ دی پریچنگ آف اسلام ص ۲۸۰

Marfat.com

> یہ شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے، اور ان کے پیر اپنے عہد کے قطب تھے، حسین زنجانی عرصہ سے لہاور (لاہور) میں سکونت پذیر تھے، کچھ دنوں کے بعد ان کے پیر نے خواجہ علی ہجویری سے کہا کہ لہاور میں جاکر قیام کرو، شیخ علی ہجویری نے عرض کیا کہ وہاں شیخ زنجانی موجود ہیں لیکن پھر فرمایا کہ تم جاؤ، جب علی ہجویری تعمیل ارشاد میں لہاور آئے تو رات تھی صبح کو شیخ کا جنازہ باہر لایا گیا۔[1]

ابوالحسن علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلابی الہجویری کا وطن غزنین تھا، وہ ابوالحسن محمد بن الحسن الختلی کے مرید و خلیفہ تھے، ان کے علاوہ اور چند بزرگوں سے بھی کسب فیض کیا تھا بعض لوگوں نے ان کی پیدائش کا سال ۴۰۰ھ لکھا ہے، لیکن اس کو یقینی نہیں کہا جا سکتا بہر حال سلطان محمود غزنوی کی وفات کے وقت ان کی عمر کافی ہوگی، کیونکہ جان نکلسن نے رسالہ ابدالیہ[2] کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ سلطان مذکور کے سامنے شیخ علی ہجویری نے ایک ہندو فلسفی سے بحث کی اور اس کو قائل کر دیا تھا۔ شیخ ہجویری کی سن وفات کے متعلق بھی اختلاف رائے ہے آزاد بلگرامی نے سن وفات ۴۶۵ھ لکھی ہے لیکن نکلسن کا خیال ہے کہ ۴۶۵ھ سے ۴۶۹ھ تک کوئی بھی سال ہو سکتا ہے۔[3] لاہور آنے سے قبل شیخ علی ہجویری نے عالم اسلام میں بہت سے مقامات کا سفر کیا تھا اور طویل سیاحی کے بعد لاہور تشریف لائے تھے۔ آپ کی زندگی کے حالات بہت کم قلم بند ہوئے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کی تعلیم و ارشادات بہت جلد اور بڑی کثرت سے لوگ مستفیض ہونے لگے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت سے ہمیشہ آپ کو

---

[1] فوائد الفواد (مطبع نولکشور) ص ۵

[2] رسالہ ابدالیہ کے لئے دیکھو انڈیا آفس لائبریری کا کیٹلاگ نمبر ۱۷۷۴ (۲)

[3] نکلسن کشف المحجوب (انگریزی ترجمہ) ص ۹ (دیباچہ)

Marfat.com

شمار ہندو پاکستان کے عظیم ترین بزرگوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جب یہاں تشریف لائے تو آپ نے شیخ ہجویری کے مزار پہ چلہ کیا، وہاں سے رخصت کے وقت یہ شعر پڑھا:

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا
کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اثر اور بزرگی کے لحاظ سے شیخ ہجویری کا مقام کس قدر بلند تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

وہ صوفی بزرگ جن کی تبلیغی و اصلاحی کوششوں نے ہند پاکستان کی تاریخ پہ وسیع اور دیرپا اثرات چھوڑے

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہیں۔ آپ کی پیدائش سجستان میں ہوئی اس لئے آپ کے نام کے ساتھ سجزی لکھا جاتا ہے[1]۔ ایک مجذوب کے اثر سے آپ نے علائق دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی، وطن کو چھوڑا اور سمرقند جا کر پہلے علوم ظاہری کی تکمیل اور بعد میں حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ ایک عرصہ تک مرشد کی خدمت میں رہے اور ان ہی کے ساتھ بہت سے مقامات کی سیاحت بھی کی۔ ان ہی کی معیت میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی حاضر ہوئے۔ مدینہ شریف میں جب ان کے مرشد نے دعا کی تو عالم غیب سے یہ آواز آئی:-

"معین الدین دوست ماست اورا قبول کردیم و برگزیدیم"

یہیں آپ کو بارگاہ رسالت سے ہندوستان جانے کی ہدایت ملی۔ حضرت خواجہ عثمانؒ نے خلافت

---

[1] فرشتہ کے الفاظ ہیں:-

"تولد او در بلدہ سجستان بود"

تزک میں جہانگیر نے اس کی تصدیق کی ہے۔ بعض کتابوں میں آپ کو سنجری لکھا ہے مثلاً آئین اکبری میں

Marfat.com

عطا کی اور کلاہ چار ترکی آپ کے سر پر رکھی۔[۱] مرشد سے رخصت ہو کر پہلے شیخ نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں سنجان تقریباً ڈھائی سال تک رہے۔ اور وہاں سے چل کر شیخ محی الدین عبدالقادر گیلانی کی خدمت میں بغداد میں حاضر ہوئے۔ یہیں شیخ شہاب الدین سہروردی کی صحبت سے مشرف ہوئے اور اسی جگہ خواجہ اوحدالدین کرمانی کی خدمت میں رہ کر ان سے بھی خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد پھر سیاحت شروع کی، ہمدان، تبریز، اصفہان، استرآباد، ہرات اور سبزوار کی سیر کرتے ہوئے اور وہاں کے بزرگوں سے ملاقات کرتے ہوئے بلخ اور وہاں سے غزنین آئے اور یہاں سے روانہ ہو کر ہند پاکستان میں داخل ہوئے، لاہور میں حضرت داتا گنج بخش کے مزار مبارک پر چلہ کشی کے بعد ملتان تشریف لائے۔ یہاں پانچ سال قیام کیا اور مقامی زبان سیکھی، خواجہ صاحب کا مقامی زبان سیکھنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ آپ نے یہاں آکر یہ طے کر لیا تھا کہ تبلیغ کا کام کریں۔ تبلیغ کے لئے مقامی زبان جاننا نہایت ضروری تھا، ملتان سے خواجہ صاحب دہلی تشریف لائے اور بعد میں اجمیر آگئے جس کو انہوں نے اپنی کوششوں کا مرکز بنایا، دہلی سے اجمیر جاتے ہوئے خواجہ صاحب کے ہاتھ پر سات سو آدمی اسلام لائے۔

اجمیر شریف میں خواجہ صاحب ۵۶۱ھ (؟) میں تشریف لائے، یہاں کا حکمران پتھو

---

[۱] کلاہ چار ترکی ایک چوگوشی ٹوپی ہوتی تھی جو مشائخ چشت کو خلافت کے وقت پیر کی طرف سے عطا ہوتی تھی۔ خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ یہ اشارہ چار چیزوں کو ترک کرنے کا ہوتا تھا یعنی:-

ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک خورد و خواب مگر قدرے کہ سد رمق او، ترک خواہش نفس ہر کہ ایں چہار چیز ترک کند، پوشیدن کلاہ ترکی بوے سزاوار است۔

خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۲۶۵

Marfat.com

ہندو راجہ پتھورا (پرتھوی راج) تھا۔ اس کی حکومت دہلی تک پھیلی ہوئی تھی اور شمالی برصغیر میں اس کا شمار طاقتور راجاؤں میں ہوتا تھا۔ لیکن رائے پتھورا کے تعلقات قنوج کے راجہ جے چند سے اچھے نہ تھے کیونکہ وہ جے چند کی لڑکی کو اس کے باپ کی مرضی کے خلاف لے گیا تھا اور اس کے ساتھ شادی کر لی تھی، خواجہ صاحب کے قیام اجمیر سے پرتھوی راج کو ناگواری ہوئی، کیونکہ اجمیر کے لوگ جس میں خود راجہ کے ملازمین بھی شامل تھے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہونے لگے تھے، اس پر پرتھوی راج نے آپ کو اجمیر سے نکالنے کی دھمکی دی، خواجہ صاحب نے جواب میں فرمایا:-

"پتھورا را زندہ بہ مسلمان دادیم"[1]

آپ کی یہ پیش گوئی بہت جلد صحیح ثابت ہوگئی اور جیسا کہ معلوم ہے تراؤن کی دوسری جنگ میں پرتھوی راج نے معز الدین بن سام کے مقابلہ میں شکست کھائی اور زندہ گرفتار ہوگیا

---

[1] سید محمد کرمانی۔ سیر الاولیاء ص ۵۴۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار ص ۲۲

حضرت خواجہ معین الدین کے لاہور، ملتان، دہلی و اجمیر کے قیام اور سفر کے متعلق مستند تفصیلات موجود نہیں، ابتدائی دور کے مورخوں نے ان کا ذکر بہت مختصر بلکہ صرف اشاروں میں کیا ہے اور بعد کی تصانیف کی تمام تفصیلات کو مستند نہیں سمجھا جا سکتا، یہ مسئلہ بھی متنازعہ فیہ ہے کہ آیا آپ لاہور سے دہلی آئے یا ملتان سے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رائے پتھورا کی شکست سے پہلے ہی آپ اجمیر میں سکونت اختیار کر چکے تھے، فرشتہ نے ۵۶۱ھ میں اجمیر پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ اس تاریخ کو قبول کرنے میں ایک قباحت ہے اگرچہ خواجہ صاحب کی عمر سفینۃ الاولیاء کے مصنف کے قول کی بنیاد پر ایک سو چار سال بھی مان لی جائے تو اجمیر پہنچنے کے وقت آپ تینتیسویں (۳۳) سال میں تھے یہ قدرے بعید از واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

مسلمانوں کی فتح کے بعد خواجہ صاحب کے فیض سے برصغیر میں اسلام نے بہت جلد ترقی کی۔ سید مبارک کرمانی کے یہ الفاظ صحیح ہیں:۔

"بوصول قدم مبارک آں آفتاب اہل یقین کہ بہ حقیقت معین الدین بود ظلمت این دیار بنور اسلام روشن و منور گشت"

خواجہ صاحب کے اثر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی وفات (۶۳۳ھ) کے بعد سے آج تک آپ کا مزار مبارک زیارت گاہ خلائق اور مرجع عوام و خواص رہا ہے۔ مختلف زمانہ کے حکمران اور سلاطین نہایت عقیدت مندی کے ساتھ وہاں حاضر ہوتے رہے ہیں۔ مغل شہنشاہ آپ کی ذات گرامی سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور ان میں سے اکثر کافی فاصلہ پیدل طے کرکے مزار پر حاضر ہوتے تھے۔ اکبر تو ایک مرتبہ اپنے ابتدائی زمانہ میں فتح پور سیکری سے اجمیر تک پیدل گیا۔ عالمگیر بھی قیام گاہ سے مزار تک پیدل ہی جایا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کا سلسلہ برصغیر کے چاروں گوشوں میں جس طرح پھیلا اور اس سلسلہ کے لوگوں نے اسلام کی جس طریقہ پر تبلیغ کی اس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ لیکن یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں:۔

(۱) مسلمان بادشاہ اور فاتح مذہب کے معاملہ میں طاقت استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ تبلیغ دین کی خدمت کوئی اور طبقہ اختیار کرے۔ یہ کام صوفیہ نے بڑی حد تک اپنے ذمہ لیا اور اس سلسلہ میں سب سے نمایاں شخصیت خواجہ صاحب کی ہے۔ آپ نے اپنی کوشش کا مرکز ایک ایسے مقام پر قائم کیا جہاں مسلمان برائے نام تھے اور جہاں کا راجہ ایک طاقتور حکمران تھا۔ عام طور پر مبلغین اپنا کام ان علاقوں میں شروع کرتے تھے جن پر سیاسی اقتدار قائم ہو چکا تھا لیکن خواجہ صاحب نے مخالفین کی حکومت اور اقتدار کے باوجود تبلیغ کا کام کیا اور ہر مشکل اور مخالف طاقت کو مغلوب کیا۔ سلطان معز الدین کی فتح کے بعد اجمیر پر اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ چونکہ اس علاقہ میں فتوحات سے پہلے کچھ مسلمان آبادی خواجہ صاحب کی کوشش کی بدولت وجود میں آچکی تھی اس لئے سیاسی اقتدار کے قیام میں بھی سہولت

Marfat.com

ہوئی ـــ

(۴) خواجہ صاحب نے تبلیغ کی خاطر مقامی زبان سیکھی اور یہاں کے لوگوں سے خود ان ہی کی زبان میں گفتگو کرنے کا سلسلہ شروع کیا، یہ نہایت اہم بلکہ انقلابی اقدام تھا، اس کا سب سے زیادہ اثر تو یہ ہوا کہ اسلام کے مبلغین کی رواداری قطعی طور پر ثابت ہوگئی، یہ امر دلچسپ ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں نے سنسکرت زبان کو تقدیس اور خصوصیت کے پھندوں میں ایسا مقید کر دیا تھا کہ خود ہندو مذہب کے پیرو، برہمنوں کے علاوہ اس کو استعمال نہیں کر سکتے تھے، برخلاف اس کے مسلمان صوفیاء نے یہ ضروری سمجھا کہ دیسی زبان سیکھیں، تاکہ مقامی لوگوں سے روابط قائم کرنے میں سہولت ہو، علمی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے بھی یہ اقدام دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا، حقیقت یہ ہے کہ اس نئی زبان کی بنیاد جو اسلامی ہند و پاکستانی تہذیب کے عظیم ترین کارناموں میں سے ایک ہے، اسی طریقہ سے رکھی گئی، مشائخ نے اس کو تبلیغی ضرورتوں کے ماتحت سیکھنا شروع کیا ان کے اتباع میں دوسرے طبقوں نے بھی جن کو مقامی لوگوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے قریبی روابط پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی گئی، یہی طریقہ اختیار کیا، تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ زبان ادب اور ثقافتی زندگی کے دوسرے پہلوؤں نے بھی ہر طرح ترقی کی۔

Marfat.com

باب سوم

اسلامی فتوحات کا تیسرا دور

سلطنت دہلی کا قیام

سلطان محمود غزنوی نے جن علاقوں کو فتح کرکے سلطنت غزنویہ میں شامل کیا تھا ان میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ریاست غور کی بھی تھی۔ یہاں کے حکمران خاندان کا نام شنسبانیہ تھا اور بارھویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں اسی خاندان کا ایک فرد غیاث الدین غزنین کا حکمران تھا۔ غیاث کے چھوٹے بھائی کا نام شہاب الدین تھا۔ یہی شہزادہ بعد میں سلطان ہوا اور اس نے معزالدین کا لقب اختیار کیا۔ معزالدین نے سلطان محمود کی طرح ہند پاکستان میں متعدد فتوحات حاصل کیں۔ ہند پاکستان میں اس کا مقصد اور طریقہ کار غزنوی سلطان سے قدرے مختلف تھا۔ محمود نے مفتوحہ علاقہ کا بہت تھوڑا حصہ اپنی سلطنت میں شامل کیا اور بقیہ علاقوں سے کچھ مال و دولت بطور تاوان جنگ یا غنیمت کی شکل میں لے کر ان کو آزاد چھوڑ دیا۔ معزالدین نے برخلاف اس کے جو علاقے فتح کئے ان پر اپنی حکومت قائم کی اور نظم ونسق کے لئے اپنے حکام مقرر کئے۔ اس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ ۱۱۷۵ء میں شروع کیا۔ ہند میں اس کو کچھ مسلمان حکمرانوں اور سرداروں کے خلاف بھی لڑنا پڑا۔ غزنوی خاندان کی حکومت اب صرف ہند پاکستان کے علاقہ پر باقی رہ گئی تھی اور مدت سے لاہور ان کا دارالحکومت

Marfat.com

تھا۔ تقریباً گیارہ سال میں (۱۱۷۵ء تا ۱۱۸۶ء) سلطان نے ملتان، اچھ، پشاور اور لاہور فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کئے۔ اس طرح اس کی سلطنت کی حدود راجپوتانہ اور دہلی کے علاقوں سے ملحق ہوگئیں۔ ۱۱۹۰ء میں سلطان نے بھٹنڈہ فتح کیا اور وہاں اپنا ایک افسر مقرر کرکے واپس جارہا تھا کہ اس کو خبر ملی کہ پرتھوی راج ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کے علاقہ کی طرف آرہا ہے۔ سلطان فوراً واپس ہوا، ترائن کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، لڑائی میں سلطان زخمی ہوگیا اور اس کی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ پرتھوی راج نے بھٹنڈہ پر قبضہ کرلیا۔ معزالدین کو مجبوراً واپس ہونا پڑا تھا لیکن غزنین پہنچ کر اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ پرتھوی راج سے فیصلہ کن جنگ کرنی چاہئے۔ پرتھوی راج نے بھی شمالی ہندوپاکستان کے سرداروں اور راجاؤں سے اپیل کرکے ایک بہت بڑی فوج تیار کی۔ اس مرتبہ بھی سلطان اور پرتھوی راج ترائن ہی کے میدان میں نبرد آزما ہوئے (۱۱۹۲ء) پرتھوی راج کے پاس اس قدر بڑی فوج اور اتنا زیادہ سامان جنگ تھا کہ اس کو اپنی فتح یقینی نظر آرہی تھی۔ اس پر اس کو گھمنڈ بھی تھا چنانچہ اس نے لڑائی سے پہلے سلطان کو خط لکھا کہ اس کو اپنے اور اپنے آدمیوں پر رحم کھانا چاہئے اور واپس چلا جانا چاہئے ورنہ وہ اپنی تین لاکھ فوج سے حملہ کرکے اس کو تباہ کردے گا۔ سلطان نے اس غرور سے بھرے ہوئے خط کا جواب نہایت مختصر اور سادہ الفاظ میں دیا کہ وہ اپنے بھائی کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ پرتھوی راج کو اب مجبوراً میدان جنگ میں آکر مسلمانوں کا مقابلہ کرنا پڑا باوجود کثیر التعداد ہونے کے راجپوتوں نے شکست فاش کھائی۔ پرتھوی راج زندہ گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کردیا گیا۔

سلطان معزالدین نے اپنے ایک غلام قطب الدین کو جو اس کی فوج میں بڑا سردار تھا مفتوحہ علاقہ کا حاکم مقرر کیا اور خود غزنین واپس چلا گیا۔ قطب الدین نے دہلی، میرٹھ کوئل (علی گڑھ) اور قرب وجوار کے علاقوں پر قبضہ کرکے باقاعدہ انتظام کیا۔ دو سال بعد

Marfat.com

سلطان معزالدین نے قنوج کے راجہ جے چند کو اٹاوہ کے قریب چھندواڑہ کے مقام پر شکست دی اور اس کے ملک کو فتح کرتا ہوا بنارس تک چلا گیا۔ سلطان معزالدین کی یہ آخری بڑی فتح تھی۔

اس کے بعد تقریباً دس سال تک وہ خوارزم شاہیوں سے لڑتا رہا، خوارزم شاہیوں نے قراخطائی اور دوسرے پڑوسیوں کی فوجیں مدد کے لئے بلالیں، معزالدین کو مجبوراً بغیر لڑے ہوئے واپس ہونا پڑا، خوارزم شاہیوں نے تعاقب کیا اور ہزار سپ کے قریب اس کو زبردست شکست دی، سلطان کی بچی ہوئی فوج پر قراخطائیوں نے اندخود میں جہاں اس نے پناہ لی تھی حملہ کرکے اس کو مجبور کردیا کہ گھوڑے، ہاتھی اور دیگر اسباب دیکر دشمن سے پیچھا چھڑائے۔ اس شکست سے معزی سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں، غزنین کا گورنر باغی ہوگیا، ایک اور باغی افسر نے ملتان پر دھوکہ سے قبضہ کرکے اس کے حاکم کو قتل کردیا، سب سے زیادہ خطرناک بغاوت جودی کے پہاڑی علاقہ میں کھکروں کی تھی لیکن ان نازک اور خطرناک حالات میں بھی سلطان نے ہمت نہیں ہاری، وہ ہندوستان میں آیا اور ملتان کی بغاوت فرو کی، یہاں سے غزنین گیا اور اس پر دوبارہ قبضہ کیا ۱۲۰۵ء میں وہ غزنین سے برصغیر کی طرف اس مقصد سے روانہ ہوا کہ باغی کھکروں کو قرار واقعی سزا دے، راستہ میں اس کو قبائلی علاقہ کے لوگوں سے بھی لڑنا پڑا۔ اس موقعہ پر اس کی کوششوں سے قبائلیوں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا، اب وہ کھکروں کے علاقہ میں پہنچا، ان کی بغاوت کو ختم کیا، سلطنت کے مختلف حصوں میں امن و امان قائم کیا۔ اس طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد سلطان نے طے کیا کہ وہ قراخطائیوں کے مقابلہ کے لئے پھر جائے، چنانچہ اس نے بامیان کے حاکم کو فوجیں جمع کرنے اور لڑائی کی تیاری کے لئے ضروری ہدایات بھیجیں، لیکن افسوس ہے کہ یہاں سے واپسی میں جب وہ دریائے سندھ کے کنارے دمیک کے مقام پر خیمہ زن تھا تو مارچ ۱۲۰۶ء میں باطنیوں نے

Marfat.com

عین نماز کی حالت میں سلطان کو شہید کر دیا۔[1]

سلطان معز الدین ہماری تاریخ میں ایک ممتاز شخصیت کا مالک ہے اس میں شک نہیں کہ اس کی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع نہیں تھا جیسا کہ سلطان محمود کا اور یہ بھی صحیح ہے کہ جو شہرت محمود کو حاصل ہوئی وہ معز الدین کو نہ مل سکی حقیقت تو یہ ہے کہ محمود کے مقابلہ میں معز الدین کیا خود سکندر کے جنگی کارنامے بھی ماند پڑ گئے تھے لیکن ہم تاریخ کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ سلطان محمود نے اپنی سلطنت میں زیادہ تر اسلامی ریاستوں کو شامل کیا برصغیر کا ایک محدود اور مختصر علاقہ سلطنت غزنین کا حصہ تھا۔ اس کے برخلاف سلطان معز الدین نے شمالی ہند پاکستان کے وسیع علاقوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملایا۔ بنارس تک تو سارا ملک خود اسی نے فتح کر لیا تھا۔ کچھ مقامات اس کے ایک افسر قطب الدین ایبک نے فتح کئے، بہار اور بنگال دونوں محمد بن بختیار خلجی کی افواج نے زیر کئے۔ اس طرح سلطان کی شہادت سے پہلے سارا شمالی ہند پاکستان وسط ہند میں مختصر علاقے کے علاوہ سلطنت غور میں شامل ہو گیا تھا۔

سلطان محمود نے اپنی فتوحات کے ذریعہ مسلمانوں کو ہند پاکستان کا راستہ دکھلایا اور یہ بتلایا کہ اس خطہ میں اسلام کی اشاعت اور سیاسی اقتدار کی توسیع کی کس قدر گنجائش ہے، سلطان معز الدین نے اسی راستہ پر گامزن ہو کر ایک اسلامی سلطنت قائم کی اگر غور سے دیکھا جائے اور تاریخی واقعات کا صحیح پس منظر میں مطالعہ کیا جائے تو یہ بات

---

[1] فرشتہ کی یہ روایت صحیح نہیں کہ سلطان کو کسی گھکر نے قتل کیا۔ قاضی منہاج الدین سراج نے جو سلطان کے معاصر تھے صاف طور پر لکھا ہے کہ قاتل باطنی تھا۔ صاحب تاج المآثر نے جو ثقہ اور معاصر تھا اس قول کی تصدیق کی ہے۔

Marfat.com

ظاہر ہو جائے گی کہ سلطان معز الدین نے جو شاندار کامیابی حاصل کی اس کی داغ بیل سلطان محمود ہی نے ڈالی تھی، سلطان معز الدین علم اور علماء کی سرپرستی کرتا تھا، اس عہد کے مشہور فاضل و مفسر امام فخر الدین رازی اس کے لشکر کے پیش امام تھے۔

قطب الدین ایبک

۱۲۰۶ — ۱۲۱۰ء

سلطان معز الدین کے بعد ہند پاکستانی علاقوں کا غوریوں سے تعلق ختم ہو گیا، چونکہ قطب الدین نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا، اس لئے تاریخ میں یہ مملکت سلطنت دہلی کے نام سے یاد کی جاتی ہے، قطب الدین کے چار سالہ دور حکومت ۱۲۰۶ء-۱۲۱۰ء میں کچھ نئی فتوحات بھی ہوئیں لیکن ان سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ نظام حکومت کا بنیادی خاکہ تیار ہو گیا قطب الدین نے اس کی بنیاد شرعی قوانین پر رکھی، تاج المآثر میں اس کی طرف مندرجہ ذیل الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

"شعار شرائع اسلام بہ غایت ظہور انجامید، و مناہج و شواہد مسلمانی بذروۂ وضوح پیوست"

ایک بہادر سپاہی ہونے کے علاوہ قطب الدین اپنی فیاضی اور علم نوازی کے لئے بھی مشہور تھا، ان فضلاء اور شعراء میں جو اس کے دربار سے وابستہ تھے، بہاء الدین اوشی، جمال الدین محمد اور قاضی حمید الدین قابل ذکر ہیں، ان سے بھی زیادہ شہرت حسن نظامی نیشاپوری نے حاصل کی، سلطان قطب الدین کی خواہش پر اس عہد کی تاریخ تاج المآثر انہوں نے تالیف کی، اس کتاب میں عبارت آرائی بہت ہے، مگر اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس دور کا یہ ایک اہم ماخذ ہے۔

سلطان شمس الدین التمش

۱۲۱۰ — ۱۲۳۶ء

قطب الدین ایبک کی وفات چوگان کے ایک حادثہ سے ہوئی، اس وقت وہ لاہور میں تھا، چنانچہ وہیں دفن ہوا، اس کے بعد کچھ

Marfat.com

دنوں کے لئے آرام شاہ تخت پر بیٹھا، وہ حکومت کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اس لئے عمائدین سلطنت نے قطب الدین کے داماد شمس الدین التمش کو تخت پر بٹھایا، التمش کی ابتدائی زندگی بہت دلچسپ ہے، وہ ایک ترکی سردار کا لڑکا تھا، باپ اس سے بہت محبت کرتا تھا، اس وجہ سے بھائیوں کو رشک ہوا اور حضرت یوسف کی طرح اس کو وہ بہکا کر لے گئے اور ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا، اس کے بعد وہ بخارا لایا گیا اور وہاں سے اپنے آقا کے ساتھ بغداد آیا، یہاں مختلف بزرگوں کی خدمت کرتا اور یہ لوگ اس کو برابر دعائیں دیتے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس کے متعلق فرمایا کہ "دہلی کا بادشاہ ہوگا"۔

التمش کا مالک اس کو لے کر غزنین آیا تو شہر میں اس کی شہرت ہوگئی اور خود سلطان معز الدین نے اس کو خریدنا چاہا لیکن قیمت کا فیصلہ نہ ہونے کے سبب اس نے نہیں خریدا۔ بعد میں قطب الدین نے اس کو خرید لیا اور اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا، یہاں تک کہ اپنی ایک لڑکی کی شادی بھی اس سے کردی، تخت پر بیٹھنے کے بعد التمش نے سلطنت دہلی کو مستحکم بنانے کی بہت کوشش کی۔ اس سلسلہ میں اس کو غزنین کے حاکم تاج الدین یلدوز اور سندھ کے حاکم ناصر الدین قباچہ سے بھی لڑنا پڑا۔ یلدوز لاہور پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، التمش نے اس کا مقابلہ کیا اور شکست دی۔ اسی سال یعنی ۱۲۱۶ء میں اس نے قباچہ کو شکست دے کر بھگا دیا، پانچ سال بعد ہندوستان پر ایک سخت مصیبت نازل ہوئی اور یہ التمش کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس سے محفوظ رہا، ۱۲۲۱ء میں چنگیز خاںؒ مغل سردار، خوارزم کے شہزادے جلال الدین منکبرنی

لہ چنگیز خاں یا تیموچین جس نے منگولوں کو منظم کرکے ان کی قوت کو بہت بڑھایا، یسوگئی کا بیٹا تھا۔ چنگیز خان ۱۱۶۲ء میں ولیم بولاک کے مقام پر پیدا ہوا، باپ کے انتقال کے وقت اس کی

Marfat.com

تعاقب میں دریائے سندھ کے کنارے تک آ گیا۔ اٹک کے قریب لڑائی ہوئی، جلال الدین کے
پاس بہت مختصر فوج تھی، منگولوں کا لشکر اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھا۔ جلال الدین کے
سپاہی نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوتے رہے۔ جب ان کی تعداد بہت کم رہ گئی
تو جلال الدین کے سرداروں نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ جان بچا کر چلا جائے، یہ مشورہ بہادر شہزادہ
نے بہت توقف کے بعد قبول کیا، گھوڑے پر سوار ہو کر دریا کے کنارے آیا، اگرچہ کنارہ
اس مقام پر آٹھ دس گز اونچا تھا لیکن جلال الدین نے اس میں گھوڑا ڈال دیا۔ اس کے بعد
جلال الدین نے التمش سے مدد مانگی، اس سلطان نے نہایت ہوشمندی سے کام لے کر

٭٭ عمر صرف تیرہ سال تھی، مگر اپنی ذاتی قابلیت سے اس نے دوسرے منگول سرداروں کو شکست
دے کر خود کو "خان" تسلیم کرا لیا، فوج کو از سر نو منظم کر کے اس نے عالم اسلامی پر حملے
شروع کر دئیے، منگولوں کی فتوحات متمدن فاتحوں کے کارناموں سے بالکل مختلف تھیں، ان کا
مقصد تہذیب و تمدن کو برباد کرنا اور مخالفین کو اپنی خونخوار خواہشوں کا شکار بنانا تھا۔ عورتیں
بچے، بوڑھے، کوئی بھی ان کے مظالم سے محفوظ نہ تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی اور چودھویں صدی
کے ابتدائی دور میں چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں نے ایشیا اور یورپ کے بعض حصوں
میں ناقابل بیان مظالم توڑے اور تباہی مچائی، تباہ کاری کی ان نیم وحشی قوموں نے سب
سے زیادہ نقصان اسلام کو پہنچایا۔ وسط ایشیا سے مصر و شام تک لاتعداد مراکز تہذیب پامال ہو کر خاک
ہو گئے، سینکڑوں کتب خانے اور لاکھوں نوادرات سے ہمیشہ کے لئے نسل انسانی محروم ہو گئی [illegible]
انسان کی تاریخ میں تہذیب و تمدن کو اتنے بڑے پیمانے پر کبھی صدمہ نہیں پہنچا تھا، مسلمانوں کے دور انحطاط کا آغاز
حقیقتاً یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ لفظ منگول کی عربی شکل مغل ہے، لیکن ہم نے [illegible] منگولوں
کے لئے بھی لفظ استعمال کیا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ عام طور پر مغل ہی کہلانے لگے۔

Marfat.com

اس کو ٹال دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چنگیز خاں کو دریائے سندھ کے اس طرف آنے کا کوئی بہانہ نہ مل سکا، جلال الدین نے کچھ فوج جمع کر کے سندھ کے حاکم قباچہ پر حملہ کیا اور اس کو شکست دینے کے بعد ایران کی طرف چلا گیا۔

منگول حملہ کا خطرہ ٹل جانے کے بعد التمش نے قباچہ کے خلاف جنگ کی، قباچہ شکست کھا کر بھکر کے دریائی قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا، کچھ دن بعد وہ کشتی میں سوار ہو کر جنوبی سندھ کی طرف جا رہا تھا کہ کشتی ڈوب گئی اور وہ مع اہل و عیال ختم ہو گیا۔ اب سندھ اور ملتان باقاعدہ سلطنت دہلی میں شامل کر دئے گئے۔ سندھ کے بعد التمش نے راجپوتانہ کے علاقہ کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کیا۔ ۱۲۳۳ء میں اس نے گوالیار اور اگلے سال اجین پر قبضہ کر کے مالوہ کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔ دو سال بعد اس کو سرکش کھکروں پر حملہ کرنا پڑا تاکہ ان کو سزا دے سکے، راستہ میں وہ بیمار ہوا اور آخر کار ۲۹ اپریل ۱۲۳۶ء کو وفات پائی۔

التمش کے بعد اس کا لڑکا رکن الدین فیروز تخت پر بیٹھا، نا اہلیت کی بنا پر اس کو جلد ہی معزول کر دیا گیا، امرائے دربار نے اس کی بہن رضیہ کو تخت پر بٹھلایا۔ رضیہ نہایت بہادر اور دانشمند عورت تھی اور سلطنت کا کام بخوبی انجام دے سکتی تھی، لیکن با اثر امراء کا ایک طبقہ اُس کو پسند نہیں کرتا تھا، چنانچہ اس کے خلاف بغاوت ہوئی۔ شکست کھانے کے بعد اس کو جان بچانے کی خاطر بھاگنا پڑا۔ اسی حالت میں ہندوؤں کی ایک جماعت نے اس کو اور اس کے شوہر التونیہ کو قتل کر ڈالا[۱]۔ مولف طبقات ناصری کے الفاظ یہ ہیں:۔

"رضیہ و التونیہ بدست ہندوان گرفتار شدند و ہر دو شہید گشتند"

رضیہ کی شکست کے بعد امراء نے اس کے بھائی بہرام شاہ کو تخت پر بٹھلایا اور بھی نا اہل ثابت

---

[۱] یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ سلطان شمس الدین التمش کہا کرتا تھا کہ اس کی بیٹی رضیہ اس کی ساری اولاد میں سب سے زیادہ قابل ہے اور وہی حکومت کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

Marfat.com

ہوا۔ اس کے مختصر عہد حکومت (۱۲۴۰ء تا ۱۲۴۲ء) میں منگولوں نے لاہور پر حملہ کرکے شہر کو تباہ کردیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ ۱۲۴۲ء میں بہرام کو معزول کرکے امراء نے التتمش کے ایک پوتے علاؤالدین کو تخت نشین کیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اس کو بھی معزول کردیا۔ اور التتمش کے ایک اور بیٹے ناصرالدین محمود کو تخت نشین کیا۔[1]

سلطان غیاث الدین بلبن

ناصرالدین نہایت سادہ مزاج اور نیک طبیعت شہزادہ تھا۔[2] لیکن اس وقت دہلی کو ایک درویش صفت شہنشاہ نہیں بلکہ سخت مزاج سلطان کی ضرورت تھی جو شورہ پشتوں کو دبا کر فتنہ انگیزی کو ختم کرسکے۔ ناصرالدین کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ایک ایسا وزیر دستیاب ہوگیا جو سلطنت کی مشکلات کا صحیح اور مناسب طریقوں سے علاج کرنے کی اہلیت بدرجہ اتم رکھتا تھا۔ سلطان کی بھی یہ قابل تعریف خوبی تھی کہ اس نے وزیر کی صلاحیت اور دیانت کا اندازہ لگا کر حکومت کے اختیارات اس کو سپرد کردیئے۔ اس طرح غیاث الدین بلبن[3] تقریباً بیس سال تک ناصرالدین کے نائب کی

---

[1] التتمش کے ترکی غلاموں (سرداروں) کے ایک گروہ نے اپنا اثر بہت بڑھا لیا تھا، چونکہ ان کی تعداد چالیس یا قریب قریب اتنی تھی اس لئے یہ لوگ چہل گانی کہلانے لگے۔ کمزور سلاطین کی جلد جلد تخت نشینی اور معزولی ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔

[2] ناصرالدین کی سادگی مزاج، نیک طینتی اور دیانت داری کے بہت سے واقعات تاریخ کی کتابوں میں منقول ہیں۔ [3] بلبن بھی التتمش کی طرح ترکوں کے البری قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ لڑائی میں گرفتار ہوا اور غلام بنا کر بیچا گیا۔ اس کے مالک نے دہلی لا کر اس کو فروخت کیا، جہاں التتمش نے اس کو خرید لیا۔ ابتدا میں اس کو سقایت کی خدمت سپرد کی گئی لیکن زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ بلبن کی قابلیت کا اظہار ہوتا گیا اور اس کو ترقی ملتی رہی۔ یہاں تک کہ ناصرالدین کے عہد میں وہ نیابت (وزارت) کے عہدہ پر فائز ہوا۔

Marfat.com

حیثیت سے انتظام مملکت کرتا تھا، ناصرالدین کی وفات پر وہ خود تخت پر بیٹھا اور بیس سال تک بحیثیت سلطان حکومت کی، بلبن کا یہ چالیس سالہ دور اقتدار ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

ناصرالدین ۱۲۴۶ء میں تخت پر بیٹھا تھا، دو سال بعد ہی اس کو دوآبہ اور بند ھیل کھنڈ کے باغی سرداروں اور راجاؤں کی سرکوبی کے لئے جانا پڑا، شورہ پشت سرداروں کو شکست ہوئی، ان میں سے بہت سے مارے گئے اور اکثر قلعوں پر سلطانی افواج کا قبضہ ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد وسط ہند میں گوالیار اور چند دوسری ہندو ریاستوں کے خلاف بلبن کو بھیجا گیا، یہاں بھی اس کو مکمل کامیابی ہوئی۔ ان فتوحات کی وجہ سے بلبن کا اثر سلطان اور اس کے دربار پر بہت زیادہ بڑھ گیا اور دوسرے امراء اس سے حسد کرنے لگے، انہوں نے سلطان کے کان بھرنے شروع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۲۵۳ء میں سلطان نے اس کو نائب الملکی کے عہدہ سے علیحدہ کردیا، بلبن کے مخالفین کا سرگروہ عمادالدین ریحان تھا، وہی اب سب سے زیادہ با اثر امیر ہوگیا۔ لیکن لوگوں کو بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ وہ اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہونے کی صلاحیت سے قطعاً محروم ہے، جس پر سازش کے ذریعہ وہ قابض ہوگیا تھا۔ آخر کار ۱۲۵۵ء میں ناصرالدین نے مجبور ہوکر بلبن کو بلایا اور دوبارہ اس کو نائب ملکی کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ اس کے بعد دس سال تک بلبن نے بحیثیت نائب الملک سلطنت کا انتظام کیا، اس زمانہ میں اس کو دو بڑے حملے دوآبہ کے مفسد اور سرکش جاگیرداروں کے خلاف کرنے پڑے مگر اس نے سرکشی کی قوتوں کا کم از کم کچھ عرصہ کے لئے خاتمہ کردیا۔ ۱۲۶۰ء میں دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ بلبن نے میوات پر حملہ کیا کیونکہ میواتیوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ بلبن نے ان کے بہت سے آدمیوں کو میدان جنگ میں ختم کیا اور تقریباً ڈھائی سو کو قیدی بنا کر دہلی لایا، یہاں یہ بھی قتل کردئے گئے، سرکشوں اور فتنہ پروروں کو سخت سزائیں دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں بڑی حد تک امن قائم ہوگیا۔ ۱۲۶۶ء میں ناصرالدین کی وفات پر بلبن خود تخت پر بیٹھا اور بیس سال سے زائد مدت تک نہایت کامیابی کے ساتھ سلطنت کی۔

Marfat.com

ملوکیت کی تاریخ میں ایک دور آتا ہے جب سلطان اور امراء کی کشمکش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ بلبن کو تخت نشینی کے بعد اسی مہم سے دوچار ہونا پڑا۔ چہلگان شمسی جس میں وہ خود بھی شامل تھا اب اس قدر با اثر ہو گئے تھے کہ خود سلطان کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا لہذا مختلف تدابیر سے اس نے ان کو ختم کیا۔ بلبن کا یہ اقدام نہایت ضروری تھا، ورنہ اندیشہ تھا کہ امراء میں اقتدار کی خاطر گروہ بندی کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور سلطنت کو نقصان پہنچتا۔ بلبن نے اپنی حکمت عملی کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئیں، پہلا اصول یہ تھا کہ اس نے نئی فتوحات کے ذریعہ حدود سلطنت کی توسیع پر نظم مملکت کے استحکام کو ترجیح دی، اس عہد کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے بہت تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ جب کبھی اس کے مشیر اس طرف اس کی توجہ مبذول کراتے تو وہ جواب دیتا کہ اس میں دو قباحتیں ہیں، ایک تو یہ اگر وہ دارالسلطنت سے دور جا کر نئی فتوحات میں مصروف ہو گیا تو منگول حملہ کر کے خود دہلی پر قبضہ کر لیں گے۔ دوسرے یہ کہ اس کے پاس تجربہ کار اور قابل اعتماد آدمیوں کی اس قدر کمی ہے کہ نئے مفتوحہ علاقوں کا انتظام حسب منشا نہ ہو سکے گا، اس کے عہد کی تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس نے معاملات کو بالکل صحیح سمجھا تھا۔

رہزنی کا استیصال

بلبن کے سامنے تین بڑے مسائل تھے:۔

۱۔ میوات اور دوآبہ میں رہزنوں کی مکمل سرکوبی۔

۲۔ منگولوں کے حملوں سے سلطنت کو بالخصوص شمال مغربی علاقوں کو محفوظ رکھنا اور

۳۔ سرکش اور باغی حاکموں کو سزائیں دے کر بغاوت کا خاتمہ کرنا۔

ان تینوں مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک زبردست فوج کی ضرورت تھی۔ اس کا بہت فاعلانہ کے ساتھ انتظام کیا۔ قطعی صحت کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے پاس کس قدر فوج تھی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے بلبن نے میواتیوں کی طرف توجہ کی۔ یہ لوگ رہزنی

Marfat.com

میں اس قدر دلیر ہو گئے تھے کہ خود دہلی کے قریب دن میں شہر پناہ کے پاس ڈاکے ڈالتے اور لوگوں کو لوٹ لیتے تھے، شہر کے قرب وجوار کی سرائیں انہوں نے تباہ کردی تھیں اور تجارت کا خاتمہ ہو گیا تھا، ان کا خوف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ظہر کی نماز کے بعد ہی شہر پناہ کے مغربی دروازے بند کر دئے جاتے تھے، بلبن نے ان کے خلاف سپاہی بھیجے اور ان جنگلوں کو جہاں وہ پناہ لیتے تھے صاف کرادیا، بڑی تعداد میں میواتیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تہ تیغ کیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا، اس طرح بہت جلد اس علاقے میں امن قایم ہو گیا، مسافر نہایت اطمینان سے سفر کرنے لگے اور تجارت وغیرہ کے جو راستے بند ہو گئے تھے وہ جاری ہو گئے۔

میواتیوں سے فارغ ہو کر بلبن نے دوآبہ کا رخ کیا، یہاں کے رہزنوں نے قتل و غارت گری سے علاقے کے علاقے تباہ و برباد کر دئے تھے، میواتیوں کی طرح یہ لوگ بھی جنگلوں میں پناہ لیتے تھے اور وہیں اپنے مرکز بنا رکھے تھے، ان رہزنوں نے دہلی اور بنگال کے درمیان راستے بند کر دئے تھے، بلبن خود فوج کے ساتھ ان علاقوں میں گیا اور وہیں قیام کرکے ان کی سرکوبی کی۔ ان کے مرکزوں پر قبضہ کرکے قلعے اور مسجدیں تعمیر کرائیں اور مسلمانوں کو وہاں آباد کیا، جنگلات کو کٹوا یا اور تھانے اور چوکیاں قایم کیں۔ اس مہم کو سرانجام دے کر وہ دہلی واپس آیا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ وہ اپنی فوج لے کر کٹھیر[1] کے علاقہ میں پہنچا، یہاں بھی دوآبہ کی طرح اس نے رہزنوں کے ساتھ بہت سختی برتی اور بڑی تعداد میں ان کو قتل کیا، امروہہ سنبھل اور بدایوں وغیرہ کے علاقوں میں جو رہزنی کے خاص مرکز بن گئے تھے مکمل طور پر امن بحال ہو گیا۔ برنی بلبن کے اس کارنامے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ہمارے زمانہ تک بلبنی قلعوں کی تعمیر اور تھانوں کے استحکام کو تین پشتیں گذر چکی ہیں، ہندوستان کے راستے جاری ہیں اور رہزنی کلیتاً موقوف ہو گئی ہے[2]"

---

[1] اٹھارھویں صدی میں روہیلوں کی حکومت قایم ہونے کے بعد یہ علاقہ روہیل کھنڈ کہلانے لگا، آج بھی اس کا یہی نام ہے۔ [2] دیکھیے تاریخ فیروز شاہی (مطبوعہ کلکتہ) ص ۵۵

Marfat.com

منگولوں کے خلاف دفاعی انتظامات

رہزنی کا قلع قمع کرنے کے بعد بلبن نے منگولوں کی طرف توجہ کی۔ ان خوفناک حملہ آوروں کو روکنے کی خدمت سلطان ناصرالدین کے زمانہ میں بلبن کے چچا زاد بھائی ملک شیر خان سنقر کے سپرد کی گئی تھی، اس نے اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۲۴۱ء میں لاہور کی تباہی کے بعد شمال مغربی علاقوں کو منگولوں کے حملوں سے بچانا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا، چناب سے آگے کے علاقوں میں جنگی مراکز کا قیام مشکل تھا، کھوکروں نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اور بھی مشکلات پیدا کردی تھیں۔ شیر خان نے بڑی حد تک ان کے حملوں کو روکا۔ مگر حالات اب بھی قابل اطمینان نہ تھے۔ ۱۲۷۰ء میں شیر خان کی وفات پر بلبن نے فوراً اس علاقہ میں نئے انتظامات کئے۔ اس نے خود موقع پر جا کر لاہور کے شہر اور قلعے کی تعمیر کرائی اس کے بعد قرب و جوار کی آبادیاں بسائیں اور دفاعی مراکز قائم کرکے قابل اعتماد افسروں کو متعین کیا۔ لاہور کے علاقہ کا انتظام کرکے سندھ و ملتان کی طرف توجہ کی، دریائے چناب سے سمندر تک کا سارا علاقہ اس نے اپنے عزیز بیٹے شہزادہ محمد کی سپردگی میں دیا اور ملتان کو اس کا مستقر بنایا۔ شہزادہ نے سرحدوں کی حفاظت نہایت خوبی اور کامیابی سے کی، وہ بہادری سے منگولوں کا مقابلہ کرتا تھا۔ ۱۲۸۵ء میں منگولوں نے ایک بڑا حملہ کیا، شہزادہ نے مقابلہ کیا اور شکست دیکر ان کو بھگا دیا۔ لیکن جب وہ ایک مختصر جماعت کے ساتھ ان کا تعاقب کر رہا تھا تو منگولوں نے اس کو گھیر لیا اور وہ شہید ہوگیا۔ اسی بنا پر اس کو مورخوں نے خان شہید بھی لکھا ہے۔

سرکش سرداروں کی بغاوت کے سلسلہ میں بلبن کو بنگال جانا پڑا۔ یہاں کے حاکم طغرل بیگ کو خیال تھا کہ بلبن ضعیف العمر ہے۔ چنانچہ اس نے علم بغاوت بلند کیا۔ بلبن نے دو مرتبہ فوجیں بھیجیں لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی تیسری مرتبہ وہ خود گیا۔ طغرل اس کے ایک سپاہی کے ہاتھ مارا گیا۔ بلبن نے طغرل کے ساتھیوں کو بہت سخت سزائیں دیں اور سینکڑوں آدمیوں کو پھانسی پر لٹکایا تاکہ دوسرے لوگ سبق حاصل کریں۔

Marfat.com

باب چہارم

سلطنت دہلی کا عروج و زوال

سلطان علاء الدین خلجی

خان شہید کی وفات نے بلبن کی کمر توڑ دی اس کے بعد وہ صرف تین سال زندہ رہا بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد تخت پر بیٹھا لیکن وہ نوعمر اور نا اہل تھا ۱۲۹۰ء میں اس کے ایک امیر جلال الدین خلجی نے دہلی پر قبضہ کر کے خلجی خاندان کی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا جلال الدین نے صرف چھ سال حکومت کی ۱۲۹۶ء میں اس کے بھتیجے اور داماد علاء الدین نے جو کڑہ کا حاکم تھا اپنے چچا کو قتل کر دیا اور تخت پر قبضہ کر لیا۔ علاء الدین کی حکومت کے بیس سال سلطنت دہلی کی تاریخ کا ایک اہم دور ہیں علاء الدین کے کارنامے یہاں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کئے جا سکتے، لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا حکمران تھا جس نے دکن و جنوبی ہند فتح کر کے سارے ہند پاکستان کو ایک مرکز کے تحت کیا، علاء الدین کی فتوحات کا سلسلہ اس کی تخت نشینی کے بعد جلد ہی شروع ہو گیا، پہلے اس نے گجرات پر حملہ کیا اور اس کے بعد راجپوتانہ اور وسط ہندوستان کے راجاؤں کی ریاستوں کو سلطنت دہلی میں شامل کیا راجپوتانہ کی لڑائیوں اور رنتھمبور اور چتوڑ کی فتوحات میں سلطانی افواج نے بڑی بہادری دکھلائی۔ راجپوت مجبور ہو گئے کہ سلطان کی اطاعت قبول کر کے اپنے علاقوں کو دہلی کا باجگذار بنائیں۔

Marfat.com

دکن کی فتوحات اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں، علاء الدین نے اپنی شہزادگی کے زمانہ میں شمالی دکن میں دیوگیر کے علاقہ پر حملہ کر کے اس کو شکست دی تھی، چنانچہ راجہ رام دیو نے سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس نے اس وعدہ پر عمل نہیں کیا، چنانچہ علاؤالدین نے اپنے ایک سردار ملک کافور کی سرکردگی میں دیوگیر کے خلاف فوج روانہ کی، رام دیو نے کافور کے سامنے معذرت کرلی اور درخواست کی کہ اس کو ماتحت راجہ تسلیم کرلیا جائے، علاء الدین نے اس کی یہ درخواست قبول کرلی، اس طرح دیوگیر سلطنت دہلی میں شامل ہوگیا ۱۳۰۹ء میں سلطان نے ملک کافور کو دوبارہ دکن روانہ کیا وہ دیوگیر سے گذرتا ہوا ورنگل پہنچا، راجہ اپنے مضبوط قلعہ میں محصور ہوگیا، لیکن کافور نے محاصرہ جاری رکھا، یہاں تک کہ راجہ پرتاپ ردر دیو نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی اور باجگذار کی حیثیت سے رہنے کی پیشکش کی، سلطان نے یہ درخواست قبول کرلی، کافور کی ان فتوحات سے سلطان کا حوصلہ بہت بلند ہوگیا اور اس نے طے کیا کہ آئندہ سال پھر وہ ایک فوج لے کر جائے اور ہند پاکستان کے جنوبی علاقہ کو فتح کرے، چنانچہ ۱۳۱۰ء کے آخر میں وہ تیسری بار روانہ ہوا، اور انتہائی جنوبی علاقہ میں پانڈیا راجہ کی ریاست میں داخل ہوا۔ راجہ خوف سے اپنا دارالحکومت چھوڑ کر بھاگ گیا، کافور نے مدورا پر قبضہ کرلیا۔ یہاں سے وہ جنوبی ساحل کی طرف بڑھا اور برصغیر کی انتہائی جنوبی حد پر سمندر کے کنارے رامیشورم کے مقام پر ایک مسجد بنائی اور سلطان کے نام پر اس کا نام علائی مسجد رکھا۔ اس طرح پانچ چھ سال کی مختصر مدت میں سلطان علاء الدین کی فوجوں نے دکن اور جنوبی ہند کے سارے علاقہ کو فتح کرکے سلطنت دہلی کی حدود ہند پاکستان کے جغرافیائی حدود تک پہنچا دیں۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جبکہ سارے ہند پاکستان پر ایک حکمران کی حکومت قائم ہوئی۔ فتوحات علائی کی تفصیلات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین نے دکن میں وہی کام انجام دیا جو سلطان

محمود اور معز الدین نے شمال میں انجام دیا تھا۔[1]

منگولوں کے حملے

علاء الدین خلجی کی حکومت کے ابتدائی چند سالوں میں منگولوں نے یکے بعد دیگرے چھ سات حملے کئے۔ علاء الدین کے افسروں نے جن میں ظفر خاں خاص طور پر قابل ذکر ہے، ان حملہ آوروں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن ان حملوں میں دو موقعوں پر بے حد تشویشناک حالات پیدا ہو گئے تھے، ایک تو ۱۲۹۹ء میں جبکہ منگول سردار قتلغ خواجہ تقریباً دو لاکھ فوج لے کر جمنا کے کنارے تک آ پہنچا۔ اس کی فوجوں کو دیکھ کر سب لوگ گھبرا گئے، علاء الدین کے اکثر امراء نے مشورہ دیا کہ روپیہ دے کر منگولوں کو واپس کر دیا جائے، لیکن اس نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور فوج کو جنگ کے لئے تیاری کا حکم دیا، دونوں فوجیں بالمقابل ہوئیں اور زبردست لڑائی ہوئی، سلطانی افواج میں سب سے زیادہ بہادری ظفر خان نے دکھلائی، مگر بہادری کے جوش میں وہ غنیم کی صفوں میں اس قدر آگے بڑھتا ہوا چلا گیا کہ گھر گیا اور مارا گیا۔ بہر حال اس کی بہادری کا سکہ منگولوں پر ایسا بیٹھ گیا تھا کہ انہوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ واپس چلے جائیں، اس کامیابی کے بعد علاء الدین کو خیال ہو گیا کہ منگولوں کی طرف سے اب کوئی خاص خطرہ نہیں رہا اور تین چار سال تک واقعی انہوں نے کوئی حملہ نہیں کیا، لیکن جس زمانہ میں سلطان فتح راجپوتانہ میں مصروف تھا منگولوں کی فوج نے جس کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی اپنے ایک سردار طرغی کی سرکردگی میں برصغیر پر حملہ کیا اور دہلی کے قریب تک آ گئے، چونکہ انہوں نے دہلی سے جانے والے راستوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا اس لئے علاء الدین کو سیری میں قلعہ بند ہونا پڑا، منگولوں کا محاصرہ کافی عرصہ تک جاری رہا مگر ان کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی بالآخر وہ یکایک محاصرہ ختم کر کے چلے گئے۔[2] اس حملہ نے یہ ثابت

---

[1] علاء الدین خلجی کی دکن میں فتوحات کے لئے سب سے بہتر کتاب امیر خسرو کی خزائن الفتوح ہے۔

[2] اس محاصرہ کے متعلق ضیاء برنی اور دیگر مورخوں نے لکھا ہے کہ تشویش اور پریشانی کی حالت میں سلطان نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ وہ اس کی کامیابی کے لئے دعا فرمائیں، آپ نے جواب دیا کہ سلطان کو اطمینان رکھنا چاہئے، اسی روز رات کو منگولوں نے اپنے خیمے اکھاڑ کر یکایک بھاگنا شروع کر دیا۔

Marfat.com

کر دیا کہ منگولوں کی آئے دن کی یورشوں کو روکنے کے لئے کوئی خاص انتظام کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے بہت سی اصلاحات کیں۔ اس کی فوجی اور اقتصادی اصلاحات اسی سلسلہ میں نافذ کی گئیں۔ اس کے علاوہ راجپوتانہ پر حملوں کے زمانہ میں کئی بغاوتیں پے در پے ہوئیں۔ علاء الدین نے بغاوت کے اسباب پر غور کیا اور اپنے وزراء سے مشورہ کر کے کچھ انتظامی اصلاحات جاری کیں، ان اصلاحات کا مختصر تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

انتظامی اصلاحات

جس زمانہ میں علاء الدین راجپوتانہ کی ریاستیں فتح کرنے میں مصروف تھا تو اس کی عدم موجودگی میں کئی بغاوتیں ہوئیں۔ رنتھمبور جاتے ہوئے وہ راستہ میں شکار کے لئے تلپت کے قریب مقیم ہوا۔ اس کے بھتیجے سلیمان اکت خان نے موقع پاکر اس پر حملہ کر دیا، سلطان زخمی ہوا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سلیمان سمجھا کہ وہ مر گیا۔ بعد میں سلطان اپنے کیمپ میں واپس آیا، اکت خاں کو قتل کر دیا گیا۔ محاصرہ رنتھمبور کے دوران اس کے دو بھانجوں عمر اور منگو خاں نے بدایوں اور اودھ میں علم بغاوت بلند کیا لیکن مقامی سرداروں نے ان پر قابو پا لیا۔ ابھی یہ بغاوتیں فرو نہیں ہوئی تھیں کہ دہلی میں حاجی مولا نے بغاوت کی۔ اس پر بھی ملک حمید الدین نے جلد ہی قابو پا لیا اور حاجی مولا کا سر کاٹ کر سلطان کے پاس بھیج دیا۔ ان پے در پے بغاوتوں سے علاء الدین کو تشویش ہوئی اور اس نے اپنے معتمدوں سے مشورے کئے کہ بغاوتوں کو ختم کرنے کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں۔ کافی غور و مشورہ کے بعد سلطان اور اس کے مشیر اس نتیجہ پر پہنچے کہ بغاوتوں کے اسباب مندرجہ ذیل چار امور ہیں:

۱۔ حکومت کی لوگوں کے معاملات سے بے خبری اور جاسوسی کا ناقص انتظام۔

۲۔ شراب نوشی کی کثرت۔

۳۔ امراء اور بااثر لوگوں کی آپس میں قرابت اور رشتہ داریاں۔

۴۔ کثرت زر و مال۔

مسائل متعلقہ پر غور کرنے کے بعد سلطان نے طے کیا کہ ان کو دور کرنے کے لئے جلد از جلد

Marfat.com

کوشش کی جائے، چنانچہ سب سے پہلے اس نے آخری سبب کی طرف توجہ کی، اس سلسلہ میں اس نے ایک انقلابی اقدام کیا یعنی جملہ جاگیریں فوراً ضبط کر لیں اور ٹیکس وصول کرنے والے افسروں کو ہدایات کیں کہ محصول میں سونا لیا جائے اور ان کو چاہئے کہ وصولیابی میں سختی سے کام لیں، ٹیکسوں کی تعداد اور شرح میں بھی اضافہ کر دیا گیا، اس طرح جاگیرداروں کی دولت و ثروت کا بیشتر حصہ حکومت کے خزانہ میں آ گیا۔ اب ان لوگوں کو معاش کی فکر ہوئی اور بقول برنی

"کسی کو لفظ بغاوت منہ سے نکالنے کی بھی فرصت نہیں رہی"۔

جاگیرداروں کا زور ختم کرنے کے بعد سلطان نے مقدموں، بلاہروں، خوطوں اور چودھریوں[1] کے متعلق ضوابط جاری کئے اور وہ حقوق خوطی" کو ختم کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ با اثر اور طاقت ور طبقہ کے واجبات کا بوجھ اب کمزوروں پر سے ہٹ گیا۔[1] علاء الدین خلجی نے زمینوں کی پیمائش بھی کرائی اور پیداوار میں حکومت کا مطالبہ بڑھا کر نصف کر دیا، اس میں شک نہیں کہ یہ شرح بہت زیادہ ہے لیکن علاء الدین کی اصلاحات کی وجہ سے دولت چند خاندانوں میں جمع نہ ہو سکی اور حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان اصلاحات سے معیشت کے ساتھ سماجی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑا۔ معاشرے میں اعلیٰ یعنی مالدار طبقہ ختم ہو گیا۔ ایک نتیجہ ان اصلاحی اقدامات کا یہ ہوا کہ وہ لوگ جو جاگیرداری نظام کی وجہ سے بغیر محنت کے زندگی بسر کرتے تھے اور دوسروں کی محنت کا ذائقہ خود اٹھاتے تھے اب مجبور ہو گئے کہ محنت کر کے روزی کمائیں۔ اقتصادی اور سماجی لحاظ سے یہ اصلاح بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ جاسوسی

---

[1] مقدم۔ خوط، بلاہر اور چودھری، یہ گاؤں کے سربرآوردہ لوگ ہوتے تھے، حکومت کی طرف سے مالگذاری وصول کرتے تھے اور کچھ حصہ بطور کمیشن کے ان کا حق ہوتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاشتکاروں پر سختیاں کرتے تھے اور خود اپنی مال گذاری کا بوجھ بھی ناجائز طریقوں سے ان ہی پر ڈال دیتے تھے۔

Marfat.com

نظام کو علاء الدین نے اس قدر مکمل کر دیا کہ لوگوں نے غیر ذمہ دارانہ گفتگو کرنا قطعاً بند کر دی بلکہ خوف کی وجہ سے اکثر پبلک مقامات پہ اشاروں سے کام لیتے تھے۔ تیسرا ضابطہ شراب نوشی سے متعلق تھا، اس کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اخلاقی اور دینی احکام کے علاوہ سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر سے بھی یہ بہت خطرناک تھا، با اثر امراء اور افسر پارٹیوں میں شرابیں پی پی کر بدمستی میں ایسی باتیں کرتے تھے جن سے سازشوں اور بغاوتوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ علاء الدین نے اس کے روکنے میں بہت سختی کی۔ وہ خود بھی شراب کا عادی تھا لیکن نئے احکامات جاری کرنے کے ساتھ اس نے اپنی تمام شراب قلعہ کے باہر پھینکوا دی اور جو برتن اس کے لئے استعمال ہوتے تھے ان کو تڑوا ڈالا۔ برنی کا بیان ہے کہ شراب محل کے باہر اتنی مقدار میں پھینکی گئی کہ برسات کی طرح کیچڑ ہو گئی۔ حکومت نے شراب کی خرید و فروخت قانوناً ناجائز قرار دیدی اور جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑے جاتے تھے ان کو بہت سخت سزا دی جاتی تھی۔ چوتھا ضابطہ شادیوں اور رشتہ داریاں قائم کرنے سے متعلق تھا اس کے لئے یہ قاعدہ بنا دیا گیا کہ با اثر خاندانوں کے رشتے حکومت کے علم کے بغیر نہیں کئے جا سکتے تھے، علاء الدین کی ان اصلاحات کا نتیجہ حسب منشا نکلا، بغاوتوں کا امکان بہت کم ہو گیا، چنانچہ اس کے زمانہ حکومت میں اس کے بعد کوئی قابل ذکر بغاوت نہیں ہوئی۔

اقتصادی اصلاحات

علاء الدین کی عظیم ترین اصلاحات میں اشیاء کی قیمتیں کم کرنا اور ان کے نرخ مقرر کرنا ہیں، عام طور پہ مورخوں کا خیال ہے کہ سلطان نے یہ اصلاحات اس غرض سے جاری کی تھیں کہ وہ سپاہ کی تنخواہیں کم کر سکے اور اسی کم تنخواہ میں ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں امن قائم کرنے اور منگولوں کے حملے روکنے کے لئے ایک مستقل اور کثیر التعداد فوج کی ضرورت تھی اگر فوج کی تعداد اور اخراجات کو اس حد تک بڑھایا جاتا کہ وہ بڑے سے بڑے حملے کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکے تو سلطان کی جمع کی ہوئی دولت بہت جلد ختم ہو جاتی وہ یہ بھی خوب

سمجھتا تھا کہ حکومت کوئی فوری اقدام اس قسم کا نہیں کرسکتی تھی جس سے اس کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو سکے، لہذا اس نے اشیاء ضرورت کی قیمتوں کو اس قدر کم کردیا کہ بہت کم تنخواہ میں سپاہی کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ مورخوں نے ان اصلاحات کی جو وجوہات لکھی ہیں وہ ایک حد تک صحیح ہیں، مگر ہم کو مکمل حقیقت خیر المجالس کی اس روایت میں ملتی ہے جو شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے قاضی حمید الدین کے حوالہ سے بیان کی ہے۔
شیخ فرماتے ہیں کہ قاضی حمید الدین نے ان سے بیان کیا کہ ایک موقع پر انہوں نے سلطان علاء الدین کو دیکھا کہ بہت متفکر ہے، اس کے ایک امیر ملک قرابیگ نے سبب دریافت کیا تو سلطان نے کہا کہ میرے دل میں اکثر یہ خیال آتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھکو اتنے زیادہ آدمیوں پر حکومت کرنے کے لئے منتخب کیا ہے، اس لئے میرا یہ فرض ہے کہ میں کوئی ایسا کام کروں جس سے عوام الناس کو فائدہ پہنچے، یہ مقصد مال و اسباب تقسیم کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا لہذا میں نے طے کیا ہے کہ میں اجناس کی قیمت اس قدر کم کردوں کہ غرباء کو اس سے پورا فائدہ پہنچے۔ اس روایت کی صحت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ سلطان نے اشیاء کی قیمت کم کرکے صرف سپاہیوں ہی کو نہیں بلکہ ہر شخص کو ارزاں چیزیں مہیا کرنے کی ذمہ داری لی۔ اگر وہ صرف سپاہیوں کے لئے یہ نرخ مقرر کرنا چاہتا تو لشکر کے بازاروں میں ارزاں فروشی کا انتظام کرسکتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ خود اس زمانہ میں بھی بعض مخصوص دوکانیں ہوتی تھیں جہاں فوجی افسروں کو کم قیمت پر اشیاء ملتی تھیں سنتے یہ سہل تھا کہ یہ انتظام صرف چھاؤنیوں میں کیا جاتا لیکن سلطان نے یہ نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اشیاء کی قیمتیں کم کرکے اس نے سپاہیوں کی تنخواہیں بھی کم کیں اور خزانہ پر بغیر کسی بار کے فوج میں اضافہ کردیا گیا۔ تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق علاء الدین نے اس طرح چار لاکھ پچھتر ہزار سواروں کی مستقل فوج تیار کرلی۔ چنانچہ جب بھی منگولوں نے حملہ کیا ان کو منہ کی کھانی پڑی بالآخر انہوں نے ہندوپاکستان پر حملے بند کردیے۔[۱]

---

[۱] اس نظریہ پر خلیق احمد نظامی نے اپنی تصنیف سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات میں مفصل بحث کی ہے دیکھو صفحہ ۲۵۰۔

Marfat.com

علاءالدین کی یہ اصلاحات اس قدر دلچسپ ہیں کہ ان کے متعلق چند تفصیلات بیان کرنا ضروری ہیں۔ سب سے پہلے اس نے غلہ کی ارزانی کی طرف توجہ کی کیونکہ انسانی ضروریات میں یہ سب سے اہم ہے اس سلسلہ میں چند قوانین وضع کئے گئے اور مختلف اجناس کی قیمتیں حکومت کی طرف سے مقرر کردی گئیں، بازار کو ایک افسر کے تحت کردیا گیا جو شحنہ منڈی کہلاتا تھا۔ راشن بندی کا بھی انتظام کیا گیا۔ حکومت نے سرکاری دوکانیں کھلوائیں اور تاجروں کو حکم دیا کہ وہ بغیر اجازت کے خرید وفروخت نہ کریں، غلہ تھوڑی مقدار میں بھی جمع کرنا بہت سخت جرم قرار دیدیا گیا، غلہ کا سرکاری دوکانوں پر کافی مقدار میں اسٹاک رکھنے کی غرض سے دوآبہ کے حکام کو ہدایات کردی گئیں کہ وہ مال گذاری، غلہ کی شکل میں وصول کریں اس کے علاوہ سلطان نے یہ بھی انتظام کیا کہ مختلف ذرائع سے بازار کے معاملات کی رپورٹ روزانہ اس کو پہنچائی جایا کرے جب وقت بھی کوئی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اس کو بہت سخت سزا دی جاتی[1]۔ غلہ کے علاوہ دوسری اشیائے ضرورت مثلاً کپڑا، شکر، روغن وغیرہ

---

[1] علاءالدین نے اجناس کی قیمتیں مندرجہ ذیل شرح پر مقرر کیں :۔

گیہوں ۔	۷½	جیتل	فی	من
جو ۔	۴	،	،	،
چنا	۵	،	،	،
چاول	۵	،	،	،
ماش	۵	،	،	،
موٹھ	۳	،	،	،
شکر	۱۰۰	،	،	،

جیتل تانبے کا سکہ تھا اور ایک تنکہ میں پچاس جیتل ہوتے تھے۔ تنکہ چاندی کا ہوتا تھا اور ۱۷۵

غیرہ کی قیمتوں کے متعلق علیحدہ ضوابط جاری کئے گئے۔ پہلا ضابطہ یہ تھا کہ تمام قسم کا مال چاہے وہ وہیں کا تیار کردہ ہو یا باہر سے لایا جائے سب سے پہلے ایک خاص جگہ لایا جاتا اس کا نام سرائے عدل تھا، اگر کسی قسم کا مال سرائے عدل کے علاوہ کہیں اور بیچا جاتا تھا تو وہ بحق سرکار ضبط ہوجاتا تھا، ہر تاجر کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنا مال سرکاری دفتر میں درج کرائے اور پھر مقررہ قیمت پر فروخت کرے، بہت سا مال خود حکومت بھی خرید کر رکھتی تھی تاکہ کسی وقت میں کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ کپڑے کا مسئلہ کچھ پیچیدہ تھا، اس لئے علاء الدین نے ملتانی سوداگروں کو جو کپڑے کے بیوپاری تھے بیس لاکھ تنکہ کی رقم پیشگی ادا کی تاکہ وہ کپڑا لاکر سرائے عدل میں فروخت کریں قیمتی اور کمیاب کپڑے کی راشن بندی کی اور وہ بغیر اجازت نامہ کے نہیں خریدا جاسکتا تھا گھوڑوں کی خرید و فروخت کا بھی خاص انتظام کیا گیا تھا، اچھی قسم کے گھوڑے بغیر اجازت نامہ کے نہیں خریدے جاسکتے تھے، اسی طرح دوسرے جانوروں کی قیمتیں بھی مقرر کیں، قیمتوں کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عمدہ گائے تین تنکہ تک مل جاتی تھی اور بکری کی قیمت دس سے بارہ جیتل تک تھی، غرضیکہ ہر چیز کی قیمت مقرر کردی گئی، سوئی سے لے کر ہاتھی تک مقررشدہ قیمت پر بکتا تھا، چونکہ قانون شکنی کی سزا سخت تھی اس لئے تاجر لوگ جو بے شرم، بے باک، دھوکا دینے والے

؎ اس کا وزن ایک تولہ تھا یعنی کم وبیش موجودہ روپیہ کی برابر۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ اس زمانہ کا من بہت کم تھا، گزشتہ کے تول کے مطابق من میں چالیس سیر ہوتے تھے اور ایک سیر ۲۴ تولہ کا تھا گویا کہ اس زمانہ کا من آج کل کے ۱۲ سیر کی برابر ہوا۔ اس طرح ایک جیتل یعنی آج کل کے دو پیسوں میں ڈیڑھ سیر سے زیادہ گیہوں خریدے جاسکتے تھے، دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ علاء الدین نے ایک سوار کی تنخواہ ۲۳۴ تنکہ سالانہ یا 19½ تنکہ ماہانہ مقرر کی تھی، اشیاء کا نرخ دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس کی فوج کا سپاہی نہایت فراغت کی زندگی بسر کرسکتا تھا۔

Marfat.com

کمینے اور جھوٹے تھے، سب راہ راست پر آگئے۔ بہت سے عیوب معدوم ہو گئے، مثلاً جھوٹ بولنا، کم تولنا، آمیزش کرنا، یہ باتیں ختم ہو گئیں۔[1]

علاء الدین نے اشیاء کی قیمتیں مقرر کرکے جس کامیابی سے اپنی اسکیم کو نافذ کیا، حیرت انگیز ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ دور میں جب بھی قیمتیں مقرر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو چور بازار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور وہ اشیاء جن کی قیمت مقرر کی جاتی ہے بازار سے غائب ہو جاتی ہیں۔ علاء الدین کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ حکومت خود اس چیز کے مہیا کرنے کا سامان کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے یہ ناممکن بنا دیا تھا کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ اشیاء کا ذخیرہ رکھے۔ اقتصادیات کے طلباء کے لئے علاء الدین کا یہ منصوبہ اور خاص طور پر اس کا نفاذ ایک دلچسپ مگر مشکل مسئلہ ہے۔ مورخ کو سلطان کے حسن انتظام اور اس کی ذہانت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

سلطان محمد بن تغلق

۱۳۲۵ تا ۱۳۵۱ء

علاء الدین کی وفات کے بعد خلجی خاندان کا زوال شروع ہو گیا۔ اس کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ کو ایک نومسلم غلام خسرو خان نے جس پر اس کو بے حد اعتماد تھا قتل کرکے تخت پر قبضہ کر لیا۔ خسرو خان گجرات کی ایک نیچی ذات برادو[2] سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے زمانہ

---

[1] دیکھو تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ۳۱۶

[2] اس نام پر مورخین میں اختلاف ہے جو کتابت کی غلطیوں سے مشکل ہوا ہے۔ بعض تاریخوں میں اس کو پرواری یا پروار لکھا گیا لیکن ہم نے امیر خسرو کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

بے ہنر وکہ گوہر سر باد و ۔۔۔ [illegible]

براد و صفت بندی است پرباز ۔۔۔ [illegible]

(تغلق نامہ ص ۱۹)

عروج میں اس قوم کے بہت سے لوگ دہلی آگئے اور انہوں نے خسرو خان کی شہ پر اسلام کی توہین کرنا اپنا شعار کرلیا۔ ان حالات کو مسلم امراء برداشت نہیں کرسکتے تھے لیکن کچھ عرصہ تک وہ بے بس اور مجبور رہے۔ آخر کار ایک ترکی سردار ملک تغلق نے ہمت کرکے دہلی پر حملہ کردیا۔ خسرو خان کو شکست ہوئی اور امراء نے بالاتفاق تغلق کو اپنا سلطان منتخب کیا۔ سلطان غیاث الدین کی تخت نشینی کے وقت کافی عمر تھی لیکن پھر بھی اس نے بڑی تن دہی اور جوان ہمتی سے کام کیا اور اپنے مختصر دور حکومت ۱۳۲۰-۱۳۲۵ء میں بہت سے اصلاحی کام کئے۔ اس کی زرعی اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکاروں کی حالت جو پچھلے دنوں میں ابتر ہوگئی تھی بہت سنبھل گئی۔ اس کے علاوہ دکن اور بنگال کے علاقے جو سلطنت سے علیحدہ ہوگئے تھے دوبارہ فتح ہوکر دہلی کے تحت آگئے۔ ۱۳۲۵ء میں سلطان بنگال کی بغاوت کو ختم کرکے دہلی واپس آرہا تھا کہ ایک حادثہ[1] میں اس کی وفات واقع ہوگئی۔ اس کے بعد اس کا بڑا بیٹا جونا خاں تخت پر بیٹھا۔

بیٹا سلطان جس کا نام محمد بن تغلق تھا دہلی کے قابل ترین بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس نے ستائیس برس حکومت کی اور اس زمانہ میں بہت سی اصلاحات بھی نافذ کیں لیکن آخر زمانہ میں بغاوتوں کا زمانہ شروع ہوگیا اور سلطنت کے بعض حصے بالخصوص جنوبی علاقے

---

[1] غیاث الدین دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر ایک عارضی کوشک میں مقیم تھا جہاں اس نے ہاتھیوں کی پریڈ کا حکم دیا۔ اس کی دھمک سے کوشک کی بنیادیں جو ابھی گیلی تھیں متزلزل ہوگئیں اور یکایک وہ گر پڑا۔ سلطان اس کے نیچے دب کر مر گیا۔ بعض مورخین نے واقعہ کی نوعیت کو نہیں سمجھا اور یہ لکھ دیا ہے کہ اس کے بیٹے نے جان بوجھ کر یہ کوشک اس طرح بنوایا تھا کہ وہ وقت مقررہ پر گر پڑے اور سلطان اس کے نیچے دب جائے۔ سلطان محمد تغلق پر یہ تہمت بالکل بے بنیاد ہے۔ اس مسئلہ پر راقم کا ایک مفصل مقالہ "مسلم یونیورسٹی جرنل" میں شائع ہوچکا ہے۔

Marfat.com

خود مختار ہوگئے۔ یہاں اس کی چند اصلاحات اور کارناموں کا مختصر الفاظ میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔

دو دار الحکومت

محمد بن تغلق کا سب سے دلچسپ اقدام دولت آباد کو دوسرا دار الحکومت بنانا تھا، عام طور پر مورخوں نے لکھا ہے کہ اس نے دہلی کو برباد کر کے دکن میں اپنا دار الحکومت قائم کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے سلطان کے منصوبے کی کیفیت اور اس کے مقصد کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ علاء الدین نے دکن اور جنوبی ہند کے علاقے فتح کر کے سلطنت میں تو شامل کر لئے تھے۔ لیکن وہاں کا نظم حکومت ان ہی راجاؤں اور سرداروں کو سپرد کر دیا تھا جن کو اس نے شکست دی تھی۔ اس زمانہ کے مخصوص حالات میں یہی طریقہ کار قابل عمل ہوتا، مگر یہ انتظام زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ ہندو راجہ جس وقت بھی دیکھتے کہ دہلی کا سلطان کمزور شخص ہے یا کسی مہم میں مصروف ہے تو وہ بغاوت کر کے خود مختار ہو جاتے۔

محمد بن تغلق نے ان حالات پر غور کیا اور یہ طے کیا کہ جنوبی علاقوں کا انتظام براہ راست اپنی حکومت کے سپرد کرے۔ اس انتظام کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہاں مسلمانوں کی مؤثر آبادی ہو۔ لہٰذا اس نے ایک ایسا منصوبہ بنایا کہ دولت آباد نہ صرف دار الحکومت ہی نہ ہو بلکہ تبلیغ اسلام کا زبردست مرکز بنی ہو۔ چنانچہ حکومت کے افسران اور فوج کے علاوہ دہلی کے علماء و مشائخ کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ دولت آباد میں جا کر قیام کریں۔ اس زمانہ کے معاشرہ میں حالات ایسے تھے کہ اہل ثروت اور دوسرے با اقتدار لوگوں کے ساتھ متعدد خاندان اور افراد وابستہ ہوتے تھے۔ امراء، علماء، مشائخ اور دوسرے با اقتدار لوگوں کی [illegible] کے ساتھ ان کے متعلقین بھی [illegible] غرضیکہ سلطان کے ہمراہ سارے امراء، فوج، علماء اور مشائخ کے ہمراہ دہلی کی آبادی کا بہت بڑا حصہ دکن چلا گیا، لیکن بعض مورخوں کا یہ بیان غلط ہے کہ دہلی بالکل برباد ہو گئی اور کوئی شخص بھی

وہاں باقی نہ رہا۔ ہاں جو لوگ باقی رہے ان میں زیادہ تر ادنیٰ اور معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ ابن بطوطہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ شہر دہلی ایک ویرانہ میں تبدیل ہو گیا، جہاں آگ روشن نہ ہوتی تھی۔ یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ معاصر تاریخوں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ سلطان نے دہلی سے علماء اور مشائخ کے جانے کے بعد دوسرے شہروں کے علماء اور مشائخ سے کہا کہ وہ دہلی آکر قیام کریں، دولت آباد جانے والوں کو سلطان نے سفر کی سہولتیں جہاں تک ممکن تھا مہیا کیں، مگر پھر بھی ان کو یقیناً بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، بہر حال بہت جلد دولت آباد ایک بڑا خوبصورت شہر اور اسلامی تہذیب و تمدن کا عظیم الشان مرکز بن گیا، سلطان محمد بن تغلق کا یہ اقدام بہت دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ جنوبی علاقوں میں صرف مسلمانوں کی آبادی ہی نہیں قائم ہو گئی بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن بھی پھیلنے لگا، اس کا اثر زبان، ادب آرٹ، غرض کہ زندگی کے ہر پہلو اور شعبہ پر پڑا، یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ محمد بن تغلق کے اس منصوبہ کی بدولت ہند پاکستان کے جنوبی اور شمالی حصے ایک ہی تمدن میں منسلک ہو گئے۔ اسلامی تہذیب کے جو شاندار آثار دکن میں ہم کو نظر آتے ہیں، ان کی بنیادوں کی ابتدائی منزل محمد بن تغلق کا یہی منصوبہ تھا جس کے ذریعہ دولت آباد سلطنت کا دوسرا دارالحکومت بنایا گیا تھا۔ دولت آباد کو ۱۳۲۷ء میں دارالحکومت بنایا گیا، اس کے بیس سال بعد محمد بن تغلق ہی کے خلاف وہاں کے مسلمان سرداروں نے علم بغاوت بلند کیا اور ایک خود مختار ریاست کی بنیاد ڈالی۔[1]

---

[1] شہاب الدین العمری مؤلف مسالک الابصار نے صاف طور پر لکھا ہے کہ سلطان دو دارالحکومت رکھتا تھا، ایک دہلی اور دوسرا دولت آباد یعنی یہ کہنا درست نہیں کہ اس نے دہلی سے دارالحکومت دولت آباد کو منتقل کیا، دہلی اس زمانہ میں بھی دارالحکومت تھا جب دولت آباد دوسرا دارالحکومت بنا۔ العمری کے اس بیان کی تصدیق سکوں سے بھی ہوتی ہے، ایک ہی سال کے سکوں میں دارالخلافت دہلی اور دارالخلافت دولت آباد موجود ہے۔

Marfat.com

تانبے کا سکہ

محمد بن تغلق کی دوسری دلچسپ اصلاح یہ تھی کہ اس نے تانبے کے سکے چاندی کے سکوں کی بجائے چلائے، بیسویں صدی میں اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ہم لوگ سونے چاندی کے سکوں کی بجائے کاغذ کے نوٹ لینے کے عادی ہیں، لیکن چودھویں صدی میں کسی حکومت کا یہ عمل کہ تانبے کے سکے کی قیمت چاندی کے سکے کی برابر قرار دے مختلف شکوک اور بدگمانیاں پیدا کر سکتا تھا، بہرحال سلطان اس اصلاح کے فوائد کو بھی خوب سمجھتا تھا، اس کو اندازہ تھا کہ اس تدبیر سے مملکت کے وسائل بہت وسیع ہو سکتے ہیں، علاوہ ازیں اس زمانہ میں چاندی بہت کم ہو گئی تھی اور اگر کثرت سے سکوں کے لئے اس کا استعمال جاری رہتا تو بازار کے نرخوں پر اثر پڑتا۔ درحقیقت محمد بن تغلق کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ اس کی اپنی مملکت میں لوگوں کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کہ چاندی کی بجائے تانبے کے سکے اسی قیمت پر چلائے جائیں۔ چنانچہ ابتدا میں یہ سکے اچھی طرح چلے اور تاجروں نے ان کو قبول کیا اس لئے کہ حکومت کے مطالبات ان ہی میں ادا کئے جاتے تھے، مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا اور جلد ہی حالات بگڑنے لگے اس کی وجہ یہ ہوئی کہ لوگوں نے تانبے کے سکے اپنے گھروں میں ڈھالنا شروع کر دئے، جعلی سکے بنانے میں نفع بہت زیادہ تھا اس لئے یہ کام بہت وسیع پیمانے پر ہونے لگا اور تانبے کے سکے اس کثرت سے بازار میں آنے لگے کہ تاجروں کو شکوک پیدا ہو گئے اور انہوں نے ان کو قبول کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا۔ سلطان نے یہ سوچ کر کہ کہیں اس سے [illegible] میں فتنہ و انتشار کی قوتیں زور نہ پکڑ جائیں حکم دیدیا کہ تانبے کے سکوں کے بدلے خزانے سے چاندی کے سکے لئے جا سکتے ہیں۔ اس پر اتنی کثرت سے لوگ تانبے کے سکے دہلی میں لائے کہ بقول مورخین کے ان کے ڈھیروں سے پہاڑیاں بن گئیں۔ ظاہر ہے کہ سلطان کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور جو لوگ تانبے کے بدلے چاندی کے سکے وصول کرنے آئے تھے وہ ناکام واپس گئے اس میں شک نہیں کہ اس سے بہت سے لوگوں کو نقصان ہوا ہوگا اور انہوں نے محمد بن تغلق کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہوگا، لیکن واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ سلطان کا منصوبہ نہایت

مفید اور عمدہ تھا، مگر بے ایمانوں اور جعل سازوں نے اس کو ناکام بنا دیا، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سلطان جعلی سکوں کو رد کرنے میں ناکامیاب کیوں ہوا۔ اس زمانہ میں سکے ڈھالنے کے طریقے ایسے نہ تھے کہ جعلی اور اصلی سکوں میں کوئی نمایاں فرق ہوتا، تانبہ کا سکہ دے کر چاندی کا وصول کرنے میں فائدہ اتنا زیادہ تھا کہ یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر شروع ہو گیا اور حکومت اس کا سد باب نہ کر سکی۔

محمد بن تغلق کی ایک اور اصلاح جس پر بعض مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے نکتہ چینی کی ہے، دو آبہ میں مال گزاری میں اضافہ سے متعلق تھی، یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ دو آبہ کی زمینیں اور علاقوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ زرخیز ہیں اور یہاں کی پیداوار دوسری جگہوں سے کہیں زیادہ ہے، سلطان کو معلوم تھا کہ زمین کے زرخیز ہونے کا فائدہ صرف مقامی سردار اٹھاتے تھے، حکومت کو اس سے کچھ بھی فائدہ نہ تھا، کیونکہ شرح مال گزاری دوسرے علاقوں کے برابر ہی تھی، سردار اور جاگیر دار مالدار ہونے کے سبب خود سر بھی ہو گئے تھے، علاءالدین نے اسی سبب سے شرح مال گزاری میں اضافہ کیا تھا، محمد بن تغلق نے بھی اضافہ کیا لیکن اتنا نہیں جتنا کہ خلجی سلطان نے کیا تھا، اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ جس زمانہ میں اضافہ کیا گیا ان ہی سالوں میں اس حصہ میں زبردست قحط پڑا اور کئی سال تک خشک سالی رہی، ان حالات میں رعایا کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار رود بدل ہونے لگی۔ سلطان نے خشک سالی کا علاج یہ کیا کہ بہت سے کنویں کھدوائے اور کاشتکاروں کو رقمیں ادا کیں لیکن یہ سہولتیں اس وقت بہم پہنچائی گئیں جبکہ بہت کچھ نقصان ہو چکا تھا اور بہت سے کاشتکار اپنے گاؤں سے بھاگ گئے تھے اس پر سلطان کو غصہ آیا اور اس نے ان لوگوں کو سخت سزائیں دیں۔

محمد بن تغلق نے ان اصلاحات کے علاوہ دو منصوبے فوجی حملوں سے متعلق بھی تیار کئے۔ ایک خراسان فتح کرنے کے سلسلہ میں تھا اور دوسرا ہمالیہ کے پہاڑی علاقہ میں کسی خود سر راجہ کو سزا دینے کی غرض سے تیار کیا گیا تھا۔ خراسان کا حملہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ وہاں کے حالات

Marfat.com

بدل گئے تھے اور کامیابی کی امید بہت کم رہ گئی تھی دوسرے حملے کے لئے جو فوج روانہ کی گئی تھی اس کے سپہ سالار خسرو ملک نے یہ غلطی کی کہ پہاڑی علاقہ میں آگے بڑھتا چلا گیا اور واپسی کے لئے راستوں کو محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا، چنانچہ واپسی میں بارش کی وجہ سے راستے بند ہو گئے اور پہاڑی ڈاکوؤں اور لٹیروں نے فوج پہ حملے کئے جس سے تقریباً تمام لشکر برباد ہو گیا۔ یہ بہت بڑی تباہی تھی جو سلطانی افواج پہ آئی اس کو خود بھی بہت صدمہ ہوا لیکن وہ مجبور تھا۔

سلطان کی بعض اصلاحات سے جو تباہی سلطنت پر آئی اس کا لازمی نتیجہ سیاسی انتشار تھا۔ اس کے بعض افسر اور امراء نے بجائے حق نمک ادا کرنے کے اس کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور حالات کو اور بھی بدتر بنا دیا۔ ان بغاوتوں میں دکن اور گجرات کی بغاوتیں قابل ذکر ہیں۔ دکن میں با اثر جاگیرداروں کے ایک گروہ نے جو امیران صدہ کہلاتے تھے بغاوت کی۔ یہ بغاوت اس لئے کامیاب ہو گئی کہ اسی زمانہ میں گجرات میں بھی باغیوں کا زور تھا۔ امیران صدہ نے پہلے اسمٰعیل مخ کو اور بعد میں علاؤالدین حسن بہمن شاہ کو اپنا سردار منتخب کیا۔ باغی لیڈر نے دولت آباد کو مستقر بنا کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ان کے سردار کے نام کی وجہ سے یہ بہمنی سلطنت کہلائی اور محمد بن تغلق کا تعمیر کردہ شہر دولت آباد اس کا پایۂ تخت بنا (۱۳۴۷ء)۔ بہمنی سلطنت کے جنوب میں دو بھائیوں ہری ہر اور بکا نے ایک خود مختار ریاست کی بنیاد ڈالی جو وجے نگر کے نام سے مشہور ہوئی۔ بہمنی سلطنت کی جس وقت بنیاد پڑی، سلطان گجرات میں طغی کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا۔ طغی نے متعدد لڑائیوں میں شکست کھائی لیکن وہ ہر موقعہ پہ جان بچا کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوا۔ گجرات سے بھاگ کر وہ سندھ میں آیا اور یہاں کے حاکم نے جس کا لقب جام تھا اس کو پناہ دی۔ سلطان بھی اس وجہ سے سندھ آیا اور کچھ دنوں ٹھٹھہ میں قیام کرنے کے بعد فوج لے کر طغی کے خلاف روانہ ہوا ابھی وہ منزل مقصود پہ پہنچا بھی نہ تھا کہ یکایک اس کی وفات واقع

Marfat.com

ہو گئی (مارچ ۱۳۵۱ء)[1]

سلطان کا کردار

محمد بن تغلق نہایت فاضل شخص تھا، کم از کم سلاطین دہلی میں دوسرا کوئی حکمران اس جیسا عالم نہیں تھا۔ برنی نے اس کے کمال علم و فضل پر کئی صفحے لکھے ہیں، طب میں اس کو ایسی مہارت تھی کہ اکثر اطبا سے بحث کر کے ان کو قائل کر دیتا۔ خوش تقریر ایسا تھا کہ اگر دن بھر بھی اس کی تقریر کوئی سنتا تو ناگوار نہیں معلوم ہوتی نظم نثر دونوں اچھی طرح لکھ سکتا تھا، فلسفہ اور منطق سے خاص طور پر دلچسپی تھی، باوجود اس کے نہایت خوش عقیدہ اور باعمل مسلمان تھا۔[2] عدل و انصاف کا اس قدر دلدادہ تھا کہ قاضی کی عدالت میں جواب دہی کے لئے خود جاتا، بلکہ ابن بطوطہ کے قول کے مطابق ایک مرتبہ تو قاضی کے حکم سے سلطان کے ۲۱ کوڑے لگائے گئے۔ اس کی اخلاقی زندگی بھی بے داغ تھی لیکن باوجود ان خوبیوں اور بلند کرداری کے محمد بن تغلق کے بعض منصوبے عوام کی تکالیف کا سبب ہوئے وہ جو بھی اصلاح کرتا وہ خلوص نیت پر مبنی ہوتی اور اس کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود ہی ہوتی تھی لیکن جب وہی طبقے جن کی بھلائی کے لئے اصلاح جاری کی جاتی اس کی مخالفت کرتے تو قدرتاً سلطان کو برا معلوم ہوتا وہ جن لوگوں کو قصوروار سمجھتا ان کو سخت سزائیں دیتا ان

---

[1] سلطان محمد بن تغلق نے عاشورہ محرم کا روزہ رکھا تھا روزہ افطار کر کے مچھلی کھائی جو موافق نہ آئی، بیمار ہو گیا اور ۲۱ محرم ۷۵۲ھ کو وفات پائی۔

[2] تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد محمد بن تغلق پر فلسفہ کا اثر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور اس کا ایمان متزلزل ہو گیا تھا، لیکن جلد ہی وہ سنبھل گیا اور پھر ساری عمر وہ راسخ العقیدہ مسلمان رہا اس کا ذکر ہم کو صرف سلطان کے خود نوشتہ حالات کے ان چند صفحات میں ملتا ہے جو اتفاق سے ایک مخطوطے کے ساتھ ملے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ عمدہ کتاب ان چند صفحات کے علاوہ دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔

Marfat.com

سزاؤں کی وجہ سے لوگ اس کو ظالم کہتے اور اس کا اثر اس پر بہت خراب پڑتا اور اسے اس کو غصہ آتا۔ آخر زمانہ میں سلطان اور بعض لوگوں کے درمیان بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہوگیا جس کو ختم کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ برنی کو اس نے ایک روز مشورہ کے لئے بلایا اور دریافت کیا کہ اس کی کیا رائے ہے، برنی نے رائے دی کہ سلطان کو تخت سے دستبردار ہو جانا چاہئے، کیونکہ ان حالات میں ازمنہ ماضیہ کے سلاطین نے بھی یہی طریقہ کار اختیار کیا ہے، سلطان کو یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ اس کی پالیسیوں اور سیاست کا اثر مملکت کے بعض حصوں میں بغاوتوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ دکن، گجرات اور بنگال کے علاقے خودمختار ہو گئے۔

سلطان فیروز شاہ
۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ء

سلطان محمد بن تغلق کے بعد عمائدین سلطنت نے اس کے چچا زاد بھائی فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ فیروز شاہ کو تخت پر بٹھانے میں علماء و مشائخ کی کوشش کو بھی دخل تھا۔ محمد بن تغلق کی غیر متوقع وفات نے شاہی کیمپ میں ایسے حالات پیدا کر دئے تھے جس سے ملک میں انتشار پیدا ہو سکتا تھا۔ مسئلہ کی پیچیدگی میں اس وجہ سے اور بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ سلطان مرحوم کے کوئی لڑکا نہ تھا جس کو بغیر کسی دقت کے تخت پر بٹھلایا جاتا۔ اس لئے عمائدین دربار کے علاوہ دینی رہنماؤں نے بھی فیروز کو حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش کی۔ فیروز کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت حلم و بردباری تھی۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ اس میں اس قدر قوی تھا کہ وہ سلطنت کے مفاد کو بھی بعض اوقات قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ وہ امن کا حامی تھا اور صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا تھا۔ تخت نشین ہونے پر اس نے [illegible] کی خود مختار ریاستوں کو تسلیم نہیں کر لیا بلکہ بنگال اور سندھ کے حاکموں کو بھی کسی حد تک نیم خود مختار رہ جانے کی اجازت دیدی۔ بنگال پر اس نے دو مرتبہ حملہ کیا۔ پہلی دفعہ ۱۳۵۳ میں اور دوبارہ ۱۳۵۹ء میں۔ اس کی افواج کے لئے دوبائی فوجوں کے مقابلہ میں مکمل فتح حاصل

Marfat.com

کرنا ناممکن نہیں تھا، لیکن اس خیال سے کہ لڑائی میں انسانی جانیں کثرت سے تلف ہو رہی تھیں اس نے لڑائی بند کردی اور بنگال کا الحاق کئے بغیر واپس آ گیا۔ سندھ کے حکمران جام بابنیہ کے خلاف اس کی فوج کو مکمل کامیابی ہوئی، وہ گرفتار کر لیا گیا اور دہلی لایا گیا۔ اس موقعہ پر بھی فیروز نے یہ اعلان کیا کہ اس کو نہایت افسوس ہے کہ اس کی وجہ سے اتنی جانیں ضایع ہوئیں، مسلم و غیر مسلم مورخوں کی بہت بڑی تعداد نے فیروز شاہ کی نرم اور صلح جو پالیسی کی تعریف کی ہے۔

فیروز شاہ کی اصلاحات

فیروز شاہ فتوحات کے سلسلے میں تو کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کر سکا لیکن اس نے بہت سی ایسی اصلاحات جاری کیں جن سے عوام کو بہت فائدہ پہنچا اور ان کی خوش حالی میں اضافہ ہوا۔ بعض مورخوں کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ فیروز شاہ کی فتوحات لڑائی کے نہیں امن کے میدان میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اصلاحات کے سلسلے میں اس نے جو اقدامات کئے ان کا مختصر ذکر ہم کو فتوحات فیروز شاہی میں مل جاتا ہے۔ یہ رسالہ خود سلطان کی تصنیف ہے اور کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ فیروز شاہ کی خواہش تھی کہ اس کی حکومت شریعت اسلامی کے مطابق ہو۔ یوں تو اسلامی حکومت کے ہر دور میں قانون شریعت جاری تھا لیکن بعض اوقات سلاطین ان قوانین کی تاویلیں کر کے اپنی مرضی کے مطابق ضوابط جاری کر دیتے تھے[1] اس سلسلہ میں ٹیکسوں کا مسئلہ بہت اہم ہے، قرآن مجید

[1] مثال کے طور پر سلطان علاءالدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو کا حوالہ دیا جا سکتا ہے دوران گفتگو میں قاضی نے سلطان کو بتلایا کہ کون کون سے ضابطے جو اس نے جاری کئے ہیں شرع کے خلاف ہیں سلطان کو بالآخر یہ کہنا پڑا کہ اس نے جو کچھ کیا خلق اللہ کی بھلائی کے لئے کیا۔ یہ گفتگو بہت اہم ہے اور اس کا مطالعہ بہت غور سے کیا جانا چاہئے۔

Marfat.com

میں بہت کم ٹیکسوں کا ذکر ہے، حکومتوں کو ان کے علاوہ بہت سے اور ٹیکس لگانے پڑتے تھے۔ سلاطین دہلی نے مختلف اوقات میں یہ نئے ٹیکس لگائے تھے، ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اسلام کی روح کے خلاف تھے، یہی سبب تھا کہ فیروز شاہ نے خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ میں نے تیئیس ۲۳ ایسے محصول اور ابواب منسوخ کئے جو شریعت کے خلاف تھے، ان کی منسوخی سے حکومت کو جو مالی نقصان ہوا اس کو پورا کرنے کی غرض سے سلطان نے چند ذرائع آمدنی نکالے۔ اسی سلسلہ میں آبپاشی کا نیا انتظام عمل میں لایا گیا۔ اس منصوبہ کے تحت تقریباً ڈیڑھ سو کنوئیں کھدوائے اور چار بڑی نہریں نکالیں، ان میں سے ایک نہر تو بہت عرصہ استعمال ہوتی رہی۔ ان نہروں سے حصار اور فیروز آباد کے نئے شہروں کو جو اسی نے تعمیر کرائے تھے پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ وہ علاقہ جو بالکل بے کار پڑا تھا اور جہاں گھاس کا پتہ بھی نظر نہ آتا تھا اب زیر کاشت آ گیا اور آباد ہو گیا۔ نہروں اور کنوؤں سے صرف زیر کاشت رقبہ میں ہی اضافہ نہیں ہوا، بلکہ لوگوں کو اور سہولتیں بھی ملیں اس کے علاوہ حکومت کی آمدنی کافی بڑھ گئی۔ پانی مہیا ہو جانے کے بعد سلطان نے تقریباً بارہ سو باغ لگوائے۔ ان سے بھی حکومت کو مالی فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ نے بہت سے کام ایسے کئے جن سے عوام کو آرام بھی پہنچا تھا اور ان کو تفریح کے مواقع بھی مل جاتے تھے۔ اس نے کئی شہر اور بہت سے قصبات تعمیر کرائے جن میں فیروز آباد نزد دہلی، فتح آباد، حصار، فیروز پور اور جونپور قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر کا نام اس نے اپنے پیشرو سلطان محمد بن تغلق کے بچپن کے نام یعنی جونا خان پر رکھا تھا۔ فیروز شاہ کو فن تعمیر سے بھی دلچسپی تھی۔ اس نے متعدد عمارتیں بنوائیں اور بعض کی مرمت کرائی۔ اس کا محل اور قلعہ جو آج تک کوٹلہ فیروز شاہ کے نام سے مشہور ہے اور بیرون شہر دہلی واقع ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس فن نے سلطان کی سرپرستی میں بہت ترقی کی۔ اس نے مہاراجہ اشوک کے دو مینارے جو ایک ہی پتھر کے تراشے گئے تھے بہت فاصلے سے لا کر دہلی میں نصب کرائے[1]۔ اشوک کے میناروں کو ان دونوں کے

۱؎ ایک مینار جمنا کے کنارے خضر آباد میں تھا اور دوسرا میرٹھ کے علاقہ میں اس زمانہ میں اتنے بھاری

باوجود دہلی لانا، سلطان فیروز شاہ کے پاکیزہ مذاق کا ایک بین ثبوت ہے۔

سلطان کو بے روزگار اور غریب لوگوں کی بہت فکر تھی، کوتوال شہر ان کی رپورٹ سلطان کے سامنے پیش کرتا تھا اور وہ ان کو روزگار بہم پہنچا کر یا کسی دوسرے طریقہ سے ان کی معاش کا انتظام کرتا تھا۔ فیروز شاہ نے باقاعدہ ایک علیحدہ محکمہ قایم کیا تھا جو دیوان خیرات کہلاتا تھا۔ یہاں سے غریب لڑکیوں کی شادی کا سامان اور جہیز کا انتظام بھی کیا جاتا تھا، بیماروں کی بھی نگہبانی اور علاج کے لئے حکومت کی طرف سے ہسپتال بنا دئے گئے تھے۔ یہ دار الشفاء کہلاتے تھے۔ محمد بن تغلق کے زمانہ میں صاحب مسالک الابصار کے بیان کے مطابق دہلی کے شہر میں بہت زیادہ ہسپتال تھے فیروز شاہ نے بھی ایک بہت بڑا دار الشفاء تیار کرایا۔ سلطان فیروز شاہ علم دوست اور علماء کی بہت سرپرستی کرتا تھا، اس نے جو مدارس وغیرہ قایم کئے ان کا تفصیلی ذکر کسی اور مقام پر اس کتاب میں آئیگا۔

اس کے پاس ایک لاکھ اسی ہزار غلام تھے، جن کو وہ غلاموں کی طرح نہیں رکھتا تھا بلکہ ان کو مختلف فنون سکھلائے جاتے تھے اور جو جس کام کی صلاحیت رکھتا تھا اسی کی تربیت اس کو دی جاتی ان میں سے بعض نہایت قابل ثابت ہوئے اور بہت ممتاز عہدوں پر ان کا تقرر ہوا، بعض نے تعلیم حاصل کی اور اپنی زندگیاں علم اور دین کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔

دور جدید کے بعض مورخوں نے فیروز شاہ پر اعتراض کیا ہے کہ وہ کمزور بادشاہ تھا ایک حد تک یہ تنقید صحیح ہے، لیکن سلطان کی امن پسندی اور لڑائی سے نفرت صرف کمزوری طبیعت ہی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس میں انسانی ہمدردی، حلم اور بردباری جیسی قابل تحسین صفات کو بھی دخل

---

۲۴ اور ایک پتھر سے تراشے ہوئے میناروں کو ایک جگہ سے لیجا کر دوسری جگہ نصب کرنے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا ان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، معاصر تاریخوں میں ان کے دہلی لائے جانے کا مفصل حال موجود ہے۔ بڑی احتیاط سے روئی کے فرش پر گرا کر ان کو ایسی گاڑیوں میں لادا گیا جن میں بیلوں کی بڑی تعداد تھی وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

تھا، اور یہ واقعہ ہے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کے لئے ان اوصاف میں کمال حاصل کرنا سخت مزاجی اور جنگجوئی کے مظاہرے سے زیادہ مشکل ہے، اس کی پالیسی کے نتیجہ میں وسعت سلطنت تو ضرور کم ہو گئی لیکن اس کی اکثر اصلاحات عوام کی خوش حالی اور بہبودی کی غرض سے جاری کی گئی تھیں اور اس مقصد میں سلطان کو پوری کامیابی ہوئی، اگر کسی حکمران کی کامیابی کا اندازہ لگانے کے لئے وسعت سلطنت اور جنگی فتوحات کے علاوہ اور کوئی چیز بھی معیار ہو سکتی ہے تو یقیناً فیروزشاہ ہماری تحسین و ستائش کا مستحق ہے۔

امیر تیمور کا حملہ ۱۳۹۸ء

سلطان فیروزشاہ کے بعد تغلق خاندان کا زوال شروع ہو گیا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے جانشین کمزور اور نااہل تھے، اسی دور انحطاط میں امیر تیمور نے برصغیر پر حملہ کیا، تیمور ایک ترکی سردار کا لڑکا تھا، وہ سمرقند کے قریب ایک گاؤں میں ۱۳۳۶ء میں پیدا ہوا، تینتیس سال کی عمر میں وہ چغتائی ترکوں کا سردار تسلیم کر لیا گیا، اس کے بعد اس نے قرب و جوار کے علاقوں پر حملے شروع کئے اور ان کو فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا، ۱۳۹۸ء میں اس نے برصغیر پر حملہ کی تیاری کی، اپنی مجلس مشورت میں اس نے لوگوں کو بتلایا کہ وہ یہاں کے غیر مسلموں سے جہاد کر کے غازی بننا چاہتا ہے لیکن یہ صرف جوشیلے اور جاہل مسلمانوں کو جنگ کے لئے تیار کرنے کی تدبیر تھی، ورنہ تیمور خوب جانتا تھا کہ برصغیر پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت ہے اور ان کے خلاف جہاد نہیں کیا جا سکتا بہرحال ۱۳۹۸ء کا موسم گرما شروع ہونے سے قبل وہ سمرقند سے روانہ ہوا اور ستمبر میں دریائے سندھ کو عبور کر کے دہلی کی طرف بڑھا، راستہ میں اس نے کئی سرداروں کو شکستیں دیں اور بہت سا مال و اسباب اور غلام جمع کر لئے، دسمبر میں وہ دہلی کے قریب لونی کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ دہلی کی فوج نے تیموری لشکر کے عقب پر حملہ کیا، اس کو شکست ہوئی لیکن اس حملہ کا خوفناک نتیجہ یہ ہوا کہ تیمور نے اپنے ایک لاکھ ہندوستانی قیدی غلاموں کو قتل کرا دیا کیونکہ حملہ کے وقت انہوں نے خوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ تیمور کے اس جابرانہ اقدام کو پسندیدہ نظر سے کوئی بھی

Marfat.com

نہیں دیکھے گا۔ لیکن ہم یہ بات بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ لڑائی کے دوران یہ قیدی دہلی کی فوج سے مل کر تیمور کو سخت مشکل میں ڈال سکتے تھے، ایک لاکھ انسانوں کو چند گھنٹوں میں تلوار سے قتل کرنا سہل نہ تھا، اس لئے اس نے حکم جاری کیا کہ لشکر میں جس کے پاس بھی ہندوستانی غلام بطور قیدی کے ہیں وہ ان کو خود قتل کرے اور بعض ایسے لوگوں کو بھی انسانی خون بہانا پڑا جنہوں نے کبھی بھیڑ بکری بھی ذبح نہ کیا ہوتا۔ لڑائی میں دہلی کی فوج کو شکست ہوئی۔ تغلق سلطان رات کے وقت گجرات کی طرف بھاگ گیا، تیمور نے دہلی میں دربار کیا اور شہر کو لوٹا بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور کثیر دولت جمع کر کے پہلی جنوری ۱۳۹۹ء کو واپس ہو گیا۔ دہلی سے واپسی پر میرٹھ ہوتا ہوا وہ ہردوار پہنچا، وہاں سے جموں آیا۔ یہاں ایک اور دربار منعقد کیا، خضر خان کو جو ملتان کا حاکم تھا اور تیمور کے ساتھ ہو گیا تھا اپنا نائب مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ تیمور کے حملہ نے سلطنت دہلی کو جو خود کمزور ہوتی جا رہی تھی نیم مردہ کر دیا جس سے مختلف علاقوں کے حاکموں اور سرداروں کو بغاوت کر کے خود مختار ریاستیں قایم کرنے کا موقع مل گیا۔

سید اور لودی خاندان

خضر خان نے آخری تغلق سلطان کو شکست دے کر ۱۴۱۴ء میں اپنی حکومت قائم کر لی، اس خاندان میں خضر خان کے بعد تین بادشاہ اور ہوئے، چونکہ خضر خان سید تھا اس لئے مورخ ان کو سید سلاطین ہی لکھتے ہیں، خضر خان کی وفات پر اس کا بیٹا سید مبارک ۱۴۲۱ء میں تخت پر بیٹھا، اس نے تیرہ سال حکومت کی لیکن یہ زمانہ زیادہ تر بغاوتیں فرو کرنے میں صرف ہوا، ۱۴۳۴ء میں اس کو ایک سردار نے سازش کر کے قتل کر دیا، اس کے بعد اس کا بھتیجا سید محمد تخت نشین ہوا۔ اس کا بیٹا اور جانشین سید علاء الدین عالم شاہ اپنے باپ سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوا، اس کو بدایوں کا شہر اس قدر پسند تھا کہ دہلی کو اپنے وزیر حمید خان کے ہاتھ میں چھوڑ کر اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حمید خان نے ایک پٹھان سردار بہلول لودی کو پنجاب سے بلا کر فوج کی سرداری سپرد کر دی تھی، بہلول اور حمید خان میں جلد ہی جھگڑا ہوا

Marfat.com

اور آخر کار بہلول نے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اور عالم شاہ کو اطلاع کر دی، آخر الذکر نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خوشی سے اپنی سلطنت اس کو دیدی اور خود بدایوں میں خاموش زندگی بسر کرنے لگا۔

بہلول نے اڑتیس سال ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۹ء حکومت کی، اس کے سامنے بہت اہم اور مشکل مسائل تھے، سلطنت دہلی کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور اس کے علاقوں میں بہت سی خود مختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں، ان ہی میں جونپور کی ریاست بھی تھی جو شرقی سلطنت کہلاتی تھی۔ بہلول کو سلاطین جونپور سے کئی سال تک لڑنا پڑا لیکن آخر میں وہ کامیاب ہوا، جونپور پر اس کا قبضہ ہو گیا اور وہاں کا حکمران سلطان حسین شاہ مجبور ہو کر بہار کی طرف بھاگ گیا، سلطان بہلول لودی نے اپنے بڑے بیٹے باربک شاہ کو جونپور کا حاکم مقرر کیا اور خود دہلی واپس آ گیا ۱۴۸۹ء میں جب وہ گوالیار کے حملہ سے واپس آ رہا تھا تو ضلع ایٹہ کے ایک گاؤں میں بیمار پڑا اور وفات پا گیا۔ بہلول نے سلطنت دہلی کے مردہ جسم میں جان ڈالی اس کو بہت سی لڑائیاں لڑنا پڑیں لیکن ان کے بغیر وہ ان علاقوں کو جو سلاطین دہلی کے ہاتھ سے نکل گئے تھے واپس نہیں لے سکتا تھا، بہلول قابل، جفاکش اور سادہ مزاج سلطان تھا وہ شاہانہ شان و شوکت پسند نہیں کرتا تھا حتی کہ تخت پر بھی نہیں بیٹھتا تھا بلکہ اپنے سرداروں اور مشیروں کے ساتھ فرش پر ہی بیٹھ کر کام کرتا۔ بہلول کی وفات پر اس کا دوسرا بیٹا نظام سکندر شاہ کے لقب کے ساتھ تخت پر بیٹھا، باربک شاہ نے اس کو بادشاہ تسلیم نہیں کیا، دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی جس میں باربک شاہ کو شکست ہوئی، سکندر نے اس کو جونپور کا حاکم دوبارہ مقرر کر دیا، سکندر لودی کو بھی اپنے باپ کی طرح بہت سی لڑائیاں لڑنا پڑیں حسین شاہ سے جو اب بہار کا بادشاہ تھا بنارس کے قریب لڑائی ہوئی حسین شاہ کو شکست ہوئی اور سکندر لودی نے بہار کا علاقہ سلطنت دہلی میں شامل کر لیا۔ سکندر لودی کو وسط ہند اور راجپوتانہ کے ہندو راجاؤں سے بھی لڑنا پڑتا تھا اس لئے اس نے اپنا دارالحکومت

Marfat.com

دہلی سے آگرہ تبدیل کیا، آگرہ کو رونق دیکر اس نے بہت بڑا شہر بنا دیا، سکندر کو افغان سرداروں کی خود سری بھی ختم کرنا پڑی۔ بہلول کے طریقہ کار نے ان لوگوں کو بہت مغرور اور سرکش بنا دیا تھا، چنانچہ سکندر نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ سخت برتاؤ کرنا چاہئیے، انہوں نے مخالفت کی مگر آخر میں سلطان کو کامیابی ہوئی۔ سکندر نے ۱۵۱۷ء میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا ابراہیم تخت پر بیٹھا، ابراہیم نا اہل نہیں تھا لیکن افغان امراء سے اس کے تعلقات اچھے نہ رہ سکے۔ ان ہی میں سے ایک نے بابر کو کابل سے بلایا۔ بابر نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں افغانوں کو شکست دیکر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

Marfat.com

باب پنجم

عہدِ سلطنت میں معاشرہ و ادب

مسلمانوں کی فتوحات اور حکمرانی کی مفصل تاریخ یہاں بیان نہیں کی جاسکتی، تاہم ان کی اصلاحات کا تفصیلی ذکر کرسکتے ہیں۔ اس مختصر کتاب میں ان اہم موضوعات کے چند نمایاں اور مخصوص پہلوؤں کے ذکر پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ بہرحال ان مختصر اشارات کی بنیاد پر بھی تاریخ کا طالب علم ہماری تمدنی اور ثقافتی زندگی کی ایک تصویر تیار کرسکتا ہے اور یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسلام نے برصغیر ہند و پاکستان کو کس حد تک متمدن اور مہذب بنایا اور اس سلسلے میں یہاں کے لوگوں کو اس کا کس درجہ ممنون ہونا چاہیے۔

ورودِ اسلام سے پہلے برصغیر کی سیاسی زندگی طوائف الملوکی کا شکار ہو چکی تھی۔ مہا اشوک کے چند سالوں کو چھوڑ کر کسی وقت بھی برصغیر میں ایک سیاسی نظام جاری نہیں ہو سکا، یہی نہیں بلکہ ہزارہا برس گذر جانے کے باوجود آریائی یا کوئی دوسری تہذیب سارے برصغیر کو اپنے زیر سایہ نہ لا سکی تھی آریائی تہذیب سے بھی اس کا ایک حصہ ہی متاثر ہوا بارھویں صدی کے نصف آخر میں برصغیر کے مختلف حصوں میں بہت سی خود مختار ریاستیں تھیں، سماجی زندگی میں بھی اخوت اور مساوات کے جذبات کبھی کارفرما نہیں رہے تھے۔ آریائی تہذیب کی بنیادیں تقسیم ذات پر رکھی گئی تھیں جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ذلت کی

Marfat.com

پابندیاں سخت ہوتی گئیں. بدھ مت ذات پات کے خلاف تھا اس کی اشاعت سے اس نظم کو زبردست صدمہ پہنچا تھا اور ایک زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ لوگوں کو ان جکڑ بندیوں سے چھٹکارا مل جائے گا، لیکن برہمنوں نے اپنا مذہب اور اقتدار قائم رکھنے کے لئے بدھ مت کا مقابلہ کیا، دونوں کی یہ کشمکش صدیوں تک جاری رہی، اور بالآخر ہندو بدھ مذہب پر غلبہ پانے میں کامیاب ہو گئے آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کے حملہ کے وقت ہم کو سندھ وغیرہ کے علاقوں میں بدھ مذہب کے پیرو کافی تعداد میں ملتے ہیں لیکن سلطان محمود اور معز الدین کی ساری لڑائیاں ہندوؤں کے خلاف لڑی گئیں، ان واقعات کی بناء پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ آٹھویں اور بارہویں صدی کے درمیان بدھ مت کے ماننے والے ہی نہیں بلکہ ان کی تہذیب و تمدن کے آثار بھی تقریباً ختم کر دئے گئے تھے، برہمنی اقتدار کے مظالم کی تاریخ جن کے نتیجہ میں بدھ مذہب کا تقریباً خاتمہ ہو گیا، ابھی مکمل طریقہ پر مرتب نہیں ہو سکی ہے یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر تحقیق کی ضرورت ہے. بہرحال قیام سلطنت کے وقت سارے برصغیر میں ہندو مذہب کا دور دورہ تھا اور برہمنی اقتدار اپنے عروج کے نقطۂ کمال پر پہنچ چکا تھا، شمالی ہند و پاکستان میں اکثر ریاستوں کے حکمران خاندان راجپوت تھے لیکن ہندو سماج میں برہمنوں کی حیثیت سب سے اعلیٰ تھی۔

اسلام اور ہندو تہذیب

برہمنی اقتدار اور تقسیم ذات کی سخت گیر پابندیوں نے ہند و پاکستانی سماج کی جن روایات کو مقدس اور مستحکم بنا دیا تھا ان میں سے اکثر اسلامی تعلیمات اور مسلم اقوام کے نظریات سے مختلف تھیں. یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب جو قدیم زمانہ سے اس کا عادی ہو چکا تھا کہ باہر سے آنے والی فاتح قوموں کو اپنے اندر ضم کرنے کے لئے اپنے اصولوں اور روایتوں میں تبدیلی اور لچک پیدا کرے، اس طریقہ کار کو مسلمانوں کے خلاف کامیاب نہ بنا سکا، مثلاً برصغیر میں آنے والی اکثر قومیں جو خود شرک اور بت پرستی کے عقیدے پہلے ہی سے رکھتی تھیں اس کے لئے آسانی سے تیار ہو گئیں کہ ان کے دیوتا

Marfat.com

اور سوم کو ہندو دیوتاؤں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے اور وہ ہندو کہلانے لگیں۔ اصنام پرست معاشروں میں مختلف گروہوں اور قبیلوں بلکہ مختلف خاندانوں کے مخصوص دیوتا ہوتے ہیں اور خاص خاص مورتیاں مخصوص مندروں میں موجود رہتی ہیں اور خود لوگوں کے گھروں میں بھی مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرنے والوں میں وجہ اشتراک صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسرے دیوتاؤں کی مخالفت نہ کریں اور ان کی پرستش کے راستہ میں حائل نہ ہوں۔ برخلاف اس کے مسلمان صرف موحد ہی نہ تھے بلکہ ان کی عبادت کی بنیاد بھی اجتماع پر تھی۔ ہر مسلمان کے لئے ضروری تھا کہ روزانہ پانچ وقت نماز باجماعت ادا کرے، تنہائی میں نماز کی ادائگی رخصت استثنیٰ کی حیثیت رکھتی تھی اور چونکہ اسلام نے دینی اور دنیوی امور کو دوسرے معاشروں کی طرح زندگی کے دو علیحدہ اور غیر متعلق پہلو قرار نہیں دیا ہے بلکہ انسان کے لئے ایک ایسا مکمل اور جامع قانون حیات پیش کیا ہے جو روحانی اور مادی زندگی پر یکساں حاوی ہے اس لئے مسلمانوں کا تصور حیات ہندوؤں کے بنیادی نظریات سے بالکل مختلف تھا۔ ہندو مسلمان کسی غیر شعوری یا غیر محسوس طریقہ پر ایک معاشرہ میں ضم نہیں ہو سکتے تھے اس مسئلہ پر ہماری تاریخ کا فیصلہ بالکل واضح ہے۔ جو قومیں یہاں بحیثیت فاتح آئیں اور یہیں رہنے لگیں ان میں آریہ، سیتھین اور یونانی قابل ذکر ہیں یہاں آباد ہونے کے بعد یہ ختم ہو گئیں، اور آج اہل یا لٹریچر کے علاوہ کسی کا نام بھی باقی نہیں یہ خود تو ختم ہو گئیں لیکن ان کے بہت سے دیوتا ہندو دیوتاؤں کی فہرست میں شامل کر لیے گئے یہی سبب ہے کہ اتنے دیوتا کسی اور مذہب کے پاس نہیں جتنے ہندوؤں کے پاس ہیں۔

اسلامی معاشرہ

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے۔ جہاں بھی مسلمانوں کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا وہاں مبلغین بھی سیاسی [illegible] سے پہلے یا بعد میں پہنچ گئے۔ ابتدا میں تو یہ طریقہ اسی گروہ کے مسلمان [illegible] انفرادی [illegible] تھے۔ بعد میں علماء اور [illegible] کی زیادہ [illegible] ذمہ داری [illegible] جب مکمل ہو گیا تو علماء [illegible] افراد [illegible] درس و تدریس [illegible]

تصنیف وتالیف میں مصروف ہو گئے، لیکن صوفیاء نے دنیوی علائق سے خود کو یکسر علیحدہ رکھا۔ یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ بعض غیر مسلم مصنفین اور چند مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ وہ ترک دنیا اور رہبانیت کے قائل تھے، یہ ایک ایسا الزام ہے جس کو تاریخی شواہد سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ چند مثالیں مل بھی جائیں تو تمام گروہ پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ یا تو مسلمانوں کو روحانی تعلیم وتربیت دیتے یا غیر مسلموں میں تبلیغ کرتے اور غور سے دیکھا جائے تو دونوں کام بہت اہم تھے، ہند پاکستان میں سیاسی اور فوجی رہنماؤں نے اشاعت اسلام میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، ان کو خیال تھا کہ ایسے ملک کے حکمرانوں کو جہاں کی آبادی میں غیر مسلموں کی تعداد بہت زیادہ ہو مذہب کے معاملات میں دلچسپی کا اظہار زیادہ نہیں کرنا چاہئے، مسلم حکومتوں کی اس رواداری کا مقابلہ کمپنی کی حکومت سے کیا جا سکتا ہے مسلمانوں کے نظام حکومت میں کوئی محکمہ تبلیغ مذہب کے لئے علیحدہ نہ تھا لیکن کمپنی نے یہ محکمہ قائم کیا۔ یہاں یہ بحث ضروری نہیں کہ مسلم حکمرانوں کا یہ خیال کس حد تک درست تھا لیکن ان کی اس پالیسی کا معاشرہ پر بہت گہرا اثر پڑا، تبلیغ کا کام تقریباً صوفیاء ہی کے ذمہ ہو گیا اس لئے ہم کو تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ پاکستان میں اسلامی معاشرہ پر تصوف کا رنگ ہمیشہ بہت گہرا رہا اور ہر طبقہ کے لوگ صوفیاء کے سلسلوں میں سے کسی نہ کسی سے متعلق ہوتے رہے مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور تعمیر میں بہت بڑا حصہ صوفیاء کا ہے، صوفیاء کے بعد علماء اور ادباء آتے ہیں، علماء میں تو بعض نے درس وتدریس کے علاوہ تبلیغی خدمات بھی انجام دیں، لیکن معاشرہ پر ادباء کا اثر صرف ان کی تصانیف کے ذریعہ ہوا۔

تشکیل معاشرہ میں جو عوامل کارفرما رہے ہیں ان کا جائزہ لیتے وقت ہم اس چیز کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس عمارت کی تعمیر میں یہاں کے رسم ورواج آب وہوا، علوم و فنون، غرض کہ پورے ماحول کا بھی اثر ہونا لازمی تھا۔ آرٹ، ادب، زبان، رہنے سہنے کے

Marfat.com

طریقے، روزانہ کی زندگی سے متعلق رسم و رواج میں ہم مقامی روایات کا اثر پاتے ہیں، اور یہ ایک فطرتی امر ہے، ایک دلچسپ پہلو اس مسئلہ کا یہ بھی ہے کہ بعض مقامی روایات اور رسوم جو اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف ہیں، مسلمانوں کی سماجی زندگی میں داخل ہو گئیں اور دینی رہنماؤں کو ان کے روکنے کی کوشش کرنا پڑی۔ اس کوشش کی صحیح تصویر ہمارے سامنے اسی وقت آسکتی ہے جبکہ ہم تاریخ کے ہر دور میں اس پہلو کا مطالعہ کریں۔ علوم و فنون کی ترویج اور ترقی کا جائزہ بھی بہت ضروری ہے۔

سندھ میں ابتدائی دور کے علماء اور صوفیاء کرام

قطب الدین ایبک کو حکومت کرنے کا بہت مختصر موقع ملا، لیکن اسی مدت میں اس نے دینی خدمات اور علماء کی سرپرستی سے متعلق چند روایتیں قائم کیں جو بعد میں زیادہ مضبوط ہو گئیں، صاحب تاج المآثر کی سرپرستی کا ذکر کیا جا چکا ہے، ان کے علاوہ فخر مدبر بھی قابل ذکر ہیں، ان کا وہ رسالہ جو ڈینی سن روس نے تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کے نام سے شائع کیا ہے اس دور کے لئے اہم معلومات کا ماخذ ہے، بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ فتوحات اور قیام حکومت کے فوراً ہی بعد ان مسلمان فاتحین نے روحانی تربیت اور ظاہری تعلیم کے ادارے قائم کر دئے تھے، محمد بن بختیار خلجی سے متعلق طبقات ناصری کے الفاظ قابل غور ہیں:۔

"و چوں محمد بختیار آں مملکت (بنگال) را ضبط کرد .... مساجد و مدارس و خانقاہات در آں اطراف بہ سعی جمیل او و امرائے او بنا شد"[1]

قطب الدین کے دو داماد تھے، ناصر الدین قباچہ، سندھ و ملتان کا حاکم تھا اور التتمش دہلی کا، دونوں کے تعلقات مشائخ اور علماء سے بہت اچھے تھے اور یقینی طور پر دونوں ان حضرات

---

[1] طبقات ناصری

کے پند و نصائح اور روحانی تربیت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ ایک موقع پر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ ملتان میں موجود تھے کہ اس پر چنگیز خانی منگول حملہ آور ہوئے، قباچہ نے ان بزرگوں سے امداد کی درخواست کی۔ قطب صاحب نے اس کو ایک تیر دیا اور کہا کہ وہ لڑائی کے وقت برج پر سے اس کو دشمن کی افواج میں پھینکے، قباچہ نے حکم کی تعمیل کی اور دشمن پر اس کو فتح ہوئی۔ بعد میں جب قطب صاحب ملتان سے روانہ ہونے لگے تو قباچہ نے روکنا چاہا، آپ نے جواب دیا کہ ہم کو دہلی جانا ضروری ہے اور ملتان کے لئے شیخ بہاء الدین زکریا کافی ہیں۔ ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ قباچہ اور التتمش میں اختلافات تھے۔ وہ التتمش کے خلاف کوشش کر رہا تھا، شیخ بہاء الدین زکریا التتمش کی حکومت کو بہتر اور ضروری خیال کرتے تھے چنانچہ انہوں نے اس کو قباچہ کی حرکتوں کی اطلاع دینے کے لئے خط لکھا، یہ خط قباچہ کے ہاتھ آ گیا، اس نے شیخ کو بلا کر دریافت کیا تو آپ نے انتہائی بے نیازی سے جواب دیا کہ یہ خط حق کی خاطر لکھا گیا ہے، قباچہ کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ کچھ کہتا، اس نے کھانا منگوایا، شیخ نے کھانے میں شرکت کی، اس پر قباچہ شرمندہ ہوا اور عزت کے ساتھ شیخ کو رخصت کیا۔[1]

قباچہ فضلاء و شعراء کی بھی سرپرستی کرتا تھا، اس کا وزیر عین الملک اس سے بھی زیادہ اپنی علمی سرپرستی کے لئے مشہور ہے، اس زمانہ میں منگولوں کی غارت گری کے نتیجہ میں اسلامی ممالک سے علماء و فضلاء اپنے قدیم وطنوں سے بھاگ کر برصغیر میں آنا شروع ہو گئے تھے قباچہ کے دربار میں ان کی پذیرائی ہوتی تھی۔ محمد عوفی، منہاج الدین سراج، شمس الدین محمد بلخی افضلی ملتانی اور ضیاء الدین سنجری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عوفی نے پہلے لب الالباب لکھی اور بعد میں عین الملک کی خواہش پر جوامع الحکایات تصنیف کی۔ اس کی تکمیل سے پہلے ہی قباچہ وفات

---

[1] دیکھو سیر الاولیاء ص ۵۰ مانبزم مملوکیہ ۳۷۳

پا گیا اور عوفی دوسرے فضلاء کی طرح التتمش کے دربار میں آگیا یہیں یہ کتاب مکمل ہوئی، قباچہ کے عہد کی ایک اور دلچسپ تصنیف چچ نامہ ہے یہ درحقیقت ایک عربی تاریخ کا فارسی ترجمہ ہے، جو محمد بن علی بن ابی بکر کوفی نے اس زمانہ میں کیا، اصل عربی کتاب نایاب ہے اور چچ نامہ (فارسی) نے اصل تصنیف ہی کی حیثیت حاصل کرلی ہے، مصنف نے اس کا نام فتح نامہ رکھا تھا لیکن زیادہ مقبول نہ ہوا[۱]۔ دوسرے مقامات کی طرح سندھ میں بھی کافی درسگاہیں قائم ہوئیں، طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج کو ابتداء میں قباچہ نے مدرسہ معزی سپرد کیا تھا، بعد میں ایک اور عالم مولانا قطب الدین کاشانی اپنے وطن ماوراء النہر سے آئے تو ان کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔

التتمش اور مشائخ

التتمش کی زندگی کا ابتدائی زمانہ بخارا اور بغداد میں گذرا تھا، یہاں چشتیہ و سہروردیہ سلسلوں کے بزرگ اور بہت سے علماء موجود تھے، التتمش کو ان حضرات کی خدمت کا موقع ملا تھا اور مستند کتابوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی بزرگوں نے اس کو دعائیں بھی دی تھیں، خواجہ معین الدین چشتیؒ، اوحد الدین کرمانیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا ذکر خاص

---

[۱] چچ نامہ میں بعض غیر معتبر روایتیں بھی شامل کرلی گئی ہیں، مثلاً محمد بن قاسم کی موت کا افسانہ کہ اس کو خلیفہ نے اس وجہ سے قتل کر دیا کہ جب داہر کی لڑکیاں خلیفہ کی حرم میں لائی گئیں تو انہوں نے خلیفہ سے کہا کہ محمد بن قاسم نے پہلے ہی ان کو خراب کر دیا ہے۔ اس پر خلیفہ کو غصہ آیا اور اس نے محمد بن قاسم کو قتل کرا دیا۔ قتل کے بعد لڑکیوں نے کہا کہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا کیونکہ وہ اس طرح محمد بن قاسم سے اپنے باپ کی شکست کا بدلہ لینا چاہتی تھیں، یہ قصہ اسر غلط ہے اور معلوم نہیں کہ چچ نامہ کے مصنف کو کہاں سے ملا۔ چچ نامہ کا انگریزی ترجمہ ۱۹۰۰ء میں قلیچ بیگ فریدون نے شائع کیا اور فارسی متن ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر داؤد پوتہ نے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ اس کا اردو اور سندھی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

Marfat.com

طور پر کیا گیا ہے، فوائد الفواد میں حضرت نظام الدین اولیاء کی مندرجہ ذیل روایت موجود ہے:-

"او خدمت شیخ شہاب الدین سہروردی را و شیخ اوحد کرمانی را رحمتہ اللہ علیہم دریافتہ بود و یکے ازیں ہا گفتہ بود کہ تو پادشاہ خواہی شد"[1]

تخت نشینی کے بعد بھی التتمش کو مشائخ سے عقیدت رہی اور ان میں سے بعض سے اس کے قریبی تعلقات کا ذکر مختلف تذکروں اور ملفوظات میں کیا گیا ہے۔ کچھ واقعات ہمعصر تاریخوں میں بھی ملتے ہیں، خواجگان چشت سے اس کی وابستگی مسلمہ ہے، گنج الاسرار کی روایت کے مطابق خواجہ عثمان ہارونیؒ ۶۱۲ھ میں دہلی تشریف لائے تو اس نے مرید ہونے کی درخواست کی، آپ نے اس کو کچھ تعلیم دی اور خواجہ معین الدینؒ سے فرمایا کہ سلوک اور پند و نصائح پر مشتمل ایک رسالہ تیار کریں، چنانچہ آپ نے یہ رسالہ تحریر فرمایا اور التتمش کو بھیج دیا لیکن گنج الاسرار کو خواجہ صاحب کی تصنیف ماننے میں احتیاط ضروری ہے اس میں بعض اندرونی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بعد کی تصنیف ہے بہر حال یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات کاتب اور قارئین قدیم تصانیف میں بغیر ذکر کئے ہوئے اضافہ کر دیتے تھے خواجہ عثمان ہارونی کی دہلی تشریف آوری کا ذکر ہمعصر ماخذ میں نہیں ملتا اگرچہ فرشتہ نے تاریخ محمد قند ہاری کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے، یہ یقیناً صحیح ہے کہ خواجہ معین الدینؒ التتمش پر مہربان تھے، سیر الاولیاء میں ان کی دہلی میں تشریف آوری کا ذکر ہے۔ اگرچہ وہ ایک نجی کام سے آئے تھے، ان کے لڑکوں کے پاس اجمیر میں ایک گاؤں تھا، مقامی حکام ان کو پریشان کر رہے تھے، خواجہ صاحبؒ دہلی اس غرض سے تشریف لائے کہ بادشاہ سے اس سلسلہ میں ضروری احکامات جاری کرا دیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر التتمش جیسا نیک سیرت بادشاہ تخت دہلی پر جاگزیں نہ ہوتا تو وہ تشریف نہ لاتے، جاتے وقت خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو اپنے ہمراہ لے جائیں، لیکن قطب صاحب سے دہلی کے

---

[1] فوائد الفواد (لکھنؤ ایڈیشن) ص ۲۱۲

لوگوں کو اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ ایک بڑی جماعت مع التمش کے خواجہ صاحب کے پاس آتی اور "بہ اضطراب و زاری می نمودند" یہ دیکھ کر خواجہ صاحب نے قطب صاحب کو واپس جانے کی اجازت دیدی اور فرمایا "روا ندارم کہ چندین دلہا خراب و کباب باشند۔ برو این شہر را در پناہ تو گذاشتیم"[1]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے التمش کو بے حد عقیدت تھی اور بعد کے بعض تذکروں میں تو کہا گیا ہے کہ وہ قطب صاحب سے بیعت تھا۔ یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو سکتی ہے لیکن بہرحال اس میں ذرا شک نہیں کہ اس کی عقیدت اس قدر گہری تھی جیسی ایک مرید کی پیر سے ہوتی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ التمش کے اخلاق و کردار اور اس کی حکومت کے اطوار اور حکمت عملی پر آپ ہی کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا۔ فوائد السالکین میں جو قطب صاحب کی تصنیف بتائی جاتی ہے سلطان کی اس عقیدت کا متعدد بار ذکر آیا ہے۔ ان بزرگوں کی صحبت اور تربیت نے التمش کو نہایت ہی متقی مسلمان بنا دیا تھا۔ وہ راتوں کو عبادت کرتا اور اس وقت شاہی لباس اتار کر معمولی کپڑے پہن لیتا تھا۔ اس واقعہ کی طرف فوائد الفواد میں اشارہ موجود ہے۔

"بعد ازاں عقیدہ او (یعنی التمش) حکایت فرمود کہ شبہا بیدار بودے
و ہیچ کس را بیدار نکردے"[2]

شیخ نظام الدین اولیاء نے جہاں بھی التمش کا ذکر کیا ہے ایسے الفاظ کہے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں سلطان کی عزت اور محبت تھی۔ مثلاً اس کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا[3]

بہ سال شش صد و سی و سہ بود کہ از ہجرت × شہنشاہ جہاں شمس دین و التمش

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۵۔۵۴

[2] فوائد الفواد ص ۲۱۳

[3] سیر الاولیاء ص ۵۶

Marfat.com

سلطان التمش علم و فضل کے علاوہ فن تعمیر سے بھی دلچسپی رکھتا تھا، اس کی تعمیرات میں حوض شمسی اور قطب مینار سب سے زیادہ مشہور اور قابل ذکر ہیں، ان دونوں کی تعمیر اس کی عقیدت مندی ہی کی بدولت ہوئی، اس کی خواہش تھی کہ ایک بڑا تالاب تیار کرائے[1] اسی زمانہ میں اس نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ایک گھوڑے پر سوار ہیں اور اس کو ہدایت فرما رہے ہیں کہ اس جگہ بڑا تالاب بنوائے جہاں آپ کے گھوڑے نے ٹھوکر ماری تھی، ارشاد نبوی کی تعمیل میں حوض شمسی تیار کرایا گیا۔ قطب مینار جو دنیا کے بلند ترین میناروں میں ہے اور فنی حیثیت سے بے نظیر سمجھا جاتا ہے خواجہ قطب الدینؒ کے نام نامی پر بنایا گیا تھا، بعض لوگوں نے یہ غلط روایت تسلیم کرلی ہے کہ مینار کا تعلق قطب الدین ایبک سے ہے، حقیقتاً یہ مینار ۱۲۳۲ء یعنی ایبک کی وفات کے چھبیس[2] سال بعد تعمیر ہوا۔ قطب صاحب کا انتقال دسمبر ۱۲۳۵ء میں ہوا، جنازہ تیار ہونے پر خواجہ ابو سعید نے کہا کہ:

> "حضرت قطب نے وصیت کی تھی کہ ہمارے جنازہ کا امام ایسا شخص ہو جو عفیف رہا ہو اور عصر کی سنتیں اور فرائض نماز کی ادائگی میں تکبیر اولیٰ اس سے ترک نہ ہوئی ہو۔"

اس اعلان پر کچھ دیر تامل کرنے کے بعد التمش سامنے آیا اور کہا کہ وہ اپنی نمازوں کی نمائش نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن قطب صاحب کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے، پھر نماز جنازہ پڑھوائی یہ روایت خزینۃ الاصفیاء میں موجود ہے۔

مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہوگا کہ مشائخ و علماء سے عقیدت اور ان کی تربیت نے

۱؎ بدایوں میں بھی التمش نے اپنے زمانہ میں ایک تالاب بنوایا تھا جو حوض شمسی کہلاتا ہے
دیکھو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۳ ص ۲۴۴

۲؎ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۳ ص ۵۵

Marfat.com

التمش کے کردار کو مکمل طور پر اسلامی رنگ میں رنگ دیا تھا، یہ واقعہ ہند پاکستان کی سماجی و ثقافتی تاریخ میں بہت اہم ہے، اس لئے کہ التمش پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے سلطنت دہلی کے نظم مملکت کی تشکیل کی اور اس کو استحکام بخشا، اس میں شک نہیں کہ اس نے بعض نئے علاقے بھی سلطنت میں شامل کئے لیکن اس کا حقیقی کارنامہ یہ تھا کہ سارے شمالی ہند پاکستان کو ایک نظم کے تحت لایا اور انتظام سلطنت کی جزئیات کو صحیح خطوط پر قائم کر کے ان کو مستحکم کیا، اگر التمش یہ کام نہایت خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دے چکا ہوتا تو منگولوں کے متواتر حملوں اور یورشوں کے سامنے سلطنت کا شیرازہ بکھر جاتا۔ اس کا جو پہلو ہمارے موضوع کے لحاظ سے خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ نظم مملکت کی بنیاد کا اسلامی شریعت اور شعائر اسلام پر قائم ہونا ہے۔ سلاطین برائے نام تو مطلق العنان تھے اور رہے لیکن یہ مطلق العنانی شریعت کی حدود کے اندر رہتی۔ یہ صحیح ہے کہ فارسی زبان کے رواج کی بدولت بعض ایرانی تصورات اور رسوم کا اثر بعض سلاطین کے کردار اور پالیسی میں نظر آتا ہے لیکن اس کی حیثیت مستثنیٰ کی ہے۔

التمش کے بعد کئی سلطان تخت پر بیٹھے جس کے بیٹے ناصر الدین کی سادگی اور دیانتداری کے بہت سے واقعات کتابوں میں پائے جاتے ہیں، سلطنت کے کاموں سے فرصت کے وقت وہ کلام اللہ لکھا کرتا تھا اور بقول ضیاء الدین برنی "بیشتر نفقہ خود از وجہ کتابت مصحف ساختی"[1] عصامی نے تو اس سے زیادہ بڑھ کر یہ کہا ہے "بدے محترز داشتی از بیت المال"[2] اس کی احتیاط یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنے لکھے ہوئے قرآن پر نام اس غرض سے نہیں لکھتا تھا کہ لوگ یہ معلوم کرنے کے بعد معمول سے زیادہ قیمت دے دیں گے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کسی امیر کو

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶

[2] فتوح السلاطین ص ۱۵۶

Marfat.com

کہ سلطان کا لکھا ہوا قرآن ہے تو اس نے زیادہ قیمت دیدی، اس خبر سے سلطان کو صدمہ ہوا۔[1] ناصر الدین کے ہمعصر مشائخ میں سب سے بڑے بزرگ خواجہ فریدین گنج شکرؒ تھے ایک مرتبہ سلطان نے اوچھ اور ملتان کا سفر کیا تو آپ کی قدمبوسی کا قصد کیا ..... لیکن بلبن نے کہا کہ سلطان کا لشکر بہت ہے اور پاک پٹن کے قریب پانی کی کمی ہے اس لئے بجائے خود جانے کے سلطان اس کو شیخ کی خدمت میں بھیجدے، اس ترکیب سے بلبن شیخ کی خدمت میں خود جانا چاہتا تھا، بہرحال سلطان نے ایک فرمان جس میں چار گاؤں شیخ کو پیش کئے تھے اور کچھ نقد روپیہ بطور نذرانہ بھیجا، شیخ نے روپیہ قبول کر لیا کہ فقراء میں تقسیم کر دیا جائے گا البتہ گاؤں کے لئے کہا کہ ان کے خواہش مند بہت سے لوگ ہیں ان کو دے جائیں۔[2]

بلبن کے عہد میں دینی و علمی زندگی

تخت نشینی سے پہلے بلبن بقول برنی "بہ شراب خوردن و مجلس آراستن مشہور بود" لیکن سلطنت کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد اس کی زندگی میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی چنانچہ برنی ہی لکھتا ہے:۔

در طاعت و عبادت و صیام و نفل و قیام	طاعت و عبادت، نفلی روزے اور شب بیداری
شب مبالغہ مودوبہ مواظبت جمعہ و جماعت	میں بہت بڑھ گیا، نماز جمعہ، نماز با جماعت
و نماز اشراق و چاشت و اوابین و تہجد بگیاگی	نماز اشراق و چاشت، اوابین اور تہجد کی

---

[1] سبحان رائے، خلاصۃ التواریخ مطبوعہ دہلی ۱۹۱۸ء [2] صاحب سیر الاولیاء نے یہ روایت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ بلبن اس وقت سلطنت کی خواہش رکھتا تھا اور شیخ کی خدمت میں اسی لئے حاضر ہوا تھا کہ شاید وہ کچھ دعا فرما دیں، ملاقات کے وقت بلبن کے دل میں قدرے بے چینی سی تھی، شیخ نے اس کو دور کرنے کے لئے یہ اشعار پڑھے تھے:۔ فریدوں فرخ فرشتہ نبود ۔ ز عود و ز عنبر سرشتہ نبود
ز داد و دہش یافت این نیکوئی ۔ تو داد و دہش کن فریدوں توئی
دیکھو سیر الاولیاء ص ۷۹-۸۰

Marfat.com

میل کرد و شبہائے مواسم تمامی شب قیام کردے و اوراد در سفر و حضر از و فوت نہ شدے[1]

طرف یکایک مائل ہو گیا، مواسم کی راتوں میں ساری رات جاگتا اور اس کے اوراد نہ سفر میں قضا ہوتے نہ حضر میں۔

تاریخ فیروز شاہی کے صفحات میں اور بھی دلچسپ بیانات اس کے متعلق پڑھے جا سکتے ہیں اگر اس کے لڑکوں میں سے کوئی ایک وقت کی بھی نماز ترک کر دیتا تو وہ ایک مہینہ تک اس سے بات نہ کرتا، معلوم ہوتا کہ اور لوگوں نے نماز کی ادائگی میں غفلت برتی ہے تو دربار میں اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔ اس کو علماء سے اس قدر لگاؤ تھا کہ "بے حضور علماء دست بہ طعام نہ بردے" ان سے کھانا کھاتے وقت ان کے مسائل دریافت کرتا، لیکن یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ صرف ان ہی علماء کی عزت کرتا تھا جو صاحب کردار ہوتے اور بد دانشمندان حیلہ گو و بد آموز کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ بعض علماء مثلاً مولانا برہان الدین بلخی کے مکان پر خود حاضر ہوتا اور نماز جمعہ کے بعد بزرگوں کے مزارات پر حاضری دیتا[2]۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶ [2] بلبن کے عہد کے دوسرے علماء اور فضلاء میں مندرجہ ذیل حضرات قابل ذکر ہیں:۔

علامہ نجم الدین عبدالعزیز بن محمد دمشقی امام رازی کے شاگرد تھے۔ شیخ سراج الدین ابوبکر بن یوسف سنجری، مولانا شرف الدین۔ مولانا برہان الدین کا شمار بڑے فقہا میں تھا۔ مولانا کمال الدین زاہد حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے استاد تھے۔ شیخ شمس الدین خوارزمی دہلی کے اکثر علماء کے استاد تھے اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے بھی استاد تھے لیکن ان کا اس قدر لحاظ کرتے تھے کہ اگر دو گھڑی درس میں ناغہ کرتے تو جب وہ دوبارہ آتے تو مولانا یہ شعر پڑھتے: آخر کم از آنکہ گاہ گاہے آئی [illegible]

(سیر الاولیاء ص ۲۳۰؟)

بلبن نے ان کو مستوفی الملک مقرر کیا اور شمس الملک کا خطاب دیا۔

Marfat.com

بلبن کی پابندیٔ شریعت کے متعلق نظام الدین احمد نے لکھا ہے کہ "اوامر و نواہی را کما ینبغی رعایت نمودے"[1] دوسرے مورخوں نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ موجودہ زمانہ کے بعض مصنفین[2] نے بلبن کے "تصور بادشاہی" پر بہت کچھ لکھا ہے، اس کا سبب برنی کے وہ صفحات ہیں جن میں اس نے بلبن کے دربار کی شان و شوکت اور دبدبہ کا بہت مفصل حال لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بلبن کی حکومت میں بعض ایرانی روایات پر عمل کیا گیا اور شاہزادوں وغیرہ کے نام بھی ایرانی مشاہیر کے ناموں پر رکھے گئے، لیکن اس کی ان باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دینا مناسب نہیں، شان و شوکت کے لحاظ سے بلبن کا دربار عباسی خلفاء کے درباروں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ناموں کے معاملہ میں بھی اس کا طریقہ کار قابل اعتراض نہیں کہا جا سکتا۔ بعض مورخین نے اسلامی تہذیب میں ایرانی عنصر کی اہمیت کا ذکر مبالغہ آمیز الفاظ میں کیا ہے، خود مسلم مصنفین بھی عباسی اور دوسری حکومتوں پر تنقید کرتے ہیں۔ اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے بہت سی بدعات اسلام میں داخل کر دیں، بعض کج فہم اور تاریخ سے نابلد لوگ تو اس حد تک بڑھ گئے کہ محدثین کو بھی اسی طبقہ میں شمار کرتے ہیں، جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے وہ تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی اکثر خوبیاں دوسری اقوام سے لے لی گئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بنیادی مسائل اور تعلیمات میں ہر جگہ کے مسلمانوں نے سنت رسول ہی کو قائم رکھا، ہاں فروعات میں مقامی رواج اور دوسری چیزیں انہوں نے اختیار کیں۔ ایک بات ضرور کھٹکتی ہے یعنی نسب پر انتہائی زور دینا، اس کے متعلق بھی ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اعلیٰ نسبی ذریعہ ملازمت تو تھی لیکن اس سے عدل و انصاف پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا بلکہ بلبن کی زندگی کے ایسے واقعات محفوظ ہیں جبکہ اس نے انتہائی غریب اور ادنیٰ طبقہ کے مظلوموں کی دادرسی کے سلسلہ میں اعلیٰ ترین

---

[1] طبقات اکبری ص ۹۴

[2] مثلاً دیکھو خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (ندوۃ المصنفین دہلی) ص ۱۷۸-۱۷۹

Marfat.com

حلقہ کے امراء کو سخت سزائیں دیں۔ تیرھویں صدی میں تعلیم بہت محدود تھی اور زیادہ تر لوگ غیر تعلیم یافتہ ہوتے تھے یا کم از کم بہت معمولی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ تقرری کے وقت نسب کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا کیونکہ خاندانی روایات اور ماحول انسانی کے کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ تعلیم کا رواج بھی اعلیٰ خاندانوں ہی تک محدود تھا۔ بلبن نے اس پر یقیناً ضرورت سے زیادہ زور دیا لیکن نسب و خاندان کا لحاظ دوسرے حکمران بھی کرتے تھے۔ ہندوستان میں یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ ذات نے لوگوں کو آبائی پیشے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تقسیم ذات کا اصول تو یہاں کے مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا، مگر آبائی پیشہ کو جاری رکھنے کا طریقہ ان میں اسلام قبول کرنے کے بعد بھی قائم رہا بلکہ ایک حد تک اب بھی ہے۔ ان حالات میں حکمرانوں کا یہ خیال کہ کسی شخص کو عہدہ یا ذمہ داری سپرد کرتے وقت اس کے نسب کو نظرانداز نہ کیا جائے کوئی تعجب خیز بات نہیں۔

بلبن کو شعراء و ادباء سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کہ مشائخ و علماء سے تھی۔ وہ شعراء کو انعام وغیرہ تو دیتا تھا لیکن شعراء کے مقابلہ میں اس کے تعلقات علماء سے زیادہ تھے۔ سلطان کی اس کمی کو اس کے بیٹوں نے پورا کر دیا۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ شہزادہ سلطان محمد جب ملتان گیا تو وہ اپنے ہمراہ جن شعراء و ادباء کو لے گیا ان میں امیر خسرو و حسن سنجری[1] قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شمس دبیر اور قاضی اثیر اس عہد کے دو مشہور شاعر تھے ان میں موخرالذکر کے حالات مل سکے ہیں اور نہ کلام۔ مولانا شمس سنام کے رہنے والے تھے۔ وہ سلاطین دہلی کے دربار یعنی سرکاری ملازم ہو گئے تھے اس لئے ان کا نام [illegible] لکھا جاتا ہے۔ وہ بابا فرید گنج شکرؒ کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی۔ ابتدا میں ان کو تنگی [illegible] بسر کرنا پڑی۔ اس کا ذکر انہوں نے بابا صاحب سے کیا۔ آپ نے دعا فرمائی اور یہ بادشاہ دہلی کے

---

[1] ان کے حالات آگے بیان کئے گئے ہیں۔

Marfat.com

بیٹے ناصرالدین بغراخاں کے دبیر مقرر ہوتے [1] بغرا خاں جب دہلی سے سامانہ کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تو شمس دبیر اس کے ساتھ گئے۔

طغرل کی بغاوت فرو کرنے کی غرض سے بلبن جب بنگال گیا تو بغرا خاں، شمس دبیر اور امیر خسرو بھی اس کے ساتھ تھے۔ طغرل کی شکست کے بعد بغرا خاں کو بنگال کا حاکم مقرر کیا گیا اس موقع پر بلبن نے اپنے بیٹے کے لئے جو پند و نصائح لکھوائے وہ شمس دبیر ہی نے لکھے تھے [2] بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد تخت دہلی پر بیٹھا، اس کی اور اس کے باپ بغرا خاں کی جو بنگال میں خود مختار ہو گیا تھا، تاریخی ملاقات کے موقع پر شمس دبیر بھی موجود تھے، امیر خسرو کی اسی وقت ان سے ملاقات ہوئی جس کا ذکر انہوں نے اعجاز خسروی (رسالہ سوم) میں کیا ہے شمس دبیر واپس بغرا خاں کے ساتھ لکھنوتی چلے گئے، رخصت ہونے سے پہلے بقول امیر خسرو انہوں نے دیوان خاص کہ نظمش از نثر و شعر سخن می گوید، یادگار بہ کاتب سپرد۔ لیکن آج ان کے کلام میں صرف وہ قصیدہ ملتا ہے جو انہوں نے بغرا خاں کی تعریف میں لکھا تھا عبدالقادر بدایونی نے اس کو اپنی تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے [3] سیر الاولیاء میں ان کا ایک شعر نقل کیا گیا ہے [4]

آہ سرشتہ من اشک مرا در دل گفت
خیز با ببے تو برون رو کہ گذر یافتہ

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۲۷ - ۱۲۸

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۹۵

[3] دیکھو منتخب التواریخ جلد اول ص ۹۳

[4] سیر الاولیاء ص ۹۲

Marfat.com

مشائخ سہروردیہ

سلطنت دہلی کے ابتدائی دور میں جن مشائخ نے معاشرہ کی اصلاح اور دین کی تبلیغ کی ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے خلیفہ شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی شخصیتیں نمایاں طور پر پیش کی گئی ہیں۔ تیرہویں صدی میں چشتیہ سلسلہ کے علاوہ ایک اور سلسلہ کے بزرگوں نے بھی یہ خدمات انجام دیں۔ برصغیر میں سہروردیہ سلسلہ کے بانی حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتانی تھے۔ قلعہ کوٹ کروڑ میں سنہ ۱۱۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ بارہ سال ہی کے تھے کہ ان کے والد شیخ وجیہہ الدین کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد بہاء الدین زکریا خراسان چلے گئے اور وہاں سے بخارا آ گئے۔ ان مقامات میں کئی سال تک رہ کر انہوں نے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ بعدہٗ مدینہ منورہ میں پانچ سال روضہ اقدس پر مجاوری کی اور شیخ محمد یمنی سے جو حدیث کے بہت بڑے عالم تھے حدیث کی سند لی۔ مدینہ سے واپسی میں وہ بغداد آئے اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ شیخ کی ہدایت پر وہ اپنے وطن واپس آئے اور یہیں اپنی خانقاہ قائم کی جو تھوڑے ہی عرصہ میں رشد و ہدایت کا بہت بڑا مرکز ہو گئی۔ ملتان کے جنوب و مغرب کے علاقوں میں سہروردیہ سلسلے کے بزرگوں کا اثر بہت زیادہ تھا۔[1] شیخ بہاء الدین کا سلسلہ ان کے بیٹے اور پوتے اور بعض خلفاء سے آگے بڑھا۔

---

[1] خزینۃ الاصفیاء میں ایک روایت درج ہے کہ ایک قوال پاک پٹن سے ملتان جا رہا تھا۔ اس نے بابا فرید گنج شکرؒ سے درخواست کی کہ اس کے لئے دعا فرمائیں کہ سفر میں کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ شیخ نے کہا کہ فلاں موضع تک کا علاقہ ہم سے متعلق ہے وہاں سے آگے شیخ بہاء الدین زکریا کا علاقہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ حضرات اپنے مقررہ علاقوں میں کام کرتے تھے۔ دیکھو خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۲۲۔

Marfat.com

ان سے پہلے عراقی کے مرید ہونے کا دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔

فخرالدین عراقی، شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے تھے، علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد انہوں نے ہمدان میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، ایک مرتبہ چند قلندر انکے مدرسہ میں آئے، عراقی ان میں سے ایک خوش رو جوان کے حسن صورت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مسند درس کو چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو لئے اور انہی کی وضع قطع اختیار کر لی، قلندروں کی یہ جماعت ملتان پہنچی اور سہروردیہ خانقاہ میں مقیم ہوئی، شیخ بہاءالدین نے عراقی کو جو اُن کے مرشد کے خواہرزادہ تھے، اس بلا سے نجات دلائی، انہوں نے ان کو بلا کر اپنے سینہ سے لگایا جس کا اثر یہ ہوا کہ عراقی کا دل خدا کی طرف پھر گیا، وہ شیخ سے بیعت ہوئے اور ان کی ہدایت سے عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اب ان کی حالت اتنی بہتر ہو گئی کہ شیخ بہاءالدین نے اپنی صاحبزادی کی ان سے شادی کر دی، اس کے بعد عراقی حج بیت اللہ کے لئے گئے، وہاں سے فارغ ہو کر وہ قونیہ چلے گئے۔ وہاں ان کو شیخ صدرالدین قونوی خلیفہ شیخ ابن العربی کی خدمت میں کچھ عرصہ تک رہنے کا موقع ملا، اس زمانہ میں انہوں نے اپنی لمعات تصنیف کی۔ صوفیا کی تصانیف میں یہ کتاب ایک مقام رکھتی ہے، عراقی کی غزلیں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، ان کی ایک غزل بہت مشہور ہے جس کا مطلع و مقطع یہ ہیں ؎

نخستین بادہ کاندر جام کردند ز چشم مست ساقی وام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش عراقی را چرا بدنام کردند

مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں کہ یہ غزل بحالت وجد کہی گئی تھی۔ جس پر خانقاہ کے دوسرے لوگوں نے اعتراض بھی کیا تھا، مگر شیخ بہاءالدین نے فرمایا کہ عراقی کے لئے یہ باتیں درست ہیں اور مقطع کو تو بہت پسند کیا۔[1]

---

[1] نفحات الانس، نولکشور ایڈیشن ص ۵۲۴۔

شیخ بہاء الدین کے بیٹے شیخ صدر الدین عارف اپنے والد محترم کی وفات (۶۶۶ھ) کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ ان کی بزرگی اور زہد کے بہت سے واقعات سیر العارفین اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔ ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ سلطان بلبن کا بیٹا سلطان محمد جس زمانہ میں ملتان کا حاکم تھا تو اس نے اپنی بیوی کو جو التمش کی پوتی تھی غصہ میں طلاق دیدی، بعد میں وہ اس حرکت پر نادم ہوا اور چاہتا تھا کہ اس کو دوبارہ نکاح میں لائے لیکن قاضی نے اس کو بتلایا کہ جب تک پہلے اس کی شادی کسی اور سے نہ ہو اور پھر وہ اس کو طلاق نہ دے شہزادہ اس سے شادی نہیں کر سکتا، اس لئے قاضی نے جو سلطان محمد کا محرم راز بھی تھا یہ مشورہ دیا کہ وہ اس لڑکی کی شادی شیخ صدر الدین جیسے ملکوتی صفات بزرگ سے کرا دے اور بعد میں ان سے طلاق دلوا دے گا۔ ایسا ہی کیا گیا لیکن شیخ صدر الدین نے اپنی منکوحہ بیوی کو طلاق دینے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ اس پر سلطان محمد کو بہت طیش آیا اور اس نے شیخ کے ساتھ سختی کرنے کا ارادہ کیا، لیکن وہ اس ارادہ کو عملی شکل نہ دے سکا کیونکہ ملتان پر منگولوں نے حملہ کیا اور لڑائی میں شہزادہ بھی شہید ہو گیا۔ اس واقعہ کو لوگ شیخ صدر الدین کی کرامت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کی اہمیت یہ ہے کہ شیخ نے بلند کرداری کی ایسی ہی مثال پیش کی جیسی کہ ان کے والد بزرگوار نے قباچہ کے معاملہ میں کی تھی بلند کرداری کے یہ اعلیٰ نمونے لازمی طور پر معاشرہ کی اصلاح میں مدد دیتے تھے۔

شیخ رکن عالم

ابو الفتح شیخ رکن الدین اپنے والد بزرگوار شیخ صدر الدین عارف کی وفات (۶۸۴ھ) پر ان کے جانشین ہوئے اور کم و بیش پچاس سال تک مشعل ہدایت کا مرکز بنے رہے۔ شیخ رکن عالم کے تعلقات سلاطین دہلی سے بہت خوشگوار تھے اور معاصر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ لاتعداد حاجتمندوں کی عرضیاں سلطان وقت کے سامنے پیش کرتے اور ان کی ضروریات پوری کرا دیتے۔ وہ سلاطین کی پیش

Marfat.com

کی ہوئی رقوم قبول کر لیتے اور ان کو غربا پر تقسیم فرما دیتے۔ مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ شیخ رکن الدین دو مرتبہ علاؤ الدین خلجی کے عہد میں دہلی تشریف لائے، ہر مرتبہ سلطان نے آنے کے وقت دو لاکھ اور واپسی کے موقع پر پانچ لاکھ تنکہ نذر کئے۔ یہ رقوم آپ اسی روز فقراء میں تقسیم کر دیتے تھے[1]۔ شیخ رکن الدین کو شیخ نظام الدین اولیاء سے بے حد عقیدت و محبت تھی، ایک مرتبہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے عہد میں آپ دہلی تشریف لائے۔ مبارک شاہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے خلاف تھا اور چاہتا تھا کہ شیخ رکن عالم کو ان کا مدمقابل بنائے، اس کو اس کا صحیح اندازہ نہ تھا کہ ان دونوں بزرگوں میں کس قدر محبت اور خلوص تھا۔ شیخ رکن عالم دہلی میں داخل ہوئے تھے تو شیخ نظام الدین ان کے استقبال کے لئے حوض علائی تک گئے تھے۔ چنانچہ جب شیخ رکن عالم کی ملاقات سلطان سے ہوئی اور اس نے دریافت کیا کہ دہلی میں

---

[1] سیر العارفین ص ۱۴۲

[2] یہ امر قابل ذکر ہے کہ بالعموم چشتیہ سلسلہ کے مشائخ سیاسیات سے علیحدہ رہتے تھے اور شاہی درباروں میں بھی بہت کم جاتے تھے۔ خاص طور پر شیخ نظام الدین اولیاء تو اس میں بہت احتیاط کرتے تھے، قطب الدین نے ان کو زیر دستی طلب کرنا چاہا اور حکم بھیج دیا کہ اگلے مہینہ کی پہلی تاریخ کو وہ دربار میں ضرور حاضر ہوں، ظاہر ہے کہ حکم نہ ماننے کی صورت میں وہ شیخ کو سزا دینے کی نیت رکھتا تھا، شیخ کے خلفاء چاہتے تھے کہ وہ دربار میں چلے جائیں لیکن انہوں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ ہم نہیں جائیں گے۔ ان کی یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ قطب الدین کے غلام خسرو خاں اور اس کے ہندو ساتھیوں نے اس کو جبکہ وہ عین مستی کی حالت میں تھا قتل کر دیا۔ امیر خسرو تغلق نامہ (ص ۲۱) میں لکھتے ہیں سے

چون آن تاج سران را سر فگندند ⁂ وزان بالا بخاک اندر فگندند

میان صف ترکان خاست شورے ⁂ درآمد ہندوان را دست زورے

Marfat.com

سب سے پہلے آپ کا استقبال کس نے کیا تو شیخ نے جواب دیا یہاں کے بہترین شخص نے
اس جواب سے شیخ رکن عالم کا اشارہ شیخ نظام الدین اولیاء کی طرف تھا۔ آپ کی علالت کے زمانہ
میں بھی وہ دہلی ہی میں تھے چنانچہ شیخ کی نماز جنازہ بھی شیخ رکن عالم ہی نے پڑھائی تھی۔
ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق کی اچانک موت
کا قصہ مشہور ہے، وہ بنگال فتح کر کے واپس آیا تو اس کے استقبال کے لئے اس کے بیٹے نے
ایک کوشک دہلی سے قریب ہی افغانپور میں تیار کرایا، سلطان نے ان ہاتھیوں کی پریڈ کا حکم
دیا جو حال ہی میں اڑیسہ کی طرف سے لائے گئے تھے اور خود کھانا کھانے لگا۔ اس وقت شیخ رکن
عالم بھی شریک طعام تھے، آپ نے سلطان سے کہا کہ یہ عمارت بالکل نئی ہے اور گرنے کا خطرہ
ہے اس لئے آپ باہر آجائیں، سلطان نے کہا میں کھانا ختم کر کے آتا ہوں، شیخ نے اصرار کیا اور
خود چلے آئے، سلطان وہیں رہا اور جیسا کہ ہم کو معلوم ہے ہاتھیوں کی پریڈ سے مکان گر گیا
اور غیاث الدین مع چند ساتھیوں کے ملبہ کے اندر دب کر مر گیا۔[1] غیاث الدین کی طرح
اس کا بیٹا اور جانشین سلطان محمد بن تغلق بھی شیخ رکن عالم کی بے حد عزت کرتا تھا، ملتان

---

[1] یہ واقعہ سیر العارفین میں (ص ۱۴۴) موجود ہے، دوسری کتابوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔ مختلف روایات کی بنا پر بعض مورخین کو غلط فہمی ہو گئی ہے کہ محمد بن تغلق نے دانستہ یہ مکان اپنے باپ کو ختم کرنے کے لئے بنایا تھا۔ کچھ لوگوں نے برنی کے الفاظ کو غلط سمجھا ہے۔ وہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "صاعقہ بلائے آسمانی بر زمینیان نازل شد" بعض مورخین نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے کہ مکان پر بجلی گری تھی۔ راقم الحروف نے اس مسئلہ پر ایک مقالہ تحریر کیا جو [illegible] جرنل میں شائع ہو چکا ہے، مقالہ کا عنوان یہ ہے: "واز محمد بن تغلق اے پیراسائیڈ؟" اس مقالہ میں معاصر ماخذ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

Marfat.com

میں کشلو خاں نے علم بغاوت بلند کیا۔ محمد بن تغلق کو اس پر اس قدر طیش آیا کہ بغاوت فرو ہونے کے بعد اس نے حکم دیا کہ شہریوں کا قتل عام کیا جائے، لیکن جب شیخ رکن عالم ننگے پاؤں بادشاہ کے پاس آئے اور سفارش کی تو سلطان نے فوراً اپنا حکم واپس لے لیا۔ عصامی[1] نے اس واقعہ کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے۔

ابوالفتح شیخ زماں رکن دیں ؛ نگر بد مردان هفته عزلت گزیں
چو بشنید در شهر طوفان خون ؛ برهنه سر و پائے آمده برون
گشاده زبان شفاعت گری ؛ همی گفت شاها جهان پروری
بسے خون فشاندی درین بوم و بر ؛ ز تیغت گرفته جهان خون تر
بر اہل گنه، نزد اہل صفا ؛ پسندیده تر هست عفو از جزا
کنون دست وا از سیاست گری ؛ چو شد نوبت عفو و رسم آوری
چو بشنید آن شاه آفاق گیر ؛ شد از شیخ مشفق شفاعت پذیر
کبیر نکو نام را گفت شاه ؛ که دارند دست از اہل گناه

به یک بند بند اسیران تمام
گذارند مر غان عاجز ز دام

۷۳۵ھ میں شیخ رکن عالم کا انتقال ہو گیا، ان کے سلسلے کے بعض چند اور بزرگوں کا ذکر ضروری ہے۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت

ملتان کے بعد سہروردیہ سلسلہ کا دوسرا مرکز اچھ (پانچ دریاؤں کے سنگم یعنی پنج ند کے قریب ایک قصبہ) تھا۔ سب سے پہلے سہروردی بزرگ جو یہاں آئے سید جلال الدین شاہ میر سرخ

---

[1] فتوح السلاطین

Marfat.com

تھے، وہ بخارا کے رہنے والے تھے لیکن شیخ بہاء الدین زکریا کے خلیفہ تھے، سندھ میں آکر وہ بھکر میں مقیم ہوگئے، یہاں کے ایک رئیس سید بدر الدین بھکری نے اپنی بیٹی کی شادی ان سے کردی، اس پر مقامی لوگ ان سے حسد کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ مجبور ہوگئے کہ بھکر چھوڑ کر چلے جائیں چنانچہ ۱۲۴۴ء میں وہ اُچھ آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔[1] سید جلال الدین کے پوتے اور ہم نام جن کو کثیر السیاحت ہونے کے سبب[2] مخدوم جہانیاں جہاں گشت کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے سب سے بڑے اور مشہور شیخ تھے جلال الدین ۷۰۷ھ میں پیدا ہوئے اور اٹھتر سال کی عمر میں ۷۸۵ھ میں وفات پائی، وہ سہروردیہ سلسلہ میں اپنے والد اور شیخ رکن عالم سے بیعت تھے اور چشتیہ سلسلہ میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے، ان کے علاوہ اور بہت سے بزرگوں سے بھی فیض حاصل کیا۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں "او خلیفہ چہار دہ خانوادہ بود" مخدوم جہانیاں اپنے عہد کے بہت با اثر مشائخ میں تھے۔ تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں جن کا ذکر جستہ جستہ بعض تاریخ کی کتابوں اور تذکروں میں ملتا ہے اور آپ کے کردار اور تعلیمات کا بہت کچھ اندازہ ہم آپ کے ملفوظات[3] سے بھی لگا سکتے ہیں۔ سلطان محمد بن تغلق ان سے بہت عقیدت رکھتا تھا اس نے آپ کو شیخ الاسلام کا منصب اور سیوستان میں خانقاہ محمدی کی مسند عطا کی تھی۔ فیروز شاہ بھی آپ سے بے حد

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۱

[2] صاحب سیر العارفین نے مخدوم جہانیاں کہلانے کی یہ وجہ لکھی ہے۔ ایک دفعہ عید کے دن شیخ بہاء الدین کے مزار پر عیدی مانگی تو ان کو آواز آئی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو مخدوم جہانیاں کیا یہی تیری عیدی ہے ص ۱۵۰

[3] ان کا اردو ترجمہ الدر المنظوم فی ملفوظ المخدوم کے نام سے شائع ہوچکا ہے، شیخ عبدالحق نے اپنے ماخذ میں تاریخ محمدی کا بھی ذکر کیا ہے۔ سیر العارفین نے ایک اور کتاب مناقب قطبی کے حوالے سے بعض واقعات نقل کئے ہیں۔

Marfat.com

عقیدت رکھتا تھا، مخدوم صاحب کو کئی بار اس سے اس قدر لگاؤ تھا کہ ہر دوسرے تیسرے سلطان سے ملنے فیروزآباد (دہلی) آتے، سلطان ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ جب آپ واپس اُچ تشریف لیجاتے تو سلطان بالائے بام خانہ اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک آپ اس کی نظر سے اوجھل نہ ہوتے، جب وہ دہلی آتے تو لاتعداد اشخاص اپنی حاجات سے متعلق عرضیاں لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کرتے، آپ ان کو سلطان کے سامنے رکھ دیتے اور ان سب کی گذارشات منظور ہو جاتیں۔[1] مخدوم جہانیاں کے کردار کی بلندی کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، فیروزشاہ کے وزیر مقبول خان جہان تلنگی کو آپ سے عقیدت نہ تھی بلکہ وہ بدگمانی کرتا تھا۔ باوجود اس کے جب ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ اس کے بیٹے کو وزیر نے قید کر رکھا ہے اور اس پر بہت سختیاں کی جارہی ہیں، اس کی رہائی کی کوئی صورت نہیں تو مخدوم صاحب اس شخص کو لے کر وزیر کے مکان پر گئے، لیکن وزیر نے محل کے اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ میں تمہاری سفارش ہرگز نہیں سنوں گا بلکہ تمہارا منہ تک نہ دیکھوں گا، اور اب تم میرے در پر سفارش لے کر نہ آنا، لیکن شیخ پھر بھی اس کی سفارش کو گئے اور پھر ناکامی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ انیس مرتبہ آپ اسی طرح وزیر کے محل پر حاضر ہوئے آخری دفعہ اس نے کہلا کر بھیجا کہ ان کو شرم نہیں آتی کہ بار بار میرے دروازہ پر سفارش لے کر آتے ہیں حالانکہ میں منع کر چکا ہوں، مخدوم صاحب نے جواب کہلا کر بھیجا کہ اے محترم، ہر دفعہ میں سفارش کے لئے آتا ہوں تو داخل ثواب ہوتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ کسی صورت سے میں اس مظلوم کو آپ سے رہائی دلا دوں تاکہ آپ بھی داخل

---

[1] مخدوم جہانیاں کا سلطان فیروزشاہ پر کس قدر اثر تھا، اس کا اندازہ ہم اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں کہ فیروزشاہ نے جب سندھ پر حملہ کیا تو یہاں کے لوگوں سے اس کو سخت ایذا پہنچی، چنانچہ ان کو شکست دینے کے بعد وہ سزا دینا چاہتا تھا لیکن مخدوم صاحب کی سفارش پر اس نے یہاں کے سرداروں کو معاف کر دیا۔

Marfat.com

حسنات ہو جائیں، تلنگی پر اس کا بڑا اثر ہوا، وہ گردن میں رسی ڈال کر حاضر ہوا اور بیعت ہو گیا، اس نے بہت سا روپیہ آپ کی نذر کیا، یہ سب آپ نے اسی شخص کو دیدیا جس کی سفارش کے لئے آئے تھے۔

بابا فرید شکر گنجؒ اور چشتیہ سلسلہ کی اشاعت

چشتیہ سلسلہ کے پہلے دو بزرگوں کا ذکر کیا جا چکا ہے، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے خلیفہ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے ذریعہ اسلام کی اشاعت اور سلسلہ کی ترقی کا کام بہت تیزی کے ساتھ ہوا۔ بابا صاحب کے اجداد کا وطن کابل تھا، ان کے جد امجد قاضی شعیب برصغیر میں آئے اور ملتان کے قریب قصبہ کھوتوال کے قاضی مقرر ہو گئے، بابا صاحب اسی جگہ ۱۱۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں آپ جس مسجد میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی تشریف لائے۔ جب وہ دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو بابا صاحب بھی ان کی ہم رکابی میں گئے، راستہ میں خواجہ صاحب نے فرمایا کہ مسعود (بابا فرید کا ابتدائی نام یہی تھا) واپس جاؤ اور پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کرو، چنانچہ انہوں نے تعمیل ارشاد کی اور پانچ سال بعد تعلیم سے فراغت پا کر دہلی آئے اور بیعت سے مشرف ہوئے، کچھ مدت کے بعد یہ دیکھ کر کہ دہلی میں کثرت سے لوگ ان کے پاس آنے لگے اور ہجوم خلائق سے ان کی عبادات میں خلل واقع ہوتا ہے وہ مرشد سے اجازت لے کر ہانسی چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے لیکن اکثر دہلی آتے رہتے تھے اور ایسے ہی ایک موقع پر وہ اس وقت آئے جب کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ وہاں تشریف فرما تھے، خواجہ بزرگ نے ان کو دیکھ کر خواجہ صاحب بختیار کاکیؒ سے فرمایا: شہبازیست کہ خانوادہ درویشان منور سازد، یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی تھی۔ خواجہ قطب الدینؒ کی وفات پر وہ کھوتوال چلے گئے اور کچھ دنوں بعد اجودھن یعنی پاکپتن تشریف لائے اور آخر عمر تک وہیں قیام فرمایا۔ بابا صاحب کی خانقاہ کی بدولت یہ شہر جہاں کے لوگ زیادہ تر کج طبع، درشت مزاج و بد اعتقاد تھے، برصغیر کا ایک عظیم روحانی مرکز

Marfat.com

بن گیا، ابتدا ہی سے بابا صاحب اہل دنیا سے علیحدہ رہنا چاہتے تھے، لیکن ان کی ریاضت اور تقویٰ کی شہرت جلد ہی پھیلنے لگی، یہ ناممکن ہو گیا کہ لوگ ان کے پاس نہ آتے، اور ذکر کیا گیا ہے کہ سلطان ناصر الدین مع اپنے لشکر کے اودھرسے گذر رہا تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو لیکن بلبن نے کہا کہ وہ حاضر ہونا چاہتا ہے سلطان نے چند گاؤں کا فرمان اور کچھ زر نقد بطور نذرانہ بھیجا۔ آپ نے نقد لے کر درویشوں میں تقسیم کر دیا اور جاگیر قبول کرنے سے معذرت کر لی، بابا صاحب کے تقدس اور بلندی کردار کی شہرت برصغیر کے مختلف حصوں میں پھیلنے لگی اور بہایت کثرت سے لوگ آ کر بیعت ہونے لگے لیکن اس شہرت اور نذروں کی کثرت کے باوجود بابا صاحب کے زہد و تقویٰ میں کوئی فرق نہ آیا آپ کے فقر اور کرامات سے متعلق متعدد واقعات تذکروں میں منقول ہیں لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ کے تربیت یافتہ بزرگوں نے دین کی اشاعت اور روحانی تربیت کا سلسلہ بہت وسیع کر دیا۔ روحانی تربیت پر زور دینے اور اخلاق کی اصلاح کرنے کے علاوہ بابا صاحب ظاہری علوم کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے انکی اپنی تعلیم کا تذکرہ تو اوپر کیا جا چکا ہے، ہم کو یہ بیان بھی ملتا ہے کہ عوارف المعارف کا آپ درس دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایسے ہی موقع پر آپ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو آپ نے اس کا نام شہاب الدین رکھ دیا، لیکن آپ نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، ملفوظات کے دو مجموعے آپ سے منسوب ہیں مگر ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کا بیشتر حصہ بعد کا اضافہ شدہ ہے یہ شک بڑی حد تک صحیح ہے، اخلاق اور اوصاف انسانی پر آپ کس قدر زور دیتے تھے، اس کا اندازہ ان کی اس رباعی سے لگایا جا سکتا ہے ؎

در روز دوائے شخص بسیار کنی ⁂ گیرم کہ بہ شب نماز بسیار کنی

صد خرمن گل بہ سر یک خار کنی ⁂ تا دل نہ کنی ز خشم و کینہ خالی

Marfat.com

شیخ علاء الدین احمد صابرؒ اور اُن کا سلسلہ

بابا صاحب کے خلفاء نے چشتیہ سلسلہ کو برصغیر کے مختلف علاقوں میں مقبول بنایا، ان میں تین بزرگ قابلِ ذکر ہیں، شیخ جمال الدین ہانسوی سے ان کے مرشد کو اس قدر انسیت تھی کہ آپ ایک مدت تک ان کی وجہ سے ہانسی ہی میں مقیم رہے، بابا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شیخ جمال جمالِ ما است۔ آپ جس کو خلافت نامہ عطا فرماتے اس کو شیخ جمال الدین کے پاس بھیج دیتے۔ جس خلافت نامہ کو وہ چاک کر دیتے تو فرماتے کہ پارہ کردہ جمال را فرید نمی تواند دوخت۔ شیخ جمال نے ۶۵۹ھ میں وفات پائی، لیکن شیخ جمال الدین سے کہیں زیادہ یہ سلسلہ شیخ علاء الدین صابر اور شیخ نظام الدین اولیاء کے خلفاء اور معتقدین کے ذریعہ اشاعت پذیر ہوا۔

شیخ علاء الدین احمد کی زندگی کا زیادہ حصہ ضلع سہارنپور (بھارت) کے ایک قصبہ کلیر میں گذرا اور وہیں آپ کا مزار واقع ہے، شہری زندگی سے دور رہنے اور اہلِ دنیا سے زیادہ تعلقات نہ بڑھانے کی وجہ سے آپ کے سوانح حیات بہت کم قلم بند کئے گئے۔ ہمعصر تذکرۂ مشائخ یعنی سیر الاولیاء میں قطعاً ذکر ہی نہیں، شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بھی اس پر اظہارِ تعجب کیا ہے۔ سیر الاولیاء کے نام سے غلط فہمی ہوتی ہے کہ اس کے مصنف نے سب سلسلوں کے مشائخ میں سے انتخاب کیا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ انہوں نے ایک خاص ترتیب سے انتخاب کیا ہے اور اس انتخاب میں صابریہ سلسلہ کے مشائخ کو نظر انداز کیا ہے شاید ان کو مستند تحریری مواد دستیاب نہ ہوا اس لئے انہوں نے بھی کوئی مستند ذکر نہیں کیا لیکن چونکہ آپ کا سلسلہ بہت جلد پھیلنے لگا اس لئے متعدد روایات مشہور ہو گئیں انہی روایات کی بنیاد پر بعد کے تذکرہ نویسوں نے آپ کے حالات جمع کئے۔ ان تذکروں میں سیر الاقطاب مصنفہ شیخ الہدیہ اور معارف الولایت مولفہ غلام معین الدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، کرامات کے قصوں کے علاوہ جس کے متعلق یہ شک کیا جا سکتا ہے کہ بعد میں

Marfat.com

رواج پا گئے ہوں گے، بعض واقعات زندگی جو روائتیاں ان مصنفین تک پہنچے ان کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں، یقیناً یہ کتابیں شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد کی تصانیف ہیں لیکن روایات کو محفوظ رکھنے والے حضرات، مشہور ادبی اور تاریخی شخصیتیں تھیں، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ (جو سلاطین لودی کے ہمعصر تھے) اور علاءالدین صابرؒ کے درمیان اس سلسلہ کے سب بزرگ مشہور دینی رہنما تھے اور یقیناً یہی حضرات ان روایات کے بیان کرنے والے لوگوں میں شامل ہوں گے۔

شیخ علاءالدین، بابا صاحب کے خلیفۂ اعظم ہی نہیں بلکہ "علاوہ بران بہ نسبت فرزندی و خواہرزادگی ہم سرفراز بود" آپ کی عظیم المرتبتی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بابا صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرا ظاہری و باطنی علم شیخ نظام الدین کو ملا ہے، اور میرے پیران کبار کا علم علاءالدین صابر کو، ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میرا علم سینہ نظام الدین کو ملا ہے اور علم دل علاءالدین صابر کو، صاحب سیرالاقطاب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علاءالدین اوائل عمر ہی سے بے حد متقی اور پرہیز گار تھے، بابا صاحب نے اپنی خانقاہ کے لنگر کی تقسیم ان کے سپرد کر دی تھی، بارہ سال تک وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے لیکن خود ایک لقمہ بھی اس لنگر میں سے نہ کھایا، صرف اس لئے کہ بابا صاحب نے یہ اجازت صاف الفاظ میں ان کو نہیں دی تھی، جب ان کو کمال صبر کے اس بے مثال مظاہرہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ علاءالدین احمد صابراست، اس وقت سے ہی آپ کا لقب ہو گیا

شیخ علاءالدین کے خلافت نامہ چاک کئے جانے سے جو روایت مشہور رہے وہ درحقیقت ایک اور بزرگ کا واقعہ ہے، ان کا نام نظام الدین تھا۔ مشہور روایت یوں ہے کہ غالباً شیخ علاءالدین احمد کے مزاج، ان کے استغراق، اہل دنیا سے کنارہ کشی اور عبادات و ریاضات سے شغف کی وجہ سے ان کا دہلی جیسے ہنگامہ پرور مقام میں قیام کرنا خلاف مصلحت تھا۔ شیخ جمال کے خلافت نامہ چاک کرنے پر شیخ علاءالدین واپس پاک پٹن گئے اور بابا صاحب نے

Marfat.com

ان کو ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ کلیر میں قیام کرنے کی ہدایت دی۔

شیخ علاء الدین احمد کا خلافت نامہ چاک کئے جانے والی غلط روایت کے سلسلہ میں تذکرہ نگاروں نے اول الذکر کی بعض کرامات کا ذکر کیا ہے۔ کرمانی نے سیر الاولیا میں مخدوم صاحب اور ان کے سلسلہ کے بزرگوں کو نظر انداز کیا ہے، حالانکہ شیخ جمال الدین ہانسوی اور بابا صاحب کے دوسرے خلفاء کے حالات لکھے ہیں۔ فرشتہ نے (جلد دوم ص ۷۲۹) صاف الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ یہ روایت جن بزرگ کی ہے[1] ان کا نام نظام تھا۔ سیر الاولیاء میں ان کو "شخص" کہا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہیف تو تھے لیکن ان کا مرتبہ زیادہ بلند نہ تھا۔

"شیخ شیوخ العالم (بابا فرید شکر گنج) شخصے را خلافت نامہ دادہ بود و اورا فرمودہ کہ چوں در ہانسی بہ سی جمال مارا بنمائی۔ چون آن شخص در ہانسی آمد و خلافت نامہ کہ از شیخ شیوخ العالم یافتہ بود بخدمت شیخ جمال الملة والدین بنمود شیخ جمال الدین آن خلافت نامہ را پارہ کرد و فرمود تو شایان خلافت نہ ۔ ماناکہ آن شخص با التماس و مراحمت از شیخ شیوخ العالم خلافت نامہ یافتہ بود غرض آن شخص از ہانسی در اجودھن باز آمد و خلافت نامہ کہ شیخ جمال الدین پارہ کردہ بود پیش شیخ شیوخ العالم نمود شیخ شیوخ العالم فرمود کہ پارہ کردہ جمال را ما نتوانیم دوخت"

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۹۔ سیر الاولیاء کی تصنیف مخدوم صاحب کی وفات کے ساٹھ سال بعد ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں روایات و تفصیلات کے متعلق بہت سی غلط باتیں مشہور ہو گئی تھیں اور کرمانی نے ان کو لکھنے میں احتیاط نہیں کی۔ کرمانی کی اسی غلطی کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان واقعات کے سلسلہ میں بہت سے قصے ملا دیے ہیں۔ ہم نے ان کا ذکر یا ان کرامتوں کی تفصیل کو جو زمانہ قیام صابر میں آپ کے متعلق بیان کی گئی ہیں اپنے موضوع کے لئے غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔

Marfat.com

شیخ علاءالدین صابرؒ نے ایک طویل مدت کلیر میں عبادات و ریاضات میں گزاری اور اپنی وفات (سنہ ۶۹۰ھ) تک وہیں مقیم رہے چند کراماتی واقعات کے علاوہ اس دور کے حالات کہیں مذکور نہیں، تبلیغی و اصلاحی کام تو انہوں نے یقیناً کیا ہوگا اس لئے کہ بابا صاحب کا ان کو وہاں بھیجنا اور وہیں قیام کرنے کی ہدایت دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اس علاقے میں یہی کام کرنا تھا، ورنہ خالص عبادت کے لئے اگر وہ علائق دنیوی سے دور بھی رہنا چاہتے تھے تو جنگل وغیرہ خود پاک پٹن کے قریب بھی موجود تھے، مخدوم صاحب (شیخ علاءالدین احمد کا ذکر ان کے سلسلے کے حضرات اسی لقب سے کرتے ہیں) کے واحد خلیفہ شیخ شمس الدین ترک پانی پتی تھے، وہ اپنے وطن ترکستان سے آکر پاک پٹن میں بابا صاحب سے بیعت ہوئے اور ان ہی سے خرقہ خلافت حاصل کیا،[۱] اس کے بعد پیر کی ہدایت پر کلیر آئے اور مخدوم صاحب سے بھی بیعت ہوئے اور ان ہی کی خدمت میں رہنے لگے۔ پندرہ سال بعد مخدوم صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں دہلی آکر سلطان غیاث الدین بلبن کے لشکر میں ملازمت اختیار کی، کچھ مدت کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس کے بعد شیخ نے ملازمت ترک کر دی، بلبن کسی قلعہ کا محاصرہ کر رہا تھا شمس الدین اس وقت لشکر میں تھے، ایک رات کو سلطان کے خصوصی سقہ کو آگ کی ضرورت تھی، چونکہ ہوا تیز چل رہی تھی اور بارش کی وجہ سے طوفانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس لئے لوگوں کے خیموں میں روشنی وغیرہ نہ تھی، سقہ نے دور سے دیکھا کہ ایک خیمہ میں چراغ جل رہا ہے وہ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک درویش صفت سپاہی چراغ جلائے ہوئے تلاوت کلام اللہ میں مصروف ہے اس نے آگ حاصل کی اور چلا گیا، علاوہ ازیں اسی سقہ نے شیخ کو تالاب کے کنارے وضو کرتے دیکھا، اگرچہ تالاب کا پانی سرد تھا لیکن اس جگہ جہاں شیخ نے وضو کیا تھا

---

[۱] معارج الولایت کے بیان کے مطابق شیخ شمس الدین نے براہ راست کلیر کر مخدوم صاحب سے بیعت کی تھی۔

Marfat.com

اس کو محسوس ہوا کہ پانی گرم ہے، اس کی خبر سلطان کو بھی ہوئی، وہ خود سقہ کے ساتھ آیا، اور تجربہ کیا، اس کے بعد وہ خود شیخ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ جیسے بزرگ میرے لشکر میں موجود ہوں اور پھر بھی قلعہ فتح نہ ہو یہ عجیب بات ہے، شیخ نے اس پر دعا کی اور بالآخر قلعہ فتح ہوگیا، لیکن شیخ لشکر چھوڑ کر اپنے پیر کی خدمت میں واپس آگئے، مخدوم صاحب نے خلافت عطا کرکے فرمایا کہ ان کی وفات کے تین روز بعد وہ پانی پت چلے جائیں اور وہیں قیام فرمائیں، شیخ شمس الدین ترک کی وفات ۷۱۵ھ میں واقع ہوئی اور وہ پانی پت ہی میں دفن ہوئے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ شیخ علاء الدین احمد نے اپنے مرید کو لشکر میں ملازمت اختیار کرنے کی ہدایت کیوں کی، ظاہری حالات کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ شمس الدین ترک کو اپنی خدمت میں رکھتے اور کہیں نہ جانے دیتے، یہ بھی کوئی راز نہیں کہ ان جیسے توکل پسند اور قناعت پذیر درویش کی دنیوی ضروریات ایسی نہ تھیں کہ وہ ملازمت کے لئے مجبور ہوتے، دونوں بزرگ تنہا ہی تھے اور کسی کی پرورش کا بار ان پر نہ تھا[۱]۔ ان حالات میں شیخ کا اپنے مرید کو سلطانی لشکر میں بھیجکر ملازمت اختیار کرنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ شمس الدین ترک خاموشی کے ساتھ لوگوں کی تربیت اور ان کے کردار کو بہتر بنانے کی کوشش

---

[۱] صاحب سیر الاقطاب کا بیان ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں اکبر آباد کے حاکم ... خان کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تو اس نے اپنے وطن ترکستان جانے کا ارادہ کیا ... پانی پت میں روانہ ہوا، وہاں کے حالات دریافت کئے تو کہا کہ ... جب وہ ترکستان میں تھے تو قان کے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے تھے جن کا نام ... ہی سید احمد کی اولاد میں تھا، پنجاب میں آنے کے بعد شیخ نے کوئی شادی نہیں کی۔

خزینۃ الاصفیاء جلد اول ۳۲۲۳۳

Marfat.com

کرتے رہیں، اس میں شک نہیں کہ یہ قیاس ہے لیکن اس قیاس کو ضعیف نہیں کہا جا سکتا۔
شیخ شمس الدین ترک پانی پتی کے خلیفہ شیخ جلال الدین کا اصل نام محمد بن محمود تھا لیکن ان کے پیر نے ان کو جلال الدین کا خطاب دیا اور اسی سے وہ مشہور ہوئے، جلال الدین باطنی کمالات کے علاوہ ظاہری علوم سے بھی مزین تھے، خزینۃ الاصفیاء (ص ۳۶۲) میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ صاحب تصانیف تھے اور زاد الابرار ان کی ایک عمدہ تصنیف تھی، انہوں نے دو مرتبہ حرمین الشریفین کی زیارت کی، ان کے زمانہ میں چشتیہ صابریہ سلسلہ کی اشاعت بہت زیادہ ہوئی، شیخ کے چالیس خلفاء تھے اور ان میں سے ہر ایک صاحب سلسلہ ہوا، شیخ کی وفات ۷۶۵ھ بتلائی گئی ہے اور بحر ذخار میں ۷۳۳ھ دی گئی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا کہ سلطان فیروز شاہ آپ سے ملنے پانی پت آیا تھا۔

شیخ نظام الدین اولیاء

بابا فرید شکر گنج کے دوسرے خلیفہ جن کی شخصیت دینی و علمی زندگی کی تاریخ میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے شیخ نظام الدین اولیاء تھے، ان کی مشہور خانقاہ دہلی میں تھی اس لئے ان کے حالات ہم کو تاریخ اور سیر کی کتابوں میں بہ کثرت ملتے ہیں، سب سے اہم اور قابل ذکر تذکرہ سیر الاولیاء ہے اس کا مصنف میر خورد خود بچپن میں شیخ نظام الدین کا مرید ہو گیا اور بہت سے واقعات کا وہ یا تو عینی شاہد ہے یا خود ان لوگوں سے اس کو معلوم ہوئے جن سے ان کا تعلق تھا، شیخ کے ملفوظات فوائد الفواد ان کے مرید امیر حسن سجزی نے جمع کئے۔ اخبار الاخیار اور بعد کی کتابوں میں خاصی تفصیل موجود ہے۔

سو سال تک سلطنت کا دار الحکومت رہنے کی وجہ سے دہلی کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، احترام کے طور پر اس کے لئے حضرت کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، سیاسی اہمیت کے علاوہ دینی اور علمی زندگی کا بھی سب سے بڑا مرکزی شہر تھا، دہلی کی علمی و دینی ترقی میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا تھا، لیکن چودھویں صدی کے ابتدائی دور میں دو شخصیتیں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہیں، دینی اور ایک حد تک علمی زندگی کا سرچشمہ حضرت نظام الدین اولیاء

Marfat.com

کا قیام اور رشد و ہدایت تھی سیاسی اقتدار کی توسیع اور علم و فن کے لئے مناسب ماحول پیدا کرنے کا سہرا علاء الدین خلجی کے سر ہے تو شیخ نظام الدین اولیاء کا غیاث پور میں دہلی سے قریب ہی قیام تھا، اپنی وفات تک جو ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں واقع ہوئی۔ وہ یہیں رہے۔ ابتدائی زمانہ میں تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ باوجودیکہ ایک جنیل میں دو سیر آٹا ملتا تھا، لیکن پھر بھی آپ کو کئی کئی وقت کا فاقہ ہوتا تھا، جلال الدین خلجی کو معلوم ہوا تو اس نے کچھ گاؤں نذر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ جو لوگ شیخ کے ساتھ رہتے ہیں فراغت کی زندگی بسر کرسکیں شیخ نے اپنے ساتھیوں کو آزمانے کی غرض سے دریافت کیا کہ ان کی کیا رائے ہے۔ سب نے کہا کہ ان کو اس کی ضرورت نہیں۔ شیخ کو اس سے بےحد خوشی ہوئی۔[1]

بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ چار روز کے مسلسل فاقے کے بعد ایک خاتون نے کچھ آٹا بھیجا۔ اس کو مٹی کے برتن میں پکانے کے لئے رکھ دیا گیا، اسی وقت ایک درویش آیا اور اس نے کھانا مانگا۔ خواجہ صاحب نے وہ برتن اس کے سامنے رکھ دیا، اس نے چند لقمے کھائے اور پھر برتن کو توڑ کر یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

"شیخ فریدالدین گنج شکر نعمت باطن شیخ نظام الدین اولیاء ارزانی داشت
من نعمت فقری ظاہری او بشکستم، حالا سلطان ظاہری و باطنی شد۔"

کچھ دنوں کے بعد حالات ایسے بدلے کہ بقول خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی۔

"فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا روزانہ آگے بہتا تھا۔"

یہ تمام دولت فقراء، مساکین اور حاجت مندوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ نذریں پیش کرتے تھے جو صاحب استطاعت تھے، اس طرح آپ کے ذریعہ کثیر رقوم دولت مندوں کی تجوریوں اور خزانوں سے نکل کر غرباء کی ضروریات پوری کرتی

۱؎ سیرالاولیاء ص ۱۱۳، ۱۱۴

Marfat.com

تحقیق، اس پر غور کرنے سے معلوم ہو سکے گا کہ شہر کی اقتصادی حالت پر شیخ کے اس طریقہ کار یعنی دولت مندوں سے فتوحات قبول کرکے غربا میں تقسیم کرنے کا گہرا اثر پڑا ہوگا دوسرا اہم اور قابل ذکر پہلو خواجہ محبوب الٰہی کے رشد و ہدایت کا یہ تھا کہ ہر طبقہ کے لوگ آپ کے پاس حاضر ہوتے اور جو لوگ آتے وہ فسق و فجور سے تائب ہوجاتے تھے۔[1] شیخ نظام الدین دربار سلطانی اور ملکی سیاسیات سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ باوجودیکہ کئی بادشاہ ان کے زمانہ حیات میں تخت پر بیٹھے اور ان میں سے اکثر ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ملاقات کے خواہش مند تھے، یہاں شیخ کے تفصیلی حالات لکھنا مقصود نہیں لیکن یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ مذہبی، اخلاقی اور ثقافتی زندگی پر ان کی ذات اور ان کا حلقہ بہت زیادہ اثر انداز ہوا، یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اگرچہ شیخ پیر طریقت تھے لیکن ان کی ہدایت کے زیر اثر ظاہری علوم اور شریعت کو بھی تقویت پہنچی۔ ضیاء الدین برنی جو خود شیخ کے ارادت مندوں میں شامل تھے ان الفاظ میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

> در سرائے سلطانی چندین مردمان از امرائے سلطانی و سلاحداران و نویسندگان و لشکریان و بندگان سلطانی کہ مرید شیخ شدہ بودند نماز چاشت و اشراق می گذاردند و ایام بیض و عشرہ ذی الحجہ روزہ می داشتند..... و چند کس از مریدان شیخ من می دانستم کہ از نظر ورش شیخ صاحب کشف و کرامت شدہ بودند و از وجود ہمایوں شیخ و میامن انفاس شیخ و ادعیہ مستجابہ شیخ اغلب مسلمانان این دیار در تعبد و تصوف و ترک و تجرید میل کردہ بودند و در ارادت شیخ راغب گشتہ و سلطان علاء الدین با خانماں معتقد و مخلص شیخ گشتہ۔[2]

---

[1] دیکھو سیر العارفین ص ۱۲۳

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۴

Marfat.com

برنی کا بیان ہے کہ اس ہدایت و رشد کا نتیجہ یہ تھا کہ عہد علائی کے آخری دور میں فسق و فجور بہت کم ہو گیا تھا۔ سلطان کی اصلاحات سے شراب نوشی ممنوع ہو گئی تھی اور معاشرہ کی وہ خرابیاں جو اس عادت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں بڑی حد تک جاتی رہی تھیں۔

علائی عہد علوم و فنون کی ترقی و ترویج کے لحاظ سے بھی امتیازی شان رکھتا ہے بہت سے علماء باہر سے آ کر یہاں مقیم ہو گئے تھے اور کچھ یہیں کے باشندے تھے۔ برنی نے چھیالیس نام لکھے ہیں اور کہتا ہے کہ یہ وہ علماء ہیں جن سے میں نے خود پڑھا ہے یا جن کی خدمت میں حاضر رہا ہوں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے عالم تھے جو درس و تدریس میں مصروف تھے۔ برنی کو شکایت ہے کہ علاءالدین نے ان کی ایسی قدر نہیں کی جیسی کہ اس کو کرنا چاہئے تھی۔ برنی کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ علاءالدین شرعی نقطہ نظر کو اہمیت دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی بعض اصلاحات اور فیصلے شرعی احکام کے مطابق نہ تھے لیکن اس کا سبب ہمیں اس مکالمہ میں ملتا ہے جو سلطان اور قاضی مغیث کے درمیان ہوا اور جس کو برنی نے تفصیل کے ساتھ اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ علاءالدین نے قاضی سے اپنے بعض احکامات اور پالیسیوں کے متعلق شرعی نقطہ نظر سے رائے دینے کے لئے کہا۔ قاضی نے اپنی سمجھ اور علم کے لحاظ سے بہت سچی رائے دی۔ یہاں تک کہ سلطان کے ذاتی اور محل کے اخراجات کو بھی ناجائز بتلا دیا۔ سلطان نے قاضی سے کہا کہ تو میری تلوار سے نہیں ڈرتا۔ قاضی نے کہا کہ میں تو خدا کی تلوار سے ڈرتا ہوں اور یہ الکفن میری دستار ہی ہے۔ لیکن [illegible] شرعی مسئلہ میں وہی کہوں گا جو میں حق سمجھتا ہوں۔ علاءالدین کو قاضی کی اس بیباکی پر [illegible] غصہ آیا لیکن اس نے ضبط کیا اور اپنے کاموں کا جواز پیش کیا کہ وہ ان معاشی [illegible] کو سزا دیتا ہے جن سے سلطنت پر کوئی اثر نہیں پڑتا مثلاً شراب خوری [illegible] وغیرہ لیکن ان جرائم کی [illegible] جاتی ہے جو پیغمبروں کا حکم ہے۔[1] علاءالدین [illegible]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۶

کے انداز میں ہے، بلکہ وہ یہ بھی کہنا ہے کہ وہ شرعی مسائل سے واقف نہیں، اس مکالمہ سے بعض دور جدید کے مورخین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ علاءالدین شریعت کو نظر انداز کرتا تھا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمان مورخین اور بالخصوص امیر خسرو یہ نہ لکھتے:

شاہ محمد کہ بت ابتیدائے
کرد قوی شرع رسول خدائے[1]

اور نہ ہی ان کے پیر بھائی امیر حسن سجزی اس کی دین پناہی اور نگہبانی دین کی تعریف کرتے۔

علوم وفنون علائی عہد میں

علماء کے علاوہ برنی نے عہد علائی کے فن کاروں اور دیگر اہل کمال کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً شعراء، ادباء، واعظین، منجم، مورخ، خطاط، مطرب وغیرہ۔ ان تمام کا ذکر کرکے کہتا ہے کہ ہر علم اور ہنر کے ماہر دہلی میں جمع ہو گئے تھے، یہ لوگ اپنے اپنے فن میں "بے نظیر" اور "عدیم المثال" تھے، برنی کی یہ رائے کہ ان کی موجودگی میں علاءالدین کا کوئی ہاتھ نہ تھا صرف ایک حد تک صحیح ہے، یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ان میں سے اکثر لوگوں کو اس طرح اپنے دربار سے وابستہ نہیں کیا جیسے سلطان محمود غزنوی نے کیا تھا، لیکن اس کی فتوحات سیاسی اقتدار کی توسیع، قیام امن، اشیاء کی ارزانی اور جاگیرداری نظام کو ختم کرنا ہرگز نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ علوم وفنون کی ترقی اور اخلاقی اقدار کی بلندی کے لئے جس ماحول اور امن کی ضرورت تھی وہ علاءالدین ہی نے بہم پہنچائی تھی، فرشتہ اگرچہ بہت بعد کا مورخ ہے لیکن اس نے جو رائے علاءالدین کے عہد کے متعلق دی ہے وہ حقیقت سے دور نہیں، وہ لکھتا ہے۔

گویند آن قدر فتوح کہ پادشاہ علاءالدین را روئے نمود ہیچ یک از پادشاہان ہند را نصیب نشدہ بود آن قدر عمارت کہ در عہد او بنا یافت از مسجد

---

[1] مطلع الانوار ص ۱۴، نیز دیکھو خزائن الفتوح ص ۲۷

Marfat.com

و خانقاہ و حوض و منارہ و حصار در ہیچ عصرے بوقوع نیامدہ و جمعیت اہل ہنر و ماہران ہر فن کہ در روزگار او مشاہدہ گشت در ہیچ عہدے نہ بود و راستی و انصاف در عوام و خواص و اطاعت ہنود واقع کہ در ایام او بود در ہیچ زمان محسوس نشدہ و اجتماع بزرگان دین و سالکان راہ یقین کہ دارالملک دہلی بود بوجود شریف ایشان رشک بلاد عالم گشتہ بود و آن چنان کہ در زمان او اتفاق افتاد در ہیچ عصر نہ بود۔"[1]

امیر خسرو اور امیر حسن سجزی

علاء الدین کے عہد کے لئے برنی کی تاریخ کے علاوہ ہم کو سب سے زیادہ مواد امیر خسرو کی تصانیف میں ملتا ہے۔

بحیثیت شاعر امیر خسرو برصغیر کی تاریخ میں بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، غرضکہ شاعری کی ہر صنف میں ان کا کلام قابل تعریف ہے۔ انہوں نے بلبن سے لے کر سلطان محمد بن تغلق تک کئی بادشاہوں کا عہد دیکھا۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں وہ اپنے اوج کمال پر پہنچ چکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی زیادہ شہرت کا باعث ان کی غزلیں ہی ہیں جن میں آج بھی وہی جاذبیت اور کشش ہے جو سات سو سال قبل تھی لیکن فن تاریخ کی نظر میں ان کی مثنویوں کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا سلسلہ بلبن کے جانشین کیقباد سے شروع ہوتا ہے۔ قران السعدین میں اس ملاقات کا ذکر ہے جو کیقباد نے اپنے باپ یعنی بغرا خاں سے دریائے گنگا کے کنارے پر کی۔ بغرا خاں بنگال کا گورنر تھا اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد بھی وہیں رہا، چنانچہ خود اس کا لڑکا اپنے دادا کے تخت پر بیٹھا۔ قران السعدین کے بعد جلال الدین خلجی کے عہد میں مفتاح الفتوح لکھی گئی اور علاء الدین کے زمانہ میں اس کے ولی عہد خضر خاں اور راجہ گجرات کی لڑکی دولرانی کے معاشقہ اور شادی کے واقعات

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۲۱۰

کو نظم کیا، اس مثنوی میں اس دور کے بہت سے تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں، نظامی کے جواب میں خمسہ یعنی پانچ مثنویاں بھی علاء الدین ہی کے عہد میں لکھیں اور اسی کے نام معنون کیں۔ علاء الدین کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ کے زمانہ کا ذکر نہ سپہر میں ہے، امیر کی آخری تاریخی مثنوی تغلق نامہ ہے جس میں خسرو خاں کی بغاوت اور تخت دہلی کو غصب کرنا اور ملک تغلق کا اس کے خلاف خروج کرنا بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان کے علاوہ سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات دکن پر ایک مفصل کتاب خزائن الفتوح کے نام سے لکھی، امیر خسرو کی تاریخی تصانیف میں واقعات کی بعض وہ تفصیلات مل جاتی ہیں جو کہیں اور موجود نہیں، اس کے علاوہ انہوں نے ضروریات شعری کے باوجود تاریخی واقعات کی صحت کا اس قدر التزام کیا ہے کہ اکثر اوقات ان کے بیانات کو مورخوں نے دوسری ہمعصر شہادتوں پر ترجیح دی ہے۔ امیر خسرو کی نثر میں ایک اور تصنیف بھی قابل ذکر ہے، اعجاز خسروی صنائع، بدائع پر ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔

علمی و ادبی کارناموں کی بدولت امیر خسرو نے شہرت دوام حاصل کر لی ہے لیکن ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے بہت عزیز مرید تھے ان کو اپنے مرشد سے غیر معمولی عقیدت اور محبت تھی، شیخ بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور محبت میں ترک اللہ کہا کرتے تھے شیخ کی صحبت اور تربیت نے امیر خسرو کو بلند کردار صوفی بنا دیا۔ دربار سلطانی سے وابستگی کے باوجود وہ صوفی رہے، یہی وہ حیثیت ہے جس کی یاد آج بھی ہر سال ان کے عرس کی شکل میں منائی جاتی ہے، امیر خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہی ان کے مرشد سے چند ماہ بعد ہوا۔

امیر حسن سجزی بھی امیر خسرو کی طرح شیخ نظام الدین اولیاء کے حلقہ ارادت میں شامل تھے اور اپنے مرشد سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ برنی نے لکھا ہے کہ وہ امیر خسرو کے عزیز ترین دوستوں میں تھے اور ان دونوں کی ملاقات میں نے ہی کرائی تھی جو سالہا سال امیر خسرو و امیر حسن مذکور

Marfat.com

تو دو یگانگی بودہ است و نہ ایشان بے صحبت من بتوانستند روے بود نہ من توانستے کہ مجالست ایشان را گذرانم"[۱] امیر حسن کے بقول برنی: "چند دیوان است و صحایف بہ نثر و مثنویات بسیار است" لیکن طلبا تاریخ کے لئے ان کی سب سے زیادہ مفید اور اہم تالیف فوائد الفواد (یعنی مجموعہ ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاء) ہے[۱]۔ اس میں حضرت شیخ کی تعلیمات اور بہت سے سماجی مسائل پر ان کے خیالات ہی موجود نہیں بلکہ تاریخ سے متعلق کافی معلومات بھی درج ہیں۔ امیر حسن کی نظمیں بھی تاریخ کے مطالعہ کے لئے اہم ماخذ ہیں۔

برنی نے امیر خسرو اور امیر حسن کے علاوہ چند شعراء کے نام بھی دئے ہیں وہ یہ ہیں صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ، مولانا عارف، عبد الحکیم، شہاب الدین انصاری اور صدر بستی وہ لکھتا ہے:

"ہر یکے را در نظم شیوہ و طرزے بود و دیوان ہا دارند و نظم و نثر ایشان بر استادی و شاعری ایشان حاکی است"[۲]

تغلق سلاطین کے عہد میں شعر و ادب

علاء الدین کے بیٹے سلطان قطب الدین مبارک خلجی کا عہد بھی لطف و مزاح کا دور ثابت ہوا۔ سلطان کی عیاشی، مزاجی، غیر ذمہ دارانہ رویہ اور خود سری نے نظم مملکت کی مشینری کو تقریباً تباہ کر دیا۔ دربار میں علماء اور امراء کی بجائے طوائفوں، ناچنے والی لڑکیوں، مسخروں اور دوسرے اوباشوں کا اثر بڑھ گیا۔ برنی نے دربار کی خرافات اور معاشرہ کی تنزل پذیری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کے چند جملوں سے اس انحطاط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

از جلوس سلطان قطب الدین تا ... بلکہ گذشت، جہان بکام دل ...

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۰۔

۲؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۰۔۳۶۱۔

Marfat.com

شد، و روزگار را کار و کار ستانی دیگر پیدا آمد و چون دست امر پادشاهی از سینه‌ها گم شد و رغبت مردمان توبه‌ها بشکستند صلاحیت و عفت را خیرباد گفتند، و اشتغال نوافل و طاعات که در خواص و عوام مردم مشاهده می‌شد کمی گرفت و در فرائض خلل افتاد و مساجد بے جماعت ماندند و از انچه پادشاه لیلاً و نهاراً در فسق و فجور اعلاناً و اجهاراً مستغرق گشت در بواطن رعایا هم فسق و فجور است ... ص ۳۸۴

قطب الدین کا دورِ حکومت خوش قسمتی سے مختصر تھا۔ ۱۳۲۰ء میں وہ اپنے ایک محبوب نومسلم غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے قتل ہوا[1]

---

[1] بعض جدید مصنفین کو اس بات میں الجھن ہوئی ہے کہ امیر خسرو اور امیر حسن سجزی وغیرہ نے اپنی تصانیف میں قطب الدین کی تعریف کیوں کی ہے۔ مطلق العنانی کے دور میں ان شعراء کے لئے جو دربار سے وابستہ ہوتے تھے مدحیہ قصائد لکھنا ضروری تھا۔ اکثر جو الفاظ تعریف میں استعمال ہوتے تھے وہ بے معنی ہوتے۔ یہ مبالغہ آمیز بیانات بعض اوقات مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً مثنوی نہ سپہر میں امیر خسرو قطب الدین کو "گنج بخش"، "ابر کرم گستر"، کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ؎

چنین بخششے کز تو هم یافتم ؛ ز شاهان پیشینه کم یافتم

لیکن جو بات حیرت انگیز ہے اور جس کی وجہ سے خسرو کو خراجِ تحسین دینا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ امیر کو معلوم تھا کہ قطب الدین حضرت سلطان المشائخ سے عناد رکھتا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے نہ سپہر میں جو سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے تصنیف کی گئی تھی اپنے طریقہ کار کے مطابق سلطان سے پہلے شیخ کی تعریف کی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

برو جسته پیران عالم پناه ؛ همه بالغان پیش او طفل راه

Marfat.com

سہروردیہ اور چشتیہ سلسلوں کے بعض مشائخ اور ان کے کارناموں کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تغلق خاندان کے دو بڑے سلاطین یعنی محمد بن تغلق اور فیروز شاہ کے مختلف طریقوں پر مختصر تنقید کی جائے۔ سلطان محمد بن تغلق کی اصلاحات اور ان کے نتائج کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اپنی ذہانت اور علم کے باوجود محمد بن تغلق کے تعلقات اس کے امراء اور عوام سے خوشگوار نہ رہ سکے اور یہی سبب تھا کہ اس کے عہد میں متعدد بغاوتیں ہوئیں جن کے نتائج دور رس ثابت ہوئے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سلطان علماء اور مشائخ سے بھی الجھ گیا۔ ان کے ساتھ جو برتاؤ اس نے کیا وہ کسی طرح قابل ستائش نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بزرگوں مثلاً شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ رکن الدین اور شیخ شرف الدین کا وہ بہت احترام کرتا تھا۔ لیکن من حیث الجماعت مشائخ کے ساتھ اس نے سخت نامعقول برتاؤ کیا۔ ہم کو متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں کہ متقی اور صلح پسند مشائخ کو سلطان نے تنگ کیا اور ان پر مظالم کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشد و ہدایت اور اشاعت و تبلیغ کا جو مفید کام یہ حضرات اپنی خانقاہوں میں بیٹھ کر انجام دے رہے تھے اس میں خلل آ گیا۔ سلطان کے بعض اقدامات یقیناً مفید اور عمدہ نتائج کے حامل ثابت ہوئے لیکن اگر اس کا طریقۂ کار مختلف ہوتا تو زیادہ بہتر نتائج مرتب ہو سکتے تھے۔ اس نے بعض بزرگوں کو دولت آباد بھیجا جنہوں نے وہاں اشاعت اسلام کا کام انجام دیا مگر دارالحکومت میں چشتیہ نظامیہ سلسلہ کو سلطان کی سختیوں نے ایک حد تک درہم برہم کر دیا۔ بعد اگر اس کا جانشین فیروز شاہ بالکل اس کا ضد نہ ہوتا تو اس تحریک کو شاید اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچ جاتا۔ سلطان کے دماغ میں یہ خبط سما گیا تھا کہ ان بزرگوں کو خانقاہوں سے نکال کر حکومت کی طرف سے کوئی خدمت سپرد کرنا چاہئے۔[۱] سلطان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی

---

[۱] خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ محمد بن تغلق ان علماء و مشائخ سے وہی خدمت لینا چاہتا تھا جو خلفائے راشدین اہل علم اور اہل صلاح سے لیتے تھے اور یہ خدمت حکومت کی ملازمت تھی۔ (قطبی نظامی ص ۳۰)

کہ جو خدمت یہ حضرات انجام دے رہے ہیں وہ ہر شخص کا کام نہیں، برخلاف اس کے وہ خود جو خدمت ان کے سپرد کرنا چاہتا تھا وہ ہر شخص انجام دے سکتا تھا۔ شیخ نصیر الدین کو اس نے جامہ داری کی خدمت سپرد کی، کیا یہ حرکت مضحکہ خیز نہ تھی، بعض مشائخ کو وہ دہلی سے باہر جا کر تبلیغ کرنے کے لئے کہتا تھا۔ مثلاً شیخ شمس الدین یحییٰ کو اس نے حکم دیا کہ کشمیر جا کر تبلیغ کریں، شیخ تیار ہو گئے لیکن انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے پیر شیخ نظام الدین اولیاء ان سے کہہ رہے ہیں کہ تم ہمارے پاس آؤ۔ ابھی شمس الدین انتظام جانے کا کر ہی نہ پائے تھے کہ دنبل نکلا اور وفات پا گئے، واقعہ یہ

ہے اور اس سے ہرگز اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ محمد بن تغلق کی پالیسی کو حضرت عمرؓ کے طرز حکومت سے تشبیہ دینے میں انہوں نے تاریخی حقائق اور اصول دونوں کو نظر انداز کیا ہے، اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور فرشتہ کے بیانات کو "بعد کی گھڑی ہوئی داستانیں" تصور کرنا تاریخ پر ظلم ہے ممکن ہے کہ ان کے بیانات میں کچھ تفصیلات صحیح نہ ہوں لیکن ان کو سراسر غلط خیال کرنا خود غلطی ہے، اس کے علاوہ ان واقعات کے لئے ہمعصر شہادتیں بھی موجود ہیں، مثلاً شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا واقعہ سیر الاولیاء کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

> در طلوع دولت سلطان محمد تغلق ۔۔۔۔۔۔ شیخ نصیر الدین محمود را رحمۃ اللہ علیہ کہ باتفاق ہمہ عالم شیخ عصر بود و جملہ خلق منقاد و مرید او ایذا ہا رسانید۔ و این بزرگ دین باتباع پیران خود تحمل واجب دید و در مکافات آن نکوشید تا آخر عمر این پادشاہ بیرحم طنی در کشتہ کہ از شہر دہلی ہزار کروہ باشد برفت، از انجا شیخ نصیر الدین محمود را با علماء و بزرگان حضور خود طلبید و احترام ایشان کما حقہ بجا نیاورد آن احتمال ایشان پادشاہ مذکور را از تخت سلطنت در تختہ تابوت کردہ در شہر آمدند۔ الغرض از شیخ نصیر الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ سوال کردند کہ این پادشاہ شما را ایذا ہا کرد۔ این معنی از کجا بود فرمود کہ میان من و حق جل و علیٰ معاملہ بود۔ آن را بدین برداشتند۔" (سیر الاولیاء ص ۲۴۵، ۲۴۶)

Marfat.com

ہے کہ یہ لوگ تبلیغی اور تربیتی کام مخصوص طریقے اور خاص پروگرام کے تحت کرنا چاہتے تھے نہ کہ سلطان کے احکامات کی تعمیل میں۔ ان کے احتجاج پر سلطان کا مزاج قابو سے باہر ہو جاتا اور وہ بعض اوقات وحشیانہ سزائیں دیتا۔ مولانا فخرالدین زرادی کا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اور شمس الدین یحییٰ کے واقعہ کی طرح یہ بھی سیر الاولیاء میں موجود ہے۔ ان کو دربار میں بلایا۔ وہ بادل ناخواستہ گئے۔ سلطان کا دبیر قطب الدین ان کا شاگرد تھا اس نے اپنے استاد کی جوتیاں اپنی بغل میں اٹھا کر رکھ لیں۔ سلطان نے کچھ رقم اور کپڑا مولانا کی نذر کیا، شاید وہ انکار کرتے لیکن فوراً ہی دبیر نے ان کی طرف سے قبول کر لیا اسے لیا۔ مولانا کے جانے کے بعد سلطان اپنے دبیر پر ناراض ہوتے ہوئے کہتا ہے:-

"اے مکار تو نے یہ کیا حرکت کی۔ پہلے تو فخرالدین کے جوتے بغل میں لئے اور پھر چاندی اور کپڑا لے کر میری تلوار سے ان کو بچا دیا ورنہ ان کی بلا اپنے اوپر لی"

یہی نہیں بعد کو وہ ہمیشہ اس پر افسوس کرتا رہا کہ مولانا اس کے ہاتھ سے زندہ بچ کر نکل گئے۔[1] مزید واقعات درج کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو فضا سلطان کے تشدد اور مظالم نے پیدا کر دی تھی اس کی وجہ سے علمی و دینی ترقی کے راستہ میں سخت رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں۔

علوم وفنون کی ترقی کے لئے فیروز شاہ کی کوششیں

فیروز شاہ کی کوشش تھی کہ حکومت کے نظام شرع کے مطابق ہو۔ اس کو فقہ سے گہری دلچسپی تھی اور اکثر کتب فقہی .... مسموع ہوا کرتی ..... پیدا اس دلچسپی کا عملی ثبوت یہ ہے کہ فتاویٰ فیروز شاہی اسی کے کہنے پر تیار کی گئی تھی۔[2] مولانا ...

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۷۲

[2] نسخہ فیروز شاہی کے نسخے انڈیا آفس لائبریری لندن، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور مسلم یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔

Marfat.com

کی فتاویٰ تتارخانیہ اس سے بھی زیادہ مشہور اور مستند کتاب ہے[1]۔ سلطان کو فلکیات اور نجوم سے بھی دلچسپی تھی، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحب سیرت فیروزشاہی لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے علم نجوم کا جاننا اس لئے ضروری ہے کہ اسی کے ذریعہ نمازوں کا صحیح وقت مقرر کیا جاسکتا ہے، ایک مندو مصنف کی کتاب اسی موضوع پر اس کو جوالا مکھی کے مندر میں ملی تو اس نے فوراً اس کا ترجمہ کرایا، اس کا فارسی نام دلائل فیروزشاہی رکھا گیا، نظام الدین احمد کے الفاظ میں یہ کتاب "متضمن اقسام حکمت علمی و عملی" تھی، اس کے علاوہ باراہمیر کی کتاب کا بھی ترجمہ کرایا جو کتاب النجوم کے نام سے مشہور ہے۔

علماء و مشائخ سے تعلقات کے سلسلہ میں بھی فیروزشاہ کا رویہ محمد بن تغلق سے بالکل مختلف تھا، اپنے عہد کے سربرآوردہ بزرگوں سے اس کو بہت زیادہ عقیدت تھی اور ان کا نہایت درجہ احترام کرتا تھا مثال کے طور پر شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری، شیخ شرف الدین پانی پتی، شیخ قطب الدین منور اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے اسمائے گرامی گنائے جاسکتے ہیں۔ فیروزشاہ کا عہد اس کی اصلاحات اور علوم و فنون کی سرپرستی کے لئے بھی اہم ہے۔ فیروزشاہ نے بہت سے مدرسے بنوائے اور بڑی تعداد میں علماء و مدرسین کو وظائف وغیرہ دئے، عفیف کا اندازہ ہے کہ چھتیس لاکھ ٹنکے وظائف کی شکل میں اور ایک کروڑ ٹنکے زمینوں کی شکل میں اس مد پر صرف ہوتے۔ بعض تاریخوں میں اس کے تعمیر کردہ مدارس کی تعداد تیس بتلائی گئی ہے۔ بہرحال سب سے بڑا مدرسہ جو حوض علائی کے کنارے واقع تھا اور جس کو مدرسہ فیروزشاہی کہا گیا ہے نہایت مشہور درسگاہ تھی، اس کی شاندار عمارت کا کچھ حصہ آج بھی اس کی نمایاں حیثیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ فیروزشاہ کی علمی سرپرستی سے مدرسین اور علماء کی حالت بہت بہتر ہوگئی اور

---

[1] دیکھو مناظر احسن گیلانی۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ حصہ اول ص ۳۸۵

Marfat.com

برنی کے الفاظ میں :-

"مہ بیشترے از طوائف مذکور کہ کفش درست نداشتند از مراحم سلطان فیروز شاہ جامہائے لطیف می پوشند و براسپان جیدہ سوار می شوند و بیشتر در علوم دین و بتعلم احکام شرع مشغول می باشند"

علماء، مشائخ، مدرسین، متعلم اور دوسرے ان لوگوں کو جو علمی اور دینی کاموں میں مصروف تھے مختلف رقمیں دی جاتی تھیں ان میں سے بعض کو ایک ہزار تنکے تک ملتے تھے۔[1]

سکندر لودی

فیروز شاہ کی ان کوششوں سے حالات کچھ بہتر ضرور ہوئے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علوم وفنون کی ترقی جس بلندی پر تغلقوں سے پہلے پہنچ چکی تھی اس سے آگے بڑھنے کے امکانات پھر پیدا نہ ہوئے، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ چودھویں صدی کے آخر میں تیمور کے حملے سے سلطنت کا رہا سہا شیرازہ بکھر گیا تغلقوں کے بعد سیدوں کی حکومت قائم ہوئی، یہ زمانہ انحطاط کا تھا۔ لودیوں کے عہد میں جو ان کے بعد آیا اور خاص طور پر سکندر لودی کے زمانہ میں حالات بہت کچھ سنبھل گئے۔ سکندر لودی پر شیخ عبداللہ تلنبی، شیخ سماء الدین اور مولانا جمالی کا اثر تھا اور یہی سبب تھا کہ شعائر اسلامی کی پابندی اور ان کا لحاظ کرنے کے علاوہ سکندر کا علمی مذاق بھی نہایت شستہ تھا، وہ شاعر بھی تھا اور گلرخی تخلص کرتا تھا۔[2] اس کو کھانے کے وقت بہت سے علماء کو بلانا اور ساتھ کھلانے کا انتظام دربار کی طرف سے ہوتا تھا۔ ان درباری علماء میں شیخ رزق اللہ مشتاقی فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے اور راجن تخلص کرتے تھے۔ سنسکرت میں بھی مہارت کامل رکھتے تھے۔ اس دور کے صوفیاء میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی

---

۱ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۷۔

۲ بعض حضرات نے اس کو گلرخ پڑھا ہے، مثلاً دیکھئے تاریخ داؤدی (علیگڑھ) مرتبہ شیخ عبدالرشید ۱۹۵۴ء ص ۳۲۔

Marfat.com

شخصیت خاص طور پہ قابل ذکر ہے۔ ان کے حالات آگے بیان کئے گئے ہیں، سکندر لودی نے ایک متبحر عالم شیخ حسام الدین عرف شیخ اوجھر کو محتسب مقرر کیا تھا اور ان کی کارگذاری سے بہت خوش تھا۔ شیخ اوجھر اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں گنگوہ بھی گئے کہ شیخ عبدالقدوس سے سماع کے متعلق احتساب کریں۔ لیکن شیخ کی صحبت کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنا سلما مال اسباب لٹا کر شیخ کے مرید ہو گئے اس واقعہ کے بعد سکندر لودی کو بھی شیخ سے گہری عقیدت ہو گئی۔ شیخ بھی بذریعہ خطوط سلطان کو ہدایت فرماتے رہتے تھے۔[1]

سکندر لودی نے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی ترغیب دی جس کا بقول فرشتہ اس وقت ان میں رواج نہ تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تعداد حکومت کے ملازمین میں بہت زیادہ بڑھ گئی، لیکن ساتھ ہی فارسی کی مقبولیت بھی عام ہو گئی، سکندر لودی کا جانشین ابراہیم اس خاندان کا آخری سلطان تھا، اس نے بہت جلد بااثر امراء اور بعض مشائخ سے اپنے تعلقات خراب کر لئے، علمی اور ادبی حیثیت سے اس کی حکومت کا مختصر زمانہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

اردو زبان کی ابتداء

سلطنت دہلی کے خاتمہ کے وقت یعنی ۱۵۲۶ء میں برصغیر کے مختلف حصوں میں اسلامی اقتدار کو قائم ہوئے آٹھ سو سے زیادہ سال گذر چکے تھے، اور تقریباً سواد دو سو سال تک سارا ہندوپاکستان ان کے زیر اثر رہ چکا تھا اس مدت میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے لئے جو کارنامے مسلمان مشاہیر نے انجام دئے ان پر کوئی قوم بھی فخر کر سکتی ہے، برصغیر کی زندگی کا نقشہ مکمل طور پہ تبدیل ہو چکا تھا، علم و ادب اور معاشرت و سیاست کے ہر پہلو پہ انقلابی تبدیلی اور ترقی کے آثار نمایاں طور پہ نظر آتے تھے اس میں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ مذہبی معاملات میں مسلمانوں نے رواداری

---

[1] مکتوبات قدوسی میں سکندر لودی کے نام خط موجود ہے۔

Marfat.com

کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، ان سے پہلے ہندپاکستان میں دو مذہبوں کی کشمکش جاری تھی، ان میں سے جو بھی برسراقتدار آتا وہ دوسرے مذہب کے ساتھ رواداری کا سلوک نہ کرتا بلکہ اس کو مٹانے کی کوشش کرتا، آخرکار ہندو یا زیادہ صحیح الفاظ میں برہمن مذہب کے پیروؤں نے بدھ مذہب کا تقریباً صفایا کر دیا اور اشوک کے ہم مذہبوں کا ذکر صرف تاریخ کے صفحات تک محدود ہو کر رہ گیا، سماجی زندگی میں بھی آبادی کا بہت بڑا حصہ اچھوتوں کا تھا جن کی حالت جانوروں کی سی تھی، برخلاف اس کے مسلمانوں نے اپنے عہد اقتدار میں دوسروں کو مکمل مذہبی آزادی دی اور تبدیلی مذہب پر کسی کو مجبور نہیں کیا، سماجی زندگی کا یہ حیرت انگیز پہلو ہے کہ ہندو قوم باوجود محکوم ہونے کے مسلمانوں کو اچھوت ہی سمجھتی رہی اور مسلمان باوجود حکمراں قوم ہونے کے ان کو حقیر اور اچھوت نہ سمجھتے تھے۔ اس رواداری کے برتاؤ کا ایک بہت اہم نتیجہ یہ نکلا کہ زبان کے معاملہ میں بھی مسلمانوں نے نئی زبان کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی کہ اس کا رشتہ مقامی زبانوں سے بہت قریبی ہے۔ سلطنت دہلی کے خاتمہ کے وقت یہ زبان وجود میں آچکی تھی، تاریخ داؤدی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس مسئلہ پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ بابر کی فتح کے ذکر میں وہ لکھتا ہے:

"سرش (سلطان ابراہیم) بریدہ پیش بابر بادشاہ آوردند۔ تخمینی دربان مردکہ حاضر بود۔ این شعر بر زبان راند۔

نوری او بہری نقیب	پانی جت ہمات داب
انکشین جہ بکرار	بابر جیا ابراہیم مارا

Marfat.com

باب ششم

علاقائی سلطنتیں

علاقائیت اور اسلامی معاشرہ

سلطنت دہلی کے زوال اور سیاسی انتشار کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت کا شیرازہ سلطان محمد بن تغلق ہی کے زمانہ میں بکھرنا شروع ہو گیا تھا سلطان کی قابلیت، نیک نیتی اور امور سلطنت سے غیر معمولی دلچسپی کے باوجود اس کی درشت مزاجی اور بعض نامتوازن اقدامات کے نتائج، استقامت سلطنت کے لئے خطرناک ثابت ہوئے اور اس کی حکومت کے آخری دور میں کئی علاقے مرکز سے علیحدہ ہو گئے اور وہاں کے سرداروں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ ان میں جنوبی ہند کے علاوہ، دکن میں بہمنی سلطنت اور بنگال کی خود مختار حکومت قابل ذکر ہیں۔ اس کے جانشین فیروز شاہ نے بنگال اور سندھ پر حملہ کر کے ایک حد تک ان کو مرکز کی بالادستی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا، لیکن دکن کا مسئلہ زیادہ مشکل تھا۔ چنانچہ اس نے یہی طے کیا کہ دکن کی نئی سلطنت کو خود مختار حکومت مان لیا جائے، فیروز شاہ کے بعد انتشار کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا اور رفتہ رفتہ برصغیر کا بہت بڑا علاقہ دہلی سے بے تعلق ہو گیا۔ پندرھویں صدی کے نصف اول میں دہلی کی حکومت اتنی مختصر ہو گئی تھی کہ اس کے قریب و جوار کے علاقوں کے علاوہ کہیں بھی اس کا اقتدار باقی نہ تھا۔ لودیوں کے عہد میں حالات کچھ بہتر ہوئے لیکن اب علاقائی خود جاندار حکومتیں ہو گئی تھیں۔ نظم حکومت، فوجی

Marfat.com

طاقت اور تہذیب و تمدن کی ترقی۔ غرض کہ ہر لحاظ سے ان میں سے اکثر اب دہلی سے زیادہ آگے بڑھ گئی تھیں، ان سلطنتوں کی ایک علیحدہ تاریخ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے برصغیر کی تعمیر تہذیب میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ان سلطنتوں کی خود مختاری کا خاتمہ مغلوں کے زمانہ میں ہوا۔

اس مختصر جائزہ میں علاقائی سلطنتوں کی تاریخ اور کارناموں کا ذکر ممکن نہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس کی مستحق ہے کہ اس پر علیحدہ کتاب تیار کی جائے۔ میں صرف ایک پہلو کی طرف کچھ اشارات کرنا چاہتا ہوں، برصغیر کی تاریخ اور دورِ حاضر کی سیاسی زندگی کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقائیت (یعنی تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر سے مختلف علاقوں کا ایک دوسرے سے علیحدہ رہنا) اس کی ایک نمایاں خصوصیت ہے، زبان، لباس، خوراک اور طریقۂ رہائش کے لحاظ سے یقیناً گجراتی، دکھنی، سندھی، بنگالی، بہاری، پنجابی اور پٹھان علیحدہ علیحدہ قومیں معلوم ہوتی ہیں[1]۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ آریائی تہذیب جس کا اقتدار عہدِ قدیم میں ایک مدت دراز تک شمالی علاقوں میں قائم رہا، سارے برصغیر پر بالادستی حاصل نہ کر سکی، یہ صحیح ہے کہ دور دراز کے علاقوں میں جا کر جب وہ مقامی حالات سے ٹکرائی تو اپنا کچھ نہ کچھ اثر اس نے وہاں بھی چھوڑا اور قدیم تہذیبی اقدار میں اس کے نقوش دکھائی نظر آنے لگے، لیکن علاقائی زندگی کے بنیادی خاکوں کو وہ یکسر نہ بدل سکی، برخلاف اس کے اسلامی تہذیب نے اپنے مخصوص مزاج کی بنیاد پر علاقائی تفریقات کی دیواروں کو توڑنے کی زبردست کوشش کی، مسلمانوں نے برصغیر کے سیاسی نقشے کے مختلف رنگوں کو مٹا کر اس میں ایک رنگ

---

[1] اس میں شک نہیں کہ اردو برصغیر کے ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور عام طور پر اس کو لنگوا فرنکا کہا گیا ہے، لیکن ان علاقوں کی مادری زبانیں ذرا مختلف ہیں، یہی کیفیت خوراک و لباس کی ہے۔

بھرا، ہمالیہ کے دامن سے راس کماری تک سارا علاقہ ایک ہی نظم حکومت کے تحت لے آیا گیا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم اور دیرپا وہ تصورات اور اصول تھے جن کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اسلام کے اثرات کو ہم ہند مختلف گوشوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نظام حیات جب کسی دوسری تہذیب سے دوچار ہوتا ہے تو اس مخصوص علاقے میں زندگی کی ایک نئی تصویر وجود میں آجاتی ہے اس کے دو رخ ہوتے ہیں۔ وہاں کی آبادی کا ایک حصہ اس نظام کو کلیتہً اور علانیہ طور پر اختیار کر لیتا ہے، یہ لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں اور اسلامی اقدار کی بنیادوں پر ایک نیا اسلامی معاشرہ تعمیر کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ عمارت مخصوص علاقائی حدود کے اندر محدود رہتی ہے لیکن اپنے بنیادی اصولوں اور نمایاں خصوصیات کی بنا پر ہند دوسرے علاقوں کے اسلامی معاشروں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔ اس اسلامی معاشرے کے علاوہ جو کلیتہً اسلامی اقدار پر قائم ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اسلام کی تعلیمات اور تصورات سے ایک حد تک متاثر ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی کو چھوڑ کر برصغیر کے مختلف علاقوں میں غیر مسلموں کے تمدن اور ان کے دینی تصورات کا غور سے تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اسلامی تہذیب کے اثرات کثرت سے ملیں گے، چونکہ تصویر کا یہ پہلو ہمارے موضوع سے علیحدہ ہے اس لئے ہم اس مسئلہ پر بحث نہیں کریں گے۔ؔ

اسلام کا معاشرتی تصور، انگیز اخوت اور انسانی مساوات کو بنیادی حیثیت دیتا ہے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا کو یہ اصول، انقلاب فرانس نے عطا کئے، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے

ؔ اسلام نے برصغیر کی زندگی کو کس حد تک متاثر کیا اور یہاں کی تہذیب کو کیوں کر آگے بڑھایا، یہ تاریخ کا بہت اہم مسئلہ ہے نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے مورخین نے اس کی طرف بہت کم توجہ دی ہے، ڈاکٹر تاراچند کی کتاب انفلوئنس آف اسلام ان انڈیا کو شائع ہوئے پچیس سال سے زیادہ گذر گئے، اس کے بعد کسی مورخ نے اس کو اپنا موضوع تحقیق نہیں بنایا۔

Marfat.com

یہ تاریخ کی ان مشہور غلطیوں میں ہے جن کے متعلق تعلیم یافتہ طبقے بہ بنائے تعصب اپنا خیال بدلنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ بہر حال تاریخی حقیقت پسندی اس سے انکار نہ کر سکے گی کہ ان اصولوں کا اعلان اب سے چودہ سو سال پہلے نہایت صاف اور مؤثر الفاظ میں اس وقت کیا گیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور خطبہ حجۃ الوداع میں رنگ اور نسل کے تفوق کو مہمل قرار دیا اور کہا کہ وہ طبقاتی تقسیم کو پہچاننے میں سہولت پیدا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ان اصولوں کی عملی تعمیر کو اسلام کی تاریخ میں ملتی ہے۔ جو شخص بھی اس برادری میں داخل ہوا اس کی حیثیت بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس نسل کا ہے اور کس رنگ کا دوسروں کے برابر ہوگئی۔ معاشرہ کی ان خصوصیات کو قائم رکھنے کا سب سے مضبوط ذریعہ شریعت تھی اور ان اصولوں کی اشاعت کا سب سے مؤثر طریقہ ابتدائی دور کے مشہور کرام صوفیاء کی کوششیں۔ مختصراً شریعت اور طریقت کا امتزاج اسلامی معاشروں کی بنیاد بنتا تھا۔ مشائخ کے سلاسل نے شمالی ہند پاکستان میں کس طرح یہ خدمات انجام دیں، ان کا کچھ ذکر کیا جا چکا ہے، اب ہم دیکھیں گے کہ علاقائی سلطنتوں میں اس کام کی کیا نوعیت تھی۔ اختصار کے پیش نظر ان سلطنتوں اور چند مشائخ کا ذکر کیا جا سکے گا۔

بنگال، بہار و جونپور

محمد بن بختیار خلجی کی فتوحات کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ فتوحات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس کی سرپرستی میں مساجد اور درس گاہوں کی بنیادیں رکھی گئیں۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ لکھنوتی کو آباد کر کے اس نے اسی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ محمد بن بختیار زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہا۔ لیکن بنگال کا علاقہ اب اسلامی حکومت کا ایک اہم صوبہ بن گیا اور یہ اہمیت ہمیشہ باقی رہی۔ سب سے پہلے مشہور بزرگ جو بنگال میں آئے اور جن کے حالات ہم تذکرہ کتابوں میں ملتے ہیں، شیخ جلال الدین ابو القاسم تبریزی ہیں۔ وہ ابتداء میں شیخ بدر الدین ابو سعید تبریزی سے بیعت ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین

سہروردی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور سات سال ان کی خدمت میں رہے، بغداد سے التتمش کے زمانہ میں وہ دہلی آ گئے، بیان کیا گیا ہے کہ سلطان نے بے حد عزت و احترام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے استقبال کے لئے خود شہر سے باہر آیا، شیخ نجم الدین صغریٰ اس زمانہ میں شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز تھے، ان کو یہ گوارا نہ ہوا کہ سلطان ایک نو وارد شیخ کا اس قدر احترام کرے، انہوں نے شیخ جلال کی مخالفت شروع کی، اس سلسلے میں ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کی آتش حسد بڑھتی ہی گئی، سیر العارفین میں ایک واقعہ کا ذکر ہے، شیخ جلال، نماز فجر، عشا کے وضو سے ادا کیا کرتے تھے اور اول وقت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے، شیخ نجم الدین کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا، ایک موقع پر التتمش نماز فجر کے بعد محل کی چھت پر تفریح کے لئے چلا گیا، نجم الدین بھی موجود تھے، وہاں سے شیخ جلال کے مکان کا صحن صاف نظر آتا تھا، شیخ بہیں رضائی اوڑھے ہوئے سو رہے تھے اور ایک جوان العمر غلام ان کے پیر دبا رہا تھا، نجم الدین نے سلطان سے کہا۔ دیکھئے نماز کے وقت یہ شیخ سو رہے ہیں اور ایک جوان العمر لڑکا پیر دبا رہا ہے، سلطان نے کہا کہ شاید نماز پڑھ چکے ہیں اور ان جیسے متقی کے پیر اگر کوئی لڑکا دبا رہا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ نجم الدین کی آتش حسد اس جواب سے اور زیادہ بڑھ گئی، اس نے ایک سازش کی، ایک طوائف سے جس کا نام گوہر تھا یہ طے کیا کہ وہ اس کو پانچسو دینار دے گا، اگر وہ بھرے جلسے میں یہ کہہ دے کہ شیخ جلال نے اس کے ساتھ زنا کیا ہے، ڈھائی سو دینار اس وقت دیدئے اور ڈھائی سو احمد شرف نامی ایک بقال کے پاس بطور امانت جمع کر دئے

لہ شیخ الاسلامی کے عہدہ اور اس کی حیثیت کے لئے دیکھو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی دی ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف دہلی (مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۱۹۰۳ء)

Marfat.com

اس کے بعد بادشاہ کو مجبور کر کے علماء اور مشائخ کا ایک جلسہ بلوایا تاکہ وہاں فیصلہ کیا جائے اس جلسہ میں گوہر نے صاف کہہ دیا کہ یہ قطعاً غلط ہے اور نجم الدین نے میرے ساتھ مل کر سازش کی تھی، اس پر سلطان نے نجم الدین کو فوراً برخاست کر دیا۔[1]

اس واقعہ کے بعد شیخ جلال الدین نے بھی دہلی میں مزید قیام نہیں کیا، وہ بدایوں آ گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کیا، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کو مقبولیت حاصل ہوئی اور کچھ لوگ ان کے اثر سے مشرف بہ اسلام بھی ہوئے ایک واقعہ کا ذکر تو سیر العارفین میں بھی ہے۔ ایک ہندو جو دہی بیچا کرتا تھا اسلام لایا اور بعد میں ان کے خلفاء میں شامل ہوا، جب شیخ جلال الدین بدایوں سے بنگال جانے لگے تو اس کو یہ کہہ کر کہ "این مقام بحوالہ تو نمودم" وہیں چھوڑ گئے۔

بنگال پہنچکر شیخ جلال الدین نے دیوہ محل[2] میں قیام کیا اور وہیں کچھ زمین وغیرہ خرید کر خانقاہ اور تکیہ قائم کیا، یہاں بہت جلد ان کے معتقدین کی تعداد بڑھنے لگی۔ اس عہد کے دوسرے مشائخ کی طرح شیخ جلال بھی تبلیغ اسلام کو اپنا مقصد اول قرار دیتے تھے۔ ان کی ان خدمات کی طرف صاحب سیر العارفین نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "حضرت شیخ در آنجا بسیار کافر را مسلمان ساخت"۔

---

[1] سیر العارفین ص ۱۶۷-۱۶۸۔

[2] اس نام کے متعلق بعض مؤرخین کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے اور ان کا خیال ہے کہ شاید اس سے بندر دیو یا مالدیو جزیرہ مراد ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھو جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، جلد ششم، حصہ سوم اسی مقالہ میں اس پر بھی بحث ہے کہ شیخ جلال جن کا مزار سلہٹ میں ہے، وہ شیخ جلال الدین تبریزی سے مختلف بزرگ تھے۔

شیخ سراج الدین عثمان المشہور بہ اخی سراج

شیخ جلال الدین تبریزی کا تعلق سہروردیہ سلسلہ سے تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ سہروردیہ بزرگوں کا مرکز ملتان تھا لیکن اس سلسلہ کی ایک شاخ بنگال پہنچ گئی شیخ جلال الدین کے بعد بنگال کے مشائخ میں شیخ سراج الدین عثمان قابل ذکر ہیں وہ خود بنگالی تھے اور لکھنوتی کے رہنے والے تھے۔ ابھی جوان العمر ہی تھے کہ شیخ نظام الدین اولیاء سے بیعت ہو گئے اور عرصہ تک ان کی خدمت گزاری کرتے رہے، شیخ نے ان سے کہا کہ ان کو خلافت اس لئے نہیں دی جاسکتی کہ وہ ظاہری علوم سے بے بہرہ ہیں اور "اول درجہ دریں کار علم است" اس پر ان کے ایک پیر بھائی مولانا فخر الدین زرادی نے ان کو تعلیم دینا شروع کی اور جلد ہی اس قابل کردیا کہ وہ خلافت کے مستحق ہو گئے[1] بعد میں انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل ایک اور عالم مولانا رکن الدین سے کی، شیخ نظام الدین اولیاء کے بعد وہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی خدمت میں رہے اور ان سے بھی خلافت نامہ حاصل کیا۔

محمد بن تغلق کے عہد میں جب دہلی کے لوگوں کو دیوگیر کی طرف بھیجا جارہا تھا اس زمانہ میں شیخ سراج جو ابھی تک یہیں مقیم تھے اپنے وطن لکھنوتی کی طرف چلے گئے، یہاں بہت جلد ان کی شہرت پھیل گئی اور بنگال کے مشہور بزرگ شیخ علاء الحق ان سے بیعت ہو گئے۔

نور قطب عالم حب

علاء الحق، شیخ اسعد لاہوری کے بیٹے تھے، انہوں نے بہت عزت حاصل کرلی تھی اور ان کا شمار دولت مند لوگوں میں ہوتا تھا۔

---

[1] یہ واقعہ دلچسپ ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ سربرآوردہ مشائخ ظاہری علم پر بہت زور دیتے تھے، مولانا فخر الدین کو اپنے برادر دینی شیخ سراج سے اس قدر محبت تھی کہ انہوں نے ان کے لئے ایک خاص رسالہ تصنیف کیا اور اس کا نام ان ہی کے نام پر عثمانی رکھا۔

(اخبار الاخیار ص ۸۷)

Marfat.com

لیکن جب وہ اخی سراج کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو سب کچھ ترک کر دیا اور مرشد کی خدمت میں رہنے لگے۔ مرشد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور جلد ہی ان کا حلقۂ اثر وسیع ہو گیا۔ ۷۹۸ھ میں وفات پائی اور پنڈوہ میں دفن ہوئے۔ شیخ علاء الحق کے صاحبزادے اور خلیفہ شیخ نور الحق المعروف بہ نور قطب عالم اپنے عہد کے مشاہیر اولیاء میں تھے اور بقول شیخ عبد الحق محدث دہلوی صاحب عشق و محبت و ذوق و شوق و لقدرت و کرامت تھے ان کی ریاضات اور نفس کشی کے متعدد واقعات اخبار الاخیار میں درج ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے کس قدر سخت محنت کرائی جاتی تھی، خانقاہ میں رہنے والوں کی خدمت ان کو سپرد کی گئی تھی۔ آٹھ سال تک وہ لکڑیاں کاٹ کر لانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے بڑے بھائی جو وزارت کے عہدے پر فائز تھے یہ حالت دیکھ کر افسوس کرتے لیکن شیخ دولت و جاہ کو خیرباد کہہ چکے تھے اور اس کی طرف دیکھنے تک کے بھی روادار نہ تھے۔ شیخ عبد الحق نے ان کے بعض اقوال نقل کیے ہیں، مثلاً اپنے خلیفہ شیخ حسام الدین مانک پوری کو رخصت کرتے وقت انہوں نے ہدایت کی:

در سخا ہمچو آفتاب باشی و در تواضع ہمچو آب و در تحمل چوں زمین، و جفائے خلق بکشی۔[۱]

شیخ عبد الحق نے ان کے مکتوبات کو "بغایت شیریں و لطیف، بزبان اہل درد و محبت" بتلایا ہے اور ان مکتوبات کے کچھ اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔ مکتوبات کے علاوہ ایک رسالہ انیس الغرباء بھی ان کی تصنیف ہے، یہ شائع ہو چکا ہے۔

سلطان غیاث الدین جو اس وقت بنگال کا حکمران تھا قطب عالم کا ہم درس رہ چکا تھا اور آپ کا بہت احترام کرتا تھا۔ دیناج پور کے ایک ہندو زمیندار راجہ کنس

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۵۳۔

دگنیش[1]) نے سازش کرکے سلطان کو قتل کرا دیا اور بالآخر اس نے خود تخت پر قبضہ کر لیا اقتدار ملنے کے بعد کنس نے اسلام دشمنی کی پالیسی اختیار کی۔ اکثر علماء اور مشائخ کو مقتول تیغ ستم کیا اور چاہتا تھا کہ اپنے علاقہ میں اسلام کو جڑ سے ختم کر دے[2] تو قطب عالم صاحب نے فیصلہ کیا کہ اسلام کی حفاظت کے لئے موثر قدم اٹھایا جائے، چنانچہ انہوں نے جون پور کے سلطان ابراہیم کو بنگال کے مسلمانوں کی مدد کے لئے آنے کی دعوت دی۔ جونپور میں اس وقت ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی موجود تھے، انہوں نے سلطان کو بتلایا کہ دینی اور دنیوی بہبود کا تقاضا یہی ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کی مدد کی جائے، چنانچہ جونپور کی فوجیں بنگال کی طرف روانہ ہوئیں، کنس ڈر گیا اور قطب عالم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پیشکش کی کہ وہ تخت سے دست بردار ہو جائے گا اور اس کا لڑکا مسلمان ہو کر اس کا جانشین ہوگا۔ اس کی یہ درخواست منظور ہو گئی اور کنس کا لڑکا جدو اسلام لایا اور جلال الدین ابو مظفر محمد شاہ کے نام سے تخت بنگال پر بیٹھا[3] اس سلطان کے عہد میں اسلام کی اشاعت اور ترقی بہت زیادہ

---

[1] فارسی تاریخوں میں اس کا نام کنس ہے لیکن جدید مورخ کہتے ہیں کہ یہ گنیش کی بگڑی ہوئی شکل ہے

[2] غلام حسین، ریاض السلاطین (کلکتہ ایڈیشن) ص ۱۰۸۔

[3] یہ واقعات مزید تفصیلات کے ساتھ ریاض السلاطین میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بعض مورخین کی نظر میں ریاض السلاطین کے مقابلہ میں طبقات اکبری اور فرشتہ کے بیانات زیادہ قابل وثوق ہیں اس بناء پر کنس کا اقتدار حاصل کرنا اور شاہ جونپور کی افواج سے ڈر کر اس سے دستبردار ہو جانا ایک مختلف فیہ مسئلہ بن گیا ہے، بہرحال جدید تحقیق کی نظر میں ریاض السلاطین کے واقعات بنیادی طور پر صحیح ہیں، تفصیلات میں کچھ شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھو جادو ناتھ سرکار کا مقالہ (باب پنجم، ہسٹری آف بنگال، جلد دوم، شائع کردہ یونیورسٹی آف ڈھاکہ

Marfat.com

ہوئی۔ قطب عالم صاحب نے ۸۱۳ھ (۱۴۱۰ء) میں وفات پائی، پنڈوہ میں آپ کا مزار مبارک آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے۔

نور قطب عالم صاحب کا اثر بنگال کے باہر

نور قطب عالم صاحب کی شخصیت اور کارنامے صرف مقامی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ملکی اور ملّی نقطہ نظر سے بھی بہت اہم تھے۔ بنگال میں تو آپ کے بعد آپ کی اولاد[1] کے ذریعہ سلسلہ جاری رہا، لیکن آپ نے جن خلفاء کو تربیت دی تھی ان میں سے بعض برصغیر کے دور دراز علاقوں میں گئے اور رشد و ہدایت اور تبلیغ و اشاعت کی خدمات وہاں انجام دیں۔ یہاں ان واقعات کی طرف اشارہ کرنا ممکن نہیں لیکن یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ آپ کے ایک خلیفہ شیخ حسام الدین مانک پوری اپنے وطن میں آکر مقیم ہوئے[2]۔ آپ کے ایک اور خلیفہ شیخ شمس الدین طاہر تھے۔ ان کا وطن رنتنبھور (راجپوتانہ) تھا۔ شیخ عبدالحق کا بیان ہے کہ وہ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے، اجمیر کے شہر میں بغیر وضو داخل نہ ہوتے اور اس قدر احترام کرتے کہ وہاں تھوکتے بھی نہ تھے[3]۔ ان کے علاوہ اپنے ایک اور خلیفہ شاہ کاکو کو انہوں نے لاہور بھیجا، وہ وہیں مقیم رہے اور اس علاقہ کے لوگوں کو فیضیاب کرتے رہے۔ آپ کی خانقاہ اور مدرسہ (لنڈا بازار لاہور) میں ایک مدت دراز تک مرکز علم تربیت بنی رہی۔ ان مختصر اشارات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نور قطب عالم صاحب نے

---

[1] نور قطب عالم صاحب کے بڑے صاحبزادے کا نام رفعت الدین اور چھوٹے کا شیخ انور تھا۔ اخبار الاخیار ص ۱۶۵-۱۶۶۔

[2] شیخ حسام الدین کے ملفوظات رفیق العارفین کا ذکر شیخ عبدالحق نے بار بار کیا ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف انیس العاشقین شائع ہو چکی ہے۔

[3] اخبار الاخیار ص ۱۷۵۔

Marfat.com

کس طرح اپنے خلفاء کے ذریعہ بنگال کے علاوہ دوسرے علاقوں میں کس طرح اپنے سلسلہ کو پہنچایا، اسلامی معاشرہ کی یگانگت قائم رکھنے اور اس کو مستحکم کرنے میں یہ اقدامات بہت موثر ثابت ہوئے، ان کے نتائج بہت دوررس ہوئے، بالآخر ہند و پاکستان میں اسی بنیاد پر مسلمانوں نے اپنی علیحدہ قومیت بنائی۔

شیخ جلال سلہٹیؒ

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے علاوہ ایک سہروردی بزرگ نے بھی بنگال میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کے اقتدار کی توسیع میں نمایاں حصہ لیا ہے، شیخ جلال کا مزار آج بھی مشرقی بنگال کا اہم ترین روحانی مرکز ہے۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ جلال کا تعلق اچھ کے مشہور سہروردیہ خاندان سے تھا، والدین کے سایہ عاطفت سے محروم ہونے کے بعد سید احمد کبیر سہروردی کے زیر تربیت آ گئے۔ اسی کم عمری سے شیخ جلال نے ریاضات و عبادات میں وقت گزارا، آخر کار آپ کے رہنما سید احمد کبیر نے ہدایت کی کہ وہ سفر پر جائیں اور ان کو کچھ مٹی دی اور کہا کہ جہاں کہیں اس رنگ اور بو کی مٹی ملے وہیں مقیم ہو جائیں، اسی سفر کے دوران وہ دہلی ہوتے ہوئے جہاں ان کو شیخ نظام الدین اولیاء کی قدمبوسی کا موقع بھی ملا، وہ سلہٹ پہنچے اور آخر کار وہیں اپنے ساتھی فقراء کے ساتھ قیام کیا۔

سلہٹ کا ہندو راجہ گیڑ گوبند ایک ظالم حکمران تھا، یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس کے

لہ شیخ جلال سلہٹی کے حالات معاصر یا نیم معاصر تذکروں میں موجود نہیں، بعد کی تصانیف میں بہت سی ناقابل اعتبار روایتیں شامل کر لی گئی ہیں، بہر حال اس میں شک نہیں کہ سلہٹ کی فتح اور اس کے بعد وہاں کے لوگوں کی تربیت اور اشاعت اسلام میں شیخ جلال نے نمایاں رول ادا کیا، اس کی شہادت ہم کو ایک کتبہ سے بھی ملتی ہے جو ڈھاکہ کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

Marfat.com

علاقے میں ایک مسلمان برہان الدین کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے خوشی میں ایک گائے ذبح کی، اتفاق سے گوشت کا ایک ٹکڑا چیل لے گئی اور اس کی چونچ سے نکل کر وہ ایک برہمن کے گھر میں گر گیا، برہمن نے راجہ سے شکایت کی، اس نے برہان الدین کا ہاتھ کٹوا دیا اور اس کے نومولود بچہ کو قتل کرا دیا، برہان الدین نے سلطان بنگال سے شکایت کی، چنانچہ اس نے ایک لشکر سلہٹ کے خلاف روانہ کیا، راجہ کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی اور پہلی کوشش میں مسلمانوں کو شکست ہوئی، سردار فوج شیخ جلال کی خدمت میں حاضر ہوا اور امداد کی درخواست کی۔ شیخ نے دعا بھی کی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوج میں شامل ہو گئے۔ آخر کار مسلمانوں نے سلہٹ پر قبضہ کر لیا، فتح کے بعد اشاعت مذہب اور تربیت روحانی کا سلسلہ جاری رہا۔[1]

بنگال میں صوفیاء و مشائخ کے سلسلوں کی اشاعت اس تیزی کے ساتھ ہوئی کہ بعض اوقات مورخ کو اس سے حیرت ہوتی ہے اور وہ اپنے علم اور واقفیت کی روشنی میں اس کے اسباب تلاش کرتا ہے، مثلاً ایک انگریز مقالہ نگار ہیملٹن لکھتا ہے:

"کہ اس دور میں مشائخ اور غازیوں کی کثرت غالباً سلاطین دہلی کے کسی منصوبہ کے تحت تھی"

دور جدید کے ایک ہندو مورخ نے یہ رائے قائم کی ہے:

"کہ یہ غازی اور اولیائے اسلام اس عہد کے ملک کی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کرتے رہے ہیں"

ان مورخین کی حیرت بڑی حد تک بجا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اکثر ہمارے تاریخ نگار واقعات کا سطحی مطالعہ کرتے ہیں، درباروں کی شان و شوکت اور میدان ہائے جنگ کی ہنگامہ خیزیوں

---

[1] ہسٹری آف بنگال (جلد دوم ص ۷۹) کے مقالہ نگار کا بیان ہے کہ برہان الدین سے متعلق روایت ہندو ماخذ میں بھی ملتی ہے۔

Marfat.com

الگ ہو کر ان لوگوں کو خانقاہوں اور مدرسوں کے بوریا نشینوں کے پاس بھی جانا ضروری ہے

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

بنگال سے ملحق بہار کا علاقہ ہے جس نے بعد میں ایک علیحدہ صوبہ کی حیثیت اختیار کرلی، قرون وسطیٰ میں اس کا اکثر علاقہ بنگال میں شامل تھا، لیکن بعد میں جو صوبہ وجود میں آیا وہ زبان وغیرہ کے لحاظ سے بنگال کے مقابلہ میں مغربی علاقے یعنی اودھ وغیرہ سے نزدیک تر تھا، آج بھی یہی کیفیت ہے۔ بہار میں بہت سے مشائخ نے کام کیا، لیکن ہم یہاں صرف دو کا مختصر ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا شمار ان مشائخ میں ہے جن کی شہرت عبادات و ریاضات ہی کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے اپنے عہد کے معاشرہ کی اصلاح کے سلسلہ میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں، ان کی تصانیف جن کی تعداد بہت زیادہ تھی، آج اہل نظر بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، شیخ شرف الدین ۶۶۱ھ میں قصبہ منیر (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ظاہری علوم کی تکمیل اس عہد کے ایک بڑے عالم مولانا شرف الدین سے سنارگاؤں میں کی، تفسیر، حدیث، فقہ کے علاوہ منقولات کی کتابیں پڑھیں، طالب علمی ہی کے زمانہ میں ریاضت و مجاہدہ کا سلسلہ شروع ہو گیا، مکان واپس آنے کے بعد وہاں زیادہ قیام نہیں کیا، اب ان کی خواہش تھی کہ کسی بزرگ سے بیعت کریں۔ چنانچہ دہلی آئے اور شیخ نظام الدین اولیاء سے درخواست کی، انہوں نے فرمایا کہ تم شیخ نجیب الدین فردوسی سے بیعت کرنا انہوں نے اس ارشاد کی تعمیل کی، بیعت کے بعد "حزنے در دل من نہادہ شد کہ ہر روز آں حزن زیادہ می شد" وطن واپس پہنچنے پر جذب کی یہ کیفیت زیادہ بڑھ گئی اور وہ آرہ کے علاقہ میں ایک جنگل میں چلے گئے، جہاں برسوں عبادت و ریاضت میں مصروف رہے، ایک عرصہ کے بعد جنگل سے قصبہ بہار میں آگئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، رفتہ رفتہ ان کی شہرت ملک کے مختلف حصوں میں پھیلنے لگی۔ سلطان محمد بن تغلق بھی ان کے کردار سے متاثر ہوا، اس نے مقامی حکام کو لکھا کہ شیخ کے لئے ایک خانقاہ بنوائی جائے اور پرگنہ راجگیران کو بطور جاگیر

Marfat.com

دیا جائے، حکام کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اگر شیخ اس کے قبول کرنے میں عذر کریں تو اس کو نہ مانا جائے، چنانچہ شیخ شرف الدین نے بہ جبر و اکراہ یہ قبول کر لیا۔ شاید اس وجہ سے کہ سلطان کے مزاج سے وہ واقف تھے، اس کی حکم عدولی کا نتیجہ کیا ہوتا نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ جاگیر آپ کے لئے بارگراں کی حیثیت رکھتی تھی، محمد بن تغلق کی وفات کے بعد شیخ سلطان فیروز شاہ کے پاس آئے اور کہا کہ ایک درخواست ہے، جب سلطان نے وعدہ کر لیا کہ وہ قبول ہوگی تو اس پر شیخ نے جاگیر کی سند آستین سے نکال کر سلطان کو دی اور کہا خدارا یہ واپس لے لیجئے۔ سلطان اور اس کے امراء یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ بہر حال فیروز نے ایک رقم پیش کی اور اصرار کیا کہ اس کو قبول کر لیں۔ آپ نے وہ رقم لے لی لیکن باہر آکر غرباء میں تقسیم کر دی۔[1]

یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے بلند کردار بزرگ کی شخصیت بہت جلد رشد و ہدایت کا مرکز بن گئی ہوگی۔ ان کی خانقاہ میں مختلف طبقات کے لوگ آتے جن میں عالم اور جاہل سب ہی ہوتے اس کے علاوہ مکتوبات کے ذریعہ وہ سلطان اور دیگر با اثر لوگوں کو نہایت موثر الفاظ میں نصیحتیں کرتے تھے اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو ان لوگوں کے نام انہوں نے لکھے ہیں اور جن میں سے بعض ان مکتوبات کے مجموعوں میں شامل ہیں۔[2] مثال کے طور پر ایک خط کا ذکر کیا جا سکتا ہے، شیخ کے پاس ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ اس کی جائداد حکام نے ضبط کر لی ہے اور اس پر بہت ظلم کیا گیا ہے۔ شیخ نے سلطان وقت یعنی فیروز شاہ کو ایک خط کے ذریعہ

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم صوفیہ (اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء) ص ۳۶۰۔

[2] مکتوبات کا ایک مجموعہ مکتوبات صدی۔ دوسرا مجموعہ مکتوبات دو صدی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں،

ان کے علاوہ ایک اور مجموعہ مکتوبات بست و ہشت کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

Marfat.com

عدل و انصاف کی تلقین کی، یہ خط بہت اہم ہے، اس میں شیخ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ بیان کیا جس میں آنحضرت نے ایک مظلوم عیسائی کی فریاد پر ابوجہل سے اس کا مال واپس کرایا، یہ واقعہ نہایت موثر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد رقعتیں بھی ظلم کی مذمت اور مظلوم کی مدد کے بارے میں لکھیں، اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

"الحمد للہ کہ آپ (یعنی سلطان فیروز شاہ) کی ذات معظم و مکرم، مظلوموں اور درماندوں کی جائے پناہ ہے اور آپ کی بارگاہ کا عدل و انصاف دنیا میں ظاہر ہو چکا ہے اور انصاف کو یہ سعادت حاصل ہوتی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:۔

ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، عاقبت بخیر ہو"[1]

مکتوبات میں امراء کے خطوط میں جن میں امراء، حکام اور ارباب اقتدار کو نصیحتیں کی گئی ہیں اور خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ عاجزوں، ضرورت مندوں اور بے کسوں کی مدد، بہترین نیکیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ایک حکمران کا ذکر کیا کہ وہ نفل نمازیں بہ کثرت پڑھتا ہے۔ اور نفل روزے رکھتا ہے، آپ نے فرمایا کہ بے چارے نے اپنا کام چھوڑ رکھا ہے اور دوسروں کا کام کرتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ لوگوں کی ضروریات پورا کرنا اور غرباء کی دیکھ بھال، یہ کام اس کے فرائض میں داخل ہیں۔

شیخ کی تعلیمات اور تربیت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اتباع سنت اور پابندی شرع پر بہت زور دیتے تھے، فرماتے تھے: "با خدا دیوانہ باش و با مصطفےٰ ہوشیار"[1] مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرہ کو شریعت کی راہ پر چلانے اور ارباب اقتدار کو جو ہر زمانہ میں نشہ قوت میں چور رہتے ہیں بلندی کردار کی اہمیت کا احساس دلانے کی جو کوشش مشائخ

---

[1] سہ صدی مکتوبات ۴۹۲-۴۹۳۔

Marfat.com

اور علماء پیدا کیے ہیں ان میں شیخ شرف الدین کا کارنامہ خاص طور پہ قابل ذکر ہے۔ اس کی اہلیت اسی شخص میں ہو سکتی ہے جو خود اپنے کردار میں اعلیٰ اوصاف پیدا کرے۔ شیخ شرف الدین نے عبادت و ریاضت کے علاوہ انسانی ہمدردی، خدمت خلق، عجز و انکسار اور دوسری خصائص حسنہ اپنے کردار میں جس طرح پیدا کیں اس کا ذکر تذکروں میں تفصیل سے ملتا ہے ان کے مکتوبات اور دیگر تصانیف میں اس کی شہادت موجود ہے۔

سید شاہ اشرف جہانگیر سمنانی رح

سید اشرف سمنان کے حاکم کے لڑکے تھے، یہیں پیدا ہوئے اور والد کے بعد ان کے عہدے پر فائز ہوئے، ابتدا ہی سے مذہبی رجحانات بہت قوی تھے اس لیے کافی وقت ریاضت میں صرف کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز خواب میں خضرؑ نے ہدایت کی کہ اگر روحانی دولت چاہتے ہو تو دنیوی اقتدار و ثروت سے کنارہ کشی کرو۔ اس کے بعد جاہ و دولت چھوڑ کر تلاش ہدایت میں سید اشرف نے سفر اختیار کیا۔ بخارا و سمرقند گئے اور وہاں سے برصغیر کی طرف روانہ ہوئے۔ اوچ پہنچ کر مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ملاقات کی اور ان ہی کی ہدایت پر شیخ علاء الحق کی قدمبوسی کے لیے بنگال کی راہ لی۔ اثنائے سفر میں دہلی بھی ٹھہرے۔ جس وقت قصبہ بہار میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ شیخ شرف الدین منیری کا جنازہ تیار ہے۔ سید اشرف ہی نے نماز پڑھائی۔[۱] کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے وہ بنگال کے لیے روانہ ہوئے۔ روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ شیخ علاء الحق بنگالی کو ان کی آمد کشف سے معلوم ہو گئی تھی چنانچہ وہ ایک جماعت کو لے کر شہر کے باہر استقبال کے لیے گئے اور نہایت عزت کے ساتھ لا کر ان کو ٹھہرایا

۱؎ شیخ شرف الدین نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا جائے جس میں ان کی بتلائی ہوئی چند خصوصیات ہوں، اتفاق سے وہ سید اشرف ہی میں تھیں، چنانچہ انہی نے نماز پڑھائی۔

Marfat.com

کیا، بارہ سال تک وہ پیر کی خدمت میں رہے، اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر جونپور آئے جو اس وقت سلاطین شرقیہ کا دارالحکومت تھا۔[1] یہاں آکر کچھ عرصہ تو یہیں قیام کیا بعد میں اودھ مقامات اور بالآخر کچھوچھہ میں مستقل سکونت اختیار کی، محرم ۸۰۸ھ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

جون پور میں بکثرت لوگ سید اشرف سے معیت ہوئے، ان میں ملک العلماء شہاب الدین بھی تھے، سلطان ابراہیم شاہ بھی آپ کا معتقد تھا۔ کئی مرتبہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضیاب ہوا۔ شہاب الدین کے علاوہ سید اشرف جہانگیر کے کثیر التعداد معتقدین و مریدین میں بہت سے علماء بھی شامل تھے ان میں مثال کے طور پر شمس الدین، ردولی کے شیخ صفی الدین جائس کے مولانا غلام الدین کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ایک عالم خیر الدین اس لئے مرید ہوئے کہ چند فقہ و اصول کے مسائل انہوں نے بہت سے علماء سے دریافت کئے لیکن تسلی بخش جواب

---

[1] سفر پر روانہ ہونے کے لئے جب تیاریاں کر رہے تھے تو مرشد نے دریافت کیا کہ کیا ارادہ ہے جواباً عرض کیا: میاں برائے خدمت می بندم، مرشد نے فوراً کہا: اگر می بندی محکم بہ بند کہ ہیچ درمیان نماری، سید اشرف کا جواب یہ تھا: آرزوئے نفس از میان بیرون کشیدہ ام نارنندہ ام (لطائف اشرفی ص ۳۰۴) خدمت سے یہاں مراد خدمت خلق ہے یہ امر قابل غور ہے کہ خدمت خلق کے لئے صوفیا نفس کشی ضروری سمجھتے تھے، بعض مورخین نے ان حضرات کی نفس کشی اور ترک علائق کو رہبانیت سے متماثل قرار دیکر غلط نتائج اخذ کئے ہیں اور چند تنگ نظر لکھنے والے توان کے کردار کو اسلام کے خلاف بتلانے کی حد تک بڑھ گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات اس اصول پر کام کرتے تھے کہ خدمت خلق بے غرض ہو کر کی جائے، بے غرضی کے لئے اپنی ضروریات کو کم کرنا اور نفس کے تقاضوں کو مارنا ضروری تھا۔

Marfat.com

صرف سید اشرف ہی نے لیا، ان کا اثر لوگوں پر برابر بڑھتا رہا[1]۔ اس کی وجہ ان کا کردار ہی تھا۔ ان کے ایک مرید نواب سیف خان نے ایک موقع پر ایک گاؤں نذر کرنا چاہا تو آپ نے ان الفاظ میں قبول کرنے سے معذرت کی:

"کسے را کہ قریۂ روزگار زیر گنبد سپردہ باشد، او باین جزوی قریات مقید نہ شود۔"

سلاطین و امراء سے تعلقات کا صرف یہی جواز تھا کہ ان کو تربیت دے کر اسلام کا صحیح پیرو بنایا جائے، یہ اس لئے ضروری تھا کہ اس دور کے معاشرہ میں یہ لوگ کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی اصلاح معاشرہ کے بہت اہم طبقہ کی اصلاح تھی۔ سید اشرف نے سلاطین و حکمران کے لئے بہت واضح ہدایات قلم بند کی ہیں، ان کے خیال میں سلطنت کو چار چیزوں سے بہت نقصان پہنچتا ہے، سلطان کا لذائذ دنیا میں مستغرق ہونا، اپنے امراء سے بد خلقی کے ساتھ پیش آنا، سزا میں زیادتی کرنا، رعیت پر ظلم کرنا۔ لطائف اشرفی میں ان کے ارشادات نہایت تفصیل کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں[2]۔ یہ سید اشرف ہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ فرشتہ کے الفاظ میں "ابراہیم شرقی کے زمانہ میں...... جونپور کا ہر چھوٹا بڑا بادشاہ کے وجود کو باعث

---

[1] سید اشرف جہانگیر کے معتقدوں کی تعداد ہندوستان سے باہر کے علاقوں میں بھی اچھی خاصی تھی۔ خود امیر تیمور اور اس کے بعض امراء بھی آپ سے عقیدت رکھتے تھے۔ امیر تیمور سمرقند میں موجود تھا کہ آپ بھی سفر کرتے ہوئے ادھر پہنچے، اس نے بہت بڑی نذر اپنے ایک امیر جمشید بیگ کے ہاتھ بھیجی۔ سید اشرف نے یہ سارا مال فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ جمشید آپ سے بیعت ہو گیا۔ آخر کار اس کو خلافت عطا ہوئی (لطائف اشرفی جلد اول ص ۱۰۹-۱۰۲)

[2] کچھ حصہ کے اردو ترجمہ کے لئے دیکھو بزم صوفیہ ص ۴۵۶-۵۸۴۔

Marfat.com

برکت سمجھتا اور بعیدِ عیش و آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا، شاہ و گدا سب خوش تھے اور ملک میں حزن و اندوہ کا نام نہ تھا[1] وہ اپنا نظم حکومت شریعت کے مطابق کرنا چاہتا تھا۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لئے اس نے فتاویٰ ابراہیم شاہی مرتب کرائی۔

یہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ سید اشرف اہل دل ہونے کے علاوہ عالم متبحر بھی تھے۔ لطائف اشرفی میں بعض علمی مباحث بہت بلند پایہ ہیں جو ان کی قابلیت کی بہترین شہادت ہیں، ان کے مکتوبات کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مشتمل بر تحقیقات غریبہ کہا ہے۔ تصوف میں ایک رسالہ بشارت المریدین کہی ہے، سید اشرف شریعت کی پابندی پر بہت زور دیتے تھے، انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اولیاء بہ فنا فی اللہ و البقاء باللہ نمی رسند، مگر بہ متابعت شریعت، آن پیشوائے قوافل اصفیاء، مقتدائے طوائف اولیاء یعنی محمد مصطفیٰ صلعم ظاہراً و باطناً، قولاً و فعلاً، اعتقاداً و حالاً ...." اس خیال کا اور مقامات پر بھی ذکر کیا ہے۔

لطائف اشرفی | سید اشرف جہانگیر کے حالات اور تعلیمات پر ان کے ایک مرید نظام الدین یمنی نے مبسوط کتاب تیار کی۔[2] اس میں صرف ان کے حالات ہی نہیں ہیں بلکہ بہت سے اہم مسائل پر عالمانہ بحثیں ہیں۔ اس زمانہ میں ایک اہم اور مختلف فیہ مسئلہ وحدت الوجود کا تھا، اس پر لطائف اشرفی میں بڑی مفصل اور محققانہ بحث کی گئی ہے، تصوف کے دوسرے مسائل پر بھی بہت اچھی بحث کی گئی ہے، شریعت، تصوف کے علاوہ اخلاق کردار اور دوسرے معاشرتی مسائل پر بھی جا بجا خیال کیا گیا ہے، ان میں سے بعض موضوعات یہ ہیں: توکل، تسلیم و رضا، جود و سخا، مہمان نوازی وغیرہ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاد پر بھی انہوں نے بہت زور دیا ہے۔

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۳۰۴۔ [2] نصرت المطابع دہلی سے ۱۲۹۵ھ میں شائع ہو چکی ہے لیکن اب نایاب ہے۔

Marfat.com

"حضرت قدوۃ الکبریٰ می فرمودند جہاد کردن در راہ خدائے تعالیٰ فرض است بر جمیع عباد وقتیکہ خروج کفار شود، اما در زمن خروج کفار فرض کفایہ باشد"[1]

قاضی شہاب الدین دولت آبادی

فرشتہ کے قول کے مطابق غزنین کے رہنے والے تھے لیکن ان کی نشو ونما دولت آباد میں ہوئی، مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ وہ پیدا بھی دولت آباد ہی میں ہوئے تھے، دہلی میں مولانا خواجگی سے تحصیل علوم کی اور تیمور کے حملہ کے وقت ان ہی کے ساتھ کالپی چلے گئے وہاں سے جونپور گئے سلطان ابراہیم ان کا بے حد قدردان تھا، ان کو ملک العلماء کا خطاب دیا، یہیں انہوں نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ ۸۴۹ھ (۱۴۴۵ء) میں وفات پائی اور سلطان ابراہیم کی بنوائی ہوئی مشہور مسجد اٹالہ میں جنوب کی جانب دفن ہوئے۔ قاضی شہاب الدین اپنے عہد کے بہت بڑے عالم شمار کئے جاتے ہیں، شیخ عبدالحق کا خیال ہے کہ اس عہد کے بہت کم لوگوں کو اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی تفسیر بحر مواج کافی مشہور ہے اور شرح کافیہ تو "در بلاغت ومتانت بے عدیل واقع شدہ وہم در حالت حیات او مشہور عالم گشتہ"، ارشاد (علم نحو پر) بدایع البیان (بلاغت) شرح بزدوی (اصول فقہ) مناقب السادات اور فتاویٰ ابراہیمی قابل ذکر ہیں[2]۔

---

[1] لطائف اشرفی، جلد دوم ص ۱۲۵۔

[2] قاضی شہاب الدین کے حالات اخبار الاخیار (۱۷۵-۱۷۲) اور خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۹۰) کے علاوہ مآثر الکرام مولانا غلام علی آزاد (جلد اول ص ۱۸۸) ابجد العلوم (۸۹۳۲) وغیرہ میں موجود ہیں۔

دکن و جنوبی ہند

اس طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ برصغیر کے مختلف اور دور افتادہ علاقوں کو مسلمانوں نے سیاسی و انتظامی وحدت عطا کی، علاء الدین کی فتوحات نے اس کی بنیاد رکھی اور محمد بن تغلق کی انتظامی اصلاحات سے اس کی تکمیل ہوئی، لیکن سیاسی اور انتظامی اتحادات دیرپا نہیں ہوتے، جس طرح وہ فتوحات کی طوفانی تیز رفتاری کے ساتھ وجود میں آتے ہیں اسی طرح بعض واقعات کے نتیجہ میں پارہ پارہ ہو جاتے ہیں، برخلاف اس کے معاشرتی، ثقافتی اور ذہنی اتحاد ہمیشہ رہنے والے حالات کو وجود میں لا کر انسانی زندگی کے رخ بدل دیتا ہے، برصغیر میں شمال و جنوب کے اس ثقافتی و معاشرتی اتحاد کی تخلیق علماء اور ان سے بھی زیادہ مشائخ کا کارنامہ ہے، یہ ایک اہم موضوع ہے جس کی تفصیلات بہت دلچسپ ہیں، یہاں ہم صرف ان دو تین شخصیتوں کے کارناموں کی طرف اشارہ کریں گے جو شمالی سلاسل سے تعلق رکھتے تھے اور اسی غرض سے یہاں آکر مقیم ہوئے، اس سلسلہ میں ہم کو پھر بابا فرید شکر گنج کے خلفاء کے کارناموں پر غور کرنا ہوگا، آپ نے اپنے خلفاء میں سے شیخ منتجب الدین کو جو شیخ جمال ہانسوی کے بھانجے تھے دیوگیر روانہ کیا:

"چون در ملک دیوگیر کفر و بدعت بسیار بود حضرت گنج شکر اورا بحکم غیب بجانب دیوگیر رخصت نمود، وے در انجا رسیدہ بہ ہدایت خلق پرداخت واکثرے را بہ ہدایت راہ نمود"[1]

۶۹۰ھ میں (بقول صاحب معارج الولایت) جب انہوں نے وفات پائی تو سلطان المشائخ یعنی شیخ نظام الدین اولیاء نے ان کے چھوٹے بھائی برہان الدین غریب کو جو شیخ کے خلیفہ تھے دکن بھیجا تا کہ سلسلہ رشد و ہدایت جاری رکھیں[2]۔

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۲۰۔ [2] اگر منتجب الدین کی وفات کی اس تاریخ کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان کے انتقال اور برہان الدین غریب کے دکن پہنچنے میں کافی فرق ہوگا۔

Marfat.com

شیخ برہان الدین غریبؒ

برہان الدین ۶۵۴ھ میں ہانسی میں پیدا ہوئے، اپنے چچا اور دوسرے علماء سے تحصیل علوم کے بعد مطالعہ جاری رکھا، چنانچہ اپنے زمانہ کے جید علماء میں ان کا شمار ہونے لگا، عبادت وریاضت کا ابتدا ہی سے شوق تھا، طبعاً عزلت پسند تھے، چنانچہ کبھی متاہل نہیں ہوئے، روحانی تربیت کی تلاش میں وطن ترک کرکے دہلی آگئے اور بالآخر شیخ نظام الدین اولیاء کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ ان کے علمی تبحر کی شہرت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شیخ بھی ان کو مولانا برہان کہا کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے جس سے اس عہد کے مشائخ کے زہد وتقویٰ پر ہی نہیں بلکہ ان کے سلاسل کے ضبط ونظم پر بھی روشنی پڑتی ہے، برہان الدین غریب کمزور اور نحیف تھے، چنانچہ وہ کمبل کی دو تہیں کرکے اس پر بیٹھتے تھے، بعض لوگوں نے اس کی شکایت شیخ سے کی کہ وہ مشیخت کے طور پہ اس طرح بیٹھتے ہیں، شیخ کو یہ سخت ناگوار ہوا کہ انہوں نے بوریا نشینی کو ترک کرکے یہ طریقہ اختیار کیا، وہ برہان الدین سے ناراض ہو گئے۔ اس سے یہ سخت پریشان ہوئے لیکن آخر کار امیر خسرو نے ان کو معافی دلوادی۔

یہ واقعہ یوں تو بہت معمولی ہے لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چھوٹی سی فروگذاشت یعنی بوریا نشینی کو ترک کرنا بھی شیخ کی نظر میں کس قدر بڑا عیب تھا، ظاہر ہے کہ بوریا نشینی درحقیقت آرام طلبی سے بچنے کا ذریعہ تھا۔

بہر حال مرشد کی ہدایت پر وہ دکن روانہ ہو گئے۔ روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ مولانا برہان الدین دہلی میں پیر کی خدمت ہی میں رہنا چاہتے تھے، چنانچہ جب ان کو دکن جانے کا حکم ہوا تو کہنے لگے کہ میں آپ کی نعلین سے دور ہو جاؤں گا، جواب میں شیخ نے فرمایا، یہ نعلین لے جاؤ، پھر کہا مجلس سے دور ہو جاؤں گا، جواب میں شیخ نے فرمایا ان سب کو ساتھ لے جاؤ، اب کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ ایک کثیر گروہ (بعض بیانات کے مطابق سات سو فقیر) کے ساتھ دکن روانہ ہوئے اور تقریباً تیس سال وہاں اشاعت دین اور اصلاح کا کام

Marfat.com

کرتے رہے[1] ان کارناموں کی تفصیلات کی طرف یہاں اشارہ کرنا ممکن نہیں لیکن دو تین واقعات کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس سے کچھ اندازہ ان خدمات کی کیفیت کا ہو سکے گا، بالخصوص حکمرانوں سے تعلقات اور ان کی تربیت کا۔ فاروقی خاندان کے سلاطین میں نصیر الدین کو آپ سے بہت عقیدت تھی، چنانچہ دریائے تاپتی کے کنارے پر ایک شہر آباد کر کے اس نے آپ ہی کے نام پر اس کا نام برہان پور رکھا، یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ کسی نے کہا کہ آپ دعا کریں کہ نصیر الدین کے ہاں لڑکا پیدا ہو، شیخ نے جواب دیا کہ اس کے ایک نہیں چار لڑکے ہوں گے، لیکن وہ اس کے کام کے نہیں ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، سلطان کے چار لڑکے ہوئے لیکن سب درویش ہوئے اور وہ شیخ ہی کی خدمت میں رہے[2]۔

سلطان محمد بن تغلق کو بھی آپ سے عقیدت تھی، وہ چاہتا تھا کہ شیخ سے ملاقات کرے لیکن وہ اس سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے، ایک روز سلطان نے یہ ارادہ کیا کہ وہ بغیر اطلاع کے شیخ کے مکان پر چلا جائے، شیخ کو خبر ہوئی تو دعا کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ سلطان کی ملاقات سے محفوظ رکھے، اتفاق سے سلطان کے دل میں راستے میں کچھ خیال آیا اور وہ واپس چلا گیا، واپس جا کر اس نے تین ہزار سنہری تنکے بھیجے، شیخ نے معذرت کی تو سلطان نے کہلوایا کہ یہ رقم فقراء کے لئے ہے، شیخ نے وہ رقم لے لی اور بیس تنکے جو ان کے گھر میں موجود تھے اس میں ملا کر تقسیم کر دی، زہد و تقویٰ کے ساتھ شیخ کی قناعت و استغنیٰ کا بھی لوگوں پر بہت اثر تھا۔

شیخ برہان الدین کے کئی خلفاء نے شہرت حاصل کی، ان میں سے دو تین کا ذکر کیا جا سکتا ہے، سید زین الدین اپنے وطن شیراز سے دہلی آئے اور وہاں سے دکن منتقل ہو گئے

---

[1] دولت آباد میں اسلام کی ترویج و اشاعت میں ان کو کافی کامیابی ہوئی، اس سے متعلق واقعات کی تفصیل تذکروں میں مل جاتی ہے۔

[2] بزم صوفیہ (ص ۲۹۱) بحوالہ روضۃ الاولیاء از مولانا آزاد بلگرامی۔

Marfat.com

دولت آباد میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، ان کا ایک شاگرد شیخ برہان الدین کی محفل سماع میں شریک ہوا، اس پر وہ بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ میں شیخ کا قائل ہو سکتا ہوں بشرطیکہ وہ میرے چند فقہ سے متعلق سوالات کا جواب دیدیں، یہ سوالات انہوں نے لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے، ان کے جوابات اس قدر فاضلانہ اور قابل اطمینان تھے کہ مولانا زین الدین کا سارا علمی گھمنڈ ختم ہو گیا اور وہ فوراً جا کر شیخ سے بیعت ہو گئے۔ شیخ زین الدین بہت جلد مشہور مشائخ میں شامل ہو گئے، سلطان محمد شاہ بہمنی نے ان ہی کے ہاتھ پر اپنے اعمال قبیحہ سے توبہ کی اور شریعت کو اپنے نظم حکومت کا مدار بنایا۔ نصیر خان نے ان کے نام پر زین آباد شہر تعمیر کرایا، وہ دہلی گئے تو فیروز شاہ نے ان سے ملاقات کی اور اس قدر متاثر ہوا کہ ان کو دہلی میں مستقل سکونت پذیر ہونے کی دعوت دی لیکن شیخ نے کہا کہ میں اپنے مرشد کے پاس ہی رہوں گا۔ ان کے علاوہ شیخ برہان الدین کے کئی اور خلفاء بھی مشہور مشائخ دکن میں شمار کئے جاتے ہیں۔

سید محمد گیسو دراز

دکن میں جن مشائخ نے کام کیا ان میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز کو حاصل ہوئی ان کے مورث اعلیٰ ہرات سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے تھے اور یہیں سید محمد ۷۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد سید یوسف حسینی عرف سید راجا شیخ نظام الدین اولیاء کے معتقدین میں تھے[1] سلطان محمد بن تغلق نے دولت آباد کو دوسرا دار الحکومت بنا کر جب عمائدین و علماء و مشائخ دہلی کو وہاں بھیجا تو سید یوسف حسینی کو بھی ترک وطن کرکے جنوب کی طرف جانا پڑا چنانچہ سید محمد نے یہیں ابتدائی تعلیم پائی، ان کی عمر دس سال کی تھی کہ والد کی وفات ہوگئی اس کے

---

[1] خواجہ سید محمد گیسو دراز کے ملفوظات جوامع الکلم میں ہے:

پدر من زیارت خدمت شیخ نظام الدین بودہ ۳۸

پانچ چھ سال بعد ان کی والدہ دولت آباد سے دہلی آگئیں۔ اسی سال (۷۳۶ھ) سید محمد جو اپنے والد کی وجہ سے خواجگان چشت سے عقیدت رکھتے تھے خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے بیعت ہو گئے، بیعت ہونے کے بعد وہ چاہتے تھے کہ سارا وقت عبادت و ریاضت میں صرف کریں لیکن مرشد نے ہدایت کی کہ ابھی علوم ظاہری کی تکمیل کی جائے اور چند فقہ و تفسیر کی کتابوں کے مطالعہ کی خاص طور پر تاکید کی، سید محمد جو اپنے مرشد کی طرف سے گیسو دراز کا لقب حاصل کر چکے تھے[1]، ان کی بے حد خدمت کرتے تھے اور بہت جلد دونوں کو ایک دوسرے سے بہت زیادہ انسیت ہو گئی، آخر کار وہ ان کے خلیفہ اعظم ہو گئے، شیخ نصیر الدین کی وفات (۷۵۷ھ) کے بعد وہی ان کے جانشین ہوئے[2]۔

خواجہ گیسو دراز دکن میں

شیخ نصیر الدین کے بعد تقریباً چوالیس سال تک خواجہ گیسو دراز دہلی میں مقیم رہے، نویں صدی ہجری کے شروع میں دکن کا قصد کیا، گلبرگہ کے قریب پہنچے تو سلطان فیروز شاہ بہمنی بہت احترام کے ساتھ ان کو لایا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد شیخ کی توجہ سلطان کی طرف کم ہو گئی، فرشتہ نے یہ اشارہ کیا

---

[1] ایک مرتبہ وہ اپنے مرشد کی پالکی کندھے پر رکھے ہوئے لیجا رہے تھے کہ زلفوں کے بال جو کسی قدر لمبے تھے پالکی کے پائے میں الجھ گئے لیکن پاس ادب سے ان کو علیحدہ کرنے کی کوشش نہیں کی، جب شیخ نصیر الدین کو یہ معلوم ہوا تو بے حد خوش ہوئے اور اسی وقت گیسو دراز کا لقب عطا کیا۔

[2] شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے متعلق روایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا اور اسی بنا پر اپنے مرشد کے تبرکات (عصا، خرقہ، نعلین، تسبیح وغیرہ) کے بابت وصیت کی کہ ان کے ساتھ دفن کر دئے جائیں، لیکن خواجہ گیسو دراز نے ان کو غسل دیکر جب دفن کر دیا تو اس پلنگ کی ڈوریاں جس پر غسل دیا تھا اپنے گلے میں ڈال لیں اور کہا کہ میرے لئے یہی خرقہ ہے۔

Marfat.com

ہے کہ سلطان کو فلسفہ و حکمت سے دلچسپی تھی اور شیخ کو اس میں کمال حاصل نہ تھا بہر حال صاحب برہان مآثر کے مطابق فیروز شاہ کا حصاپانگل پر شکست کھانا اسی بے توجہی کے سبب تھا وہ لکھتا ہے:

"مردم این شکست را از اثر کلفت سلطان الاولیاء، والمحققین، زبدۂ آل طٰہٰ و یٰسین، شہباز بلند پرواز، سید محمد گیسو دراز دانستند و بہ سبب این شکست ضعف قویٰ سلطان مضاعف گشتہ۔ بارہا بزبان الہام بیان می گذرانیدند کہ موجب شکست لشکر تغیر خاطر آن فخر الاولیاء و سید البشر بود"[1]

بہر حال فیروز کا جانشین احمد شاہ بہمنی تخت نشینی سے پہلے ہی خواجہ گیسو دراز کے حلقہ معتقدین میں شامل ہو گیا تھا، بعض روایات کے مطابق تو اس کا تخت حاصل کرنا ہی خواجہ صاحب کی دعا ہی کا نتیجہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ احمد شاہ کی عقیدت ان سے بہت گہری تھی، اس کی تخت نشینی کے بعد اسی سال خواجہ کا انتقال ہو گیا، لیکن احمد شاہ نے ان کی قبر پر ایک عظیم الشان مقبرہ تیار کرایا اور اس کے لئے جائداد وقف کی۔ اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خواجہ گیسو دراز کے زیر اثر احمد شاہ نے اپنی زندگی اور حکومت کو شرع کے مطابق کرنے پر بہت زور دیا اور نتیجہ میں بقول صاحب برہان ماثر در تمام ملک دکن احدے ارتکاب منہیات جل تحمل آن نتوانستے نمود۔ خواجہ گیسو دراز کا اہل دکن پر ہمیشہ بہت اثر رہا ہے، شیخ عبدالحق نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"بہ دیار دکن رفت، و قبول عظیم یافت، اہل این دیار بہ منقاد و مطیع او گشتند"[2]

---

[1] ص ۴۷

تصانیف

خواجہ گیسو دراز ایک بلند کردار شیخ ہونے کے علاوہ مصنف بھی تھے ان کی بعض کتابیں نہایت مستند پایہ رکھتی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں[1]:۔

۱۔ ملتقط : صوفیانہ رنگ میں کلام اللہ کی تفسیر ۲۔ حاشی بر تفسیر کشاف

۳۔ شرح مشارق الانوار ۴۔ ترجمہ مشارق الانوار

۵۔ شرح عوارف المعارف ۶۔ فارسی شرح عوارف

۷۔ شرح تعارف ۸۔ شرح آداب المریدین عربی و فارسی

۹۔ شرح فصوص الحکم ابن عربی ۱۰۔ شرح رسالہ قشیریہ

۱۱۔ رسالہ استقامت الشریعت بطریقۃ الحقیقت ۱۲۔ ترجمہ رسالہ ابن عربی

۱۳۔ حواشی قوت القلوب ۱۴۔ رسالہ سیر النبی

۱۵۔ شرح فقہ اکبر ۱۶۔ اسماء الاسرار۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد رسالے و تالیفات ہیں، شیخ کے ملفوظات کے دو مجموعے ہیں جن میں جامع الکلم کافی مشہور ہے۔ خواجہ گیسو دراز کی ان عربی و فارسی تصانیف سے ان کی علمی قابلیت اور تصوف سے شغف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کے علم و فضل کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"جامع است میان سیادت و علم و ولایت، شانے رفیع و رتبہ منیع و کلام عالی دارد و اورا درمیان مشائخ چشت مشربے خاص و در بیان اسرار حقیقت طریقے مخصوص است[2]"

دکھنی اردو

دکن کی ادبی تاریخ میں خواجہ گیسو دراز کا یہی کارنامہ قابل ذکر نہیں ہے کہ انہوں نے تصوف پر متعدد کتابیں لکھیں اور بعض کلاسیکی تصانیف پر عمدہ

---

[1] کتابوں کی فہرست کے لئے دیکھو بزم صوفیہ ۵۰۹-۱۰۴۔

[2] اخبار الاخیار ص ۱۲۳۔

Marfat.com

شرحیں اور حواشی تیار کئے، ان کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ انھوں نے اس نئی زبان کی بھی سرپرستی کی جو حال ہی میں وجود میں آئی تھی، یوں تو یہ نئی زبان علاء الدین کی فوجوں کے ساتھ دکن میں پہنچ چکی تھی، لیکن صوفیائے کرام نے تبلیغی کوششوں کے سلسلہ میں جب اس کی سرپرستی کی تو اس کی ترقی اور توسیع میں بہت بڑا اضافہ ہوا، دکن میں اردو میں لکھنے والے پہلے مصنف شیخ عین الدین گنج العلم بیان کئے جاتے ہیں وہ ۷۰۶ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔[1] خواجہ گیسو دراز سے متعلق بعض واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ ہندوی (جو بعد میں اردو کہلائی) جانتے ہی نہ تھے بلکہ اس میں اشعار بھی کہتے تھے۔[2] اسی دور کے ایک اور شاعر سعدی دکھنی تھے وہ شیخ برہان الدین غریب سے بیعت تھے اور ایک روایت کے مطابق شیخ نظام الدین اولیاء کی قدم بوسی سے مشرف ہوئے تھے،[3] ان کے مشہور اشعار میں سے چند یہ ہیں:-

قند چو دیدم بر لبش گفتم کہ یہ کیا ریت ہے ؛ گفتا کہ دلے باور سے اس ملک کی یہ ریت ہے

ہم تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا ؛ ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ ریت ہے

سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ، دُر ریختہ ؛ شیر و شکر آمیختہ، ہم ریختہ ہم گیت ہے

ان کے علاوہ اور بھی شاعر ہیں، جن کا ذکر اور کلام تذکروں میں موجود ہے۔ یہاں مثال کے طور پر صرف چند واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شمالی برصغیر کی

---

[1] مختصر حالات کے لئے دیکھو تاریخ ادب اردو (شائع کردہ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز کراچی ۱۹۶۱ء) جلد اول صفحہ ۲۵-۳۲۳۔

[2] تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۷-۳۲۶) میں خواجہ گیسو دراز کے چند اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

[3] دیکھو تاریخ ادب ص ۳۲۸۔

Marfat.com

طرح مسلم رہنماؤں نے جنوب میں بھی معاشرہ کی اصلاح اور ادب وفن کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، ان کے یہ اصلاحی کارنامے تاریخ تمدن کی شاہراہ کو روشن کرتے رہے اور اس طویل الmیعاد سفر میں سنگہائے میل کا کام دیتے رہے۔

Marfat.com

باب ہفتم

مغلیہ سلطنت کا قیام و استحکام

بابر، ہمایوں، شیر شاہ اور اکبر

بابر بادشاہ کی فتوحات

۱۵۲۶ - ۳۰ ۱۵ء

مشرقی ممالک کی تاریخ میں مغلیہ سلطنت کے بانی بابر بادشاہ کی شخصیت ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں چنگیزی و تیموری دونوں خون موجود تھے باپ کی طرف سے اس کا شجرہ چھٹی پشت میں تیمور سے مل جاتا ہے اور ماں کی طرف سے اس کے اور چنگیز خاں کے درمیان تیرہ پشتیں تھیں۔ ۱۴۹۴ء میں جب بابر کے والد عمر شیخ مرزا کی اچانک موت واقع ہوئی تو وہ بارہ سال کا لڑکا تھا۔ عمر شیخ مرزا ایک چھوٹی سی پہاڑی ریاست فرغانہ کا حکمران تھا، اس کے مرنے پر بابر اس کا جانشین ہوا۔ آٹھ دس برس تک اس کم عمر حکمراں کو نہایت سخت محنت اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانہ میں اس نے دو مرتبہ سمرقند فتح کیا لیکن دونوں مرتبہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا، اور ساتھ میں اس کی آبائی ریاست بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔ بالآخر ۱۵۰۰ء میں وہ کابل آیا، اور اسی سال یہاں کے لوگوں نے اس کو امیر تسلیم کر لیا۔

کابل میں حکومت قائم کرنے کے بعد بھی بابر کی خواہش یہی تھی کہ سمرقند کو جو تیمور کا دارالحکومت رہا تھا اور اس کے بعد سے اسلامی تہذیب کے عظیم مراکز میں شمار کیا جاتا تھا اپنی

Marfat.com

سلطنت میں شامل کرے۔ ۱۵۱۲ء میں اس کو سمرقند فتح کرنے کا ایک اور موقع ملا۔ چنانچہ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا لیکن اس مرتبہ بھی وہاں اپنی حکومت قائم نہیں کر سکا اور جلد ہی اس کو کابل واپس آنا پڑا۔ اس ناکامی کے بعد بابر کو یقین ہو گیا کہ سلطنت کی توسیع سمرقند کی جانب ممکن نہیں، برخلاف اس کے مشرق کی طرف ہندوپاکستان کے وسیع علاقے میں حالات ایسے تھے کہ ایک بہادر اور قابل سردار کامیابی کے ساتھ قسمت آزمائی کر سکتا تھا، سلطان ابراہیم لودی کے بددل امراء اور چتوڑ کے راجہ رانا سانگا کی طرف سے جب اس کو یہاں آنے کی دعوت ملی تو اس نے جلد ہی ہندوپاکستان فتح کرنے کے لئے ایک منصوبہ تیار کر لیا، اس کی تکمیل کے لئے حملوں کا سلسلہ ۱۵۱۹ء میں شروع ہوا، آخری حملہ ۱۵۲۶ء میں ہوا اور پانی پت کے میدان میں مغل اور افغان فوجوں میں زبردست معرکہ ہوا ابراہیم لودی کی فوج بہت زیادہ تھی لیکن فتح آخر کار بابر ہی کو ہوئی، پانی پت کے بعد دہلی و آگرہ اور قرب وجوار کے علاقے پر بابر کا قبضہ ہو گیا، اور باوجود لشکر کی مخالفت کے اس نے یہاں مستقل قیام اور نئی حکومت کا سنگ بنیاد رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا، وہ جانتا تھا کہ پریشانیوں اور دقتوں کا سلسلہ حقیقتاً اب شروع ہوا ہے۔ افغان سلطنت کی فوجیں تو شکست کھا چکی تھیں، لیکن ابھی بعض سردار ایسے موجود تھے جو مغلوں کی حکومت بغیر فیصلہ کن جنگ کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے، افغانوں سے بھی زیادہ سخت دشمن راجپوت تھے، رانا سانگا بہت سی لڑائیاں لڑ چکا تھا اور قرب وجوار کے وسیع علاقے پر اس کی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا، متواتر فتوحات نے سانگا کو مغرور بنا دیا تھا، اب اس کے دماغ میں دہلی پر حکومت کرنے کا خیال چکر لگا رہا تھا، جس وقت اس نے بابر کو ہندوپاکستان آنے کے لئے مدعو کیا تھا تو شاید اس کا خیال تھا کہ افغانوں کو شکست دے کر اور یہاں کی دولت لوٹ کر بابر کابل واپس چلا جائے گا اور جب دہلی کی مسلم حکومت کا خاتمہ ایک مسلمان حملہ آور کے ذریعہ ہو جائے گا تو ہندو اقتدار قائم کرنے میں راجپوتوں کو

Marfat.com

بہت سہولت ہوگی۔ لیکن واقعات نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ بابر نے افغان فوج پر فتح حاصل کرنے کے بعد یہاں اپنی سلطنت قائم کرنے کا ارادہ کیا اور یہیں ٹھہر گیا۔ حالات کا یہ رنگ دیکھ کر رانا سانگا نے بابر کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس موقع پر صرف راجپوت راجہ ہی رانا کی مدد کو نہیں آئے بلکہ بعض مسلمان سرداروں کو بھی اس نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ حسن خاں میواتی بارہ ہزار سوار لے کر رانا کی مدد کے لئے آیا۔ رانا کی فوجی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت وہ بابر کے مقابلہ کے لئے آگرہ کی سمت روانہ ہوا تو اس کے پاس ایک لاکھ سوار تھے۔ آگرہ سے سینتیس ۳۷ میل کے فاصلہ پر خانوہ گاؤں کے قریب ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو مغل اور راجپوتوں میں فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ بابر کو ایک طاقتور غیر مسلم حکومت کے مقابلہ میں جہاد کا یہ پہلا موقع تھا۔ دشمن کی فوج اس کے لشکر سے کئی گنا زیادہ تھی، لیکن بابر ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا اور غیر مسلموں کے خلاف جہاد میں ہر قربانی کو ارزاں سمجھتا تھا۔ دس گھنٹہ کی متواتر جنگ کے بعد بالآخر اس کو کامیابی ہوئی۔ رانا تو جنگ کا پانسہ پلٹا ہوا دیکھ کر میدان چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن حسن خان آخر تک لڑتا رہا اور میدان جنگ ہی میں مارا گیا۔ اس شاندار فتح کے بعد بابر کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ میواتیوں کے علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو اطمینان ہوا۔ ۱۵۲۸ء کے شروع میں بابر نے چندیری کے راجہ میدنی رائے کے خلاف لشکر کشی کی۔ راجپوت سپاہیوں نے اپنی عورتوں کو قتل کر کے مغلوں پر حملہ کیا لیکن ان کو مکمل شکست ہوئی۔ اس عرصہ میں افغان سرداروں نے مشرقی اضلاع میں اپنی فوجوں کو دوبارہ مرتب کر کے بابر کے مقابلہ کی تیاری کر لی تھی۔ افغان فوج سلطان محمود لودی[1] کی سرکردگی میں گنگا کے کنارے تک آ [illegible]

---

[1] محمود، ابراہیم لودی کا بھائی تھا۔ اس نے بہار کے علاقہ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔

Marfat.com

اور گھاگرہ کے سنگم کے قریب ۶ مئی ۱۵۲۹ء کو بابر اور محمود کی فوجیں نبرد آزما ہوئیں، محمود کی فوج تعداد میں زیادہ تھی، لیکن بابر کے مقابلہ میں اس کو شکست ہوئی، اس فتح کے بعد بابر صرف ڈیڑھ سال زندہ رہا، ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو اڑتالیس سال کی عمر میں اس نے وفات پائی۔

بابر کا کردار اور کارنامہ بابر نے حکومت کی ذمہ داری بارہ سال کی عمر میں سنبھالی اور باوجودیکہ اس کے دشمنوں کی تعداد اور قوت اس کے ہمدردوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی اس نے سخت سے سخت پریشانیوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اس کی خواہش تو یہی تھی کہ وسط ایشیا میں اپنے جد اعلیٰ تیمور کے دارالسلطنت سمرقند کو اپنی حکومت کا مرکز بنائے، لیکن اس میں اس کو کامیابی نہ ہوسکی، اس کا حریف شیبانی خان بہت قابل اور با اثر سردار تھا، بابر کو اس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی، بہر حال اس نے اپنی کوشش جاری رکھی اور بالآخر کابل میں ایک مستقل حکومت قائم کرلی مگر یہ مختصر ریاست بابر کے بلند حوصلوں کے لئے کافی نہ تھی، چنانچہ اس نے اس کی توسیع کے امکانات پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب اس کو مشرق کی جانب بڑھنا چاہئے، شمال مغربی علاقوں کو فتح کرکے اس نے پانی پت کی فیصلہ کن جنگ لڑی، اس فتح نے اس کے بلند حوصلوں کے لئے میدان مہیا کردیا۔ مغلیہ سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھنے میں بابر نے جو اقدام کیا اس کے دور رس نتائج تو ظاہر ہیں لیکن ان کی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے ہم کو مغلوں کے کارناموں کا بالاستقصا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ بابر کی سوانح حیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کامیابی کا راز پیہم کوشش، مستقل مزاجی اور بلند ہمتی میں مضمر تھا، وہ ایک بہادر سپاہی اور قابل سردار ہونے کے علاوہ ایک عمدہ اور خوش مزاج دوست بھی تھا، اس کی بہادری کے متعدد واقعات تاریخ میں موجود ہیں، گنگا کے کنارے جس وقت وہ پہنچا تو

Marfat.com

دریا طغیانی میں تھا۔ بابر نے طے کیا کہ تیر کر اس کو عبور کرے اور معہ ساتھیوں کے کود پڑا۔ خود ہی لکھتا ہے کہ ۳۳ ہاتھوں میں اس پار پہنچ گیا اور پھر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کی جسمانی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے قلعہ کی دیوار پر دو آدمیوں کو بغل میں لے کر دوڑا کرتا تھا اور جس جگہ سے چلتا تھا وہیں واپس آ جاتا تھا۔ اس کو قدرتی مناظر سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہند و پاکستان سے اس کو ایک شکایت یہ بھی تھی کہ یہاں عمدہ باغ نہیں ہیں۔ بابر شاعر بھی تھا اور نثر نگار بھی۔ اس کی تزک یا خود نوشت سوانح کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا۔ سولہویں صدی میں مشرق و مغرب میں کئی مشہور حکمران سریر آرائے سلطنت تھے۔ لیکن جو دلکشی بابر کی شخصیت میں تھی وہ کسی اور میں نظر نہیں آتی۔

ہمایوں ۱۵۳۰-۱۵۵۶ء

بابر کی وفات کے وقت یوں تو بنگال اور گجرات کے علاوہ سارا شمالی ہند و پاکستان اور کابل کا علاقہ مغلیہ حکومت میں شامل تھا لیکن اس کا دورِ حکمرانی اس قدر مختصر تھا کہ وہ نئی حکومت کی بنیادیں مستحکم نہ کر سکا۔ افغان سلطنت کو شکست تو ہو گئی تھی لیکن ابھی افغان سرداروں کا اثر بہت سے علاقوں پر باقی تھا۔ ان حالات میں ہمایوں اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا۔ شروع ہی سے اس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مشکلات میں سب سے زیادہ خطرناک اس کے بھائیوں کا رویہ تھا۔ کامران، عسکری اور ہندال تینوں آخر تک اس کی مخالفت کرتے رہے باوجودیکہ اس کا برتاؤ نہایت مشفقانہ تھا۔ کامران کو کابل کا علاقہ دے دیا گیا تھا لیکن یہاں اس نے تقریباً خود مختار حکمران کی حیثیت حاصل کر لی۔ کامران کا رویہ مغلیہ حکومت کے لئے بہت مضر ثابت ہوا۔ عسکری اور ہندال نے بھی جہاں تک ہو سکا ہمایوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر سلطنت اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

ہمایوں اور شیر شاہ

مغل افغان کشمکش کے پس منظر کے لئے شیر خان کی زندگی کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے۔ شیر خان کا اصلی نام فرید تھا۔ اس

Marfat.com

کا باپ حسن سہسرام کا جاگیردار تھا، جس نے ایک ہندو عورت سے شادی کرلی تھی اور اس کے اثر کی وجہ سے اپنی پہلی بیوی کے لڑکوں کی طرف سے بے التفاتی برتتا تھا، گھر کے اس ناقابل برداشت ماحول سے تنگ آکر فرید جونپور چلا گیا اور تعلیم کا سلسلہ شروع کردیا۔ بہت جلد وہ اس قابل ہوگیا کہ اس کے باپ نے اس کو بلاکر جاگیر کا انتظام سپرد کردیا، یہاں بھی فرید نے نہایت قابلیت سے کام کیا، لیکن جلد ہی اس کی سوتیلی ماں نے فرید کو دوبارہ گھر چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ اب وہ آگرہ آیا اور دولت خاں لودی کے لشکر میں ملازم ہوگیا، جس کی وفات پر دولت خاں کے اثر سے فرید کو سہسرام کی جاگیر مل گئی، کچھ عرصہ بعد اس نے بہار کے حکمراں کی ملازمت کرلی، سلطان نے اپنے لڑکے جلال خاں کی تربیت بھی اسی کے سپرد کردی، اسی زمانہ میں ایک موقع پر شیر کو تلوار سے مارنے پر سلطان نے فرید کو شیر خاں کا خطاب دیا، لیکن شیر خاں کے تعلقات سلطان سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے، وہ مجبوراً بہار سے چلا آیا، اب سلطنت دہلی پر مغلوں کا قبضہ ہوچکا تھا، کرہ مانکپور کا حاکم بابر کی طرف سے جنید برلاس مقرر ہوا تھا، شیر خاں نے کوشش کی اور بالآخر جنید کے ذریعہ سے بابر کی ملازمت حاصل کرلی، لیکن ایک موقعہ پر اس سے کچھ بے ادبی ہوئی جس کی وجہ سے بابر ناراض ہوگیا، یہ حالات دیکھ کر شیر خاں مغلوں کی ملازمت چھوڑ کر پھر بہار آگیا اور سلطان کے ملازموں میں شامل ہوگیا، سلطان کی وفات کے بعد اس کا کم عمر بیٹا جلال خاں تخت پر بیٹھا اور انتظام سلطنت کلیتہً شیر خان کے ہاتھ میں آگیا، لیکن جلال خاں کے دربار میں سازشوں اور فرقہ بندی کا سلسلہ شروع ہوگیا اور شیر خان کو علیحدہ ہونا پڑا، ان حالات سے فائدہ اٹھاکر بنگال کے حکمران سلطان محمود نے جلال خاں کو اپنے ساتھ ملالیا اور بعد میں اس کے علاقہ پر قبضہ کرلیا، اس پر شیر خاں نے محمود کے مقابلہ کی تیاری کی اور حملہ کرکے بہار کے سارے علاقہ کو اپنے تصرف میں لے لیا، اسی عرصہ میں سلطان ابراہیم لودی کا بھائی محمود لودی جو رانا سانگا کے یہاں پناہ گزین تھا، بہار پہنچ گیا، شیر شاہ نے بہار کی حکومت اس کو پیش کردی

Marfat.com

اور خود اس کے لشکر میں شامل ہو گیا، محمود لودی نے اودھ پر حملہ کیا اور لکھنؤ پر قبضہ کر لیا۔ یہ دیکھ کر ہمایوں بھی افغانوں کے خلاف اودھ کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے گومتی کے کنارے دورہ کے قریب دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ لڑائی میں محمود لودی کو شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ پہلے بہار یا اور پھر اڑیسہ کی طرف چلا گیا، مغلوں کی اس فتح کے بعد شیر خان نے ہمایوں سے صلح کر لی۔

ہمایوں فوراً آگرہ واپس آیا کیونکہ گجرات کے حکمران سلطان بہادر شاہ نے ایک فوج تاتار خاں[1] کی سرکردگی میں آگرہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ کی تھی۔ یہ فوج دارالسلطنت کے قرب و جوار میں آگئی تھی، حقیقت یہ ہے کہ سلاطین گجرات کے دربار میں مغلیہ حکومت کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ بہادر شاہ نے چند مرزاؤں کو جو بادشاہ کے خلاف تھے پناہ دے رکھی تھی اور باوجود ہمایوں کی اپیل کے ان کی سرپرستی کر رہا تھا۔ ان حالات میں ہمایوں نے یہ طے کیا اور صحیح طے کیا کہ گجرات کے سلطان کو اس کی خودسری کی سزا دینی چاہیے چنانچہ وہ اپنی فوج کے ساتھ گجرات پر حملہ آور ہوا اور اس کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔[2] بہادر شاہ

---

[1] تاتار خاں کے باپ علاؤالدین لودی نے سکندر لودی کے عہد میں دہلی سے بھاگ کر گجرات میں پناہ لی تھی۔

[2] ہمایوں جس وقت گجرات کی طرف بڑھ رہا تھا، اس وقت بہادر شاہ راجپوتانہ میں چتوڑ کے محاصرہ میں مصروف تھا۔ ہمایوں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر گجرات کو بہ آسانی فتح کر سکتا تھا لیکن اس کی حمیت اسلامی نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے مخالف کو اس وقت پریشان کرے جبکہ وہ جہاد میں مصروف تھا۔ اس نے اتنا انتظار کیا کہ بہادر شاہ راجپوتانہ کی مہم سے فارغ ہو لے۔ بہادر شاہ اس فیاضانہ سلوک کا جواب دے سکتا تھا اگر فتح کے [illegible] ہمایوں سے صلح کر لیتا، لیکن اس نے یہ نہ کیا، راجپوتوں کے خلاف فتوحات نے اس قدر مغرور کر دیا تھا کہ اس نے ہم

Marfat.com

بھاگ گیا اور پرتگیزوں کے یہاں ڈیو میں پناہ لی، ہمایوں کو شمال میں بغاوتوں کی خبریں ملیں چنانچہ وہ عسکری کو گجرات کا حاکم مقرر کر کے مالوہ کی طرف روانہ ہو گیا، ہمایوں کی روانگی کی خبر سے گجراتیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور سلطان بہادر نے اپنی سلطنت واپس لینے کی کوشش شروع کر دی، جوں ہی اس نے مغلوں کے خلاف کارروائی شروع کی گجرات کے لوگ کثرت سے اس کے ساتھ ہو گئے، ہمایوں کے بھائی عسکری نے اس نازک موقع پر غدارانہ رویہ اختیار کیا، چند امراء کی مدد سے اس نے طے کیا کہ ہمایوں سے تخت چھین لے، بجائے اس کے کہ بہادر شاہ کا مقابلہ کرتا وہ آگرہ پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا، بہادر شاہ نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اپنا ملک واپس لینے میں کامیاب ہو گیا اور عسکری کو گجرات سے بھاگنا پڑا۔

بہادر شاہ کی موت

بہادر شاہ نے ہمایوں کی مخالفت میں پرتگیزوں سے معاہدہ کیا تھا اور ان سے دوستانہ تعلقات بڑھالئے تھے لیکن پرتگیز اس کے ساتھ خلوص سے نہیں ملے تھے، ان کے پیش نظر اپنی اغراض تھیں، بہادر شاہ کی شہرت ایک بلند کردار سلطان کی نہ تھی اور ممکن ہے کہ یہ نظریہ کسی حد تک صحیح ہو کہ پرتگیز سیاست داں

---

۴۴ ہمایوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا، جیسا کہ ہم جانتے ہیں بہادر شاہ نے پرتگیزوں سے مدد مانگی لیکن اسفر کار اس کو شکست ہوئی اور گجرات پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا، بعض مورخوں نے ہمایوں پر اعتراض کیا ہے کہ اس نے بہادر شاہ کی راجپوتانہ میں مصروفیت سے فائدہ نہیں اٹھایا، لیکن اس نے اخوت اسلامی کا عملی مظاہرہ کر کے یہ امید کی تھی کہ بہادر شاہ بھی یہی طریقہ کار اختیار کرے گا مگر بہادر شاہ نے وہ کیا جس کو نہ ذاتی مفاد سے تعلق تھا نہ اخوت اسلامی سے، بہر حال آخر میں اس کو تباہی اور موت کا ہی منہ دیکھنا پڑا۔

Marfat.com

کو یقین تھا کہ بہادر شاہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد ان وعدوں کو پورا نہ کرے گا جو اس نے وقت ضرورت ان سے مدد لینے کی غرض سے کئے تھے اس لئے انہوں نے اس کے خلاف سازش کی۔ بہادر شاہ نے ان کے وائسرائے کو بلایا لیکن اس نے بیماری کا بہانہ کیا۔ بہادر شاہ خود اس سے ملنے چلا گیا۔ ملاقات کے دوران پرتگیزوں نے اس کی مختصر جماعت پر حملہ کر دیا۔ بہادر جان بچا کر بھاگا، لیکن وہ اس کوشش میں تھا کہ کشتی میں گھس جائے کہ ایک پرتگیز نے اس کا کام تمام کر دیا۔ بہادر شاہ بہادر اور فیاض بادشاہ تھا۔ ایک زمانہ میں اس نے گجرات کی سلطنت بہت وسیع کر لی تھی اور برہانپور، مانڈو، اجمیر، کالپی اور راجپوتانہ کے کچھ حصوں میں اسی کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ لیکن اس کی پالیسی کی کسی طرح تعریف نہیں کی جا سکتی۔ ہمایوں سے صلح کرنے کی بجائے اس نے مغل بادشاہ کے راستہ میں مشکلات پیدا کیں اور پرتگیزوں کی دوستی پر بھروسہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو سلطنت اور اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے اور ہمایوں کے لئے ناقابل حل مسائل پیدا ہو گئے۔

ہمایوں کی جلاوطنی
۱۵۴۰ء

ہمایوں کی عدم موجودگی میں شیر شاہ نے بہار پر اپنا تسلط مکمل کر لیا اور کچھ حصہ بنگال کا بھی لے لیا تھا۔ گجرات سے واپسی پر ہمایوں تقریباً ایک سال تک آگرہ میں مقیم رہا۔ اس وقت میں شیر شاہ کو اپنی قوت بڑھانے کا اچھا موقع ملا۔ مختصراً یہ کہ اس کی قوت اب اتنی بڑھ گئی تھی کہ مغلوں کی حکومت کا وہ سب سے طاقتور حریف سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ ہمایوں کے لئے ضروری ہو گیا کہ اس کی قوت کو ختم کرے۔ اس مقصد کے لئے وہ ۱۵۳۷ء کے موسم برسات میں آگرہ سے روانہ ہوا۔ سب سے پہلے اس نے چنار کے مضبوط قلعہ کو افغانوں سے لیا۔ شیر شاہ نے ہمایوں کا [illegible] بنگال کے علاقہ میں پہنچ کر وہاں کے خزانہ پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے حکمران سلطان غیاث الدین محمود کو شکست دے کر بھگا دیا۔ محمود جان بچا کر بھاگا۔ اور بالآخر ہمایوں کے لشکر میں آ گیا۔ ہمایوں نے اب ایک آخری کوشش شیر خان سے صلح کی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب —

نہ ہوا، چنانچہ جب بنگال کی طرف بڑھا، شیر شاہ کے بیٹے نے ہمایوں کو راستہ میں اتنے عرصہ تک روکے رکھا کہ اس کا باپ اپنے خزانہ اور اہل خاندان کو روہتاس کے مضبوط قلعہ میں پہنچا سکے اس کے بعد ہمایوں کو راستہ صاف ملا اور وہ بنگال کے دارالحکومت غور پہنچ گیا، اس عرصہ میں غیاث الدین محمود زخموں کی تاب نہ لاکر وفات پا چکا تھا۔ چنانچہ بغیر کسی دقت کے ہمایوں کا قبضہ بنگال پر ہو گیا۔ غور کی آب و ہوا اس کو بہت پسند آئی اس نے اس کا نیا نام جنت آباد رکھا اور کچھ عرصہ تک قیام کیا، یہ قیام ہمایوں کے لئے بہت مضرت رساں ثابت ہوا، اس کے بھائی ہندال نے کھلم کھلا بغاوت کردی۔ ادھر شیر شاہ بنگال میں ہمایوں کو چھوڑ کر خود مغربی سمت میں روانہ ہوا اور بنارس تک آ گیا۔ اس پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اپنے بیٹے جلال خاں کی سرکردگی میں ایک فوج جونپور کی طرف بھیجی، ان حالات کو معلوم کرنے کے بعد ہمایوں غور سے مایوس ہوا تاکہ شیر شاہ کو آگے بڑھنے سے روکے، اس نے چونسہ کے مقام پر جو بہار کے علاقے اور بنارس کے درمیان واقع ہے مقام کیا، جلد ہی شیر شاہ کی فوجیں بھی وہاں پہنچ گئیں، ہمایوں کے بعض سرداروں نے مشورہ دیا کہ افغان فوج سفر کر کے آئی ہے اور تھکی ہوئی ہے اس پر فوراً حملہ کر دینا چاہئے۔ لیکن ہمایوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور دو ماہ سے زیادہ یعنی اپریل تا جون ۱۵۳۹ء دونوں فوجیں پڑی رہیں، دونوں کیمپ گنگا کے جنوب ہی میں تھے اور ان کے چھوٹے دستوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں، ساتھ ہی ساتھ صلح کے لئے نامہ و پیغام کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ہمایوں کا اندازہ تھا کہ گفت و شنید کامیاب ثابت ہوگی اور شیر شاہ اس پر راضی ہو جائے گا کہ بنگال اور بہار کا کچھ علاقہ اس کو دیدیا جائے اور وہ ہمایوں کا اقتدار

ل‍ہ ہمایوں نے ایک بزرگ شیخ پھول (بہلول) کو ہندال کو سمجھانے کے لئے بھیجا لیکن ہندال کی کم فہمی اور بعض باغی سرداروں کی سازش کے نتیجہ میں شیخ کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ کی تفصیل کے لئے دیکھو تذکرۃ الواقعات جوہر آفتابچی (اردو ترجمہ از سید معین الحق)

اصلی بحیثیت بادشاہ تسلیم کرلے اس کو یہ یقین اس لئے بھی تھا کہ شیر شاہ نے اپنی فوجیں بہلہ کی طرف روانہ کردی تھیں، لیکن یکایک اس نے فوجیں واپس بلالیں اور دھوکے سے مغل کیمپ پر حملہ کردیا، ہمایوں جنگ کے لئے تیار نہ تھا، اس کو شکست ہوئی، کم و بیش اس کے سات آٹھ ہزار آدمی مارے گئے اور وہ خود بھی زخمی ہوگیا اور جان بچا کر بھاگا، اگر ایک سقہ جس کا نام نظام[1] تھا اپنی پھولی ہوئی مشک اس کو نہ دیتا تو وہ گنگا ہی میں ڈوب جاتا، بہر حال بدقت تمام دشمن کے معاقب دستوں سے بچتا ہوا ہمایوں آگرہ پہنچا، تقریباً ایک سال بعد وہ افغانوں سے فیصلہ کن جنگ کے ارادے سے روانہ ہو کر قنوج کے قریب گنگا کے کنارے خیمہ زن ہوا، لڑائی میں ہمایوں کو پھر شکست ہوئی، اس مرتبہ بھی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس کے بعض سردار شیر شاہ سے ملے ہوئے تھے، اس کے علاوہ مغلوں کی بدقسمتی کہ برسات قبل از وقت شروع ہوگئی اور ان کے لشکر میں پانی بھر گیا، چنانچہ لڑائی کے وقت ہمایوں کا سامان وغیرہ بھیگا ہوا تھا، مغلیہ فوج کو واپسی میں مشکلات پیش آئیں اور بہت دقتوں اور نقصان اٹھانے کے بعد وہ آگرہ پہنچی، ہمایوں کے پاس اب آگرہ اور دہلی کو الوداع کہہ کر بھاگنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ سندھ میں بھکر کو مرکز بنا کر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے کی آخری کوشش کرے لیکن حالات اس قدر نا موافق تھے کہ بالآخر اس کو یہ ملک چھوڑ کر ایران جانا پڑا۔

شیر شاہ کی حکومت

ہمایوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد شیر شاہ نے ہمایوں کا تعاقب کیا پنجاب آکر ملک اور [illegible] تک [illegible] جب اس کو یقین ہوگیا کہ مغلوں میں اب اتنی طاقت نہیں کہ اس کا مقابلہ کرسکیں[2] تو اس نے انتظام حکومت اور [illegible]

[1] نظام کو بعد میں ہمایوں نے دو دن کے لئے تخت پر بٹھایا اور احکامات جاری کرنے کی اجازت دیدی تھی۔

[2] [illegible] کامران کو ہمایوں نے کابل اور پنجاب کا علاقہ دے دیا تھا۔ [illegible] سے پہلے ہمایوں پہنچا تھا کہ کامران [illegible] اپنے بھائی کی مدد کی [illegible] ہمایوں کی شکست [illegible] کرکے اس نے کس قدر بزدلی [illegible] کی، شیر شاہ کے مقابلہ [illegible]

توجہ شروع کردی، سب سے پہلے اس کو بنگال جانا پڑا کیونکہ وہاں کا حاکم باغی ہوگیا تھا، وہاں سے
واپس ہوکر مالوہ کی طرف روانہ ہوا، راستہ میں گوالیار کے حاکم نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔
۱۵۴۳ء میں اس نے رائے سین کے راجہ پورن مل کے خلاف فوج کشی کی، یہ شخص نہایت ظالم
تھا اور مسلمانوں پر خاص طور سے ظلم توڑتا تھا، شیر شاہ نے اس کے قلعہ کا محاصرہ کرکے اس کو فتح کیا اس
کے بعد پنجاب کی حالت درست کرنا تھی۔ پنجاب سے وہ راجپوتانہ آیا جہاں میوار کے راجہ مالدیو کے
خلاف اس کو زبردست جنگ کرنی پڑی، یہ لڑائی اجمیر کے قریب ہوئی، مال دیو کو شکست ہوئی اور بہت
سے راجپوت مارے گئے، چتوڑ کے قلعہ دار نے اپنا قلعہ شیر شاہ کے سپرد کردیا۔ اس فتح کے بعد شیر شاہ
نے کالنجر پر حملہ کیا اسی کے محاصرہ کے دوران وہ زخمی ہوگیا۔ اگرچہ قلعہ فتح ہوگیا لیکن شیر شاہ جانبر نہ ہوسکا
پانچ سال کی مختصر حکومت کے بعد ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو یہ قابل حکمران دنیا سے رخصت ہوگیا۔

شیر شاہ کی اصلاحات

شیر شاہ اپنی اصلاحات اور نظام حکومت کی خوبیوں کی بدولت ہماری تاریخ میں ایک کامیاب اور عظیم حکمران شمار کیا جاتا ہے، یہاں اس کے کارنامے بالتفصیل بیان کرنا ممکن نہیں لیکن ان کے بعض پہلوؤں کی طرف مختصر اشارے کئے جاسکتے ہیں، شمالی ہندوپاکستان کا سارا علاقہ اس کی سلطنت میں شامل تھا اس وسیع علاقہ کو اس نے بہت سے ضلعوں میں تقسیم کیا جو سرکار کہلاتے تھے، ان کا تعلق براہ راست مرکزی حکومت سے تھا، ہر سرکار میں بہت سے پرگنے ہوتے تھے، پرگنہ کا انتظام ایک امین کے سپرد ہوتا تھا اس کے علاوہ ایک شقدار اور ایک خزانچی اور حسابات رکھنے کے لئے کچھ افسر بھی مقرر کئے جاتے تھے عدلیہ کا کام سرکار میں منصف کے سپرد تھا۔ فصل کے وقت زمین زیر کاشت کی پیمائش کی جاتی تھی اور پیداوار کی قیمت کا اندازہ کرکے مال گذاری وصول کی جاتی تھی۔ شیر شاہ کی حکومت پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ لیتی تھی، یہ نقد روپیہ یا جنس کی شکل میں لیا جاتا تھا، شیر شاہ کی پالیسی کی بنیاد یہ تھی کہ کاشتکار کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ شیر شاہ کا انتظام بہت کامیاب ثابت ہوا اور بعد میں اکبر کے حکام نے اسی کی بنیاد پر نیا نظام قائم کیا تھا۔ مالیہ کی طرح فوج کا انتظام بھی نہایت خوبی سے

Marfat.com

کیا گیا تھا۔ علاءالدین خلجی کی طرح شیر شاہ نے فوج کے گھوڑوں کو داغنے کا رواج جاری کیا اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ حکومت کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا تھا اور اچھے گھوڑوں کی بجائے لوگ کم قیمت جانور نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ تھی کہ شیر شاہ کی فوج میں سوار بہت زیادہ تھے، ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، پیادہ سپاہی صرف پچاس ہزار تھے

شیر شاہ کو عمدہ سڑکوں کی اہمیت کا بھی خوب اندازہ تھا اس نے اپنے مختصر دور حکومت میں بڑی تعداد میں اور بہت لمبی لمبی سڑکیں تعمیر کرائیں اور بعض کی مرمت کرائی۔ اس کی سب سے بڑی سڑک جو بعد میں گرانڈ ٹرنک روڈ کہلائی سنار گاؤں (بنگال) سے شروع ہو کر آگرہ، دہلی اور لاہور سے ہوتی ہوئی دریائے سندھ کے کنارے تک گئی تھی، دوسری سڑک آگرہ سے مانڈو تک اور تیسری آگرہ سے جودھپور تک تھی، ایک سڑک لاہور سے ملتان تک بنائی گئی تھی۔ ان سڑکوں کے دونوں کناروں پر پھلدار درخت لگوائے گئے تھے جن کا سایہ اور پھل دونوں کارآمد تھے۔ تھوڑی تھوڑی دور پر کارواں سرائے بنوائی گئی تھیں جن کی کل تعداد ستر ہ سو کے قریب تھی، ان میں ہندو اور مسلمان ملازم مقرر کئے گئے تھے تاکہ اپنے ہم مذہب مسافروں کے کھانے کا انتظام کریں۔ ہر سرائے میں کنواں اور مسجد ہوتی تھی جس میں باقاعدہ حکومت کی طرف سے امام اور مؤذن کا تقرر ہوتا تھا۔ مسافروں کے جانوروں کو چارہ مہیا کرنے کا بھی انتظام تھا۔ امن اور حفاظت کے لئے ایک پولیس افسر بھی متعین کیا جاتا تھا کارواں سرائے ڈاک چوکی کا بھی کام دیتی تھی اور دو گھوڑے ڈاک لے جانے کے لئے [illegible] میں ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ شیر شاہ کی بنوائی ہوئی سراؤں کا کوئی نشان نہیں [illegible] حکومت نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا اور بے مرمت [illegible] ختم ہو گئیں [illegible] باقی رہیں اور بعد کی حکومتیں ان ہی کو [illegible] اور مرمت کرتی [illegible] سلسلہ میں کئی قلعے بھی بنوائے اور بعض کی مرمت کرائی۔ دریائے جہلم کے کنارے [illegible] مضبوط قلعہ تیار کرایا اس کو رہتاس ہی نام دیا [illegible] قلعہ [illegible] تھا جہاں اس نے اپنے خزانہ کو محفوظ کیا تھا۔ دہلی کے شہر کی توسیع کی اور قلعہ تعمیر کرایا۔ اپنی حکومت میں امن قائم کرنے

Marfat.com

نظام انصاف کو عام کرنے کی بھی شیر شاہ نے بہت کوشش کی، ہر گاؤں کے سربرآوردہ اشخاص کو وہ اپنے علاقہ میں امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا اور اس علاقہ میں جو جرائم ہوتے تھے ان کے لئے وہی جوابدہ تھے، شیر شاہ کا یہ انتظام اس قدر کامیاب تھا کہ ان مورخوں نے بھی جو شیر شاہ کے خلاف تعصب رکھتے ہیں یہ کہا ہے کہ اس کے عہد میں ایک بڑھیا بلا خوف وخطر ٹوکرے میں سونا رکھ کر کھلے میدان میں سو سکتی تھی، بدایونی نے تو اس بات پر فخر کیا ہے کہ وہ شیر شاہ جیسے عادل بادشاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے، غرض یہ کہ حکومت کی مشینری کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کو شیر شاہ نے بہتر نہ کیا ہو، اس کی قابلیت کا اعتراف اور اس کے کارناموں کی تعریف ہر عہد کے مورخوں نے کی ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ اس کی مدت حکومت اس قدر مختصر ہوئی۔

ہمایوں کی واپسی ۱۵۵۵ء

سلطنت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہمایوں جب سندھ کے علاقہ میں سرگرداں پھر رہا تھا تو ۱۵۴۲ء میں عمر کوٹ کے مقام پر اس کا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جلال الدین رکھا گیا۔ ہمایوں اس زمانہ میں اس قدر پریشانی کی حالت میں تھا کہ ایران جاتے وقت وہ اپنے نومولود بچے کو بھی ہمراہ نہیں لے جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس بچہ کو مرزا عسکری کی بیوی کے پاس قندھار میں چھوڑ دیا۔ ایران سے واپسی[1] پر جب ۱۵۴۴ء میں ہمایوں

---

[1] ہمایوں کے ایران میں قیام کا تذکرہ یہاں نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ بتلانا دلچسپی سے خالی نہیں کہ شاہ ایران نے اس کو مدد دینے کی قیمت تبدیلی عقائد کی شکل میں طلب کی۔ عبدالقادر بدایونی (منتخب التواریخ نولکشور ایڈیشن ص ۱۲۱) کا بیان ہے کہ جب ہمایوں کے سامنے شیعہ عقائد تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ ان کو ایک کاغذ پر لکھ دیا جائے، اس پر جو کچھ لکھا تھا اس کو بادشاہ بطریق نقل خواندند و ذکر ائمہ اثنا عشر بہ یاد خطبہ بروش عراق تقبل نمودند، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمایوں نے دل سے تبدیل عقائد نہیں کیا بحالت مجبوری یہ طریقہ اختیار کیا۔

Marfat.com

نے قندھار فتح کیا تو اس کا بیٹا بھی اپنے والدین کے پاس آ گیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اب بھی ہمایوں کے بھائی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کے اپنے مفاد میں باہمی اتحاد ضروری ہے۔ کئی سال تک اس کو ان کے خلاف جنگ کرنا پڑی ۱۵۴۸ء میں بالآخر کامران کو اپنے بڑے بھائی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے، ہمایوں نے اس کے سارے قصور معاف کر کے ایک مختصر سے علاقہ کی حکومت اس کے سپرد کر دی، لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کامران نے دوبارہ بغاوت کی اور کابل پر قبضہ کر لیا، ہمایوں نے پھر فوج مرتب کی اور کامران اور مرزا عسکری کو دوبارہ شکست دی۔ عسکری گرفتار ہوا اور حج کے لئے مکہ بھیج دیا گیا، وہیں اس کی وفات ہوئی، کامران بھاگ کر جان بچانے کی غرض سے ہندوستان میں داخل ہوا اور اسلام شاہ سے پناہ طلب کی، اس میں اس کو کامیابی نہ ہوئی، وہ گکھڑوں کے علاقہ میں پہنچا جہاں اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب وہ ہمایوں کے سامنے پیش ہوا تو اس کے افسروں نے مشورہ دیا کہ کامران کو قتل کر دینا چاہئے۔ مگر ہمایوں نے پھر اس کو معاف کر دیا لیکن اس کو اندھا کر دینے کا حکم دیدیا۔ اب وہ نہایت عسرت اور لاچاری کی حالت میں تھا چنانچہ وہ بھی مکہ چلا گیا اور ۱۵۵۷ء میں وہاں وفات پائی۔

۱۵۵۴ء کے آخر میں ہمایوں اپنی ہندوستانی سلطنت واپس لینے کی غرض سے کابل سے روانہ ہوا اس کی فوجیں پنجاب کا علاقہ فتح کرتی ہوئی سرہند تک پہنچ گئیں، سکندر شاہ سوری دہلی سے مقابلہ کرنے کے لئے آیا اور ایک مرتبہ پھر مغل اور افغان فوجوں میں ۲۲ جون ۱۵۵۵ء کو میدان جنگ ہوئی، افغانوں نے شکست کھائی اور ٹھیک ایک ماہ بعد ۲۳ جولائی کو ہمایوں فاتحانہ انداز میں دہلی میں داخل ہوا، سکندر کے تعاقب کا کام بیرم خاں اور شہزادہ اکبر کے سپرد کر دیا گیا اور ہمایوں خود نظام سلطنت میں مصروف ہو گیا، لیکن ابھی اس کو سلطنت حاصل کئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک روز شام کے وقت وہ اپنے کتب خانہ کی چھت پر تھا کہ نماز مغرب کی اذان سنائی دی، فوراً وہ بیٹھنا چاہتا تھا کہ اس کی لکڑی پھسل گئی اور وہ زینہ سے نیچے گر گیا جب اس کو ہوش آیا تو اس نے اپنے بیٹے کو پیغام بھیجا کہ اس کی حالت نازک ہے اور وہ اس کو اپنا

Marfat.com

جانشین نامزد کرنا ہے، ۲۶ جنوری کو وہ اس جہان سے رخصت ہو گیا۔

ہمایوں کے متعلق صحیح کہا گیا ہے کہ اس کے نام کے معنی ہیں خوش قسمت لیکن اس کی زندگی بد قسمتیوں کا ایک مجموعہ تھی، بعض مورخوں نے اس کے کردار اور کارناموں کی غلط تصویر پیش کی ہے اور اس کی ناکامیابیوں کی تمام تر ذمہ داری اس پر رکھی ہے، یہ صحیح نہیں۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور خوش اخلاق انسان تھا، اس نے مصیبتوں کا سامنا بہت استقلال اور ہمت سے کیا بہت کم لوگ تاریخ میں ایسے ہیں جو سلطنت ایک مرتبہ کھونے کے بعد دوبارہ اس کو فتح کر سکے ہوں، یہ صرف غیر معمولی صبر و تحمل اور پختہ عزم کے ساتھ ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ ہمایوں کی وفات کی خبر سنکر بیرام خاں نے ایک لمحہ ضایع کئے بغیر کلانور کے قصبہ میں اکبر کی رسم تخت نشینی ادا کی اور اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا، اس وقت برصغیر کے نقشہ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ اس کے سامنے بہت سی مشکلیں تھیں۔

سوریوں کی سلطنت شیر شاہ کے بعد ہی سے انحطاط پذیر ہونے لگی تھی شیر شاہ کا بیٹا اسلام شاہ نو سال تک حکمرانی کرتا رہا لیکن اس میں نہ شیر شاہ جیسی قابلیت تھی اور نہ اس کی سی ہمت ۱۵۵۴ء میں اس نے گوالیار میں جو اس کو بہت پسند تھا وفات پائی، امرا نے اس کے بیٹے فیروز کو جس کی عمر صرف بارہ سال تھی تخت پر بٹھلایا، لیکن اس کو تخت پر بیٹھے ہوئے کچھ ہی دن گذرے تھے کہ اس کا ماموں مبارز خان جو شیر شاہ کے بھائی کا لڑکا تھا گوالیار آیا اور فیروز کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ گیا اس نے عادل شاہ کا لقب اختیار کیا، عام طور پر لوگ اس کو عدلی کہتے تھے، اس نے تخت پر بیٹھتے ہی ان باثر امرا اور رشتہ داروں کو قتل کرنے کی سازشیں شروع کر دیں جن کو وہ خطرناک سمجھتا تھا، ان ہی میں اس کا بہنوئی ابراہیم سور تھا، ابراہیم کو بادشاہ کے ارادوں کی خبر اپنی بیوی سے مل گئی چنانچہ وہ بھاگ کر دہلی گیا اور وہاں اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، کچھ عرصہ بعد عادل شاہ کا دوسرا بہنوئی احمد بھی اپنی جان بچا کر گوالیار سے بھاگا اور دہلی پہنچا، اس نے ابراہیم کو شکست دیکر دہلی پر قبضہ کر لیا اور سکندر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ابراہیم شکست کھانے

Marfat.com

کے بعد مغربی پنجاب کی طرف چلا گیا اور گجرات کے قریب رجبار کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سوری سلطنت تین حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی، ان تین بادشاہوں کے علاوہ بنگال، گجرات، ہند، راجپوتانہ اور کشمیر بھی سوری سلطنت میں شامل نہ تھے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب اور دہلی کا علاقہ جو ہمایوں نے فتح کر لیا تھا اس کو چھوڑ کر سارا برصغیر خود مختار تھا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی

۱۵۵۶ء

ان حالات میں یہ امر تعجب خیز نہیں کہ اکبر کی حکومت کا نیم صد سالہ دور چھوٹی اور بڑی لڑائیوں کی ایک مسلسل کہانی ہے، مغلیہ فتوحات کا ایک مختصر خاکہ غیر دلچسپ نہ ہو گا لیکن فتوحات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے اکبر اور اس کے اتالیق بیرام خان کو ایک زبردست دشمن سے مقابلہ کرنا پڑا۔ عادل شاہ سوری نے ایک ہندو سردار ہیمو کو بہت وسیع اختیارات سپرد کر رکھے تھے، ہیمو پیشہ کے لحاظ سے بقال تھا لیکن اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ میدان جنگ میں بھی کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ ہمایوں کی موت سے فائدہ اٹھا کر اس نے آگرہ کی طرف سے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور آگرہ اور دہلی دونوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کامیابیوں سے اس کے وسائل اور قوت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا، اور قوت کے ساتھ ساتھ اس کا غرور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ دہلی کی فتح کے بعد بعض مغل سرداروں کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ ہیمو کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے ان کا خیال تھا کہ نئے بادشاہ کو کابل واپس چلا جانا چاہئے لیکن بیرام خاں نے اس کے خلاف یہ مشورہ دیا کہ ہیمو کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ پانی پت کے میدان میں زبردست جنگ ہوئی، ہیمو نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ پانی پت کی دوسری جنگ بھی پہلی جنگ کی طرح اہم اور فیصلہ کن تھی۔ اس فتح سے مغلوں کا اقتدار دوبارہ قائم ہوا۔

تین چار سال کے اندر مغلوں نے دوسرے قریبی علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ ۱۵۶۰ء میں اکبر جو اب جوان ہو گیا تھا اپنے اتالیق اور ہمایوں کے وفادار دوست اور سردار یعنی بیرام خاں کو اختیارات سے محروم کر کے حکومت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا

Marfat.com

بیرام خاں نے بادشاہ کا مقابلہ کیا لیکن اس کو شکست ہوئی، اکبر نے اس کو حج جانے کی اجازت دیدی، مگر اثنائے سفر میں اس کو ایک شخص نے قتل کر دیا، بعض مورخوں نے بیرم خاں کے ساتھ اکبر کے اس برتاؤ پر سخت نکتہ چینی کی ہے، بیرام کی خدمات اور کارنامے مسلم ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ بعض معاملات میں اس کا رویہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ بیرام خاں کے بیٹے عبدالرحیم خاں نے اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں بہت ترقی کی۔

اکبر کی فتوحات

۱۵۶۲ء میں اجمیر جاتے وقت اکبر نے جے پور کے راجہ کی لڑکی سے شادی کی اور اس کے بیٹے بھگوانداس اور پوتے مان سنگھ کو اپنی ملازمت میں لے لیا، اس کے بعد راجپوت راجاؤں کی متعدد لڑکیاں اور بہنیں اس کی حرم میں داخل ہوگئیں، مگر چتوڑ کے راجہ نے اس کی بالادستی قبول نہ کی اور مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا، چنانچہ ۱۵۶۷ء میں اس نے چتوڑ پر حملہ کیا، کئی ماہ کے محاصرے کے بعد چتوڑ فتح ہوا۔ اس کے بعد رنتھمبور، بوندی، کالنجر اور دوسری راجپوت ریاستیں فتح ہوگئیں اور آخر کار کل راجپوتانہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوگیا۔ فتح چتوڑ کے پانچ سال بعد گجرات اور ۱۵۷۵ء میں بنگال کی خود مختار ریاستیں فتح ہوئیں اور سلطنت میں شامل ہوگئیں۔

۱۵۸۱ء میں اکبر کے چھوٹے بھائی مرزا حکیم نے جو کابل کا حاکم تھا حملہ کیا، اکبر نے فوراً جوابی کارروائی شروع کی اور ایک زبردست فوج لے کر پنجاب کے علاقہ میں داخل ہوا، حکیم کابل واپس چلا گیا، اکبر بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا کابل تک پہنچا، یہاں اس نے حکیم کا قصور معاف کر دیا اور دوبارہ اس کو اسی صوبہ کا حاکم مقرر کر دیا[1]۔ چھ سال بعد کشمیر کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۵۹۰ء

[1] مرزا حکیم کے حملے سے قبل اکبر کی اسلام دشمنی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور اسلامی شعائر پر متعدد ضربیں پڑ چکی تھیں درباری زندگی پر غیر اسلامی رنگ روزانہ زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا، لیکن اکبر اب تجربہ کار سیاست داں بن چکا تھا، چنانچہ کابل جاتے وقت قبائلی علاقوں کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی غرض سے اس نے نماز بھی گاہ بگاہ پڑھنی شروع کر دی اور علی مسجد میں جو درہ خیبر میں واقع ہے خاص اہتمام تشہیر کے ساتھ نماز ادا کی گئی۔

Marfat.com

میں اکبر نے عبدالرحیم خانخانان کو ملتان کا حاکم مقرر کرکے ہدایت کی کہ سندھ کو سلطنت میں شامل کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں، خانخانان نے سندھ پر حملہ کیا اور مرزا جانی بیگ کو جو وہاں کا حاکم تھا شکست دے کر دربار اکبری میں حاضری کے لئے مجبور کیا، جانی بیگ دربار میں حاضر ہوا اور اکبر کی سرپرستی حاصل کرنے کی غرض سے اس نے دین الٰہی قبول کرلیا۔ ۱۵۹۵ء میں قندھار کے ایرانی گورنر نے اپنا علاقہ مغل شہنشاہ کو سپرد کر دیا، چنانچہ مغلیہ سلطنت کا اقتدار شمال میں کابل اور جنوب میں قندھار کے علاقوں پر قائم ہو گیا۔

دکن میں بہمنی سلطنت پانچ خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تھی[لہ]۔ اکبر کے زمانہ میں تین بڑی ریاستیں باقی تھیں یعنی احمد نگر، گولکنڈہ اور بیجاپور۔ احمد نگر دکن کے شمالی علاقہ میں تھی اس لئے سب سے پہلے مغلوں کا حملہ اسی پر ہوا، چاند بی بی نے جس کے ہاتھ میں اصلی اقتدار تھا جم کر مقابلہ کیا لیکن بالآخر وہ صلح کرنے پر مجبور ہوئی اور احمد نگر کا کچھ حصہ جس میں برار شامل تھا مغلوں کے قبضہ میں آگیا، یہ صلح زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور احمد نگر کے حالات خراب ہو گئے۔ بالآخر چاند بی بی قتل ہو گئی اور احمد نگر مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ ہو گیا۔ ۱۶۰۱ء میں خاندیش کی چھوٹی سی ریاست جو احمد نگر کے شمال میں تھی اور اسیر گڑھ کا مضبوط قلعہ بھی مغلوں نے فتح کر لیا۔ اس کے بعد دکن کے علاقے کو تین صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا یعنی برار، خاندیس اور احمد نگر۔ اکبر کی یہ آخری بڑی فتوحات تھیں کیونکہ چار سال بعد یعنی ۱۶۰۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ بحیثیت مجموعی اس میں شک نہیں کہ حربی فتوحات کے لحاظ سے یہ ایک عظیم کارنامہ تھا کہ اکبر نے سارا شمالی ہند و پاکستان فتح کرکے اس پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل قدر اس کی وہ اصلاحات تھیں جو استحکام سلطنت کی غرض سے نافذ کی گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ اکبر کی اصلاحات برصغیر کی تاریخ کے بہترین نمونوں میں سے ایک تھا۔

لہ ان پانچ سلطنتوں کے نام یہ ہیں: بیدر، برار، احمد نگر، گولکنڈہ، بیجاپور۔

کی جاتی ہیں، انتظامیہ و مالیہ کا جو ڈھانچہ اس نے تیار کیا وہ کلیتہً کبھی بھی نہ بدلا گیا، بعد کی حکومتیں ان میں حسب ضرورت تبدیلیاں کرتی رہیں، لیکن اس سے بہتر کوئی متبادل انتظام وجود میں نہیں آیا اسی طرح منصب داری طریقہ مغلیہ حکومت کے آخری زمانہ تک قائم رہا، تاریخ کے طلبہ کے لئے ان اصلاحات کا مطالعہ بہت اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی، لیکن یہاں ان کی تفصیلات کا ذکر ممکن نہیں۔

Marfat.com

باب ہشتم

معاشرہ و ادب مغلوں کے ابتدائی دور میں

مغل بادشاہ اور علمی و ادبی زندگی

تہذیب و تمدن کی ترقی کے لحاظ سے مغلیہ سلطنت کا دور برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔ تمدن کے ہر شعبہ میں ہماری ترقی انتہائی عروج پر پہنچی اور ہند پاکستان اس زمانہ میں دنیا کے عظیم ترین علاقوں میں شمار کیا جانے لگا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یورپ میں مغل شہنشاہ کو "مغل اعظم" کہا جاتا تھا۔ علوم و فنون کی ترقی کا مفصل تذکرہ یہاں ممکن نہیں اس موضوع کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے، لیکن اس سلسلہ میں ہم سلاطین ہائے دہلی، علماء، ادباء اور دوسرے اہل فن نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی چند خصوصیات اور ان سے متعلق اہم واقعات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا یہاں بے محل نہ ہوگا کہ سلاطین دہلی کے مقابلہ میں مغل حکمران من حیث المجموع مذہبی زندگی اور دینی لٹریچر میں کم دلچسپی رکھتے تھے، عالمگیر بے شک اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی سرپرستی میں زیادہ تر ادب کے غیر مذہبی شعبوں نے ترقی کی ان میں شاعری اور تاریخ نویسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، دینی علوم سے متعلق جو کچھ لکھا گیا، اس کا بڑا حصہ انفرادی یا مجلس اداروں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ تعلیم کی ذمہ داری براہ راست حکومت نے کبھی نہیں لی، یہ ٹھیک ہے کہ بعض حکمرانوں اور امیروں نے مدرسے قائم کئے۔ ان کے لئے جائدادیں وقف کیں اور علماء وغیرہ کو

عطیات اور انعامات دیتے لیکن یہ سب چیزیں انفرادی سطح پر تھیں، جس حکمران یا صاحب ثروت و اقتدار کو جس شعبہ سے زیادہ دلچسپی ہوتی اسی کی وہ سرپرستی کرتا، حکومت کی بحیثیت حکومت کے کوئی پالیسی نہ تھی، آئندہ صفحات میں ان واقعات کی طرف مزید اشارہ کیا جائیگا ان واقعات کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانے میں سہولت ہوگی کہ حکومت کی غیر توجہی کی پالیسی کے باوجود مسلم حکمرانوں نے اس سلسلہ میں کتنی کوشش کی اور اس سلسلہ میں ان کا کیا کارنامہ ہے۔ لاتعداد علماء نے اپنی زندگیاں تعلیم کے لئے وقف کیں، ذاتی منافع اور آرام و آسائش کو ٹھکرایا اور خدمت کی زندگی کو ترجیح دے کر درس و تعلیم کی ذمہ داری لی، ان کی کوششوں اور گرانبہا قربانیوں کے خوشگوار نتائج آج بھی تاریخ کے صفحات میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

بابر کا علم و ادب سے شغف

بابر نے اپنی زندگی میں جن انقلابات اور ہنگامہ آرائیوں سے گزرنا پڑا ان کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کو علم و ادب سے دلچسپی کے مواقع بہت کم ملے ہوں گے، لیکن اس کے کارناموں کی تفصیلات سے یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے کہ سیاسی کشمکش اور لڑائیوں کے باوجود علم و ادب اور شعر و شاعری میں وہ اپنی فطری دلچسپی رکھتا تھا اور ان کے لئے اتنا وقت نکال لیتا تھا، وہ ترکی اور فارسی میں شعر بھی کہتا تھا اور نثر بھی لکھتا تھا[1] تزک بابری اس قدر دلچسپ اور قابل قدر تصنیف ہے کہ بعض مورخین نے بابر کو خود نوشت سوانح نگاروں کا بادشاہ کہا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ لقب غلط نہیں، خود نوشت سوانح حیات میں بالخصوص جب ان کے مصنف حکمران ہوں، تصنع اور مبالغہ سے خالی نہیں ہوتے، لیکن بابر کی تزک اس سے مستثنیٰ ہے، اس لئے تاریخ

---

[1] بابر اور اس خاندان کے دوسرے شہزادوں کی شاعری کے لئے دیکھو ڈاکٹر اے شمل "بابر بادشاہ بحیثیت شاعر......" اسلامک کلچر حیدرآباد دکن جلد ۳۴ نمبر ۲ اپریل ۱۹۶۰ء

Marfat.com

کے طلبا کی نظر میں ہمیشہ ایک مفید اور معتبر مآخذ رہی ہے۔ اس کے ان بیانات کو بعض مورخوں نے تسلیم کر لیا ہے جس کا وہ تنہا راوی ہے۔ ابوالفضل جو خود بڑا فاضل شخص تھا اس کے متعلق لکھتا ہے: "بہ عبارت فصیح و بلیغ نوشتہ است"۔ مغربی مورخوں نے مثلاً ہنری الیٹ، ولیم ارسکن ایس۔ ایم ایڈورڈس وغیرہ نے بھی اس کی مختلف خصوصیات کی تعریف کی ہے اور اس کی حقیقت پسندی اور صداقت بیانی کا اعتراف کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد بابر کی خود اپنی شخصیت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی تزک کے ترجمے متعدد بار اور متعدد زبانوں میں ہوئے۔ اکبر کے زمانہ میں اور اس کے ایما سے مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے اس کو فارسی لباس پہنایا۔ دور جدید میں اس کا ترجمہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو میں مرزا نصیر الدین حیدر نے اس کا ترجمہ کیا۔ شعر گوئی میں بابر کو بلند مقام حاصل تھا۔ ابوالفضل نے اس کے دیوان کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ [illegible] اپنے لڑکے کامران کے لئے مذہبی و فقہی مسائل پر مشتمل دو ہزار اشعار کی ایک مثنوی [illegible] بعض جگہ نفقہ بابری کے نام سے بھی ذکر کیا ہے۔ شیخ زین [illegible] رسائل [illegible] نام سے ترکی شاعری کے عروض پر [illegible] بہت کم دستیاب ہوتے ہیں لیکن ان کی [illegible] فارسی میں اشعار دلپذیر دارد [illegible] بہت زیادہ [illegible] بگوید [illegible] اس کے جاننے کے بعد [illegible]

۱؎ اکبر نامہ جلد ۱، ص ۱۱۸

۲؎ ایضاً جلد ۳، ص ۲۰۴

قرار و عہد ابن چنین نبود مرا ۔۔ گزید ہجر و مرا کرد بے قرار آخر
بہ عشوہ ہائے زمانہ چہ چارہ ساز کس ۔۔ بجور کرد جدا یا ساز یار آخر

بابر کا ایک مشہور اور بے حد مقبول شعر ہے ؎

نوروز و نو بہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ابوالفضل نے اس کی ایک رباعی اکبر نامہ میں نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیاء کرام اور درویشوں کی وہ کس قدر عزت کرتا تھا۔

درویشان را اگرچہ نہ از خویشانیم ۔۔ لیک از دل و جان معتقد ایشانیم
بہتر است مگو شاہی از درویشی ۔۔ شاہیم ولے بندۂ درویشانیم

اپنے مرشد خواجہ عبداللہ کے وصال کے بعد ان کا تصور کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

در ہوائے نفس گمرہ عمر ضائع کردہ ایم ۔۔ پیش اہل اللہ از افعال خود شرمندہ ایم
یک نظر با مخلصان خستہ دل فرما کہ ما ۔۔ خواجگی را ماندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

ان اشعار سے بابر کی طبیعت کا رجحان اور اس کا عجز و انکسار ٹپکتا ہے۔

بابر صرف شاعر ہی نہ تھا بلکہ سخن سنج اور سخن شناس بھی تھا اور علماء، فضلاء اور شعراء کی سرپرستی بھی کرتا تھا، کئی عالم اور شاعر اس کے دربار سے وابستہ تھے، شیخ زین الدین وفائی، شہاب الدین حقیر اور مولانا بقائی کا ذکر خاص طور سے کیا جا سکتا ہے، تاریخوں میں بعض واقعات مذکور ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اہل علم اور اہل فن کو دل کھول کر انعامات دیتا تھا، اسی طرح ہم کو کتابوں سے اس کی دلچسپی کا حال تاریخی واقعات میں ملتا ہے، ایک مختصر سا کتب خانہ اس کے ساتھ سفر میں بھی رہتا تھا، فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ لاہور کے قریب اس نے ایک سردار غازی خاں کو شکست دی، غازی خان کے کتب خانہ پر اس کا قبضہ ہوا، بابر نے نہایت احتیاط سے کتابیں تقسیم کیں، کچھ خود اپنے کتب خانہ میں رکھیں اور کچھ ہمایوں اور کامران کے پاس بھجوائیں۔

Marfat.com

ان مختصر اشارات سے معلوم ہوگا کہ یہ برصغیر کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی تاریخ میں سب سے شاندار اور عظیم سلطنت کا بانی علم و فضل اور ان کی سرپرستی کی گہری روایتیں اپنے ہمراہ لایا تھا، اس کے معدود نتائج ہم کو زمانہ مابعد کی تہذیب و تمدن کی غیر معمولی ترقی کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

ہمایوں

بابر کو علم و ادب سے جو دلچسپی تھی اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے اپنے بیٹوں کے لئے بہتر سے بہتر تعلیم دلوانے کا انتظام کیا ہوگا، اس کی تفصیل ہم کو نہیں معلوم لیکن جہاں تک ہمایوں کا تعلق ہے بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اچھے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہوگا اور ان کے کمالات سے بدرجہ اتم مستفیض ہوا ہوگا تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کو اتنی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا کہ اس زمانہ میں وہ علمی ادبی کوشش بڑے پیمانہ پر جاری نہ رکھ سکا، پھر بھی ہم کو اس کے ذوق شاعری اور شعراء و ادباء کی سرپرستی سے متعلق ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس کا پچیس سالہ دور حکومت پر امن ہوتا تو وہ اس شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دیتا، ہمایوں کے ذوق سخن اور شعر گوئی کا ذکر مورخین اور تذکرہ نگاروں نے اچھے الفاظ میں کیا ہے اور نمونے کے اشعار بھی اکثر نقل کئے ہیں۔ قنوج کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد وہ لاہور اس غرض سے گیا کہ شاید اب بھی اس کا بھائی مرزا کامران اس کے ساتھ متحد ہو کر افغانوں کا مقابلہ کرے، کامران نے زمانہ کی نیرنگیوں سے ابھی کچھ تجربہ حاصل نہیں کیا تھا، چنانچہ وہ ظاہر میں تو ہمایوں سے اتفاق و اتحاد کی باتیں کرتا رہا لیکن حقیقت میں شیر شاہ سے سازش کرنے میں مصروف تھا، چنانچہ شیر شاہ لاہور کے بہت قریب پہنچ گیا اور ایک قاصد کامران کے پاس بھیجا، کامران نے اس کا استقبال کیا اور اس سلسلہ میں جشن منایا، ہمایوں کے دل پر جو گذرا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں اس موقعہ پر اس نے مندرجہ ذیل رباعی لکھی اور بقول گلبدن بیگم، شیر خان کے پاس بھیجی ؎

در آئینہ گرچہ خود نمائی باشد ٭ پیوستہ ز خویشتن جدائی باشد

خود بنمائی غیر دیدن عجب است ؛ این بوالعجبی کار خدائی باشد

جلاوطنی کی حالت میں جب شاہ ایران کی طرف رخ کیا اور اس سے مدد مانگی تو اس خط میں کچھ اشعار بھی لکھے جن میں سے چند نقل کرنے کے لائق ہیں:-

خسروا عمریست تا عنقائے عالی ہمتم ؛ قلہ قاف قناعت را نشیمن کردہ است

. . . .

دشمنم تیر است اما پشت برمن کردہ بود ؛ این زمان از ضعف طالع رو برمن کردہ است

التماس از شاہ آن دارم کہ با من آن کند ؛ آنچہ با سلمان علی در دشت ارژن کردہ است

ان ہی کے ساتھ جو رباعی اس نے لکھی تھی وہ بھی دلچسپ ہے:

اے شاہ جہاں کہ تہ فلک پایہ تست ؛ در دست ولایت ہمہ سرمایہ تست

شاہان جہان جملہ ہما می طلبند ؛ بنگر ہما عنقوہ در سایہ تست

ابوالفضل نے ہمایوں کی موزونی طبع کی تعریف کی ہے اور لکھتا ہے کہ "دیوان شعر آنحضرت در کتاب خانہ عالی موجود است" وہ اس کے بعض اشعار بھی نقل کرتا ہے، ان میں ایک رباعی یہ ہے؎

اے دل مکن اضطراب در پیش رقیب ؛ حال دل خود مگو بہ ہیچ طبیب

کامد بلا تو باد آن جفا کار ز نشاد ؛ بس قصہ مشکل است و بس عجیب

اسی طرح فرشتہ نے بھی کچھ غزلیں نقل کی ہیں جو اس کو پسند تھیں، ان میں سے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں:-

گذشتن از دل سرگشتہ ناوک ستمش ؛ نماند بر من دلدادہ لذت المش

بقصد کشتن عشاق گر کشد میلے ؛ عجب مباش از آن اخلاق و شیوہ کرمش

گر است نصرت قرب حریم عزت او ؛ کہ جبرئیل امیں نیست محرم حرمش

اگر بہ پرسش عشاق می نہد قدمے ؛ ہزار جان گرامی فدائے ہر قدمش

Marfat.com

صاحب تذکرہ مخزن الغرائب، احمد علی سندیلوی نے ہمایوں کو "مربی اہل فضل و کمال و مرجع اہل تقویٰ و صلاح و بہ شعر و شعرا مائل" لکھ کر رائے دی ہے کہ "دو شعر نیکو گفتہ" اور کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں، ان میں ایک شعر یہ بھی ہے:

دریا دلیم و دیدۂ ما معدن درست ؛ گر [illegible] ماتمی است [illegible] چشم ما پیداست

ہمایوں کا دیوان حافظ شمس الدین (پٹنہ کالج) کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں پٹنہ میں شائع ہو چکا ہے۔ ہمایوں کے نعتیہ کلام میں سے دو اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

اے [illegible] کا نشان [illegible] ؛ [illegible] حبیب حق [illegible]

بر خیز تماشائی عالم آ [illegible] ؛ [illegible] عالم مشہور

سلطان [illegible] ؛ [illegible]

[illegible] ؛ [illegible]

[illegible]

[illegible] بزم تیموریہ [illegible] ۲۵

حاصل تھی، ہمایوں کو ان سے بہت دلچسپی تھی، ہمایوں کی وفات پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا جو بہت مقبول ہوا:

همایوں پادشاه آن آفتابے ۔۔۔ که فیض شامل او عام افتاد
بنائے دولتش چوں یافت رفعت ۔۔۔ اساس عمرش از انجام افتاد
چو خورشید جہاں تاب از بلندی ۔۔۔ بیاباں چوں نماز شام افتاد
جہاں تاریک شد در چشم مردم ۔۔۔ خلل در کار خاص و عام افتاد
پے تاریخ او کاہی رقم زد
ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

کاہی بعد میں دینِ الٰہی میں شامل ہو گیا تھا، اس لئے عبدالقادر بدایونی اس سے خوش نہیں لیکن پھر بھی اس کے کمالاتِ شاعری کا تذکرہ انہوں نے کیا ہے[ل]۔ ان کے علاوہ شیخ امان اللہ پانی پتی جلالی، میر ویسی، ضمیری، موتی کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ہمایوں کو فضلاء و ادباء کی صحبت پسند تھی، صاحبِ طبقاتِ اکبری نے اس کی ان دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ رات رات بھر علماء و فضلاء کی مجلس میں بیٹھا رہتا تھا۔ ان مجلسوں میں علمی بحثیں ہوتی تھیں اور وہ سنتا رہتا تھا۔ "ارباب فضل و ہنر را در عہدش رونق تمام پدید آمد"۔ چند فضلاء کا ذکر یہاں نہایت مختصر الفاظ میں کیا جا سکتا ہے:۔

خواند امیر ہرات میں پیدا ہوا اور وہیں دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اس کی سب سے پہلی کتاب مآثر الملوک ہے جس میں ملوک اور اولیاء کے حالات ہیں۔ خلاصۃ الاخبار میں اس نے اپنے نانا میر خواند کی مشہور تاریخ روضۃ الصفا کی تلخیص کی ہے، اس کے علاوہ اس کی اور بھی کئی تصنیفیں ہیں، جب ہرات شاہ اسمٰعیل صفوی کے زیرِ اقتدار آ گیا تو خواند امیر بھی

[ل] دیکھو منتخب التواریخ ص ۳۳۶

Marfat.com

اسی کے دربار سے وابستہ ہوگیا، شاہ اسمٰعیل کے وزیر کریم الدین حبیب اللہ کی سرپرستی میں اس نے اپنی مشہور تصنیف حبیب السیر فی اخبار افراد البشر تین جلدوں میں تیار کی۔ یہ تاریخ ابتدائے عالم سے شروع ہوتی ہے اور آج تک نہایت مستند اور معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ ۱۸۵۵ء میں تہران سے اور پھر ۱۸۵۷ء میں بمبئی سے شائع ہو چکی ہے۔ ابھی حبیب السیر ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ حبیب اللہ کا انتقال ہو گیا۔ خواندمیر ان حالات میں ایران چھوڑ کر قندھار آ گیا اور وہاں سے ہندوستان آ کر بابر کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ بابر کے بعد ہمایوں نے بھی اس کی قدر کی اور اس کو امیر مورخ کا خطاب دیا۔ اس نے ہمایوں کے کہنے پر قانون ہمایونی تصنیف کی جس میں اس زمانہ کی اختراعات کا ذکر ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کو شائع کر دیا ہے۔

ہمایوں کے عہد کی ایک اور تاریخ قابل ذکر ہے۔ ہمایوں کے آفتابچی جوہر نے جو سفر و حضر دونوں میں اپنے آقا کے ساتھ رہتا تھا، اس عہد کے واقعات قلم بند کئے ہیں۔ اس کی یہ تصنیف (تذکرۃ الواقعات) ہمایوں کے عہد حکومت کی سب سے بہتر تاریخ ہے۔ کیونکہ مصنف نے اکثر واقعات کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ کہیں کہیں اس میں غلطیاں رہ گئی ہیں لیکن کتاب نہایت مستند ہے اور مبالغہ و تصنع سے پاک ہے۔ زبان ظاہر ہے کہ ادبی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ جوہر کی علمی استعداد محدود تھی اور وہ ایک مدت تک آفتابچی کی خدمت پر مامور رہا تھا۔ ہمایوں کے عہد کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ راقم الحروف کے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ ہمایوں کا درباری طبیب یوسف بن محمد ہروی بھی مصنف تھا۔ اس کی تصانیف میں ریاض الادویہ، جامع الفوائد اور [illegible] کے نام قابل ذکر ہیں۔ علم نجوم سے بھی ہمایوں کو بہت دلچسپی تھی۔ بلکہ شہزادگی کے زمانہ میں بھی ملا الیاس اردبیلی جن سے اس نے یہ فن سیکھا تھا اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اصطرلاب کے مطالعہ میں [illegible] کو خاص مہارت تھی۔ صاحب مآثر الامراء نے مولانا نور الدین ترخان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

که وه همایوں کے زمانے خاص میں بھی اور: "گاہے پادشاہ از وے استفادہ علوم می کرد و گاہے او از علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب همایونی که دریں فن مہارت تمام داشت استفاضہ می نمود۔"[1] نجوم سے ہمایوں کے شغف کا اندازہ اس کے واقعہ موت سے لگایا جا سکتا ہے قلعہ کے اندر شیر منڈل میں اس کا کتب خانہ تھا اور اسی کے ایک برج میں اس نے رصد گاہ قائم کر رکھی تھی۔ ستارہ زہرہ کے طلوع ہونے کا گمان کیا جا رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں ہمایوں چند دیگر ماہرین فن کے ساتھ وہاں بحث میں مصروف تھا کہ اذان مغرب کی آواز آئی۔ وہ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ پھسل گیا اور گر پڑا۔ ہمایوں کی سرپرستی کی بدولت کرّے اور اصطرلاب یہاں بننے لگے جن میں سے بعض آج تک عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ ہمایوں نے خود ایک خاص اصطرلاب ایجاد کیا تھا جو اصطرلاب ہمایونی کہلاتا ہے۔ نجوم کے ساتھ ریاضی کا علم بھی ضروری تھا۔ یہی سبب ہے کہ فرشتہ نے لکھا ہے کہ: "در علم ریاضی مہارتی افراشت"۔ نجوم سے ہمایوں کا شغف اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ہر معاملہ میں ستاروں کے اثرات نحس و سعد کا متلاشی رہتا تھا اور دربار کی ترتیب و لباس وغیرہ میں بھی اس کا لحاظ رکھتا تھا۔ اس کی تفصیل قانون ہمایونی میں موجود ہے۔ بعض اوقات یہ چیز مضرت رساں بھی ثابت ہوئی۔

مذہبی و سماجی حالت

بابر اور ہمایوں دونوں کٹر حنفی مسلمان تھے اور اسلام کے احکام پر حتی الامکان عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بابر میں شراب نوشی کی کمزوری موجود تھی لیکن آخر عمر میں اس نے اس کو ترک کر دیا تھا۔ وہ خواجہ مولانا قاضی عبداللہ کا مرید تھا۔ بابر سے اس کی عقیدت کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے تزک میں ان کا ذکر کرتے ہوئے استعمال کیے ہیں، وہ لکھتا ہے:

"خواجہ مولانا حضرت خواجہ عبیداللہ کے مرید تھے۔ ان ہی سے تربیت پائی تھی،

---

[1] مآثر الامرا جلد اول ص ۴۷۸

مجھ کو خواجہ قاضی کے ولی ہونے میں کچھ شک نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ مولانا مرحوم عجیب شخص تھے، ڈر اور خوف تو ان میں نام کو نہ تھا، ایسا دلیر آدمی دیکھا نہ سنا۔ یہ صفت بھی ولایت کی دلیل ہے۔ دنیا دار کیسے ہی بہادر ہوں مگر کچھ دھڑکا اور اندیشہ رہتا ہے۔ خواجہ اس سے بالکل پاک تھے[1]۔

اس کی تزک ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض مشائخ سے اس کو بہت عقیدت تھی اور ان کی تعلیمات سے وہ متاثر تھا۔ مثلاً مولانا جامیؒ کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کرتا ہے، ان کے علاوہ بعض اور بزرگوں کا بھی ذکر بابر نامہ میں ملتا ہے۔ ہندو پاکستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھنے کے بعد بھی بابر کی مشائخ سے عقیدت جاری رہی اور ان کے پند و نصائح سے فائدہ اٹھاتا رہا۔

شیخ عبدالحقؒ ردولوی

اس زمانہ میں چشتیہ نظامیہ سلسلہ جو کافی عرصہ تک [illegible] منتشر ہو چکا تھا اور [illegible] برقرار ہو گئے تھے۔ لیکن چشتیہ صابریہ سلسلہ کی [illegible] شاخ [illegible] شیخ جلال الدین پانی پتی کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان کے خلیفہ شیخ احمد عبدالحق ردولوی [illegible] کا اثر بہت تھا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی [illegible] نام [illegible] [illegible] شیخ [illegible] سے اور سا [illegible] [illegible] تھا [illegible] ایک مرتبہ سلطان ابراہیم لودی کا کیمپ [illegible] کے قریب تھا۔ شیخ [illegible] ملاقات کریں [illegible] فرمایا کہ [illegible] تو تمام خلقت مسلمان ہو جائے اور اللہ کی محبت کا دم بھرنے لگے[2] [illegible]

---

[1] تزک بابری، بحوالہ بزم تیموریہ [2] دیکھو [illegible] [illegible]

سلمان ہونے سے یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اسلامی تعلیمات پر نظامی کے ساتھ عمل کرے۔ صوفیانہ ترک [illegible] ترک دنیا کے معنی ترک محبت دنیا ہیں نہ کہ رہبانیت اور مطلق ترک دنیا

Marfat.com

کر کہ شاید کہیں سلطان پر شیخ کا اثر نہ ہو جائے ان کو اپنے پاس روک لیا اور سلطان سے کہا کہ ملاقات سے پہلے یہ امتحان کرنا چاہئے کہ نافعی شیخ باکمال شخص ہیں یا نہیں، سلطان نے امتحان کا طریقہ دریافت کیا تو قاضی نے کہا کہ کچھ جائداد شیخ کو پیش کی جائے، اگر انہوں نے قبول کر لی تو سمجھئے کہ اہل کمال سے نہیں اور ملاقات سے کوئی ضرورت نہ ہوگا، اور اگر قبول نہ کی تو پھر ملاقات ٹھیک نہیں، قاضی کو خطرہ تھا کہ شاید شیخ کے اثر سے سلطان فقیر منش نہ ہو جائے، بہرحال سلطان نے قاضی کا یہ مشورہ قبول کر لیا کہ جائداد پیش کر کے شیخ کے اہل کمال ہونے کا امتحان لیا جائے۔ قاضی چار گاؤں اور ہزار بیگہ پختہ زمین کا فرمان لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ سلطان نے آپ کے فرزندوں کے لئے یہ نذر پیش کی ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ قاضی کلمہ پڑھو، قاضی نے کہا کہ میں نے کون سے الفاظ کفر کے کہے ہیں جو کلمہ پڑھوں، شیخ نے کہا۔ کیوں یہ کفر نہیں کہ تو اور ابراہیم دونوں خدا بنے جاتے ہو کہ رزق دینے کا دعویٰ کرتے ہو۔ جو خدا ابراہیم اور اس کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کو اور تجھ کو اور تیرے خدمت گاروں اور متعلقین کو رزق دیتا ہے کیا مجھ فقیر کے بچوں کو نہ دے گا، اور فرمایا کہ کیا میری اولاد فقر کی قدر نہ جانے گی کہ الفقر کنز من کنوز اللہ تعالیٰ۔ یہ کہہ کر مکان پر واپس آ گئے۔

شیخ عبد الحق کی زندگی کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بذریعہ تقریر و تحریر پند و نصائح کرنے کی بجائے بلند اقدار اور بنیادی اصولوں کو عملی شکل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔[۱]

شیخ عبد القدوس رح
مکتوبات قدوسیہ

صابری سلسلہ کے جن بزرگ نے سلاطین وقت کی براہ راست اصلاح کی وہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی ذات گرامی تھی جن کے متعلق بدایونی نے صحیح طور پر لکھا ہے کہ "مناقب و کمالات وے از شرح و بیان مستغنی" — یہ ہی نہیں کہ آپ کے خلفاء سے یہ سلسلہ پھیلا بلکہ آپ نے شاہان وقت، امراء

---

[۱] یہ بات قابل غور ہے کہ شیخ العالم شیخ عبد الحق کچھ عرصہ کے لئے بنگال میں بھی مقیم رہے

Marfat.com

اور دوسرے با اثر لوگوں کو ایسے خطوط لکھے اور ذاتی طور پر اس طرح تربیت دی کہ ان کے اخلاق و کردار پہ گہرا اثر پڑا ان کی کوششوں کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ تھی کہ اسلامی معاشرہ میں دین کی طرف سے غفلت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، اس کی مختلف وجوہات تھیں، جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے وہ بہت سی رسومات اور خیالات اپنے ساتھ لاتے اور لاشعوری طور پہ ان کو رواج دیتے رہتے تھے، دوسرا ختلاط یعنی فیروز شاہ کے بعد سے سلاطین و امراء پوری توجہ سیاسی و سماجی استحکام کی طرف نہیں دے سکے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق و کردار کی سطح پست ہونے لگی تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کی کھلم کھلا مخالفت اور توہین کی جاتی تھی، مثلاً بہلول لودی کے عہد میں خود ردولی کی حالت جہاں شیخ عبدالقدوس مقیم تھے اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ شیخ کو وہاں سے واپس آنا پڑا[۱]۔ وسط ہند، راجپوتانہ اور بعض دیگر مقامات پر بھی حالات قابل اطمینان نہ تھے۔ سلطان ابراہیم لودی کے مختصر دور حکومت میں حالت اور بگڑ گئی، سلطان اور اس کے امراء کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہو گئے کہ یہ لوگ نظم سلطنت سے لاپرواہ ہو کر آپس کے جھگڑوں اور چپقلشوں میں پھنس گئے۔ اس کے دور کے آخری چند سالوں میں بابر نے جب حملے شروع کئے تو مغلوں اور افغانوں میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ غرضیکہ معاشرہ کی عمارت متزلزل ہونے لگی تھی۔

اس زمانہ میں یعنی لودیوں کے آخری اور مغلیہ حکومت کے ابتدائی دور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے اپنے مکتوبات اور تعلیم کے ذریعہ معاشرہ کے با اثر طبقوں کی ہدایت کا کام سر انجام دیا۔ ردولی سے آکر شیخ دہلی کے قریب شاہ آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ بابر کی سرکردگی میں اس قصبہ پر جب مغلوں کا حملہ ہوا اور بقول شیخ کے صاحبزادے رکن الدین اس کو لوٹا گیا تو شیخ نے گنگوہ کا

---

[۱] اس واقعہ، نیز دوسرے اہم واقعات کے لئے دیکھو راقم الحروف کا مضمون "شیخ عبدالقدوس آف گنگوہ" پرسیڈنگز پاکستان ہسٹری کانفرنس سنہ ۱۹۵۲ء۔

Marfat.com

تسلیم کیا۔ جس وقت شیخ سفر میں تھے تو سلطان ابراہیم کو جو دریائے جمنا کے قریب ہی خیمہ زن تھا معلوم ہوا کہ شیخ موصوف قریب ہیں تو اس نے ان کو بہ اصرار اپنے لشکر میں بلا لیا چنانچہ وہ اپنے بڑے بیٹے حمید الدین کو ساتھ لے کر ابراہیم کے کیمپ میں آ گئے۔ افغانوں کی شکست کے بعد وہ بھی گرفتار ہوئے لیکن ان کے تقدس کے پیش نظر مغل فاتحین نے ان کو صرف اس قدر سزا دی کہ پانی پت سے دہلی تک وہ پیدل سفر کریں۔ بہرحال بعد میں بابر کو شیخ کی بزرگی کا اندازہ ہو گیا اور وہ ان کا احترام کرنے لگا جیسا کہ اس کے اس خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے اس کو لکھا اور وہ ان کے مکتوبات میں شامل ہے۔ یہ خط بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ شروع ہی میں شیخ نے ثابت کیا ہے کہ لہ الحکم والیہ ترجعون یعنی حقیقی حکومت اللہ ہی کی ہے۔ اس کے بعد بابر کو ترغیب دیتے ہیں کہ اس کو علماء و مشائخ سے عقیدت اور محبت ہے اور یہ کہ جس نے شریعت اسلام کو استوار کیا ہے۔ سارے خط میں تین چار باتوں پر زور دیا ہے جس میں شریعت کی پابندی، سادات، علماء اور تمام فقراء اور ضعفاء کی امداد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مثال کے طور پر چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

باید هم چنانکه بجائے شکر نعمت منعم حقیقی عدل به عالمیان جهان گسترد هیچ کس بر هیچ کس هیچ ظلم نکنند و همه خلق و همه سپاه را به اوامر و نواهی شرع مستقیم و مشائخ و بزرگان [illegible] جماعت نگاه دارند و علم علماء را دوست دارند و در بازارها بر شهرها محتسبان مقرر گردند تا شهر و بازارها را بجمال عدل شرع محمدی بیارایند و روشن و منور گردانند و [illegible] چنانکه در عهد سلف و خلفاء راشدین با جمیع شرائط بے شبه بود همچنان در عهد همایون روزگار سلطان جهاندار بے شبه ادا شود و دین بکمال رسد و بر روئے این عهد جمال عهد [illegible] قرنی پدید آید و خانه داران سرکاران مسلمانان پاک دین چالاک امینان متدینان در ولایت تعین کنند بتحصیل اموال بر وجه شرع کنند ...... الخ

Marfat.com

اس کے بعد شیخ نے بابر کو یہ بھی تنبیہہ کی ہے کہ دیوانی وغیرہ کے ذمہ دار عہدوں پر غیر مسلموں کا تقرر نہ کیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے کہ غیر مسلموں پر بہت زیادہ اعتماد کیا جاتا، تجربے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ جب کبھی ہندوؤں کو موقع ملتا تھا وہ اسلامی حکومت کی مخالفت کرتے تھے۔ ان واقعات کی روشنی میں سلطنت کی بقا اور استحکام کے لئے یہ ضروری تھا کہ ذمہ دار عہدوں پر تقرر کرتے وقت اس خطرے کو ذہن میں رکھا جاتا۔ یہی سبب تھا کہ شیخ نے بابر کو مشورہ دیا کہ دیوانی کے عہدے پر کسی غیر مسلم کا تقرر نہ کیا جائے۔[1]

بابر کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کی شیخ سے [illegible] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں خود شیخ کی خدمت میں [illegible] بادشاہ کا کسی شیخ کے مکان پر جانا یقیناً ایک نادر اور غیر معمولی بات ہے [illegible] کسی بادشاہ کا اس [illegible] شیخ سے انتہائی عقیدت [illegible] یہ ہے کہ جس زمانے میں بادشاہ کو اس قدر عقیدت ہو اس کی [illegible] اس پر کافی اثر ہوا ہے۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں شیخ کی [illegible] حاضری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

[illegible]

---

[1] [illegible] کی مثال [illegible] دیتے تھے [illegible] ظاہر ہے [illegible] سے اس اقتباس کے سبب سے ہم [illegible] کو یقینی گمراہ کر دیتا ہے۔

Marfat.com

شیخ کے مجموعہ مکتوبات میں ہمایوں کے نام دو خطوط ہیں، ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کی خواہش تھی کہ ہمایوں سلطنت کی پالیسی میں شریعت کے اصولوں پر عمل کرے اور علماء و فقراء کا احترام کیا جائے، چنانچہ پہلے خط میں ہمایوں کی تعریف کرتے ہوئے شیخ فرماتے ہیں کہ اس بات سے بے حد اطمینان ہوا کہ بادشاہ "در جمیع امور بعلماء و صلحاء پرداختہ و در میدان طلب گوئے محبت با عارفان باختہ و قدر ارباب علم و معرفت بہ کمال شناختہ"۔ یہ خط مختصر ہے لیکن دوسرا خط مفصل ہے ہمایوں کسی لڑائی میں فتح حاصل کرکے واپس آتا ہے تو شیخ اس کو مبارکباد دیتے ہیں: "کہ مراجعت میمون مع الفتح والنصرۃ مبارکباد"۔ اس کے بعد وہ "محبت با طائفہ فقراء" کو "عروۃ الوثقیٰ" اور "احسان بر زمرہ علماء و صلحاء" کو حبل خدا قرار دیکر فرماتے ہیں کہ جب "التمسک بالعروۃ الوثقیٰ والاعتماد بالحبل الاعلیٰ" کسی کی مشیوائی کریں تو ہر مرض کی مداوا دستیاب ہو سکے گی، اس پر اظہار اطمینان کرتے ہیں کہ بادشاہ کو علماء و فقراء کی جماعت کا خیال ہے اور وہ ان پر مشفق و مہربان ہے لیکن یہ سفارش کرتے ہیں کہ ان حضرات کو جو عطیات دئے جائیں وہ "از تعرضات مصئون باشد تا از نااہلان در شغل علم و عمل تفرقہ نیابند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یوماً فیوماً رونق دین اسلام بیفزایند" آخر کے بعد اپنے مکتوب کو اس دعائیہ بیت پر ختم کرتے ہیں ۔

آنچہ از خدا یافتہ برقرار باد
وآنہا دگر کہ می طلبی مستجاب باد

ان خطوط سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ شیخ چاہتے تھے کہ شاہان وقت علماء و فقراء کا احترام کریں ان کے لئے ایسے مواقع پیدا کریں کہ وہ معاشی الجھنوں سے بے فکر ہو کر اپنے کام میں مصروف رہیں، ان کا یہ خیال کہ بادشاہ کو علماء و صلحاء سے امور سلطنت میں مشورہ کرنا ضروری ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ شریعت کی پابندی حکومت کے معاملات میں اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ حکمران طبقہ ان حضرات کی طرف رجوع کرے اور ان کے علم و دانش

Marfat.com

سے فائدہ اٹھائے۔ شیخ کی نظر اس دور کی سیاسی اور سماجی زندگی کے اس پہلو پر بھی تھی کہ اہلِ اقتدار میں خوفِ خدا کم ہوتا جا رہا تھا اور وہ عقبیٰ کو بھولنے لگے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء و فقراء میں سے خود بعض ایسے تھے جو دنیاداری میں پھنس گئے تھے۔ ان رجحانات کو روکنے کی غرض سے شیخ اپنے مکتوبات میں دنیوی جاہ و جلال کی بے حقیقتی اور عدم استقلال پر زور دیتے ہیں۔ سکندر لودی، بابر، ہمایوں اور بعض با اثر لوگوں کی زندگیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی تعلیمات سے وہ متاثر ہوئے تھے[1]۔

شیخ نے جن لوگوں کو خطوط لکھے ہیں ان میں بعض ایسے بھی تھے جو دنیوی جاہ و حشمت کے لئے اپنے بزرگوں کی روایات کو ترک کرنا چاہتے تھے۔ ایک خط شیخ مبارک کے نام ہے۔ ان کا تعلق درویشوں کے ایک خاندان سے تھا۔ مبارک نے اپنے بزرگوں کی سادگی پر شاہی خطابات وغیرہ کو ترجیح دی۔ شیخ کی نظر میں مبارک کا یہ رویہ سخت مذموم تھا۔ چنانچہ اس خط میں وہ اپنے ان جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور مبارک کو سمجھاتے ہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ یہ نصیحت اس شخص کو کرتے ہیں جس کے اجداد درویشی اختیار کر چکے تھے۔ خالص دنیادار تے [illegible] ایسا [illegible] ارادت تجویز فرماتے۔ شیخ مبارک کو [illegible] کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ عبدالقدوس اپنے ایک خط میں [illegible]

الدنیا جیفۃ وطالبہا کلاب [illegible]

[illegible] پچھلے مردارت [illegible] میں [illegible]

اس کا تعلق [illegible] دنیوی جاہ و [illegible]

---

[1] شیخ عبدالقدوس کے مکتوبات شائع ہو چکے ہیں لیکن موجودہ دور کے مورخوں نے ان سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

Marfat.com

بہت سے اشعار جو انہوں نے دنیا کی مذمت اور قناعت کی تعریف میں نقل کئے ہیں ان میں خود شیخ مبارک کے اجداد میں سے ایک یعنی سلیمانؒ تاجر کا مندرجہ ذیل شعر بھی ہے :-

ما سلیمانیم ما را گرچہ تخت و تاج نیست

ملک درویشی بہ کرو فرشہ محتاج نیست

مبارک کی ہمت بڑھانے کے لئے اس کو غیرت دلاتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ :-

"آن برادر شیر زمانہ است و عالم است، امید تمام است کہ برخیزد و بر سجادہ بنشیند و باحق آمیزد، عاقبت محمود باد بالنبی و آلہ الامجاد"

بابِ نہم

عہدِ اکبری میں ترقیِ علم و ادب

اکبر کا دورِ حکومت مغلیہ سلطنت کا عنفوانِ شباب تھا، پچاس سال کی مدت میں سلطنت کی توسیع اور نظمِ حکومت میں استحکام کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور تمدنی زندگی میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں، اکبر تقریباً ناخواندہ تھا لیکن اس کو علم و ادب نیز فلسفہ و حکمت سے گہری دلچسپی تھی۔ علاوہ ازیں وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھا، اس کے دربار سے بڑی تعداد میں شعراء، فضلاء اور اہلِ فن وابستہ تھے اور ان کی وہ بے حد قدر کرتا تھا۔ اکبر کی علمی سرپرستی اور ادب نوازی کے واقعات ابوالفضل نے مبالغہ آمیز الفاظ میں بیان کئے ہیں اور ان بیانات کی تفصیلات کو تسلیم کرنے میں محققانہ احتیاط ضروری ہے لیکن متوازن اور محتاط مصنفوں کے بیانات کی بنا پر اس دور کی صحیح تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ اکبر کی شعر و سخن سے دلچسپی کا ذکر ابوالفضل کے علاوہ دوسرے معاصر مصنفوں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ ان کتابوں میں اکبر کے بعض اشعار بھی موجود ہیں بلکہ چند ابیات کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ فغانی کا یہ شعر اس کے سامنے پڑھا گیا۔

مسیحا بود خضرش زلیخا و مجنون یوسف

فغانی آفتاب من بہ من اعزاز می آید

Marfat.com

اس کو سن کر "بر زبان گوہر بار رفت اگر بجائے آفتاب من، شہسوار من برخانید سزاوار باشد"۔ ابوالفضل نے ہی اکبر کے ایک شعر کی تعریف کی ہے جو اس کو پسند تھا:

نیست زنجیر جنوں در گردن مجنوں نہاد
عشق دست دوستی در گردنش افگندہ است

(اکبر نامہ جلد اول ص ۲۷۱)

ابوالفضل نے فیضی، نظیری، عرفی، ظہوری، غزالی، سوہد داس اور عبدالرحیم خان خاناں کو درجہ اول کے شعراء میں شمار کیا ہے، اس کے بعد درجہ دوم کے شعراء کی ایک طویل فہرست دی ہے۔[1]

فیضی اس دور کا سب سے بڑا شاعر فیضی تھا، علم و ادب میں بھی اس کا پایہ بلند مانا گیا ہے، اکبر نے اس کو ملک الشعراء کے خطاب اور منصب سے نوازا اور اس کا بے حد احترام کرتا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے فیضی کے متعلق لکھا ہے کہ "در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا عدیل در روزگار نہ داشت"، فیضی نے متعدد تصنیفات

1۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ کے تیسرے حصہ میں مشائخ کے علاوہ اس دور کے علماء، فضلاء، شعراء اور حکماء کے حالات لکھے ہیں، جن لوگوں کے حالات ابوالفضل نے بوجہ تعصب اپنی تصانیف میں شامل نہیں کئے ہیں یا بہت مختصر الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے لئے بدایونی کی کتاب بے حد مفید ہے۔

چھوٹی ہیں، ان میں اس کی تفسیر سواطع الالہام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں ہو جس میں منقوط حروف ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ فیضی نے اس میں بڑا کمال دکھلایا ہے لیکن علماء نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ تفسیر کے لئے زبان کے میدان کو تنگ کرنا مناسب نہیں. فیضی کا جواب جو اس نے اس اعتراض پر دیا دلچسپ ہے۔ اس نے کہا کہ خود کلمہ طیبہ بے نقطہ ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک مختصر جملے یعنی کلمہ طیبہ اور تفسیر کی کتاب میں بہت فرق ہے۔ نظم میں فیضی کی مثنوی نل دمن جو اکبر کے کہنے پر ۱۰۰۰ھ میں لکھی گئی قابل ذکر ہے۔ بدایونی کا قول ہے کہ امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں تین سو سال میں ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ غزل اور نظم کے دیگر اصناف میں بھی فیضی کا کلام بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فیضی کے کمال شاعری کا ایک واقعہ پروفیسر عبدالغنی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایران کے حکمران شاہ عباس کا سفیر اس کا خط لایا جس میں ملا واحد کی یہ رباعی درج تھی:

زنگی بہ سپاہ و فیل و لشکر نازد ؛ رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینہ پر از زر نازد ؛ عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

اکبر نے یہ سنکر فیضی کی طرف دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ رباعی میں جو طعنہ کیا گیا ہے اس کا معقول جواب دینا چاہئے۔ فیضی فوراً اٹھ کر گیا اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی:

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد ؛ دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد ؛ کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

اہل دربار اس فوری جواب سے بہت خوش ہوئے۔ اکبر کے لئے یہ جواب دوگونہ باعث مسرت تھا کیونکہ فیضی کے اشعار میں جو شان شہنشاہ اکبر کی طرف کیا گیا تھا اس میں ایران کے شیعہ حکمران شاہ عباس کی نسبت ذوالفقار حیدری کی دینی حیثیت سے نہ صرف خوش اعتقادی کا تذکرہ تھا بلکہ اکبر کی ذات کو دنیا کے لئے مایہ ناز ثابت کیا گیا تھا۔ اعتماد اور قوت کے لئے

Marfat.com

میں جو حکمران مست ہوں ان کے اطمینان قلب کے لئے اس طرز کی خوشامد بہت موثر ثابت ہوتی ہے فیضی ہند پاکستان کے فارسی شعراء میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے اور ہر دور کے فضلاء نے اس کے کلام کی تعریف کی ہے۔ اس کو خود بھی شدت کے ساتھ یہ احساس تھا کہ وہ بلند پایہ شاعر ہے۔ اکبر نے اپنے جلوس کی تینتیسویں سالگرہ کے موقع پر اس کو ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا اس واقعہ کی طرف اپنے ایک شعر میں اشارہ کرتا ہے :-

آن روز کہ فیض عام کردند

مارا ملک الکلام کردند

اس طرز کا ایک اور شعر ہے جس میں اپنے مجموعہ کلام (دیوان) کی بابت کہتا ہے :-

ہر نکتہ کہ می ریخت ز نوک قلم

فیضی ز خدا بود عبارت از من

باوجود اس شعر کے فیضی کی شاعری کو الہامی کہنا تو تاریخی حقائق کو جھٹلانا ہوگا، لیکن بلاک مین کے اس خیال سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہند پاکستان کے فارسی شعراء میں امیر خسرو کے بعد فیضی ہی کا مقام ہے۔[1]

فیضی کے علاوہ شاہی دربار اور سربرآوردہ امراء سے بھی بعض فضلاء و شعراء وابستہ تھے۔ ان میں مرزا عبدالرحیم خان خاناں اور ابو الفتح گیلانی کی مجلس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عبدالرحیم خود بھی فاضل ادیب اور شاعر تھا اور فضلاء و شعراء کی قدر بھی کرتا تھا، مآثر رحیمی کی ضخیم جلدیں اس کے علمی اور دوسرے کارناموں کی مستقل یادگار ہیں۔

تراجم و تصانیف

شاعری کے علاوہ ادب کے دوسرے شعبوں نے بھی اس دور میں غضب ترقی کی، فارسی نثر کے دو شعبے قابل ذکر ہیں یعنی سنسکرت

---

[1] دیکھو انگریزی ترجمہ آئین اکبری۔ مقدمہ۔

Marfat.com

کی مشہور کتابوں کے ترجمے اور تاریخی و سوانحی تصانیف۔ اکبر کی حکومت نے ہندوؤں کو بالعموم اور راجپوتوں کو خاص طور پر اپنے قریب لانے کے سلسلہ میں متعدد اقدامات کیے۔ رفتہ رفتہ وہ اور اس کے مشیر اس کوشش میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ اسلامی معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی کہ علوم اسلامیہ اور عربی ادب کی بجائے حکومت کی سرپرستی کا رخ سنسکرت کی طرف مڑ گیا۔ بادشاہ کی خواہش کے مطابق سنسکرت کی بعض مشہور اور کلاسیکی تصانیف کو فارسی کا جامہ پہنایا گیا۔ مہابھارت کے ترجمہ کی خدمت عبدالقادر بدایونی، فیضی، نقیب خاں، ملا شیری اور دیگر فضلاء کو سپرد کی گئی۔ بدایونی نے اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ اکبر نے شاہنامہ اور داستان امیر حمزہ کو پندرہ سال میں لکھوایا تھا اور ان کو اچھی طرح مرتب کرایا تھا۔ اس کے بعد اس کو خیال آیا کہ اب ہندوؤں کی وہ کتابیں جن کو ان کے "دانایان مرتاض عابد نوشتہ اند و ہمہ صحیح و نفس قاطعست و مدار دین و اعتقادات و عبادات این طائفہ بر آنست" ہیں ان کے بھی فارسی میں ترجمے ہونے چاہئیں۔ چنانچہ مہابھارت کے ترجمہ کا حکم دیا گیا۔ ابتداء میں بدایونی اور نقیب خاں کو یہ کام سپرد کیا گیا۔ تین چار مہینہ میں "از ہژدہ فن آن از خرافات لاطائل کہ ہژدہ ہزار عالم دران متحیر است، دو فن نوشتہ شد"۔ ظاہر ہے کہ بدایونی کا دل اس کام میں نہیں لگ سکتا تھا "مگر کیا کیا جائے کہ تقدیر کے نقیبہ میں یہی کتابیں لکھی تھیں"۔ بعد میں اور لوگ یعنی شیری، حاجی سلطان اور فیضی نے بھی اس پر کام کیا۔ آخر میں بدایونی نے مترجمین کے لئے نہایت دلچسپ الفاظ لکھے ہیں:۔

"ان فضلاء اور مترجمین میں سے اکثر کوروؤں اور پانڈوؤں کے ساتھ محشور ہوئے اور جو باقی بچے ہیں خدا ان کو نجات دے اور ان کی توبہ قبول کرے۔[1] مہابھارت کے اس ترجمہ پر کھلا

---

[1] دیکھو بدایونی ص ۳۴۵۔

فارسی نام رزم نامہ رکھا گیا تھا۔ ابوالفضل نے خطبہ لکھا، اس کے نسخے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں موجود ہیں[۱]۔ باوجود ان خیالات کے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، سنہ ۹۹۲ھ میں بدایونی کو رامائن کے ترجمہ کا حکم ملا اور اس کام کو مُلّا نے انجام دیا[۲]۔ اس سے قبل بھی بدایونی کو کچھ ترجمہ کا کام سپرد کیا گیا تھا، مثلاً سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ سنہ ۹۸۲ھ میں ہوا ریاضی کی کتاب لیلاوتی کا ترجمہ فیضی نے کیا، کلیلہ دمنہ کا ترجمہ ابوالفضل نے ۹۹۶ھ میں مکمل کیا اور اس کا نام عیار دانش رکھا، نل دمن کا ترجمہ فیضی نے نظم ہی میں کیا اور چار ہزار دو سو بیت کی یہ کتاب صرف پانچ ماہ کی مدت میں مکمل کردی، مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے کشمیر کی سنسکرت تاریخ راج ترنگینی کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ سنسکرت کی ان کتابوں کے علاوہ بعض اور ترجمے بھی کئے گئے۔ ان میں ابوانفدل کا ترجمہ انجیل۔ ملا احمد ٹھٹھوی، قاسم بیگ اور شیخ منور کا ترجمہ معجم البلدان اور تاریخ الکمار کا ترجمہ قابل ذکر ہے۔

تاریخ نویسی۔ ابوالفضل

ترجموں کے علاوہ تصنیف و تالیف کے کام میں بھی ترقی ہوئی نثر کی تصانیف کا جہاں تک تعلق ہے فن تاریخ نویسی میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ابوالفضل، نظام الدین احمد، عبدالقادر بدایونی کی تصنیفات اس فن کی مشہور ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں، ابوالفضل کا اکبر نامہ اور آئین اکبری ہمارے تاریخی سرمایہ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں، اکبرنامہ ایک خاص مقصد کے تحت تیار کیا گیا تھا۔ ابوالفضل، اکبر کو مطلق العنان حکمران سے زیادہ بلند مقام دینا چاہتا ہے[۳]۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کے کارناموں

---

۱ دیکھو کیٹلاگ انڈیا آفس، جلد ۲۔ ص ۲۱۸۴   " برٹش میوزیم جلد اوّل۔ ص ۵۷

۲ بدایونی ۲۵۱/۲

۳ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملے گی۔

Marfat.com

کو ایسے رنگ میں پیش کیا جائے جو دوسرے مطلق العنان اور استعمار پرست حکمرانوں سے بہتر اور اعلیٰ معلوم ہو، یہی سبب ہے کہ وہ تاریخی حقائق کو بھی ایسی عبارت میں پیش کرتا ہے جو اکبر یا اس کے اجداد کی شخصیت کو غیر معمولی اہمیت اور تقدس دے دیتی ہے۔ مختلف مواقع پر اکبر کے لئے مختلف القاب استعمال کرتا ہے اور غالباً مشہور حکمرانوں اور خاندانوں کا کوئی لقب نہیں جو اس نے اکبر کے نام کے ساتھ کسی نہ کسی طریقہ سے استعمال نہ کیا ہو۔ اسلامی دنیا میں سبقت حاصل کرنے کے لئے اکبر کو باوجود اس کی اسلام دشمنی کے "محی الدین والملت"، "ظل اللہ"، "خلیفۃ اللہ"، "امام"، "مجتہد"، "غازی"، "سلطان الاسلام" اور "امیر المؤمنین" جیسے مرعوب کن القاب استعمال کرتا ہے اور اس کے کارناموں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا تاریخ میں وہ لاثانی ہیں۔ تاریخی معلومات اور مواد کے لحاظ سے دونوں کتابیں نہایت مفید اور اہم ہیں۔ چونکہ مصنف کے سامنے اور ماخذ کے علاوہ سرکاری دستاویزات بھی تھیں اس لئے بہت سے مسائل پر جس تفصیل کے ساتھ وہ روشنی ڈال سکتا ہے دوسرے مصنفین کے لئے آسان نہ تھا۔

نظام الدین احمد و ملا عبد القادر

نظام الدین کی طبقات اکبری ایک معتبر اور مستند تاریخ ہے۔ ہند پاکستان کی تاریخ کے لئے یہ کتاب ہمیشہ بہت کارآمد و قابل اعتبار ماخذ رہی ہے۔ ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ اس دور کی بہت اہم تاریخ ہے۔ مصنف دربار شاہی سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنے ضمیر کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ملا صاحب ابوالفضل کے باپ شیخ مبارک کے شاگرد تھے لیکن اپنے استاد کی مذہبی گمراہیوں پر بھی وہ اس طرح بے لاگ تنقید کرتے ہیں جیسے کسی غیر شخص پر کرتے۔ منتخب التواریخ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اکبر کی بے دینی اور اس سے متعلق واقعات اور شخصیتوں پر جس قدر مواد اس میں ہے اتنا اور کہیں موجود نہیں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ سولہویں صدی عیسوی کی تاریخ کے اس پہلو پر

Marfat.com

اگر عبدالقادر بدایونی کی شہادت نہ ہوتی تو ندہ بڑی حد تک پردہ خفا میں رہتا، اور تاریخ بہت سے حقائق سے محروم ہوجاتی۔ یہ ضروری ہے کہ بعض اوقات ملا صاحب واقعات کو مبالغہ آمیز رنگ دیدیتے ہیں، لیکن طلباء تاریخ کے لئے صحیح نتائج اخذ کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی۔ بدایونی کی تصنیف کی قدر و منزلت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اکبر کے دین سے متعلق عیسائی پادریوں کے بعض بیانات بالکل بے سروپا ہیں۔ ملبہ کے اس ڈھیر سے صحیح معلومات اخذ کرنے میں منتخب التواریخ سے بہت مدد ملتی ہے، اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے علماء و مشائخ اور فضلاء کے حالات اور ان سے متعلق تہا دلچسپ معلومات اس میں موجود ہیں، یہ ظاہر ہے کہ ملا صاحب کی کتاب اکبر کی زندگی میں شائع نہیں ہوسکتی تھی لیکن جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد جلد ہی وہ منظر عام پر آگئی[1]۔ تاریخی تصانیف میں تاریخ الفی خاص طور پر قابل ذکر ہے، بدایونی جو اس کے مصنفین میں سے ایک ہیں لکھتے ہیں کہ اکبر اور اس کے ہم خیال لوگوں کو یقین تھا کہ "دین احمدی" ایک ہزار سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا اور چونکہ یہ زمانہ قریب آرہا تھا یہ ضروری خیال کیا گیا کہ اسلام کی مکمل تاریخ

---

[1] دور جدید کے بعض مصنفین نے ملا عبدالقادر بدایونی پر سخت تنقید کی ہے، ان میں محمد حسین آزاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، شیخ مبارک اور ان کے صاحبزادوں کی تعریف کرتے کرتے جب مولانا کو جوش آجاتا ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ملا عبدالقادر کے بیانات پر طنز اور استہزاء کرنے لگتے ہیں، آزاد کی یہ روش اس لئے اور بھی زیادہ مضحکہ خیز ہوجاتی ہے کہ ان کا ذریعہ معلومات اکثر و بیشتر بیانات کے لئے خود منتخب التواریخ ہی ہے۔ دیکھو دربار اکبری
شیخ محمد اکرام نے بھی عبدالقادر بدایونی کے بعض بیانات کو نا قابل اعتبار سمجھا ہے۔
دیکھو رود کوثر عنوان "عہد اکبری"۔

Marfat.com

پر تاریخ لکھی جائے ۔ اس واقعہ کی صحیح تصویر خود ملا صاحب کے الفاظ میں پیش کی جاتی ہے :-

چون در زعم خویش مقرر ساختند کہ ہزار سال از زمان بعثت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ مدت بقائے این دین بود تمام شد و ہیچ معنی برائے اظہار دعاوی خفیہ کہ در دل داشتند نماند و لبساط از مشائخ و علماء کہ صلابت و جہابت داشتند و ملاحظہ تمام از ایشان بایستے نمود خالی ماند ، بفراغ خاطر در صدد ابطال احکام و ارکان اسلام و برابستہ ضوابط و قواعد نو مہمل و مختل و ترویج بازار افسانہا اعتقاد در آمدہ ۔ اول حکمیکہ فرمودہ این بود کہ در سکہ تاریخ الف نویسند و تاریخ الفی از جست نویسانند ۔ [1]

ان سات مصنفین میں جو اس خدمت پر ابتداء میں مامور کئے گئے تھے ملا صاحب بھی تھے ان کے حصے میں خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کا عہد آیا لیکن ان کے بعض بیانات سے شہنشاہ اور اس کے ہم خیال مطمئن نہ ہوئے ، چنانچہ

" ایشان گرفت و گیرہائے بے محل بعنایت الٰہی عزوجل رہائی یافتم "

چھتیسویں سال کے بعد ملا احمد ٹھٹھوی تنہا اس کام پر مقرر کردئے گئے ، ور بدایونی کے الفاظ میں :-

" از نہایت تعصب کہ داشت موافق اعتقاد خویش ہرچہ خواست نوشت "

---

[1] بدایونی ۲۳۸/۲

ملا احمد دورِ جہانگیری تک پہنچے تھے کہ وہ قتل کردئے گئے،[1] اور بقیہ حصہ آصف خان کے سپرد ہوا۔ کتاب مکمل ہونے کے بعد ملا کو نظر ثانی کے لئے دی گئی لیکن شاید ان کو صرف متن کی تصحیح کی اجازت دی گئی تھی۔[2]

اکبر کے عہد میں ہندی نظم نے بھی ترقی کی اور ہندی کے بہترین شعراء میں سے ایک یعنی تلسی داس اسی عہد میں تھا، اگرچہ اس امر کی تاریخی شہادت نہیں ملتی کہ اس نے اکبر کی سرپرستی میں رامائن کو ہندی لباس پہنایا لیکن آئینِ اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار سے کئی ہندی شاعر وابستہ تھے جن میں نابینا شاعر سور داس قابل ذکر ہے۔

علمی ادبی سرپرستی کے علاوہ اکبر کا عہد فنون کی ترقی کے لحاظ سے بھی ایک یادگار دور ہے۔ فن تعمیر میں ہند پاکستانی مسلمانوں نے بہت ترقی کر لی تھی، اکبری عہد کے ابتدائی دور کی عمارتوں میں ہمایوں کا مقبرہ قابل ذکر ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گنبد کی ساخت اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے، اسی زمانہ کی ایک دوسری قابل ذکر عمارت شیخ محمد غوث گوالیاری کا مقبرہ گوالیار میں ہے[3] لیکن اکبر کی تعمیر کردہ عمارتیں سب سے زیادہ فتحپور سیکری میں ہیں۔ اس کا اوپر ذکر کیا

---

[1] ملا احمد ٹھٹھوی شیعہ تھے اور اپنے عقائد میں متشدد تھے، مرزا فولاد برلاس نے بتقریب غلوے کہ در مذہب داشت و آزارے کہ ازو یافتہ بود بقتل رسانید" (بدایونی ۲ ص ۳۶۴)

[2] بدایونی ص ۲۴۵ [3] شیخ محمد غوث شیخ بہلول کے بھائی تھے۔ دونوں بزرگ سلسلہ شطاریہ سے وابستہ تھے، شیخ محمد غوث نے بارہ سال تک چنار کے قریب جنگل میں رہ کر ریاضت و مجاہدہ کیا۔ ہمایوں بادشاہ کو دونوں بھائیوں سے بے حد عقیدت تھی، شیر شاہ چونکہ شیخ محمد غوث کو آزار پہنچانا چاہتا تھا اس لئے وہ گجرات چلے گئے، اس زمانہ میں ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا اور دہلی گجرات اور بنگال کے علاقوں میں بہت سے لوگ ان کے ارادتمندوں میں شامل ہو گئے۔ مغلیہ سلطنت دوبارہ قائم ہونے پر وہ واپس آگرہ آگئے، گوالیار میں انہوں نے اپنی خانقاہ بنوائی (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

جاچکا ہے کہ اکبر کو شیخ سلیم چشتیؒ سے بہت عقیدت تھی اور چونکہ جہانگیر کی پیدائش شیخ کی دعا کے بعد ہوئی تھی اس لئے یہ عقیدت یہاں تک بڑھ گئی کہ اس نے اپنے دارالحکومت کے لئے بھی فتحپور سیکری ہی کو منتخب کیا اور وہاں ایسی شاندار عمارتیں تیار کرائیں جو آج تک حیرت انگیز سمجھی جاتی ہیں۔ شیخ سلیمؒ کا مقبرہ، مسجد اور بلند دروازہ اور شاہی محلات آج بھی ہر سیاح سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں[1]۔ فن تعمیر کے علاوہ خوش نویسی اور مصوری کو بھی شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ خوش نویسی کو فن کے طور پہ مسلمانوں نے بہت ترقی دی ہے، آج بھی تقریباً ہر اسلامی ملک میں بڑی تعداد میں خوش خط نسخے اور خطاطی کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔

بسلسلہ صفحہ گذشتہ بادشاہ کی طرف سے ایک گروہ تنگ لعد و معاش ان کے لئے ذریعہ تھی۔ یہ [illegible] وہ ضرورت مند اصحاب میں تقسیم کر دیتے تھے چنانچہ بدایونی کے الفاظ میں [illegible] در کوہ [illegible] نقر [illegible] جاہ و جلال بود۔ باوجود اس کے ہمہ [illegible] کی یہ کیفیت تھی کہ خود کو [illegible] میں [illegible] سال کی عمر میں وفات پائی اور [illegible] میں دفن ہوئے۔ دیکھیں [illegible]

[1] عمارات کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

Marfat.com

باب دہم

عہد اکبری میں معاشرہ و مذہب

اکبری عہد کا کوئی باب تاریخ کے طلباء کے لئے اتنا دلچسپ نہیں جتنا کہ سماجی اور مذہبی زندگی کا وہ فتنہ انگیز انقلاب تھا جس کو اکثر مورخوں نے دین الٰہی کہا ہے اور جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہند پاکستانی تاریخ کا طالب علم ہمیشہ اس بحث سے دوچار رہا ہے کہ آیا اکبر نے اس "دین" کی بنیاد سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی غرض سے رکھی یا واقعی اس کے عقائد اور خیالات وہی تھے جنہوں نے اس تحریک کی صورت میں عملی شکل اختیار کی، حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا جواب اتنا سہل نہیں جتنا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ ابتدا میں اکبر ایک نہایت خوش عقیدہ مسلمان تھا اور دینی پیشواؤں یعنی علماء اور مشائخ سے اس کو اسی قدر گہری عقیدت تھی جیسی کہ اس کے اجداد کو تھی[1]۔ تاریخ کے طالب علم کو معلوم ہے کہ وہ اجمیر شریف حاضر ہو کر خواجہ بزرگ کے مزار پر دعائیں مانگا کرتا تھا اور آپ کی ذات سے اس کو اس قدر عقیدت تھی کہ اس کا نعرہ جنگ بھی "یا معین" تھا۔ شیخ سلیم چشتی

---

[1] اس کا ثبوت ہمیں اس واقعہ میں ملتا ہے کہ ایک مرتبہ جب بادشاہ زعفرانی رنگ کے کپڑے پہن کر باہر آیا تو صدر الصدور نے اس کے دامن پہ لکڑی مار کر تنبیہ کی کہ یہ لباس نامشروع ہے بادشاہ کو اس توہین کا سخت صدمہ ہوا لیکن اس کی ماں نے اس کو سمجھا دیا کہ یہ شرع کا حکم ہے۔

Marfat.com

سے اس کی عقیدت کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصہ نہ رہی۔

۱۵۷۵ء میں اس نے فتحپور سیکری میں ایک عمارت بنوائی جس کو عبادت خانہ کا نام دیا گیا، یہاں علماء ومشائخ، سادات اور امراء کبار جمع ہو کر دینی مسائل پر بحث کرتے تھے، یہ جلسے ۱۵۷۵ء میں شروع ہوئے اور ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ انہوں نے ایک نیا رنگ اختیار کرلیا، مباحثوں میں جزئیات پر اختلافات شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ یہ اختلافات ذاتی مخالفتوں اور تکفیری فتوؤں کی حد تک بڑھ گئے، انتہا یہ ہوئی کہ شرکائے محفل مجلسی آداب کو بھی نظر انداز کرنے لگے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان مباحثوں کا اکبر جیسے ناخواندہ بادشاہ پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ صرف یہی نہیں کہ بحث میں حصہ لینے والے علماء بالخصوص مخدوم الملک[1] اور عبدالنبی[2] کا وقار اس کی نظر میں گرنے لگا، بلکہ اسلامی تعلیمات کی بھی ایک مسخ شدہ تصویر

---

[1] مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری۔ بدایونی کے الفاظ میں "از فحول علمائے زمان و یگانۂ دوران بود، خصوصاً در عربیت و اصول فقہ و تاریخ و سائر نقلیات"۔ ان کی تصنیف میں کتاب عصمت الانبیاء اور شمائل النبی قابل ذکر ہیں۔ ہمایوں نے شیخ الاسلامی کے عہدے پر فائز کیا اور مخدوم الملک کا خطاب عطا کیا۔ عقائد میں بدایونی کے قول کے مطابق متعصب سنی تھے لیکن ان کی فراست، ذہانت اور قیافہ شناسی کی داد دینی پڑے گی کیونکہ ابوالفضل کو دیکھ کر ابتدائی عمر میں ہی انہوں نے پیشین گوئی کی تھی اور اپنے شاگردوں سے بیان کیا تھا کہ "چہ خلل ہا در دین ازین بخیزد"۔ انہوں نے ۹۹۰ھ میں گجرات میں وفات پائی۔ دیکھئے بدایونی ۳، ۲۰۲-۲۰۳۔

[2] عبدالنبی صدر الصدور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے تھے۔ علوم ظاہری میں کمال حاصل کرلیا تھا ورنہ اپنے بزرگوں کی روش بالخصوص سماع وغیرہ کے سخت منکر تھے۔ ایک مدت تک اپنے عہدہ کی بدولت ہندوستان میں بہت با عزت لوگوں میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اس کے سامنے آنے لگی۔ لیکن اس سلسلہ میں دو امور خاص طور پر قابل غور ہیں، یعنی اکبر پر حرم کا اثر اور جذبہ مطلق العنانی۔

اکبر پر حرم کا اثر

اکبر پر حرم کے اثر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ابوالفضل نے تو اپنے بیان کو صرف اس حد تک رکھا ہے کہ عورتوں کی زیادتی جو ہوشیار سے ہوشیار آدمیوں کو بھی "ظلمت کدۂ طبیعت" میں ڈال دیتی ہے اکبر کے لئے "فروغ بنیش" کا ذریعہ بن گئی ہے، آئین شبستان اقبال کے الفاظ یہ ہیں:۔

فزونی پردگیان کہ بزرگ دانشان را بظلمت کدہ طبیعت بردگیتی

خدیورا فروغ بنیش افزودہ

یہ امر قابل ذکر ہے کہ "فزونی پردگیان" کی وسعت کا اندازہ خود ابوالفضل ہی کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس آئین میں آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

"ہر یکے از پردگیان را کہ از پنج ہزار افزونند جداگانہ منزلے نامزد گرداند"

لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، ہر اس مرد کی طرح جس کی کمزوری عورت ہوتی ہے اکبر کو بھی "فزونی پردگیان" کی زبردست قیمت دینی پڑی۔ اکبر کی بیویوں اور حرم خاص کی عورتوں میں ایک بڑی تعداد راجپوت شہزادیوں کی تھی، جن کا اثر بادشاہ پر بہت زیادہ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ محل کے اندر ان کو اپنے طریقہ پر پوجا کرنے اور اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کی

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) ان کا شمار ہوا۔ اکبر کی اسلام دشمنی کے دور میں ان کی عزت کو بھی سخت صدمہ پہنچا، بالآخر بادشاہ سے تعلقات کی بدمزگی بہت زیادہ بڑھ گئی اور ان کو مکہ معظمہ روانہ کر دیا گیا، واپسی پر ابوالفضل کو حکم ہوا کہ سختی کے ساتھ روپیہ کا حساب لو۔ اس نے ایک عرصہ تک زیر حراست رکھا اور بقول صاحب اقبال نامہ جہانگیری بادشاہ کے حکم سے مروا ڈالا۔ دیکھو بدایونی ص ۲۰۵۔ ۲۰۶ محمد حسین آزاد۔ دربار اکبری ص ۳۰۶۔

Marfat.com

اجازت ہی نہ تھی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ خود بادشاہ بھی ہندوانی رسوم پابندی کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ ہندو بیویوں کے علاوہ بعض ہندو امراء کا بھی اکبر پر گہرا اثر تھا، مثال کے طور پر بیربل کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اکبر کو سورج کی پرستش کے لئے تیار کیا، تشقہ و زنار بھی اسی کے اثر کی بدولت اختیار کئے گئے[1]۔ مولانا محمد حسین آزاد کے الفاظ میں :-

"راجپوتوں کی محبت ان کی ہر بات کو بلکہ رسوم اور لباس کو بھی اس کی آنکھوں میں خوشنما دکھانے لگی، چنانچہ عمامہ کو اتار کر جامہ اور کھڑکی دار پگڑی اختیار کرلی، داڑھی کو رخصت کردیا ....
فرش فروش سواریاں اور دربار کے سامان آرائش سب ہندوانے ہونے لگے ...... جب بادشاہ کا یہ رنگ ہو تو ارکین و امراء ایرانی، تورانی سب کا وہی لباس .... ترکوں کا دربار اندر سبھا کا تماشا تھا[2]"

آزاد چونکہ اکبر سے غیر معمولی طور پر مرعوب ہیں اور اس کے ہر اقدام کی تعریف اپنا فرض سمجھتے ہیں اس لئے بہت سی رسوم کا ذکر یا تو قطعاً نہیں کیا ہے یا افسانوی رنگ دیکر

---

[1] بیربل کا اصل نام مہیش داس تھا، ابتدا میں بھاٹ تھا، اگرچہ بعض مورخین نے برہمن لکھا ہے بہرحال بادشاہ کو اس سے بہت انسیت تھی اور بعد میں دین الٰہی میں [illegible] اول درجہ میں پہنچ گیا تھا۔ اکبر کی محبت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ بادشاہ نے [illegible] کے لئے ایک خاص مہم [illegible] وہاں جانے سے روک دیا گیا تھا [illegible] پہنچ میں یہ سن کر بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا اور بیربل اس قدر نادم ہوا کہ اس نے یہ ارادہ کیا کہ جوگی ہو جائے گا لیکن اکبر سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ اس کو [illegible] بلا لیا اور [illegible]
بدایونی ص ۲۶۳ [2] دربار اکبری ص ۸۱

ان کی شکلیں بدل دی ہیں، اس مسئلہ کی صحیح تصویر عبدالقادر بدایونی کے شواہد کے بغیر نامکمل رہے گی، کم از کم اس کے چند اقوال یہاں لکھنا ضروری ہیں۔ ۹۸۷ھ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ:۔

"خاتم المرسلین کی رسالت کو نظر انداز ہی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس کی مخالفت کی جاتی تھی، گائے کا گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔"

بدایونی کے الفاظ قابل غور ہیں:۔

"دوختران راجہائے عظیم ہند کہ خیلے بتصرف در آوردہ بودند تصرف درمزاج کردہ از خوردن گوشت گاؤ و سیر و پیاز و صحبت باریش دارد امثال آن بکمال احتراز داشتند"[1]

مطلق العنانی

مذکورہ بالا واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اکبر صرف اپنے ہندو بیویوں اور ہندو دوستوں ہی کی وجہ سے اسلام کی مخالفت کرتا تھا، یہ مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے، اس کے علاوہ دوسرے عوامل ہیں جو بدعتوں کے وجود میں آنے کا باعث ہوئے ۱۵۷۶ء میں بنگال کی فتح کے بعد شمالی ہند پاکستان کا بہت بڑا حصہ اکبر کے زیر حکومت آ گیا تھا، اس کی سلطنت اس قدر وسیع اور مستحکم ہوگئی تھی کہ وہ اپنے عہد کی دنیا میں کسی بھی سلطنت کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مطلق العنانی کی سب سے بڑی کمزوری اور اس کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس کی حد نہیں ہوتی۔ مطلق العنان حکمران کی ذہنیت اس جواری کی سی ہو جاتی ہے جو ہر بازی جیتنے کے بعد دوسری بازی پہلی سے زیادہ بڑی لگاتا چلا جاتا ہے۔ اکبر اپنی ساری فتوحات اور فوجی طاقت کے باوجود یہ دیکھتا تھا کہ اس کے اختیارات محدود ہیں، وہ مطلق العنان حکمران ضرور ہے لیکن یہ مطلق العنانی

---

[1] بدایونی ج ۲ ص ۲۳۹۔

Marfat.com

شریعت کے دائرے میں محیط ہے، جذبہ مطلق العنانی کی پرورش تو بیرام خاں کی معزولی کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھی لیکن شریعت کی پابندیوں کو توڑنے کا خیال اس کے دل میں نہیں آتا تھا اس کی کئی وجوہات تھیں؛ علماء اور مشائخ کا اثر معاشرہ پر بہت زیادہ تھا اور بڑے بڑے امراء اور سا قسم بھی ان کے زیر اثر تھے، شاید سب سے زیادہ خود اکبر کے اپنے معاملات تھے۔ اس کی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ شروع میں اس کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی اور جہانگیر کے الفاظ میں :-

> میرے باپ کے اٹھائیس سال کی عمر تک کوئی اولاد (فرزند) زندہ نہیں رہی تھی اور اولاد کے زندہ رہنے کے لئے وہ ہمیشہ درویشان گوشہ نشین سے جن کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے التجا کرتے رہتے تھے چونکہ خواجہ بزرگ حضرت معین الدین چشتی، سرچشمۂ اکثر اولیائے ہند ہیں اس لئے ان کے دل میں خیال آیا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے آستانہ مبارک کی طرف رجوع کریں اور اپنے دل میں عہد کر لیا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو بیٹا عطا کرے تو وہ آگرہ سے درگاہ تک کا فاصلہ جو ایک سو چالیس کروہ ہے پیادہ طے کر کے از روئے نیاز تمام متوجہ گردم[1]

اسی زمانہ میں اکبر شیخ سلیم چشتی کے پاس فتحپور سیکری آیا، انھوں نے کہا کہ بادشاہ کے تین بیٹے پیدا ہوں گے، چنانچہ اس نے کہا کہ پہلے بیٹے کو میں آپ ہی کی خدمت میں بھیجوں گا۔ شیخ نے پہلے بیٹے کا نام اپنے نام پر سلیم تجویز کیا اس واقعہ نے اکبر کے دل پر مشائخ بالخصوص

---

[1] توزک جہانگیری (سرسید ایڈیشن، غازی پور ۱۸۶۳ء) ص ۱

حضرت خواجہ بزرگ کی عظمت کا ایسا گہرا نقش قایم کیا کہ وہ مدتوں تک باقی رہا۔ مشائخ کا رویہ عام طور پہ سیاسی اور درباری معاملات میں بے تعلقی کا ہوتا تھا۔ ان میں اور علماء میں یہی فرق تھا۔ اس لئے اکبر کی مطلق العنانی کے راستہ میں مسلمانوں کے دینی پیشواؤں کا صرف ایک گروہ یعنی علماء ہی حائل ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ شریعت اسلامی کے نفاذ کی ذمہ داری بھی علماء ہی پر تھی اور اس کے اقتدار کی حفاظت ان ہی کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پہ صدر الصدور کے عہدہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ صدر الصدور صرف عدلیہ ہی کا اعلیٰ عہدہ دار نہیں ہوتا تھا بلکہ مدد معاش کے لئے علماء، مشائخ، خطباء اور اماموں کو جاگیریں عطا کرنا بھی اسی کے اختیارات میں شامل تھا۔ احتساب کے سلسلے میں وہ بڑے سے بڑے لوگوں پہ سختی کر سکتا تھا۔

اکبر کے عقائد میں جو تبدیلیاں ۱۵۷۹ء کے بعد رونما ہوئیں ان کو صحیح طور پہ سمجھنے کے لئے اس عہد کے مذہبی ماحول کا تذکرہ ضروری ہے۔

مہدوی تحریک

لودیوں کے زمانہ میں شرقی اضلاع میں ایک نئی تحریک وجود میں آئی جس کا مقصد تو نہایت اعلیٰ یعنی احیاء ملت تھا لیکن بعض واقعات کی وجہ سے وہ سیاسی پیچیدگیوں کا باعث بن گئی۔ مہدوی تحریک کے بانی سید محمد جونپوری (ولادت ۱۴۴۳ء) ایک زبردست عالم اور نہایت متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق انہوں نے سلطان حسین جونپوری کو گوڑ کے ہندو راجہ کے خلاف جہاد کے لئے آمادہ کیا اور خود بھی جنگ میں حصہ لیا۔ ایک عرصہ تک عبادت میں مشغول رہنے کے بعد سید محمد دکن پہنچے اور وہاں سے اپنے مریدوں کی ایک بڑی جماعت کو ساتھ لے کر حج کے لئے چلے گئے۔ طواف کعبہ کے بعد انہوں نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ حج سے واپسی پہ گجرات میں اپنے نئے دعوے اور خیالات کی تبلیغ کی۔ کچھ عرصہ تک راجپوتانہ اور سندھ میں بھی تبلیغ کرتے اور مرید بناتے رہے۔ ٹھٹھہ سے قندھار ہوتے ہوئے خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔ ۱۵۰۴ء میں

Marfat.com

فرہ کے مقام پر وفات پائی، مہدوی تحریک کو شیخ علائی کی کوششوں سے بہت فروغ ہوا۔ شیخ علائی کے اجداد کا وطن بنگال تھا۔ ان کے والد شیخ حسن بقول بدایونی "مشائخ کبار بنگالہ" سے تھے۔ حج کے بعد وہ بیانہ میں قیام پذیر ہوئے اور یہیں عبداللہ نیازی[1] افغان کے اثر سے انہوں نے مہدویہ طریقہ اختیار کیا۔ شیخ علائی نہایت زبردست خطیب تھے ان کی فصاحت وبلاغت و تیز توکل وقناعت کی وجہ سے مہدویت کا حلقہ تیزی کے ساتھ وسیع ہونے لگا۔ مہدویوں کے بعض عقائد اور اعمال، علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک بدعات میں شامل تھے اور اسلامی حکومت میں ان کی تبلیغ کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ چنانچہ مخدوم الملک نے حکمران وقت سلیم شاہ سوری کی توجہ اس طرف دلائی۔ سلیم شاہ نے شیخ علائی کو دربار میں طلب کیا۔ شیخ مع اپنے مریدوں کے آئے اور آداب شاہی کو نظر انداز کر کے "بروجہ مسنون" جملہ اہل مجلس کو سلام کیا۔ یہ بات سلطان کو ناگوار ہوئی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ شیخ کی تقریر سے وہ بے حد متاثر ہوا اور ان کے لئے کھانا بھجوایا۔ شیخ نے کھانا نہیں کھایا اور نہ سلطان کے آنے پر تعظیم کی۔ جب نہ کھانے کا سبب ان سے دریافت کیا گیا تو سلطان سے کہا کہ "طعام تو حق مسلمانان است کہ بخلاف حکم شرع زیادہ از حق خود متصرف شدہ"۔ سلیم شاہ کو غصہ آیا لیکن [?] برداشت کیا اور شیخ کو اجازت دی کہ علمائے دربار سے بحث مباحثہ کریں[2]۔ [illegible] شیخ علائی کے [illegible]

---

[1] ابتدا میں شیخ عبداللہ شیخ سلیم چشتی سے بیعت تھے ان کی خانقاہ کے قریب ایک حجرہ میں خلوت رہتے۔ اسی جگہ پر عبادت خانہ بنایا گیا تھا۔ بعد میں وہ سید محمد جونپوری کے [illegible] مہدوی ہو گئے تھے۔

[2] ان مباحث میں شیخ مبارک بھی شیخ علائی کے ہمراہ تھے [illegible] ان کی [illegible] وقت سے معلوم ہوا کہ وہ مہدوی حلقہ میں شامل ہو گیا ہے۔

Marfat.com

سے متاثر ہوا اور ان کو محتسب کا عہدہ پیش کیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ مہدویت کے عقیدہ کو ترک کردیں، شیخ نے یہ پیش کش قبول نہ کی اس پر ان کو جلا وطن کر کے دکن روانہ کردیا گیا، کچھ عرصہ بعد مخدوم الملک نے پھر سلیم شاہ سے کہہ کر شیخ کو طلب کیا اور ان کو بہار کے ایک فاضل میاں بدھ کے پاس بھیجا کہ شیخ کے عقائد کے متعلق رائے دیں۔

سلیم شاہ نے شیخ بدھ کی رائے اس لئے طلب کی تھی کہ اس کے پیش رو شیر شاہ کو ان سے بہت عقیدت تھی، شیخ بدھ نے یہ رائے لکھ کر بھیجی کہ مخدوم الملک علمائے محققین میں سے ہیں اور ان کا فتویٰ ہی صحیح فتویٰ ہو سکتا ہے۱؎۔ اس پر سلیم شاہ نے شیخ علائی کے معاملے میں مخدوم الملک کو اختیار دیدیا، موخر الذکر نے شیخ پر کوڑے لگانے کا حکم دیا، چند ہی کوڑے لگائے تھے کہ شیخ ختم ہو گئے۔ شیخ علائی اپنے عقیدہ میں آخر وقت تک پختہ رہے اور اسی کی خاطر انہوں نے اپنی جان دیدی، لیکن ان کے مرشد یعنی شیخ عبداللہ نیازی سرہندی

۱؎ بدایونی کا بیان ہے کہ شیخ بدھ نے پہلے سلیم شاہ کو یہ خط لکھا تھا کہ عقیدہ مہدویت پر کفر والحاد کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی اس لئے شیخ علائی پر کفر و فسق کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے، انہوں نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ ان کے پاس اتنی کتابیں موجود نہیں جتنی کہ دارالسلطنت کے علماء کے پاس ہیں اس لئے مزید تحقیق وہیں کی جا سکتی ہے لیکن شیخ بدھ کے بیٹوں نے مخدوم الملک کے خوف سے اپنے بوڑھے باپ کو اس پر راضی کر لیا کہ خط کا بھیجنا خلاف مصلحت ہوگا، صرف یہ لکھ دیا جائے کہ اس مسئلہ پر مخدوم الملک ہی رائے دے سکتے ہیں کیونکہ وہ بہترین محقق ہیں، بدایونی کے اس بیان کی تفصیلات میں دو وجہ سے شک کیا جا سکتا ہے، ایک تو یہ کہ بدایونی کی عمر اس وقت دس سال کی تھی اور اس کا بیان یقیناً دوسروں کی روایتوں اور افواہوں پر مبنی ہوگا، دوسرے یہ کہ مخدوم الملک سے وہ خود بھی ناراض تھے اور اس کے خلاف ہر خراب بیان کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ دیکھو بدایونی ص ۱۱۰

Marfat.com

کا رویہ اس سے مختلف تھا، نیازی قبیلہ کے افغانوں کی ایک بغاوت فرو کرنے کے سلسلے میں سلیم شاہ کو بیانہ کی طرف جانا پڑا، سلطان نے حاکم بیانہ میاں بہوہ کے ذریعہ شیخ عبداللہ نیازی کو طلب کیا۔ حاکم مذکور ان کا معتقد تھا چنانچہ اس نے خفیہ طور پر شیخ کو وہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا، شیخ نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا بلکہ سلطانی کیمپ میں حاضر ہوئے، سلطان کے سامنے پہنچکر انہوں نے آداب شاہی کی پابندی نہیں کی بلکہ گردن بلند کرکے سلام کیا، میاں بہوہ نے باوجودیکہ وہ شیخ کا مرید تھا ان کی گردن پکڑ کر جھکائی اور کہا کہ سلطان کے سامنے سلام اس طرح کیا کرتے ہیں، شیخ نے جواب دیا کہ وہ سلام مسنون کے علاوہ کوئی طریقہ سلام کا نہیں جانتے اس پر سلیم شاہ کو غصہ آیا اور اس نے کہا کہ شیخ علائی کا یہ پیرو ہے۔ مخدوم الملک نے کہا ہاں یہی ہے۔ بادشاہ نے کوڑے لگانے کا حکم دیا، کوڑے لگتے وقت شیخ آیہ کریمہ ربنا اغفر لنا ذنوبنا ...... وانصرنا علی القوم الکافرین کی تلاوت کرتے تھے۔ سلطان نے دریافت کیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں، مخدوم الملک نے فوراً جواب دیا کہ آپ کو اور ہم کو کافر کہتے ہیں اس پر سلطان کو بہت غصہ آیا اور اس نے حکم دیا کہ اور زیادہ مارا جائے۔ یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا، چند دنوں بعد شیخ کے زخم ٹھیک ہو گئے اور وہ سیاحت کے لئے افغانستان و شمالی علاقہ میں چلے گئے وہاں سے واپسی پر انہوں نے مہدویت سے توبہ کرلی اور سرہند میں سکونت اختیار کرکے بہ درویشی تشنگان علم عام اہل اسلام سلوک میں مشغول رہے۔ عبادت خانہ کی تعمیر کے وقت جب اکبر کے سامنے شیخ نیازی کا ذکر ہوا تو اس نے ان کو سرہند سے بلوایا اور تنہائی میں باتیں کیں اسی موقع پر شیخ نے بادشاہ کو بتلایا کہ شروع میں وہ مہدوی عقائد رکھتے تھے لیکن بعد ازانکہ حقیقت حق الیقین ظاہر ہوئی انہوں نے وہ عقائد ترک کر دئے۔ اکبر نے ان کو رخصت کیا اور بعد میں ان کو کچھ زمین مدد معاش کے طور پر عطا کی۔ شیخ عبداللہ نیازی کی مہدویت

۔ بدایونی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نیازی نے امام غزالی کی احیاء العلوم اور (بقیہ اگلے صفحہ)

تائب ہونے کے باوجود شہرت باقی تھی ان کو صوفیاء کے بعض عقائد اور افعال سے اتفاق نہیں تھا، انہوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو اس سلسلہ میں خط لکھا تھا جس کا جواب موخرالذکر نے دیا اس کا عنوان شیخ عبدالحق کے مکاتیب میں یہ ہے:۔

"در رعایۃ الانصاف والاعتزال فی اعتقاد الصوفیہ من الاقوال و الاحوال"

شیخ عبداللہ کے خط میں شیخ اکبر اور ان کے ہم خیالوں پر سخت تنقید تھی، شیخ عبدالحق نے لکھا کہ شیخ اکبر کی فصوص میں "در بعضے مواضع ...... آنچہ بفہم ظاہری آید آن خود محل تردد انکار است ...... وخدا داند کہ ایشان چہ قصد کردہ اند" پھر وہ کہتے ہیں:۔

"تصوف کی تعلیم کا مدار قوۃ القلوب رسالہ قشیریہ منازل السائرین، تعرف اور عوارف پر ہے نہ کہ فصوص پر لہذا وہ اصل عنوان صوفیاء مرتبہ عظیم و مقامے رفیع و مسلک طریق مستقیم

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) کیمیائے سعادت پر ہوتا، کچھ بعید نہیں کہ ان ہی کے مطالعہ کی بدولت وہ مہدیت سے تائب ہوئے ہوں، بدایونی ہی کا بیان ہے کہ شیخ عبداللہ نیازی کی مجلس میں ایک ضعیف العمر مغل نے یہ شہادت دی کہ سید محمد کی وفات کے وقت وہ فرہ میں موجود تھا اور رحلت سے قبل سید موصوف نے اپنی مہدویت کے عقیدہ سے توبہ کر لی تھی اور اقرار کیا تھا کہ میں مہدی موعود نہیں ہوں، دیکھو بدایونی ص ۲۔۱۱ و ۲۹۴

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ منتخب التواریخ کے انگریزی مترجم مسٹر ڈبلیو ایچ۔ لو نے شیخ عبداللہ نیازی کے سلسلہ میں مہدویت کو مہادیویت پڑھ کر ترجمہ کیا ہے کہ وہ مہادیو کے حلقہ میں داخل ہو گئے تھے اور نوٹ میں تشریح کی ہے کہ ہندو ہو گئے تھے، دیکھو جلد دوم ص ۲۰۴

Marfat.com

است۔[۴]

بہرحال مخدوم الملک کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہدوی تحریک شمالی ہند پاکستان میں زیادہ زور نہ پکڑ سکی، لیکن برصغیر کے ان علاقوں میں جو سوری حکومت کے تحت نہیں تھے بعض لوگوں نے مہدوی طریقہ کو اختیار کر لیا۔ مہدوی عقائد سے اکبر اور اس کے ہم خیال درباری براہ راست تو متاثر نہیں ہوئے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر اس گروہ سے جو سنی علماء کے خلاف تھا عہد اکبری کی بدعات اور دینی بے راہ رویوں کو اخلاقی امداد ملی[۵]۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ شیخ مبارک جو دین الٰہی کے بانیوں میں تھا، اسی تحریک سے متاثر تھا۔ دین الٰہی کے مطالعہ کے سلسلہ میں دو اور تحریکوں کا ذکر ضروری ہے۔ (۱) بھگتی تحریک

---

[۴] رسائل و مکتوبات بر حاشیہ اخبار الاخیار (مطبع مجتبائی۔ دہلی ۱۳۳۲ھ) ص ۸۲۴

[۵] دور جدید کے اکثر مورخین نے اور بعض ہمعصر مصنفوں نے بھی مخدوم الملک اور عبدالنبی بلکہ علماء کے گروہ پر سخت ترین تنقیدیں کی ہیں اور ان کو تنگ نظر و متعصب کہا ہے۔ اس قسم کی تنقیدوں کا جائزہ لیتے وقت ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اسلامی حکومت میں احتساب کا محکمہ ان ہی حضرات کے سپرد ہوتا تھا اور شرعی قوانین کی ذمہ داری اور انتظامی اختیارات کے استعمال کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کے مخالف ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر مولانا آزاد کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔ مخدوم الملک اور عبدالنبی کے اختلافات کا ذکر کس قدر بلیغ الفاظ میں لیتے ہیں:

"اور یہ اس گروہ کا اولین اور لاینفک خاصہ ہے۔ سانپ بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جاتے ہیں لیکن علماء دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے، کتوں کا [illegible] اور مقصد [illegible] بے بنیاد یکتائی اور ایسے ان کے پیچھے تھے۔ اور [illegible] دنیا [illegible] مخدوم الملک اور عبدالنبی کی بہت سی باتیں قابل گرفت تھیں اور ان کی حب جاہ میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا، لیکن گروہ علماء پر یہ کڑی تنقید ایک لیے [illegible] مولانا [illegible] باقی کلیے [illegible]

اور (۲) تصوف کی اشاعت تھا۔

بھگتی بھگتی تحریک عرصہ سے ہندوستان میں جاری تھی اس کے پیرو خدا کی محبت اور نوع انسانی کے اتحاد پر بہت زور دیتے تھے، اس تحریک کا پہلا مشہور مبلغ رامانج (ولادت سنہ ۱۰۱۶ء) تھا، لیکن اس نے فروغ چودھویں صدی میں رامانند کے زمانہ میں پایا۔ رامانند کے نزدیک ویدوں اور شاستروں پر اعتقاد رکھنا ضروری نہ تھا، وہ رام سے عقیدت اور محبت پر بہت زور دیتا تھا، رامانند کے بارہ چیلوں میں کبیر بھی تھا، اس نے ایک مسلمان بافندے کے گھر میں پرورش پائی تھی لیکن رامانند کو گرو تسلیم کر کے بھگتی کی تبلیغ اپنی شاعری کے ذریعہ کی، کبیر مذہب کی روح یعنی خدا سے محبت پر زور دیتا ہے اور ظاہری پابندیوں کو غیر ضروری قرار دیکر ان پر تنقید کرتا ہے اور پنڈتوں اور ملاؤں کا مذاق اڑاتا ہے، ہندو پاکستان کی ثقافتی تاریخ میں کبیر کے کلام کی صرف دینی اہمیت ہی نہیں بلکہ اس کا اثر زبان پر بھی بہت گہرا ہوا،

بھگتی تحریک میں ہم کو قدیم ہندو عقائد کے بہت سے اصول نظر نہیں آتے، تقسیم ذات و اصنام پرستی کے خلاف بغاوت اور توحید پر شدت کے ساتھ اصرار اس کی نمایاں خصوصیات ہیں، اس بنا پر اور بعض دوسرے اسباب کے پیش نظر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بھگتی تحریک بالواسطہ اسلام کے اثرات کا نتیجہ تھی، بھگتی تحریک کا یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) سے اچھی نہیں معلوم ہوتی جو خود اپنی لیڈری قائم رکھنے کی خاطر برسوں غیر مسلموں کی قیادت میں ان ہی کی ہم نوائی کرتے رہے ہوں اور آخر عمر میں لاکھوں مسلمانوں کی آبروریزی اور قتل کا تماشا دیکھنے کے بعد اسی لادینی حکومت میں جس نے مسلمانوں کے خون سے یہ ہولی کھیلی ہو وزارت کی گدی پر براجمان رہے ہوں۔

دیکھو تذکرہ (لاہور ایڈیشن) ص ۱۰۲

Marfat.com

کہا جا سکتا کہ ان اہم رہنماؤں کی تبلیغی کامیابیوں پر اثر انداز ہوئی۔

وحدت الوجود کی اشاعت

صوفیائے کرام نے تبلیغ اسلام اور مسلمانوں کی روحانی تربیت کے سلسلے میں جو اہم کردار ادا کیا ہے اس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے، لیکن تصوف کی تاریخ کا ایک پہلو خاص طور پر مؤرخین کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے۔ صوفیا کا ایک طبقہ وحدت الوجود کا قائل ہے۔ شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن العربی کی تصانیف کے ذریعہ اس مسئلہ نے عالمگیر حیثیت حاصل کر لی تھی اور صوفیاء کے حلقوں میں اس کا چرچا عام ہو گیا تھا۔ لیکن . . . .

اپنی عقیدت کے صوفیائے کرام اور وہ علماء جو اس کے قائل تھے اس پر گفتگو نہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے کہ ہمہ اوست کا تصور عوام کے لئے نہیں، اس کی اشاعت سے خطرناک نتائج رونما ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔

گر بدانی بداں کہ اوست ہمہ
ور بگوئی بگو کہ زوست ہمہ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ممکن نہ تھا کہ جو حضرات اس مسئلہ کو اپنے خیالات کی جان سمجھتے تھے وہ اس پر خاموش رہتے۔ متاخرین فضلاء سے زیادہ شعراء نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو اپنے کلام میں شامل کیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے معمولی تعلیم حاصل کی تھی اور اس باریک مسئلہ کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اس کو غلط معنی پہنانے کے مرتکب ہونے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ ان نااہلوں کے ذریعہ شریعت اور دین کو نقصان پہنچا تھا۔ اس کا ذکر خود شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے اس مکتوب میں کیا ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ شیخ عبداللہ نیازی نے وحدت الوجود میں عقیدہ رکھنے والے حضرات کو طنز کے طور پر صوفیہ فصوصیہ کہا تھا، اسی بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ یہ صوفیا کا طریقہ نہیں . .

Marfat.com

نہ چنانکہ طریقہ نام صوفیہ اباحیہ زمان است کہ ادعا و اتہام تصوف کنند و در اعتقاد و عمل اصلا براہ تقوی و احتیاط نروند و تمسک بکتاب و سنت نکنند و در مرویات و احکام اسلام ملاحظہ نہ نمایند وشاید کہ بصوفیاء فصوصیہ کہ در مکتوب شریف واقع شدہ بود امثال این جماعۃ را ارادہ نمودہ باشند[1]"

اس گروہ "صوفیائے فصوصیہ" یا یوں کہئے کہ ان کے غیر ذمہ دارانہ اقوال وافعال کی بہت بڑی اہمیت یہ ہے کہ شیخ مبارک، ابوالفضل اور فیضی وغیرہ نے اکبر کو اسلام سے دور تر کرنے میں ان ہی کے اقوال وافعال کو ہتھیاروں کے طور پر استعمال کیا۔

بادشاہی پر تقدس کا ملمع

اکبر کے بڑھتے ہوئے جذبہ مطلق العنانی اور سولھویں صدی کے نصف اول میں سماجی اور مذہبی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان کو سامنے رکھ کر عبادت خانہ کی مجالس پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، پہلے سال کی مجالس میں صرف مسلمان شریک تھے لیکن مختلف الخیال طبقوں کے اختلافات نے بہت جلد ایسا رنگ اختیار کر لیا کہ بادشاہ کے عقائد میں تزلزل پیدا ہونے لگا، مجالس کے حالات ملا عبد القادر بدایونی نے جو عینی شاہد ہیں قدرے تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اور بعض مسائل پر جو کچھ کہا گیا اس کا مفصل حال لکھا ہے۔ یہاں چند مباحث کی طرف

---

[1] ان الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عبد الحق اپنے عہد کے ان صوفیاء کو جو وحدۃ الوجود میں عقیدہ رکھتے تھے اور اس کے اظہار میں غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے تھے اس لئے اچھا نہیں جانتے تھے کہ وہ صرف باتیں ہی کرتے تھے، نہ کتاب وسنت پر عمل کرتے تھے اور نہ متقی تھے ان کا مقابلہ "صوفیاء فصوصیہ" یعنی ابتدائی دور کے ان بزرگوں سے نہیں کیا جا سکتا، شیخ اکبر کی فصوص الحکم سے متاثر تھے، وہ لوگ زہد و تقوی کے میدان میں بہت آگے تھے۔

Marfat.com

اشارہ کافی ہوگا۔ مجلس میں ابتدا ہی سے گروہ بندی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ کردی گئی تھی۔ ابوالفضل اور فیضی نے اپنی زندگی کا مقصد متعین کر لیا تھا ان کا نصب العین بہت صاف اور کھلا ہوا تھا۔

وہ اکبر کی شخصیت کو اتنا بلند کرنا چاہتے تھے کہ تاریخ عالم میں کوئی بشر اس سے زیادہ اونچا نظر نہ آئے۔ اسلامی حکومتوں میں بادشاہ کو اکثر ظل اللہ کہا جاتا تھا لیکن یہ لقب اب تقریباً عام ہوگیا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ شاہی اقتدار کا اللہ تعالیٰ کے اقتدار سے رشتہ قائم کرکے اکبر کو روحانی پیشوا کا درجہ دیدیا۔ اس کی روحانیت کے ثبوت میں اس کی کرامات کے قصے لکھے اور جس طرح مسلمانوں نے ختم المرسلین کے اقوال کو محفوظ کیا تھا اسی طرح اس کے اقوال خاص طور پر آئین اکبری میں جمع کئے گئے۔ خوشامد کے اس انوکھے انداز نے اکبر کے جذبہ مطلق العنانی پر جادو کا کام کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوالفضل کی عزت اس کے دل میں ان تمام افسروں اور فوجی سرداروں سے زیادہ تھی جنہوں نے اس کی سلطنت کو وسیع کرنے اور نظم حکومت کو مستحکم بنانے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ ابوالفضل نے جو انعامات حاصل کئے ان کو دیکھ کر دوسرے درباری اور شعرا بھی اسی راستہ پر چلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان لوگوں کو یہ خیال ہوگیا کہ جس قدر وہ بادشاہ کی شخصیت کو بلند کریں گے اتنا ہی خود ان کے جاہ و جلال میں اضافہ ہوگا۔ شعرا میں تو مدح سرائی کی روایات بہت عرصہ سے جاری تھیں۔ لیکن اب درباری مورخین بھی ان کے پہلو میں نظر آنے لگے۔ اور مدح سرائی کا رد عمل مطلق العنان حکمرانوں پر یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی ذات کو مقدس بلکہ مافوق البشر سمجھنے لگیں۔ چنانچہ اکثر حالات میں ایسا ہی ہوا ہے۔ مغربی اسلامی ممالک اور مسلم حکومتوں میں انسان کی اس ہوس اقتدار اور لامحدود جاہ طلبی کو حد کے اندر رکھنے میں شریعت کے احکام نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ان ہی کی وجہ سے کوئی مسلمان بادشاہ حد ظل الٰہی کو عبور نہیں کر سکتا تھا۔ ان کو یہ وقت یاد دلایا جاتا تھا کہ قوانین شریعت کے وہ بھی اسی قدر پابند ہیں جس قدر کہ ان کی رعایا۔ [illegible]

Marfat.com

ہو سکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ بعض حکمرانوں نے اس کی خلاف ورزی کی، لیکن اسلامی تاریخ نے ان کو "مجرموں" ہی کے طبقہ میں شمار کیا ہے، مورخ کی نظر میں اسلامی معاشرہ کی اس خصوصیت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ قوانین شریعت نافذ کرنے کے سلسلہ میں حکومت کو علماء اور فقہاء کے اجتہادات پر عمل کرنا پڑتا تھا[1] یعنی شرعی قوانین کا نفاذ اس ہی طبقہ کے ذریعہ ہوتا تھا، یہی سبب تھا کہ صدر الصدور کا عہدہ مغلیہ نظام حکومت میں چار بڑے عہدوں میں شمار ہوتا تھا[2]۔ جہاں تک کہ دوسری وزارتوں اور اعلیٰ عہدوں کا تعلق تھا، ایک مطلق العنان حکمران کو اختیار تھا کہ بیک جنبش قلم اس کو ختم کر دے جیسا کہ اکبر نے ابتدائی زمانہ میں بیرام خاں کے ساتھ کیا یا ہارون الرشید نے برمکیوں کے ساتھ لیکن

---

(۱) موجودہ دور کے بعض متمدن ملکوں میں آج بھی عدلیہ کے اختیارات بہت زیادہ ہیں اور اس کے فیصلے حکومت کے لئے حرف آخر ہیں، لیکن ان میں اور اسلامی حکومت میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دور جدید کی حکومتیں وضع قوانین میں دخل رکھتی ہیں اور اگر کسی قانون کو اپنے خلاف سمجھتی ہیں تو کسی نہ کسی صورت سے اس میں تبدیلی کرا سکتی ہیں۔ اسلامی حکومت میں قرآن اور حدیث اور بعض حالتوں میں فقہی مذاہب کے خلاف حکومت کوئی قانون وضع نہیں کر سکتی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ بعض اوقات پست کردار مجتہد حکومت کو خوش کرنے کے لئے اس کی مرضی کے مطابق فیصلہ دے دیتے تھے۔

(۲) چار بڑے عہدے یہ تھے:- وکیل (بمنزلہ وزیر اعظم) وزیر یا دیوان (یعنی وزیر مالیہ) بخشی (اس کے فرائض مختلف النوع تھے: خاص طور پر مناصب داروں، فوج اور تقسیم تنخواہ کے سلسلے میں وہ سب سے اعلیٰ افسر تھا اور وزیر کا درجہ رکھتا تھا) صدر الصدور (عدلیہ کے علاوہ مدد معاش عطیات کا تقرر وغیرہ اور احتساب اسی کے سپرد تھا۔)

Marfat.com

صدرالصدور یا شیخ الاسلام کے ساتھ اس قسم کا سلوک خطرہ سے خالی نہ تھا اس مشکل کا حل بعض مطلق العنان حکمرانوں نے یہ نکالا تھا کہ ان کے ان عہدوں پر ایسے حضرات کا تقرر کرتے تھے جو اپنے ضمیر کا سودا کر سکتے تھے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اکبر کو اس کا احساس بہت جلد ہی ہو گیا تھا کہ علماء و فقہاء کا طبقہ جس کی قیادت مخدوم الملک اور صدر الصدور کے ہاتھ میں تھی اس کی آمریت کا سب سے بڑا دشمن ہے خود اپنی سلطنت میں تو اس خطرہ کا اظہار خلاف مصلحت تھا لیکن اس نے اپنے خط میں جو ابوالفضل کا لکھا ہوا ہے علماء و فضلاء کے لئے وہ الفاظ استعمال کئے ہیں جن کو شاید گالیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس طویل خط کے وہ فقرے جن کی طرف ہم خاص طور پر اشارہ کرنا چاہتے ہیں یہ ہیں:-

"........ در وقت صحبت با خوندہ ہائے سیاہ دل و سیہ
کاران تیرہ درون کہ از برائے خواہش جاہ و زبردستی و خودی و خود
پرستی چشم بر کاغذ دوختہ ندنہ فرمان آسمانی نامہ جاودانی را کہ
فرستادہ خدا رسانیدہ پیغمبر است از شناہراہ گردانیدہ بر رنگ
دیگر وامی نمایند و محملات لفظی را تاویلات و تسویلات نمودہ
می خوانند کہ در فرمانروائی و کارگزاری شریک پادشاہی باشند ...."[1]

اس خط کی عبارت سے وہ ذہنیت آشکارا ہو جاتی ہے جس پر اکبر کی حکومت اپنی مذہبی پالیسی کی بنیاد رکھنا چاہتی تھی۔

---

[1] ابوالفضل۔ دفتر اول ۱۲۶۹ھ ... خزانۃ الخوانین کے بیان کے مطابق فیضی نے اس خط کی تیاری کے بہانے بہت ابوالفضل کو دربار میں بلایا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:-
"تقریب جواب نوشتن نامہ عبداللہ خان اوزبک والی توران تعاقب برادر خورد شیخ ابوالفضل طلب نمود۔ بامنہا ... ۲۹"

Marfat.com

عبادت خانہ

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ عبادت خانہ میں علماء اور دوسرے مسلم رہنماؤں نے جن اختلافات اور تعصبات کا مظاہرہ کیا ان ہی کی وجہ سے اکبر کے مذہبی عقائد میں تزلزل پیدا ہوا، یہ صرف ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے اس لئے کہ تعمیر عبادت خانہ سے قبل ہی بادشاہ اور اس کے پرستاروں کا رویہ علماء اور اسلام کی طرف نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگا تھا[1]۔ بدایونی نے عبادت خانہ کی مجالس کا حال لکھنے سے پہلے ہی کہا ہے کہ "مخدوم الملک و مولانا عبداللہ سلطان پوری را بقصد ایذاء دران مجلس می طلبیدند" دونوں پر ذاتی حملے کئے جاتے تھے اور ان کی تقریر میں لوگ غیر ضروری طور پر دخل اندازی کر کے ان کو پریشان کرتے تھے بلکہ بعض مقربین بادشاہ کے ارشاد پر "در مقام کاوش و کاہش و تراش در آمده از وے چیزہائے غریب نقل می کردند"

"ان چیزہائے غریب" ہی میں یہ قصہ تھا کہ مخدوم الملک جو بخل کے لئے مشہور تھے سال کے آخر میں اپنی دولت بیوی کے نام منتقل کر دیتے اور اس سے پہلے کہ ایک سال گذرتا اپنے نام کرا لیتے، یہ شرعی حیلہ تھا زکوٰۃ سے بچنے کا، کیونکہ اس طرح کسی پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی

---

[1] منتخب التواریخ میں ان لوگوں کی کی ہوئی تاویلات کا ذکر کیا گیا ہے جن کو پڑھ کر انسان انگشت بدندان رہ جاتا ہے۔ مثلاً حاجی ابراہیم سرہندی کے متعلق جو جعلی روایتوں کے نقل کرنے اور خود وضع کرنے میں کمال رکھتا تھا بدایونی لکھتا ہے کہ "عبارتے جعلی از شیخ ابن عربی قدس اللہ سرہ در کتابے کہنہ کرم خوردہ بخط مجہول نوشتہ کہ صاحب زمان، زنان بسیار خواہد داشت و ریش تراش خواہد بود و صفتے چند کہ در خلیفۃ الزمان بود درج کرد۔۔۔۔۔۔ و موافق نقل حاجی ابراہیم در رسالہ کہنہ از کتب ملا ابو سعید برادر زادہ میان امان پانی پتی حدیثے موضوع گذرانیدہ بودند کہ پسر صحابی بے ریش در نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آمد فرمودند کہ اہل بہشت باین ہیات خواہند بود" دیکھو ۳ ۲۲۹۔

Marfat.com

تھی واقعہ کی تفصیل کہیں نہیں ملتی لیکن اس کی صحت میں شک نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بدایونی نے اس کا ذکر بہت صریح الفاظ میں کیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے شرعی حیلوں کو اچھا نہیں کہا جاسکتا اور اس سے کردار کی کمزوری معلوم ہوتی ہے، لیکن یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ مجالس میں صرف علماء و فقہا کے ہی کردار کا تجزیہ کیا جاتا تھا اور ان ہی کی ذاتی کمزوریوں کو شہرت دی جاتی تھی۔[۱]

عبادت خانہ کے مباحث کا مقصد دریافت حق تبلایا گیا تھا۔ لیکن جو مسائل وہاں زیر بحث آئے اور جس رنگ میں ان پر بحثیں ہوئیں اور جو تقریریں وہاں کی گئیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ دریافت حق کے علاوہ اور مقاصد بھی ضرور تھے۔ پہلا مسئلہ جو زیر بحث آیا وہ تعدد ازدواج سے متعلق تھا، بادشاہ نے فرمایا کہ عنفوان شباب میں انہوں نے شادیوں کی تعداد پر کوئی قید نہیں لگائی تھی اور جس قدر کی خواہش زنان آزاد و

---

[۱] مخدوم الملک کے اس واقعہ پر مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دیگر مصنفین نے بہت سخت تنقید کی ہے۔ مولانا اس کو نہایت غلیظ قسم کا باطنی فسق کہتے ہیں، مخدوم الملک کا عمل قطعی طور پر غیر مستحسن تھا، مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شریعت کی نظر میں وہ اتنا قبیح نہ تھا جتنا کہ صدر جہاں مفتی میراں اور عبدالحئی قاضی القضاۃ کی شراب نوشی، یہ دونوں حضرات "مشرف بہ دین الٰہی" ہو چکے تھے اور باوجود اپنے عہدوں کے شراب نوشی فرماتے تھے، ایک جشن کے موقع پر جب انہوں نے اکبر کے ساتھ شراب نوشی کی تو بادشاہ اس قدر محظوظ ہوا کہ اس نے فوراً خواجہ حافظ کا شعر پڑھا ۔

حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش
در دور پادشاہ خطا بخش جرم پوش

تفصیل کے لئے دیکھو بلاک مین کا انگریزی ترجمہ آئین اکبری جلد اول ص ۲۲۲۔

بندہ جمع کردیم " حالا علاج آن چہ تواں کرد" معلوم ہوتا ہے کہ کسی موقع پر اس سلسلہ میں شیخ عبد النبی نے اکبر سے کہہ دیا تھا کہ بعض مجتہدین قرآن مجید کی آیت " فانکحو...... رباع " کے ظاہری معنیٰ لے کر نو اور اٹھارہ نکاحوں کا بھی فتویٰ دیا ہے، اکبر کو اس سے کچھ تسکین ہو گئی ہوگی، اب بعد میں عبد النبی پر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے ان کو یاد دلایا کہ انہوں نے اس قسم کی دلیل اس کے سامنے پیش کی تھی عبد النبی نے کہا کہ میں نے صرف اختلاف روایات کا ذکر کیا تھا، چار سے زاید شادیوں کا فتویٰ نہیں دیا تھا اکبر کے پاس اس کا جواب نہ تھا لیکن " این معنی بر طبع بادشاہ گراں آمدہ فرمودند کہ بدین تقدیر شیخ با ما نفاق ورزیدہ بود کہ آن زمان چیزے دیگری گفت حالا دیگری گوید و این تخم در دل جا گرفت " اس مسئلہ پر بہت بحث ہوئی اور بالآخر یہ طے ہوا کہ متعہ کی آڑ لی جا سکتی ہے چنانچہ ایک مخصوص صحبت میں چند آدمی بلائے گئے اور ابو الفضل نے بہت سی روایتیں جو اس کے باپ نے جمع کی تھیں پیش کیں، اسی عرصہ میں ملا عبد القادر بلائے گئے انہوں نے بہت ترکیب سے بادشاہ کی مدد کی، انہوں نے رائے دی کہ شیعوں میں اور امام مالک کے نزدیک متعہ جائز ہے لیکن اگر کوئی مالکی قاضی فتویٰ دیدے تو حنفیوں کے لئے بھی جائز ہو جاتا ہے۔ یہ رائے بادشاہ کے لئے " دلپسند مستحسن " تھی۔ اکبر نے قاضی یعقوب کا فوراً تبادلہ کر دیا اور قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی مقرر کیا۔ موخر الذکر نے اسی جگہ متعہ کے جواز کا فتویٰ دیا اور اس طرح بادشاہ کو اطمینان ہو گیا۔

بدایونی کے علاوہ دبستان المذاہب میں کچھ تفصیل موجود ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عبادت خانہ کی بحثوں میں مسائل کی تحقیق نہیں ہوتی تھی بلکہ انتہائی گندی باتیں کی جاتی تھیں۔ شیعہ سنیوں میں صحابہ اور ائمہ بالخصوص حضرت عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق جو تقریریں دونوں جانب سے کی گئیں ان کو پڑھ کر شرم آتی ہے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اکبر اور اس کے معتمد رفقاء ان مباحث کو روکتے کیوں نہیں تھے بہرحال ایک

Marfat.com

سال کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی عقائد اور روایات پر ہر قسم کی طعنہ زنی کی جانے لگی اور کم از کم درباریوں کی جماعت کو اس پر تیار کر لیا گیا کہ حقیقت تک پہنچنے کے لئے اسلام کافی نہیں بلکہ دوسرے ادیان سے بھی فائدہ اٹھانا ضروری ہے، اس اقدام کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ وہ طبقے جو اس وقت تک حکومت اور اقتدار سے نسبتاً دور تھے، اگر ان کو قریب لایا جائے گا تو وہ یقیناً مسلمانوں کے مقابلہ میں آمریت کا زیادہ ساتھ دیں گے اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ سلطنت کی تعمیر انہوں نے ہی کی ہے اور بادشاہ وقت کے لئے ان کا تعاون ناگزیر ہے، چنانچہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کو بھی دعوت دے کر دربار میں بلایا گیا۔[1]

امام عادل کا رتبہ مجتہد سے زیادہ قرار دیا گیا

اب شیخ مبارک کی سرکردگی میں اس کے بیٹوں اور چند دیگر خوشامد پسند درباریوں نے اپنا پروگرام تیار کر لیا تھا۔ اکبر کو دینی مقتدیٰ بنا کر اس کی حیثیت پیغمبر جیسی کر دی تھی۔[2] بہ الفاظ دیگر ایک نئے دین کی داغ بیل ڈال کر بادشاہ کو پیدر

---

[1] ابوالفضل کے قول کے مطابق "صوفی، حکیم، متکلم، فقیہ، سنی، شیعہ، برہمن، جینی، سیورا (یہ جین فرقے تھے) چارباک (یہ بھی دہریہ فرقہ تھا) نصاری، یہود، صابی، زرتشتی وسایر گوناگوں مردم از دید آرامش محفل ہمایوں و نشستن گیہان خدیو بہ فراز منبر آراستہ شدن زینت گاہ بے غرضی نشاط فارغ البالی موفقند" اکبر نامہ جلد ۳ ص ۲۵۲

[2] محضر کی تیاری ۹۸۷ھ یعنی ۱۵۷۹ء میں ہوئی۔ لیکن پیغمبرانہ حیثیت [illegible] ست و نالیس تا یا تو مبارکباد دیتے وقت شیخ مبارک نے جو کہ درویش [illegible] کی تالیف [illegible] میں جا بجا [illegible] یہ عرض کیا: آنچہ اکنون [illegible] عالم غیب [illegible] اخلاص گزین [illegible] کہ آن [illegible] عالم مبارکباد [illegible] معتقدان اخلاص نہاد فرمائیکہ [illegible]

بنا دیا جائے اور خود ابو الفضل وغیرہ وہ اختیارات سنبھال لیں جو اسلامی نظام میں شیخ الاسلام اور صدر الصدور کے پاس ہوتے تھے، یہ کام سہل نہ تھا، بہت ہوشیاری سے قدم آگے بڑھانا تھا اور رفتہ رفتہ تبدیلیاں کرکے منزل مقصود تک پہنچنا تھا۔ اسی سال یہ تجویز کی گئی کہ اکبر جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھائے اور ایک خاص رنگ کا خطبہ اس موقع کے لئے تیار کیا گیا، لیکن بادشاہ نے جوں ہی خطبہ پڑھنا شروع کیا "بیک بارگی حصر شدہ بلرزہ افتادند" اور فیضی کے تین شعر "بمدد دیگران نیم تمام خواندہ از منبر فرود آمدند و امامت را بحافظ محمد امین خطیب حکم فرمودند"۔[1]

یہ طریقہ تو اچھا سوچا گیا تھا، بہت آسانی سے بادشاہ پہلے امام و خطیب اور درجہ بدرجہ سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن اکبر کی ناکامیابی نے منصوبہ کو ناکام بنا دیا، دوسرا راستہ یہ نکالا گیا کہ دینی معاملات میں صرف توحید پر زور دیا جائے اور رسالت کو قطعی طور پر نظر انداز کیا جائے چنانچہ کتابوں میں توحید کے بعد نعت نہیں بلکہ "القاب بادشاہی می نوشتند و مجال نداشتند کہ نام حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی رغم الکذابین ببرند"۔ آخر کار یہ ترکیب ایجاد کی گئی کہ امام عادل کو شرعی و ملکی معاملات میں آخری فیصلہ کا اختیار دلوایا جائے ایک محضر

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) ایزد جہان بخش از فزونی نیک اندیشی و نیک کرداری با چنین عطیہ کبریٰ و سعادت عظمیٰ کرامت فرمودہ کہ عبارت از آن ذات مقدس است کہ از فراخ حوصلگی و نیک سرانجامی نشاۃ ظاہر بشیباۓ ملک معنی گردانیدہ چنین فتوحات عالی را چہرہ کشا است" اکبر نامہ جلد ۳ ص ۲۹

[1] اشعار یہ تھے:

خداوندے کہ مارا خسروی داد — دل دانا و بازوے قوی داد
بعدل و داد مارا رہنمون کرد — بجز عدل از خیال ما برون کرد
بود وصفش ز حد فہم برتر — تعالیٰ شانہ اللہ اکبر

(دیکھو بدایونی ص ۲۲۶)

Marfat.com

تیار کیا گیا۔[1] اس میں یہ الفاظ شامل تھے :۔

"کہ مرتبہ سلطان عادل عند اللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد راست" اور چونکہ حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین، ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً"

سب سے زیادہ عادل، سب سے زیادہ عاقل اور سب سے زیادہ اللہ کے جاننے والے ہیں اس لئے اگر کسی مسئلہ میں مجتہدوں میں اختلاف رائے ہو تو وہ بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم" ایک رائے کو پسند کر کے وہ اپنا فیصلہ دیدیں گے اور یہ فیصلہ متفق علیہ سمجھا جائے گا، اس کے علاوہ امام عادل کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ اگر وہ کوئی حکم جاری کرے جو قرآن کی نص کے خلاف نہ ہو اور وہ قوم کی بہبودی کے لئے ہو تو سب لوگ اس حکم کی تعمیل کریں گے اس پر دستخط کرنیوالوں میں مخدوم الملک اور عبدالنبی بھی تھے، اگرچہ بدایونی کا یہ قول بھی قابل غور ہے کہ "وبعضے بکرہ۔ ان تذکرہ مہر ہا کردند" محضر پہ دستخط کرانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کی توجہ اسلام کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کی طرف زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ان کے رسوم کو وہ اختیار کرتا چلا جاتا ہے اور شعائر اسلام کو حتی الامکان بند کرنے کی کوشش کرتا ہے "تقلیدی اسلام" کے نام کا بہانہ بنا کر اسلامی احکامات کی مخالفت کی جاتی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

اکبر بحیثیت دینی پیشوا، آئین رہنمولی

ابوالفضل اور اس کے ہم خیال لوگوں کی اس تدبیر سے اکبر بہت جلد دینی پیشوائی کی عالی منزل پہ پہنچ گیا۔ اس گروہ کے لئے سب سے زیادہ دشوار یہی مسئلہ تھا کہ خود اکبر کو یہ یقین

---

[1] اس محضر کو انگریزی مورخین نے یہ انفالبلی ڈگری Infallibility Decree کہہ کر دور جدید کے مورخوں کے لئے گمراہی کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اس میں بادشاہ کو مامون عن الخطا نہیں کہا گیا ہے۔

Marfat.com

دلایا جائے کہ اس کی ذات میں دنیوی اقتدار اور دینی ہدایت دونوں جمع ہیں وہ یقیناً خود کو مطلق العنانی کی انتہائی منزل پر دیکھنا چاہتا تھا، لیکن اپنی روحانی حالت کا اس کو بخوبی اندازہ تھا، بہرحال اس مشکل کو حل کرنے کے لئے دینی علوم اور شعراء کی اصطلاحات کو ہتھیاروں کے طور پر استعمال کیا گیا، ان حالات کو نئے انداز سے اور نئے مطالب کے ساتھ پیش کر کے بادشاہ کو سب کچھ بنا دیا۔[۱۱۵] ان لوگوں کے طریقہ کار کا صحیح اندازہ میر ابوالفضل کے "آئین رہنمونی" سے لگایا جا سکتا ہے، بادشاہ کو راہ نما یا ہادی بنانے کے لئے کس قدر عمدہ الفاظ میں مسئلہ کو پیش کرتا ہے پہلے وہ لوگوں کے مختلف تخیلات اور مختلف العقائد طبقوں کا ذکر کرتا ہے اور بعد میں لکھتا ہے کہ جب کسی قوم کو "خوش قسمتی سے حق پرستی" کا زمانہ قریب آتا ہے تو وہ گنتی کے چند خداوند اہمیت والا پایہ بر راز و نیاز پیشوائے جہان معنی نیز بدنہ بازگردد"، کیونکہ بادشاہ بلا واسطہ "پرتو الٰہی" ہوتا ہے اور اس کا دل "زنقش دوئی" سے صاف ہو جاتا ہے، چنانچہ ہمارے زمانے کے "کشور خدا" کا یہی حال ہے۔ وہ لوگ جو مستقبل کا حال جاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں شروع ہی سے اس بات سے واقف تھے اور اپنے رازداروں کو یہ خوش خبری پہلے ہی سنا چکے تھے لیکن "شہریار دوربین" کچھ عرصہ تک "آئین بیگانگان" کے پردہ میں رہے اور اس سے خود کو آشنا نہیں کیا مگر "یہ کس کی مجال ہے کہ جو ہونا چاہتا ہے اس سے بچ جائے"۔ ابتدا میں تو کچھ ایسی باتیں منہ سے نکل جاتی تھیں جن سے لوگوں کو تعجب ہوتا تھا، لیکن آخر کار ان خیالات میں پختگی پیدا ہو گئی اور وہ مجبور ہو گئے کہ "رہنمونی" کے فرائض انجام دیکر "در ہدایت" کھول دیں اور "دشنت جویائی" کے "تشنہ دلوں" کو سیراب کریں، بعض کو مرید کر لیتے ہیں اور بعض کو روک دیتے ہیں [اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض لوگ خوشامد اور دنیوی فلاح کی غرض سے دین الٰہی میں داخل ہونا چاہتے تھے] لیکن نہ صرف اپنے "فروغ بینش و قدسی انفاس" سے مریدین کو ان مقامات پر پہنچا دیتے ہیں جہاں دوسرے روحانی پیشوا چلوں کے بعد بھی نہیں پہنچا سکے، اس کے علاوہ ایک معجزہ کا ذکر بھی کرتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ بہت سے آدمی پانی کے پیالے نہ لاتے ہوں، بادشاہ پیالہ کو ہاتھ میں

Marfat.com

لے کر سورج کی روشنی میں رکھ کر اس کی درخواست کو قبول کر لیتا ہے اور اس طرح بہت سے مریض جن کو "مسیحا نفس" طبیب بھی اچھا نہ کر سکتے تھے اس "دین الٰہی" طریقہ سے تندرستی حاصل کر لیتے ہیں، اس کے بعد ایک اور معجزہ کا ذکر ہے، ایک سادہ لوح نے اپنی کٹی ہوئی زبان آستانہ والا پر پھینک کر کہا کہ اگر اس وقت جو خیال میرے دل میں ہے یعنی یہ کہ اکبر روحانی حیثیت سے مافوق الفطرت کام کر سکتا ہے تو میری زبان ٹھیک ہو جائے گی وہ دن ختم نہیں ہوا تھا کہ "کامروائے ارزو گشتہ"۔ اکبر خود کبھی دعویٰ نہیں کرتا تھا کہ وہ روحانیت کے اوج کمال پر پہنچ گیا ہے، بلکہ اس سلسلہ میں اپنی کم مائگی کا ذکر بھی کر دیتا تھا۔ ابوالفضل اس کی ارادت اشارہ کر کے کہتا ہے کہ بادشاہ مرید کرنے میں دیر کرتا ہے اور بارہا یہ کہہ چکا ہے کہ میں کامل بنے بغیر دوسروں کی رہنمائی کیسے کر سکتا ہوں لیکن "اگر کسی طالب صادق کی پیشانی پر نشان راستی نمودار ہوتا ہے اور اس کے قلب میں تپش جویائی بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے تو انوار کے روز دنیا کو روشن کرنے والے آفتاب کی روشنی میں وہ اپنی مراد کو پہنچ ہی جاتا ہے اور بادشاہ کی سختی کے باوجود ہزارہا آدمی سلسلہ ارادت میں شامل ہو جاتے ہیں۔

دین الٰہی قبول کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ طالب صادق اپنی دستار ہاتھ میں لے کر سر کو بادشاہ کے قدموں پر رکھتا اور گویا زبان حال سے کہتا کہ میں اپنے بخت کی یاوری اور ستارہ کی رہنموئی سے خود رائی اور خویشتن گزینی کو جو تمام برائیوں کی جڑ ہیں چھوڑ کر عقیدت مندوں میں داخل ہو گیا ہوں اور دائمی زندگی کی تلاش میں میں نے حیات جاوید حاصل کی۔ بادشاہ اس کی پگڑی اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر رکھ دیتا تھا اور اس کو "شست خاصہ" (یعنی زنار یا انگوٹھی) دیتا تھا جس پر "اسم اعظم و طلسم اقدس" "اللہ اکبر" منقش ہوتا تھا۔[1]

---

[1] دیکھو آئین اکبری ص ۱۲۱۔ ۱۲۳

آگ اور سورج کی پرستش بادشاہ کو سجدہ

آئین سیہمونی کی اصل عبارت پر (ترجمہ پر نہیں[۱]) غور کرنے سے بڑی حد تک ابو الفضل کے خیالات اور مقاصد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہ اکبر کو نبی نہیں کہتا کیونکہ خود بادشاہ اس دعوے کے لئے تیار نہ تھا لیکن اس کی ذات کو تقدس، دینی ہدایت، عقل و فہم اور علم و عرفان کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اس کے لئے سجدہ کا جواز ثابت کرتا ہے، بادشاہ کے سامنے ہر شخص کو کورنش و تسلیم بجا لانا ضروری تھا، اس کا طریقہ یہ تھا کہ سیدھے ہاتھ کی پشت کو زمین پر رکھ کر اس پر سر رکھا جاتا، بعد میں سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تسلیم کرنے والا کھڑا ہوتا، لیکن "بندگان ارادت" سجدہ کرتے جس کو وہ "سجدہ ایزدی" کہتے تھے، یہ سجدہ سب پر لازمی نہیں کیا گیا تھا، ابو الفضل لکھتا ہے:-

> چونکہ کج رائے اور تیرہ دل افراد اس رسم کو انسان پرستی خیال کرتے ہیں اس لئے شہریار کارشناس نے بے خردوں کو اس سے معاف کر دیا ہے اور دربار عام میں تو مخصوص مقربین کے لئے بھی سجدہ ضروری نہیں لیکن انجمن خاص میں چونکہ چند بیدار بخت اور روشن مناره حضرات کو بیٹھنے کا حکم ہے اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنی پیشانی کو سجدہ سپاس گزاری سے جلا بخشیں اور چہرہ

---

[۱] ابو الفضل کی عبارت پیچیدہ اور مشکل ہے، الفاظ اور محاورے خاص مطالب کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، ان میں اکثر ذو معنی ہیں، بلاک مین کا انگریزی اور مولوی فدا علی طالب کا اردو ترجمہ باوجود مترجمین کی انتہائی کوشش اور محنت کے تاریخ کے طلباء کو اصل سے بے نیاز نہیں کر دیتے، مصنف کے خیالات اور ان کی اسپرٹ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے خود اسی کی عبارت کا مطالعہ ضروری ہے۔

Marfat.com

بخت مندی کو روشن کریں گے۔[1]

بدایونی کا بیان ہے کہ "سجدہ بہ عبارت زمین بوسی" بادشاہ کے سامنے سب پر لازمی قرار دیدیا گیا تھا[2] یہاں اشارہ اسی طریقہ تسلیم کی طرف ہے جس میں ہاتھ زمین پر رکھ کر پیشانی اس پر رکھی جاتی تھی، بدایونی نے چند اور احکامات و رسوم کا بھی ذکر کیا ہے، شراب کی اجازت تھی، بشرطیکہ مقصد رفاہیت بدنی ہو اور اس سے فساد پیدا نہ ہو چنانچہ دربار کے قریب ہی ایک دکان کھلوادی گئی تھی، داڑھی منڈوانے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور اس کے لئے بہت سی دلائل پیش کی جاتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ اس کی مخالفت صرف فقہاء نادان کرتے ہیں۔ ذبیحہ اور گوشت خوری کی مذمت کی جاتی تھی اور اتوار کے روز جو سورج سے متعلق ہونے کی وجہ سے مقدس خیال کیا جاتا تھا ذبیحہ کو حکماً بند کر دیا گیا تھا سورج کی اس قدر عزت کی جاتی تھی کہ اس کو حضرت نیر اعظم کہا جاتا تھا ۱۵۸۰ء کے بعد اکبر سورج کی پرستش علانیہ طور پر کرتا تھا اور چونکہ آگ کا احترام بھی ضروری ہو گیا تھا، شام کو جب شمع روشن ہوتی تو سارے درباریوں کو ادب کے ساتھ کھڑا ہونا پڑتا تھا خود اس کا قول ہے کہ شمع روشن کرنا درحقیقت سورج کی روشنی کی یادگار ہے۔ محل کے ایک حصہ میں شمع دن رات روشن رکھنے کا حکم دیا تھا، اس کی اس قدر تاکید تھی کہ ایک مرتبہ اتفاقاً اکبر اس کی طرف سے گزرا تو دیکھا کہ شمع بجھی ہوئی ہے اور وہ شخص جو اس خدمت پر مامور تھا سو رہا ہے۔ اکبر کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے وحشیانہ حکم دیا کہ اس کو مینار پر سے نیچے پھینک دیا جائے نیچے گرتے ہی اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔[3] ۱۵۸۹ء میں مہینوں اور دنوں کے ایرانی نام اختیار کئے گئے۔ ابوالفضل کی تصانیف سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

---

[1] آئین کورنش۔ دیکھو آئین اکبری جلد اول ص ۱۲۰۔

[2] بدایونی ص ۲۴۹۔

ایک نئے دین کا قیام

رفتہ رفتہ اکبر کی سرپرستی اور قیادت میں ایک نئے دین کی بنیاد پڑ گئی[1] جس کو مورخوں نے دین الٰہی کا نام دیا ہے، مورخوں میں یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے کہ آیا اکبر اسلام پر قایم رہا یا اس نے نیا دین جاری کیا، یہاں اس کی تفصیلی بحث ممکن نہیں، لیکن اندازہ بدایونی کی اس عبارت سے لگایا جا سکتا ہے:

> تا کار بعد از دہ دوازدہ سال بجائے رسید کہ اکثر مخاذیل چون مرزا جانی حاکم تتہ و دیگر اہل ارتداد خط خود نوشتہ دادند باین مضمون ہذہ صورتہ من کہ فلاں بن فلان باشم بطوع و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدران دیدہ شنیدہ بودم ابراد و تبرا نمودم و در دین الٰہی اکبر شاہی درآمدم و مراتب چہار گانہ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول کردم۔[2]

---

[1] بعض مصنفین کا خیال ہے کہ اکبر نے نیا دین نہیں بلکہ ایک نئے طریقے کی بنا ڈالی دیکھو شیخ محمد اکرام۔ رود کوثر ۱۲۹۔ دیکھو وقایع اسد بیگ۔ (انگریزی ترجمہ الیٹ ڈاوسن جلد ۶ ص ۱۱۴)

[2] بدایونی ص ۲۳۹۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیخ محمد اکرام جانی بیگ کی اس تحریر کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ "یہ تحریر خوشامدی عہدہ داروں کی جدت طرازی تھی اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اکبر کے سب مرید اس طرح کی تحریر لکھ کر دیا کرتے تھے"۔ تعجب ہے کہ مصنف مذکور کی نظر بدایونی کے مندرجہ ذیل الفاظ پر نہیں ۹۸۹ھ کے واقعات شروع کرنے سے پہلے بدایونی لکھتا ہے:۔ "و درین ایام اخلاص با صاحب بر چہار مرتبہ قرار یافت کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد و ہر کس کہ چہار دارد و ہر کس کہ یکی ناردبے داعیہ ہم خود را مرید مخلص درگاہ گرفتند"۔ ص ۲۷۴

Marfat.com

اس کے بعد بدایونی کہتا ہے کہ اس "لعنت نامہ" کو "مجتہد جدید" کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ دین میں داخل ہونے والے کی تربیت کا انتظام کیا جائے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ شعائر اسلام کو نظر انداز کر کے بہت سی وہ رسوم جاری کی گئیں جو شریعت کی نظر میں یا مکروہ یا حرام ہیں، سورج کی پرستش، آگ کا احترام، تناسخ کا عقیدہ، اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں، ان کے علاوہ بدایونی نے بہت سی "اصلاحات" کا ذکر کیا ہے، اسلام کو تقلیدی اسلام کہہ کر مخالفت کی جاتی تھی، یہ امر خاص طور پر قابل غور ہے کہ مریدان خاص سے جن چار چیزوں کی قربانی طلب کی جاتی تھی ان میں دین بھی تھا۔

ان سب باتوں سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ "اکبری طریقہ" یا بقول بدایونی "توحید الٰہی" میں آنحضرتؐ کی رسالت کا کہیں ذکر نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا طریقہ جس میں صرف توحید الٰہی پر زور دیا جائے اور رسالت پر ایمان کو غیر ضروری سمجھا جائے اس کو اسلام کہنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ چنداں اہم نہیں کہ اس کو دین کہا جائے یا طریقہ۔

دین الٰہی کے اعلان کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی اس کا تفصیلی ذکر ایک عیسائی پادری بارتولی نے لکھا ہے، اس کے بیان کے مطابق اس موقع پر عمائد سلطنت مدعو کئے گئے تھے۔ بادشاہ نے پہلے یہ بتلایا کہ ایسی سلطنت میں جہاں مختلف خیالات کے لوگ موجود ہوں اور ان پر حکمرانی ایک ہی شخص کرتا ہو یہ مناسب نہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہوں، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ سب کو ایک کر دیا جائے لیکن اس طرح کہ وہ "ایک" بھی رہیں اور "سب" بھی رہیں اس پر اس نے حاضرین کی رائے طلب کی۔ بارتولی کہتا ہے کہ

ہر برآوردہ لوگوں نے بالخصوص امراء نے جن کا خدا سوائے بادشاہ کے کوئی نہ تھا .... کہا: ہاں۔ بادشاہ آسمان سے بوجہ اپنے رتبہ اور ذہانت کے سب سے زیادہ قریب ہے اس لئے اسی کو چاہئے کہ ساری سلطنت کے لئے معبود، قوانین،

قربانیاں، رسوم اور قواعد وضوابط بناتے اس کے لئے یہ، وہ
کام کرسکتا ہے جو ایک مکمل اور عالمگیر مذہب کے قیام کے لئے
ضروری ہو"[1]

اکبر کی حکومت کے متعلق پادریوں کے بیانات عام طور پر قابل اعتماد نہیں اور ان کو صحیح مان کر کوئی نتیجہ نکال لینا خطرے سے خالی نہیں، لیکن دو وجوہات کی بناء پر بارتولی کا یہ بیان قابل اعتنا ہے، چاہے تفصیلات جو اس نے بیان کی ہیں صحیح نہ ہوں، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بدایونی نے اس جلسہ کا ذکر کیا ہے اور دوسری وجہ یہ کہ اس کا طرز استدلال وہی ہے جو ابوالفضل کی تحریروں میں بار بار کثرت سے ملتا ہے، یعنی صلح کل کی پالیسی. بہرحال بدایونی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ بادشاہی اعلان دین کے جواب میں راجہ بھگوان داس جس سے اکبر کی قریبی رشتہ داری تھی (بھگوانداس کی لڑکی جہانگیر کی بیوی تھی) اور جو یقیناً اس کے معتمدین کی صف اول میں تھا کھڑا ہو گیا اور کہا کہ

"خوش قبول کردم کہ ہم ہندوان بدانند وہم مسلمانان، اما
طائفہ دیگر رائے الشان کیست، بفرمایند تا آنرا قبول دارم"

اکبر یہ سنکر خاموش ہو گیا اور پھر زیادہ اصرار نہ کیا[2] بھگوانداس کے بیٹے مان سنگھ نے اپنے باپ سے بھی زیادہ بہادری اور صاف گوئی کا ثبوت دیا. دسمبر ۱۵۸۷ء میں اکبر نے مان سنگھ کو بہار کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا اور رخصت کرنے سے قبل شب عاشورہ کو اسے خلوت میں بلایا اور امتحان کے طور پر "بہ حرف وحکایت ارادہ درمیان آوردہ"، مان سنگھ

---

[1] بحوالہ اسمتھ، اکبر مغل اعظم ص ۱۵۲

[2] بدایونی لکھتا ہے کہ اس واقعہ کی تاریخ احداث بدعت نکالی گئی۔

Marfat.com

کا جواب قابل غور ہے، اس نے کہا کہ اگر "مریدی" سے مطلب "جان سپاری" ہے تو وہ میں ہتھیلی پہ رکھے ہوئے ہوں لیکن "اگر اس کے علاوہ کچھ اور ہے اور معاملہ مذہب کا ہے تو میں ہندو ہوں اور اگر آپ فرمائیں تو مسلمان ہو سکتا ہوں اور کوئی راستہ میں نہیں جانتا کہ کیا ہے"۔ بادشاہ نے معاملہ یہیں ختم کر دیا اور کچھ نہ کہا[1]

دین الٰہی کی اشاعت اور ترویج کا سلسلہ اکبر کی وفات تک یقینی جاری رہا لیکن یہ بتلانا آسان نہیں کہ اس کے ماننے والوں کی تعداد کہاں تک پہنچ گئی تھی، ابوالفضل کے بیانات[2] سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، یہ بیانات یقیناً مبالغہ آمیز ہیں اور اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ دین الٰہی نے عام مقبولیت حاصل نہیں کی۔ اکبر کے بعد لوگ اس کو بھول گئے۔

---

[1] بدایونی ۲، ۲۶۲-۲۶۳

[2] آئین تنضوفی میں وہ لکھتا ہے کہ "رفتہ رفتہ ہر قسم کے فقیر، سناسی و جوگی و سیوڑہ و قلندر و حکیم و صوفی اور ہر طرح کے اہل سیف و اہل قلم، سوداگر، کسان، وہمیشہ در حاضر ہونے لگے اور ان کی آنکھیں نور آگاہی سے روشن ہو جاتی ہیں"۔ اس قسم کے اشارات اور بھی ہیں۔

Marfat.com

باب یازدہم

دین الٰہی کا ردِّ عمل

دین الٰہی نے بحیثیت ایک نئے دین کے تو رواج نہیں پایا، لیکن اکبر اور ابوالفضل کے رچائے ہوئے اس تماشے نے شریعت کے بند کو توڑ کر الحاد اور بے دینی کی قوتوں کو آزاد کر دیا، وہ طوفان کی طرح بہت جلد ہر طرف پھیل گئیں، علماء و مشائخ کی تحقیر و تضحیک، دین کا استہزاء اور شعائر اسلام کی طرف سے لاپرواہی عام ہو گئیں، اکبر کی روحانی قیادت کا ڈھونگ تو اس کے آخری سانس کے ساتھ ختم ہو گیا اور اس کا نام و نشان تک نہ رہا، لیکن اس دورِ قیادت میں دینی اور سماجی زندگی میں جو شگاف پڑ گئے تھے وہ برابر بڑھتے رہے اور اقدار زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں وہ ترقی کرتی رہیں[1]۔

---

[1] عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ الحاد اور بے دینی کے اس طوفان کا مقابلہ سب سے پہلے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کیا، اس نظریہ پر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تذکرہ میں مفصل بحث کی ہے یہ حیرت ہے کہ انہوں نے معاصر تواریخ کا بغور مطالعہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے پہلے جن لوگوں نے اس طوفان کے لئے اپنی عزت و جان کی بازی لگائی وہ قطعی نظر انداز ہو گئے اور طلبائے تاریخ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

ساتھ ہی ساتھ اسلام میں رخنہ اندازی کی ان کوششوں کا ردعمل بھی شروع ہوگیا۔ تاریخ کے طلباء جانتے ہیں کہ تقریباً ڈھائی سو سال پیشتر مبارک شاہ خلجی کو قتل کر کے جب خسرو خان نے تخت پر قبضہ کیا تھا اور اسلام کی توہین علانیہ کی جانے لگی تھی غازی ملک تغلق نے "بغاوت" کی اور خسرو خان کو سزا دینے کے لئے دہلی پر حملہ کیا لیکن اکبر کے زمانہ میں دربار سے تعلق رکھنے والے علماء اور امراء میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جو بادشاہ کی طرف سے ہونے والے ان حملوں کا مقابلہ کرتے درباری علماء تو کسی بھی معیار کے لحاظ سے بلند کردار نہیں کہے جا سکتے تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ دربار میں اسلام دشمن عناصر کا اثر بہت زیادہ بڑھتا جا رہا ہے اور ان کے امتحان کا وقت قریب آگیا ہے تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے ۱۵۷۹ء کے محضر پر دستخط کرنا درحقیقت ان کی شکست کا کھلا ہوا اعتراف تھا لیکن درباری علماء کو چھوڑ کر دوسرے مقامات پر مسلم رہنماؤں میں کافی بے چینی تھی اور بعض علماء نے اس سلسلہ میں عظیم قربانیاں دیں[1]۔

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) ملت اسلامیہ ہند یہ اس قدر بے حس ہو گئی تھی کہ وہ ان تمام حملوں سے جو اسلام پر کئے جا رہے تھے قطعاً متاثر نہیں ہوتی، مولانا کی عبارت قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں گیا ہندوستان علماء اور مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے ؟ لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔" تذکرہ ص ۲۵۴

[1] بدایونی اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے: ۔۔۔ بدنامی عام گشت و تخم فساد و فتنہ در ولایت پراگندہ گردید۔ اس عبارت سے پہلے اس نے یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی ذات گرامی اور رسالت کو نظر انداز کرکے "التفات تو حید کردند" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔

Marfat.com

بنگال و بہار میں بغاوت

عقائد اور شعائر اسلام پر حملوں کے ساتھ ساتھ "مذہب و ملت نو" کے حامیوں نے علماء و مشائخ پر مظالم و سختی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ۹۸۷ھ کے واقعات میں بدایونی نے لکھا ہے کہ: "علمائے مردم خواندہ بودند و بال و سبب زوال الشان شد" کیونکہ علماء و مشائخ کو اطراف سے بلا کر ان کی مدد معاش کے فرامین کی "در تحقیق می نمودند" اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ "بمقتضائے رائے خویش قدرے زمین مقرر می داشتند"، ان مشائخ کو جو مرید کرتے تھے اور سماع وغیرہ کی محافل منعقد کرتے تھے، ایذاء پہنچانے کی یہ ترکیب تھی کہ ان کو "دوکاندار کہہ کر یا در قلاع می کشیدند یا اخراج بجانب بنگالہ و بکر می نمودند" یہ سلسلہ مستقل تھا اور "صوفیہ صاحب سماع و اہل ذوق"، کے فرامین کو جاری کرنے کی ذمہ داری ہندو مستوفیوں کو سپرد کر دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے چارے "از بدحالی حال فراموش کردند" اور جلاء وطنی کے ڈر سے چھپتے پھرتے تھے۔[1] ان حالات کے پیدا ہو جانے کا نتیجہ ظاہر تھا۔

سب سے پہلے مخالفت کے آثار ملا محمد یزدی قاضی جونپور کے فتوے کی شکل میں نمودار ہوئے اس نے اکبر کے خلاف خروج کا فتویٰ دیا، چنانچہ جونپور سے لے کر بنگال تک یہ آگ پھیل گئی۔[2] اکبری دور کے الحاد کے خلاف بڑے پیمانہ پر سب سے پہلے بنگال میں یہ علم بغاوت بلند ہوا، اس میں شک نہیں کہ اس "بغاوت" کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جاگیروں وغیرہ کے معاملے میں سختی کی گئی تھی لیکن زیادہ غصہ لوگوں کے دلوں میں مذہبی معاملات میں حکومت کی بے جا مداخلت ہی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ "باغیوں" نے اکبر کے بھائی مرزا حکیم سے سلسلہ جنبانی شروع کی اور وہ چاہتے تھے کہ تخت و تاج

---

[1] بدایونی ص ۲۳۰۔

[2] بدایونی ص ۲۲۹

Marfat.com

اس کے سپرد کر دیں، چنانچہ مرزا موصوف کا بھیجا ہوا ایک ملازم روشن بیگ بہار میں معصوم خاں کابلی کے پاس پہنچا، معصوم خاں کابلی نے جس کو اکبر عاصی (گنہگار) کہتا تھا بنگال کے سرداروں سے گفت و شنید کی اور وہاں بھی قاقشال وغیرہ کی سرکردگی میں یہ بغاوت[1] ہو گئی، نظام الدین احمد نے روشن بیگ کی سفارت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

در اوائل این سال (یعنی ۹۸۹ھ) خبر رسید کہ
مرزا محمد حکیم از روئے خط ہائے عاصی کابلی و معصوم
فرنخودی کہ نوشتہ رغبت بہ آمدن می نمودند.....
بعزیمت تسخیر ہندوستان از کابل بر آمد[1]

بنگالی فوجوں کی قیادت بابا خان قاقشال کر رہا تھا. بہار کی فوجیں معصوم خاں کابلی اور عرب بہادر کی سرکردگی میں تھیں[2] شاہی فوجوں کا بھی کچھ حصہ

---

[1] طبقات اکبری ص ۳۴۹ ۔ ابو الفضل بھی جو غصہ میں سرزمین بنگالہ کے لئے لکھتا ہے کہ بہ ہموارہ از ہوائے سفلہ پرور غبار فتنہ برخیزد «یہ روشن بیگ کے آنے اور شورش افزائی اور بدآموزی» کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے. دیکھو اکبرنامہ کلکتہ ایڈیشن جلد ۳ ص ۲۹۰ - ۲۹۲ - بدایونی ص ۲۲۰ -

[2] یہ امر بھی قابل غور ہے کہ روشن بیگ کے قتل پر ہنگامہ آرائی میں تیزی پیدا ہو گئی اور گورنر بنگال مظفر خاں کے محل پر جو غور میں تھا حملہ ہو گیا، اس کو قتل کیا گیا. نظام الدین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ روشن بیگ کے قتل کے بعد ہی قاقشال وغیرہ کی بغاوت کی ابتدا ہوئی. دیکھو طبقات اکبری ص ۳۵۳

Marfat.com

"باغیوں" کے ساتھ ہو گیا تھا۔ ان میں شرف الدین حسین مرزا خاص طور پر قابل ذکر ہے، وہ مظفر خاں گورنر بنگال کے پاس قید تھا "باغیوں" نے اس کو آزاد کرا لیا اور اپنا سردار منتخب کیا، بنگال و بہار کا زیادہ علاقہ حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اکبر نے راجہ ٹوڈرمل کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج "بغاوت" فرو کرنے کے لئے روانہ کی اور بعد میں کمک اور روپیہ بھی اس کو بھیجتا رہا، لیکن ٹوڈرمل کی ہمت کھلے میدان میں جنگ کرنے کی نہ ہوئی، وہ مونگیر میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا، اس عرصہ میں باغیوں کا زور برابر بڑھتا رہا، اسی زمانہ میں اور یقیناً سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت[1] مرزا محمد حکیم نے پنجاب کا رخ کیا اور لاہور تک باسانی آ گیا، لاہور میں راجہ مان سنگھ حاکم تھا، اس نے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کی تیاریاں کیں، مرزا حکیم کو جب خبر ملی کہ شاہی افواج اس کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو چکی ہیں تو وہ لاہور سے واپس چلا گیا۔

علماء و مشائخ پر سختیاں

مرزا حکیم کے خلاف روانہ ہونے سے پہلے اکبر نے مسلمانوں کے رہنماؤں سے بدلہ لینے اور ان کی قوت و اثر کو ختم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ملا محمد یزدی قاضی جونپور اور معز الملک کو کسی بہانہ سے فتحپور سیکری طلب کیا گیا، وہ ابھی آگرہ پہنچے بھی نہ تھے اور فیروزآباد ہی میں تھے کہ حکم دیا گیا کہ ان کو کشتی میں بٹھلا کر دریا کے راستہ سے گوالیار پہنچا دیا جائے۔ فوراً ہی "حکم دیگری رسد کہ ایں ہر دو را ضایع سازند..... آخر در قعر آب بلا جان می گویند تا کشتی عمر ایں ہر دو را در گرداب فنا غرق می سازند"

---

[1] بدایونی نے صاف لکھا ہے: "مرزا محمد حکیم از روئے طلب معصومین...... متوجہ تسخیر ہندوستان گردیدہ" ص ۲۳۴

Marfat.com

اس کے چند ہی روز بعد قاضی یعقوب کو بنگال سے بلوا کر ان کے پیچھے بھیجا اور ختم کرا دیا، کیونکہ بنگال کی "بغاوت" میں وہ بھی شریک تھے۔ بدایونی اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک ایک کر کے ان سب علماء کو جن پر "بے اخلاصی" کا شک ہو سکتا تھا "در نہاں خانہ عدم می فرستادند" اس کے بعد علمائے لاہور پر مظالم توڑے گئے، ان میں سے اکثر کو جلاوطن کر کے دور دور مقامات پر بھیج دیا گیا۔ بدایونی نے چار نام ظاہر کئے ہیں[1]۔ لیکن اس کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعداد زیادہ تھی، علماء کے علاوہ مشائخ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا، ان کو دربار میں طلب کیا جاتا تھا اور ان

---

[1] قاضی صدر الدین لاہوری کو بھروچ کا اور ملا عبد الشکور کو جونپور کا قاضی بنا کر بھیجا ملا محمد معصوم کو بہار اور شیخ منور کو مالوہ روانہ کیا گیا۔

بدایونی نے ایک اور عالم حاجی سرہندی کا ذکر کیا ہے جس نے رشوت لے کر بہت روپیہ جمع کر لیا تھا، اس کو بھی بغاوت کے شبہ میں طلب کر لیا گیا، لیکن دربار میں پہنچ کر اس نے بادشاہ کی خوشامد میں بزرگان دین کے خلاف رسالہ لکھا اور شیخ ابن عربی کے حوالہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی "کہ صاحب زمان زنان بسیار خواہد داشت و ریش تراش خواہد بود وصفتی چند کہ در خلیفۃ الزمان بود درج کرد و بادے بہ عنایت آمد در سلک باریافتگان پایہ قرب در آوردند" لیکن چونکہ حاجی ابراہیم کی ابوالفضل سے نہیں بنی اول اکبر کو رنتھنبور میں قید کر دیا گیا ۹۹۴ھ میں وہیں وہ مر گیا۔ حاجی ابراہیم کا واقعہ بہت اہم ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کی خوشامد کے باوجود اسے سزا دی گئی، صرف اس لئے کہ وہ ابوالفضل کے مقابلہ میں آ گیا تھا۔ دیکھو بدایونی ص ۲۲۶

Marfat.com

پر سختیاں کی جاتی تھیں، بعض تو اپنا رویہ خوشامدانہ کر لیتے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح جان بچاتے، پنجاب کے ایک بزرگ شیخ منتھی پیدل چل کر فتحپور آئے لیکن دربار کی حاضری سے بچنے کے لئے انہوں نے اکبر کے پاس پیغام بھیجا کہ ان کی ملاقات کسی بادشاہ کے لئے مبارک ثابت نہیں ہوئی۔ توہم پرست بادشاہ نے بغیر ملاقات کے ان کو واپسی کی اجازت دیدی۔ شیخ اللہ دیا خیر آبادی توکل کی زندگی بسر کرتے تھے ابتدائی زندگی درس و تدریس میں گذری تھی اور یہ سلسلہ اس قدر وسیع تھا کہ "بسیار دانش مندان صاحب کمال انند وارث ماندہ اند" لیکن کچھ مدت کے بعد اس کو ترک کر کے "طریقۂ صوفیا" اختیار کیا اور "ذوق سماع و حالت وجد" میں رہنے لگے، اہل دنیا حشمت وجاہ سے پرہیز کرنے لگے، یہاں تک کہ کسی کے گھر کھانا کھانے بھی نہیں جاتے تھے۔ کسی بادشاہ سے انہوں نے کوئی زمین قبول نہیں کی لیکن ان کو بھی نہیں بخشا گیا۔ حسب الطلب دربار میں حاضر ہوئے، بادشاہ نے بہت عزت کی مگر شیخ نے کان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ اونچا سنتے ہیں، چنانچہ ان کو بھی واپسی کی اجازت مل گئی [1] لیکن علماء کی طرح مشائخ میں بد نام کنندہ نکونامے چند کی کمی نہ تھی بدایونی ایسے علماء و مشائخ کو "اسافل و اراذل عالم نما و جاہل" کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ خوشامد کے طور پر ان لوگوں نے اکبر کو یقین دلایا تھا کہ وہ "صاحب زمان" ہے اور مسلم و ہندو کے فرق کو مٹانے والا ہے، ایک صاحب نے یہ دعوی کیا کہ سنہ ۹۹۰ھ میں ایک شخص باطل کو مٹا کر دین حق قائم کرے گا۔ دوسرے صاحب نے ایک رسالہ لکھا کہ مہدی موعود کی پیدائش کا وقت یہی ہے یعنی اکبر ہی مہدی موعود ہے، ان

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۷۸

Marfat.com

حالات نے بادشاہ کو دعوائے نبوت پر تیار کر دیا، لیکن یہ دعویٰ نہ بلفظ نبوت بلکہ بعبارت" تھا۔[1]

مطلق العنان حکمران کے خلاف اور پھر اسی کی سلطنت میں رہ کر حق کی خاطر ایسی بات کا اعلان کرنا یا ایسا عمل کرنا جو براہ راست اس حکمران کے احکامات کی خلاف ورزی پر مشتمل ہو بے حد مشکل ہے لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، بعض حضرات نے یہ ہمت دکھلائی۔ اکبر کے عہد میں شاہی آداب یعنی کورنش و تسلیم کے جو طریقے جاری کئے گئے تھے وہ اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف تھے، چنانچہ کچھ بزرگوں نے کھلم کھلا ان کی خلاف ورزی کی، حاجی ابراہیم محدث عبادت خانہ میں طلب کئے گئے اور آئے، مگر "بہ مراسم تکلفات و آداب ملوک مقید نہ شد"۔[2]

ایک دوسرے بزرگ شیخ عارف حسینی تھے جو جادہ شریعت قویم مستقیم پر ہونے کے علاوہ ریاضت و مجاہدہ میں بھی کمال رکھتے تھے، نان جوین اور گیاہ تلخ کے علاوہ کچھ نہیں کھاتے تھے اور دربار میں خاص ابوالفضل کے دروازہ کے قریب اذان دیتے۔[3] بادشاہ پر ان کے تقویٰ کا بہت اثر تھا اور وہ ان سے کہا کرتا تھا کہ نذر کے طور پر روپیہ یا جاگیر قبول کریں لیکن وہ یہی جواب دیتے تھے کہ اپنے ہمدیوں کو دوزخ کا حال اچھا نہیں میں کیا کروں گا۔[4]

---

[1] بدایونی ص ۲۳۳

[2] بدایونی ص ۲۲۲ نیز مولوی سعید احمد مارہروی، بوستان اخیار ص ۳۶، تذکرہ علمائے ہند ص ۲ [3] بدایونی کے الفاظ یہ ہیں: "در پنج وقت اذان در عین پیش خانہ شیخ ابوالفضل بہ دربار بادشاہی می گوید" اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اذان دینا جرم تصور کیا جاتا تھا۔ [4] حالات کے لئے دیکھیے بدایونی ۲۹۹۔

ایک اور بزرگ شیخ حسین اجمیری تھے، وہ درگاہ اجمیر کے متولی تھے ان کو حج کے لئے جانے کا حکم ہوا، واپسی پر وہ فتحپور آئے اور دربار میں حاضر ہوئے لیکن وہ شرائط آداب کہ نوعذرخواہان نو مسلم و نو مریدان نو دولت حالا قرار داده اند ازو بوقوع نیانجامید اس پر بے اخلاصی ؟؟ کے شبہ پر ان کو بھکر میں قید کر دیا گیا۔[1]

اودھ کے ایک بزرگ شیخ نظام الدین امیٹھی وال شیخ معروف چشتیؒ کے خلفاء میں تھے، وہ جمعہ کی نماز سے پہلے ظہر کی نماز باجماعت پڑھتے اور خطبہ میں بادشاہ کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اس عہد میں جبکہ خطبہ میں بادشاہ کا ذکر ضروری خیال کیا جاتا تھا شیخ نظام الدین کا یہ طرز قابل ذکر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ بادشاہ کو مسلمان بادشاہ کا رتبہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔[2]

مندرجہ بالا واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے سولھویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں مذہبی زندگی کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے، اسلامی معاشرہ اور حکومت دونوں کی بنیادی خصوصیت شریعت کا احترام اور اس کے احکام کی پابندی تھی، بادشاہ سے لے کر فقیر تک ہر شخص خود کو اس کا پابند سمجھتا تھا، مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات کے علاوہ رسول اللہؐ کی زندگی کے واقعات اور آنحضرتؐ کے ارشادات جس تفصیل اور احتیاط کے ساتھ جمع اور محفوظ کئے ہیں اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اس کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ وہ اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی بنیادیں قرآن اور سنت پر رکھنا چاہتے تھے، قرآنی اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں رسول اللہؐ کی زندگی اور اقوال کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، اس میں شک نہیں کہ آیات قرآنی کے مطالب

---

[1] مفصل حالات کے لئے دیکھو بدایونی ص ۳۰۸

[2] حالات کے لئے دیکھو بدایونی ص ۲۸۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۰

Marfat.com

اور احادیث کے استناد وغیرہ میں ہمیشہ زبردست اختلافات رہے، لیکن اس بنیادی اصول کے خلاف کبھی بغاوت نہیں کی گئی کہ اسلامی معاشرہ میں اجتماعی و انفرادی زندگی کا سرچشمہ شریعت ہی ہے، جب کبھی بھی کسی فرد نے اس کی خلاف ورزی کی اس کی مذمت کی گئی، چاہے اس کی شخصیت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔

شیخ مبارک اور مخدوم الملک

اکبر کے عہد حکومت کے ابتدائی دور میں شرعی قوانین کے نفاذ کی ذمہ داری مخدوم الملک اور ملا عبد النبی صدر الصدور کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں سخت متعصب تھے اور اپنی خود رائی اور نخوت کی وجہ سے وہ کسی طبقہ میں ہر دلعزیز نہ تھے، لیکن چوں کہ ان کے فرائض نہایت اہم تھے لوگ ان سے کھلم کھلا بغاوت نہیں کرتے تھے۔[1] اس میں ذرا شک نہیں کہ اپنے بلند عہدوں سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ جس طریقہ سے اپنی ذات اور اقتدار کو ناجائز حد تک بلند کرنے کی کوشش کرتے تھے وہ کسی کو بھی پسند نہ تھا۔ مخدوم الملک کی زندگی کا ایک بہت اہم واقعہ ہم کو ذخیرۃ الخوانین میں ملتا ہے جو بادی النظر میں بہت معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن اس پر بہ نظر عمیق

---

[1] عبد القادر بدایونی خود بھی کٹر سنی تھا لیکن اس کے بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے کردار اور کارناموں سے ان کا ہم عقیدہ طبقہ بھی مطمئن نہ تھا، مثلاً مخدوم الملک کی تعریف کرتا ہے کہ ترویج شریعت میں "سعی بلیغ می نمود"، اور "در عربیت و اصول و فقہ و تاریخ و سائر نقلیات صاحب تصانیف لائقہ رائقہ است۔ از آن جملہ کتاب عصمت الانبیاء و شرح شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم مشہور است"، لیکن ساتھ ہی بے سنی متعصب بھی کہتا ہے۔ دیکھو ص ۳۰۴

Marfat.com

غور کرنے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برصغیر کی تاریخ میں وہ انقلابی نتائج کا حامل ہوا۔ ابوالفضل کا ذکر کرتے ہوئے شیخ فرید بھکری لکھتے ہیں:۔

"روزے شیخ مبارک باہر پنج پسر نزد مخدوم الملک و شیخ عبدالنبی صدر الصدور رفتہ اظہار عسرت معیشت خود نمودہ التماس کردند کہ اگر یک صد بیگہہ در مدد معاش مرحمت شود از طرف یومیہ خاطر جمع نمودہ بہ افادہ علوم دینی بپردازد، چوں شہرت یافتہ بود کہ شیخ مبارک مذہب امامیہ دارد و پسرانش ہم بدان مرتکب اند و بعضے می گفتند کہ باعتقاد گروہ مہدویہ ہستند مخدوم الملک و شیخ عبدالنبی کہ کمال تعصب در مذہب اہل سنت جماعت داشتند شیخ مبارک را با پسرانش بہ اقبح وجہے از مجلس بدر کردند و گفتند کہ اگر ترا تقویت در معیشت می شود رواج مذہب امامیہ را خواہی داد۔ شیخ فیضی را عرق حمیت در جوش آمدہ گفت کہ اگر شیخ زادہ اصیل و در مذہب صادقہ مستقیم بودے انتقام از شما برآریم کہ در تمام ہندوستان شایع شود"[۱]

فیضی اور ابوالفضل دربار اکبری میں

شیخ مبارک اور اس کے لڑکوں کا جذبہ انتقام ناساعد حالات کی وجہ سے تیز تر ہوتا رہا، یہاں تک کہ فیضی کو شہزادہ سلیم کے مکتب میں آنے کا موقع مل گیا

۱۔ دیکھو ذخیرۃ الخوانین مرتبہ سید معین الحق (کراچی) جلد اول ۶۸-۶۹

Marfat.com

اور وہاں سے وہ دربار شاہی میں پہنچ گیا، کچھ مدت کے بعد جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ابوالفضل کو بھی اس نے اکبر کی خدمت میں پہنچا دیا، دونوں بھائی باکمال تھے۔ ابوالفضل اپنے علم و فضل اور فیضی شاعری کی بدولت بہت چمکے، لیکن دونوں نے اپنے اس جذبہ انتقام کی خاطر جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، شریعت اسلامی پر حملے شروع کر دئے اور ایک حد تک اسلامی شعائر کو مجروح کرنے میں وہ کامیاب ہوئے۔ دونوں نے مل کر رسالت کے خلاف بغاوت کی[1] اور اسلام کی جگہ ایک ایسے دین کو وجود میں لانے کی کوشش کی جس میں نبی کی جگہ بادشاہ کو دی جائے، اس تدبیر سے بمصداق ہم خرما و ہم ثواب، ان کو بادشاہ کی قربت اور دنیوی فلاح بھی حاصل ہوئی اور

---

[1] بدایونی نے (ص ۲۶۷) فیضی کی بے دینی کا بیان بہت سخت الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تفسیر بدنامی دور کرنے کی غرض سے لکھی تھی ورنہ اس کی بے اعتقادی کی کیفیت یہ تھی کہ اس کے اوراق کوچہ سگان ...... از ہر طرف پائمال ساختند، بدایونی نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ فیضی کی وفات سے قبل جب اکبر اس کی عیادت کے لئے گیا تو وہ کتے کی طرح بھونکنے لگا، اس کا منہ سوج گیا تھا اور ہونٹ سیاہ ہو گئے تھے، اس واقعہ کا اکبر نے خود دربار میں ذکر کیا اور وہ حیران تھا کہ ہونٹ اس قدر سیاہ کیوں ہیں، ابوالفضل کا خیال تھا کہ خون کی قے کرنے کی وجہ سے تھے لیکن بدایونی کی نظر میں حضرت ختم المرسلین کی شان میں اس نے جو گستاخیاں کی تھیں ان کے لحاظ سے یہ بھی کم تھا۔ فیضی کو مسلمان کس حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ ان تاریخوں سے ہوتا ہے جو اس کی وفات پر نکالی گئیں، ان میں سے چند یہ ہیں:-

فیضی بے دین چو مرد سال وفاتش فصیح ؛ گفت سگ از جہاں رفتہ بحال قبیح

فیضی نجس دشمن نبوی ؛ رفت و با خویش داغ لعنت برد

سگے بود دوزخی زان شد ؛ سال فوتش چہ سگ پرستے مرد

Marfat.com

اپنے مخالفوں سے بدلہ لینے کا موقع بھی ملا، شاید کہ ایک اور علانیہ طور پر مرتد ہونے سے ان کا منصوبہ ختم ہو جاتا، اس لئے تحریر و تقریر میں ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے یہ معلوم ہو کہ نہ سالکان راہ حقیقت ہیں اور دوسرے دینی رہنما صرف گندم نما جو فروشوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنے منطقی دلائل اور عمدہ شاعری کے ذریعہ سے وہ اکبر کے عقائد بدلنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے، یہاں تک کہ بادشاہ کو شعائر اسلامی سے مکمل طور پر برگشتہ کر دیا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ حقیقتاً وہ بحیثیت بادشاہ کے روحانی پیشوائی کا بھی حق دار اور اہل ہے۔ ایک شخص یا چند افراد کے مرتد ہو جانے سے چاہے ان کی کچھ ہی حیثیت ہو مذہب پر بہت زیادہ اثر نہیں ہو سکتا تھا، لیکن بادشاہ کا بانی مذہب بن کر ایک نئے دین کی تبلیغ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، امرائے دربار اور افسران حکومت بڑی تعداد میں اس سے متاثر ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے طبقے کے لوگ بھی رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگے، دین الٰہی میں کوئی ایسی خوبی نہیں تھی کہ اس کے اصول مقبولیت حاصل کرتے لیکن یہ ضرور ہوا کہ الحاد اور بے دینی، طوفان کی طرح پھیل گئے اور شریعت کا احترام محسوس حد تک گھٹ گیا، اس سلسلہ میں بے محل نہ ہوگا اگر ابوالفضل کے مذہبی عقائد کا ذکر بھی کیا جائے، بعض مصنفین کا خیال ہے کہ ابوالفضل اور فیضی سب کچھ بادشاہ کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد اس خاندان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں وہ لکھتے ہیں:

"بادشاہ کی فرمائش کو اس کی مرضی سے بھی کئی درجہ بڑھا کر بجا لاتے تھے۔"

آزاد کی رائے ہیں:۔

"سب کچھ کرتے ہوں گے اور پھر اپنے جلسوں میں آکر کہتے ہوں گے آج کیا احمق بنایا ہے دیکھا ایک مسخرہ بھی نہ سمجھا۔"

اس میں شک نہیں کہ ان الفاظ میں احمق بنانے کا اشارہ علمائے دربار کی طرف ہے لیکن بادشاہ

Marfat.com

کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ابوالفضل جو دلائل اپنے "زبردست حریفوں" کو احمق بنانے کے لئے پیش کرتا تھا، بادشاہ ان میں سے اکثر صحیح مان کر ان پر عمل کرنے لگتا تھا۔ ان کی نظر میں ابوالفضل وسیع الخیال مسلمان تھا لیکن بعض واقعات کے پیش نظر اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے مثلاً شیخ مبارک کی وفات پر ابوالفضل نے مع اپنے بھائیوں کے ہُبدرا کرایا۔ شیخ محمد اکرام نے رود کوثر میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

مولانا آزاد کے زمانہ میں شعائر اسلامی کی زیادہ پابندی تھی، لیکن آج تو شاید ہُبدرا کرنے کو ابوالفضل کے کفر کا بدیہی ثبوت نہ سمجھا جائے، ایک تو اس فعل کے متعلق بھی ظاہر ہے کہ بادشاہ کی خوشنودی منظور ہوگی، قدیم سے تورانی خاندانوں میں موت کے وقت یہ رسم ہوا کرتی تھی اور اکبر نے اس رسم کو کچھ تو مغلیہ آئین کے خیال سے اور زیادہ تر ہندوانہ رسم کا پاس کر کے دوبارہ تازہ کیا تھا، اس کے علاوہ مانا کہ ہُبدرا شعائر اسلامی کی خلاف ورزی ہے، لیکن کیا یہ اس قدر معمولی اور بنیادی خلاف ورزی ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے والا دائرۂ اسلام سے باہر نکل جاتا ہے؟ آج جبکہ ہندوستان اور ترکی کے بڑے بڑے قائد اور غازی، بغیر کسی بادشاہ کی خوشنودی کے خیال، بلکہ محض مغربی فیشن کی پابندی کے لئے قریب قریب ہُبدرا کئے ہوتے ہیں، شاید ابوالفضل کا جرم گناہ کبیرہ یا کم از کم ناقابل معافی نہ سمجھا جائے۔[1]

---

[1] رود کوثر، اشاعت سوم (۱۹۵۸ء) ص ۱۶۲ - ۱۶۳

Marfat.com

مولانا آزاد نے سجدہ کا ذکر کر کے ابوالفضل پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا ہے اس لئے ابوالفضل کو اس بنا پر دائرہ اسلام سے خارج کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ رود کوثر کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں کہ سولھویں صدی کے ایک "مخلص مسلمان" کا باپ کے مرنے پر سجدہ کرانا اس لئے گناہ کبیرہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ بیسویں صدی میں ہندپاکستان اور ترکی کے مسلم رہنما داڑھی اور مونچھیں منڈواتے ہیں، صاحب رود کوثر نے مسئلہ کے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ جن دو بزرگوں (یعنی قائد اعظم اور اتاترک) کی طرف انہوں نے بلاضرورت اشارہ کیا ہے وہ داڑھی مونچھیں کسی دینی رسم کے طور پر نہیں منڈواتے تھے، سجدہ کو ایک نیک اور دینی کام سمجھا گیا تھا اس کی یہی اہمیت ہے۔ محمد حسین آزاد کے لئے یہ مسئلہ اسی لئے مشکل ہو گیا ہے اور وہ اس کا کوئی حل تجویز نہ کر سکے۔

ابوالفضل کی بے گناہی کے ثبوت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بدایونی نے ایک بات بھی ایسی نہیں لکھی جس سے یہ ظاہر ہو کہ اسلام سے انحراف کی تحریک میں اور اکبر کو گمراہ کرنے کے سلسلہ میں شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں نے پہل کی ہے، کچھ مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں مثلاً سجدہ یعنی زمین بوسی کی رسم کا فتویٰ صوفی تاج الدین اور رنگین کپڑوں کے جواز کا حاجی ابراہیم سرہندی نے دیا ہے۔ واقعات صحیح ہیں لیکن مبارک اور اس کے بیٹوں کی توجہ فروعی احکام سے زیادہ بنیادی اصولوں پر تیشہ زنی کی طرف تھی۔ بدایونی کی یہ عبارت غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ بادشاہ کا قرب حاصل کرنے والے خوشامدی درباریوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

"ناگاہ بیربر حرام زادہ وشیخ ابوالفضل وحکیم ابوالفتح قدم بالا تر نہادہ از دین منحرف ساختند وانکار مطلق وحی ونبوت واعجاز وکرامت وشرایع نمودہ کار را از پیش بردند"۔ (ص ۲۰۵)

Marfat.com

وہ جانتا تھا کہ اگر بادشاہ کا ایمان وحی اور نبوت کے معاملہ میں متزلزل ہو گیا تو پھر چھوٹے موٹے معاملات میں کوئی دقت نہ ہو گی اور یہ ہی ہوا، رسالت کو نظر انداز کر کے بادشاہ کی روحانی قیادت کے لئے راستہ ابو الفضل ہی نے تیار کیا، یہ ہی وجہ تھی کہ خان اعظم عزیز کوکلتاش نے باوجودیکہ اسے ماں میں اسی نے شیخ مبارک اور ابو الفضل کو سفارش کر کے اکبر تک پہنچایا تھا (دیکھو بدایونی ص ۲۰۰) ایسی تاریخ کہی جس سے ابو الفضل کا رسالت کی طرف جو رویہ تھا وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ مصرع تاریخ یہ ہے:-

تیغ اعجاز رسول اللہ سر باغی برید

اس سے ۱۰۱۱ھ تاریخ نکلتی ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ عزیز کوکلتاش اس وجہ سے اکبر سے ناراض ہو کر حجاز چلا گیا تھا کہ اس پر شراب پینے اور داڑھی منڈوانے کے لئے زور دیا جا رہا تھا۔ لیکن آخر عمر میں عزیز بھی دین الٰہی میں داخل ہو گیا تھا۔ اور شاید یہ ہی زمانہ ہو گا جب اس نے خواب میں دیکھا کہ ابو الفضل اس سے کہہ رہا ہے کہ میری وفات کی تاریخ بندہ ابو الفضل ہے، یہ سب واقعات ذخیرۃ الخوانین میں موجود ہیں۔

ذخیرۃ الخوانین میں ایک اور دلچسپ واقعہ کا ذکر ہے کہ ایک روز شاہزادہ سلیم ابو الفضل کے گھر گیا تو دیکھا کہ چالیس کاتب بیٹھے ہوئے قرآن و تفسیر لکھنے میں مصروف ہیں شہزادہ نے بادشاہ سے جا کر کہہ دیا، اکبر کو اس پر غصہ آیا کہ ہم کو دین هنود پر راغب کیا اور خود اسلام پر قائم ہے، یہ بات اس کو اس قدر ناگوار معلوم ہوئی کہ شیخ ابو الفضل کو فوراً دکن روانہ کر دیا گیا، یہاں اس کے طور و طریقے بدل گئے، سب کو خوش کرنے کی کوشش کرتا تھا، لوگوں کو سزائیں نہیں دیتا تھا، راتوں کو چھپ کر درویشوں کی خدمت میں حاضر ہوتا، نذریں پیش کرتا اور یہ التماس می کرد کہ برائے سلامتی ایمان ابو الفضل

دعا بکنند" اس کے علاوہ اکثر سرد آہیں بھرتا اور زانو پر ہاتھ مار کر کہتا تھا
"آہ چہ باید کرد" اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو صرف اتنا کہا جا سکتا ہے:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

لیکن اس واقعہ کو آسانی سے مستند تسلیم نہیں کیا جا سکتا — ذخیرۃ الخوانین کے مصنف نے اس کے بہت مدت بعد اپنی کتاب لکھی، وہ معاصر شاہد نہیں اور اس وقت تک بہت سے قصے مشہور ہو چکے تھے، اس کے علاوہ ابوالفضل کے قتل پر اکبر نے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا، جو اس کا بین ثبوت ہے کہ ابوالفضل کے عقائد میں یا اس کی وفاداری میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

ابوالفضل کو یقیناً اس کا اندازہ نہ تھا کہ وہ الحاد و بے دینی کو عام کر کے ہند پاکستان کے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو کس قدر زبردست نقصان پہنچا رہا ہے، وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ بادشاہ وقت کو "صلح کل" کی جس پالیسی پر وہ چلا رہا ہے وہ مستقبل میں برصغیر کے لئے سم قاتل ثابت ہو گی۔ یہ کیا خوب "صلح کل" تھی کہ جس قوم کی کوششوں سے سلطنت مغلیہ کی تعمیر ہوئی تھی اور جس کا فرد ہونے کی حیثیت سے اکبر کا تخت و تاج پر قبضہ ہوا تھا اسی کے سیاسی وجود اور دینی و سماجی اقتدار کو مٹانے میں ساری کوششیں صرف کر دی گئیں![1]

---

[1] ذخیرۃ الخوانین میں شاہ ابوالمعالی کے ایک خواب کا ذکر ان الفاظ میں ہے:۔
"من از کارہائے بد شیخ ابوالفضل انکار داشتم، شبے در خواب می بینم کہ در مجلس سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام شیخ ابوالفضل را بہ اقبح وجہ حاضر آوردند، آنحضرت می فرمایند کہ این مرد در حیات چند روز مرتکب افعال کریہہ

تاریخ کے طالب علم کو اس سے حیرت ہوتی ہے کہ صلح کل کی پالیسی کے تحت حکومت نے رواداری کا جو طریقہ جاری کیا تھا، اس کا فائدہ صرف غیر مسلم طبقات اور افراد تک محدود تھا، اسلام کے ساتھ رواداری کی بجائے تشدد کا طریقہ برتا جاتا تھا۔

---

۴۴ شده۔ اما فضل حق را پایانے نیست، این مناجات سبب نجات اعمال سیہ او گردید، کہ مطلعش اینست کہ "الٰہی نیکان را بہ وسیلہ نیکی سرافرازی بخشی و بداں را بمقتضائے کرم خود دلنوازی کنی" حضرت سرور عالم جبۂ مبارک را برروئے شیخ انداختہ در مجلس نشانزدند" ۲۲۶۔۷

شیخ فرید نے کہا ہے کہ شاہ ابوالمعالی کے خواب کو غلط سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ٹھیک ہے اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فضل اور کرم بے پایاں ہیں لیکن رسول اللہ[ؐ] کے ارشادات، افعال کریمہ اور اعمال سیئہ ان ہی واقعات کی طرف تو اشارہ کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کے اقتباس میں کیا گیا ہے۔

Marfat.com

باب دوازدہم

جہانگیر و شاہجہاں

۱۶۰۵ء — ۱۶۵۷ء

جہانگیر کی تخت نشینی

شہزادہ سلیم ۳۰ اگست ۱۵۶۹ء کو پیدا ہوا[1]۔ اس کی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام کیا گیا، چنانچہ فارسی و ترکی زبانوں میں اس نے خوب مہارت حاصل کرلی، ہندی نظم سے بھی اس کو دلچسپی تھی، تاریخ، جغرافیہ نباتیات اور حیوانیات سے بھی اس کو بہت شغف تھا اس کی شہادت ہم کو توزک جہانگیری کے صفحات میں ملتی ہے، مصوری کی سرپرستی اور اس میں غیر معمولی دلچسپی کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ شکار اور جسمانی ورزش اس کی تفریحات میں شامل تھیں، اٹھارہ سال کی عمر میں ایک نوکر نے جہانگیر کو شراب پلاکر اس کو یہ عادت ڈلوادی، یہ کمزوری برابر بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وہ اس قدر عادی ہوگیا کہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا

---

[1] سلیم کی ولادت کی خوش خبری اور اس کے لئے دعا شیخ سلیم چشتیؒ نے کی تھی، شیخ کی خدمت میں اکبر کی حاضری اور ان سے لڑکے کی پیدائش کے لئے دعا کرنے کا واقعہ توزک جہانگیری کے مقدمہ میں موجود ہے۔

Marfat.com

تھا، سلیم ابھی دس سال کا بچہ تھا کہ اکبر کا دربار مذہبی اختلافات و مباحث کا اکھاڑہ بن گیا چنانچہ اس کا لڑکپن اور عنفوان شباب مذہبی کشمکش کے ماحول میں گذرا۔ لیکن یہ امر باعث حیرت ہے کہ جہانگیر نے اپنے باپ کی بڑھتی ہوئی اسلام دشمنی کا اثر نہیں لیا۔ اکبر کی عمر کے آخری دور میں باپ اور بیٹے کے تعلقات سخت کشیدہ ہو گئے تھے۔ بعض مورخوں کی رائے ہے کہ اس کشیدگی کا ایک بڑا سبب مذہبی عقائد کا اختلاف تھا۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اکبر اور شہزادہ سلیم کے تعلقات خراب کرنے میں ابوالفضل کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ابوالفضل یہ نہیں چاہتا تھا کہ اکبر کے بعد سلیم تخت پر بیٹھے۔ وہ اکبر کو ہمیشہ اس کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ سلیم اس کو برداشت نہیں کر سکا۔ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ پر ابوالفضل کا بہت زیادہ اثر ہے اس لئے اس نے ابوالفضل کو دکن سے واپسی پر نرسنگھ بندیلہ سے ۱۶۰۲ء میں قتل کرا دیا۔[1] ابوالفضل کے بعد بھی سلیم کے لئے تخت شاہی تک پہنچنے میں کچھ دشواریاں تھیں، جوں جوں اکبر کا آخری وقت قریب آتا جاتا تھا جانشینی کا مسئلہ زیادہ اہم ہوتا جاتا تھا۔ دربار میں اب بھی بعض امراء تھے جو سلیم کے خلاف سازش کرتے تھے۔ اس وقت سلیم کا سب سے بڑا رقیب خود اس کا نوجوان بیٹا خسرو تھا۔[2] اس کے دل

---

[1] اکبر کو ابوالفضل کے قتل سے بہت صدمہ ہوا۔ اس نے یہ خبر سن کر کہا اگر سلیم کو تخت کی ضرورت تھی تو مجھ کو قتل کرنا چاہئے تھا۔ ابوالفضل کا سر سلیم کو بھیج دیا گیا تھا۔ غالباً اس شعر میں جو اس موقع پر اکبر نے پڑھا اسی کی طرف اشارہ تھا۔ شعر یہ تھا:

شیخ ما از شوق بے حد چون سوئے ما آمدے ❊ ز اشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدے

دیکھو ذخیرۃ الخوانین جلد اول ص ۔۔

[2] خسرو کی عمر اس وقت سترہ سال تھی۔

میں یہ خیال بٹھلا دیا گیا تھا کہ بہت سے امراء اس کے باپ کے خلاف تھے اور وہ اس کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے، ان میں خان اعظم عزیز کوکہ اور راجہ مان سنگھ قابل ذکر ہیں، دونوں صف اول کے امراء میں تھے اور اکبر کے عزیز ترین دوستوں میں سمجھے جاتے تھے، یہ بھی صحیح ہے کہ اکبری دور کی فتوحات اور کارناموں میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا، خسرو سے دونوں کا بہت قریبی رشتہ تھا، وہ مان سنگھ کا بھانجا اور خان اعظم کا داماد۔ دونوں نے سلیم کو گرفتار کرنے کا منصوبہ تیار کیا، لیکن اس کی خبر اُس کو مل گئی اور وہ عمل میں نہیں آیا، خان اعظم اور مان سنگھ نے دیکھا کہ ان کی سازش کا راز کھل گیا تو انہوں نے علانیہ طور پر خسرو کی حمایت شروع کردی، اور سربرآوردہ امراء کو طلب کرکے اپیل کی کہ خسرو کی جانشینی تسلیم کرلیں، لیکن ایک جماعت نے سخت مخالفت کی اور جلسہ بغیر کوئی فیصلہ کئے ختم ہو گیا۔ نواب شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری اس گروہ کی رہنمائی کر رہے تھے اور جلسہ ختم ہونے کے بعد انہوں نے ہی جا کر سلیم کو بادشاہ ہونے پر مبارکباد دی تھی[۱] جب سلیم کو یقین ہو گیا کہ وہ تخت کا وارث ہو گا تو وہ اکبر کے پاس گیا۔ بادشاہ کا آخری وقت تھا لیکن اس نے آنکھیں کھولیں اور امراء سے اشارہ کیا کہ عمامہ اور تلوار جہانگیر کو دیں اس کے بعد اس کی آنکھیں ہمیشہ کے واسطے بند ہو گئیں، ایک ہفتہ بعد یعنی ۲۴ راکتوبر ۱۶۰۵ء کو شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھا اور جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔

ابھی جہانگیر کو تخت پر بیٹھے ہوئے زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ شہزادہ خسرو نے علم بغاوت بلند کیا، وہ آگرہ سے بھاگ کر پنجاب کی طرف چلا گیا، اس کے ساتھ کافی تعداد میں فوج تھی، چنانچہ جہانگیر کو تعاقب میں جانا پڑا۔ بھیروال کے قریب جنگ ہوئی خسرو

---

[۱] دیکھو ذخیرۃ الخوانین۔ ذکر شیخ فرید بخاری۔ ص ۱۲۴-۲۸)

Marfat.com

نے شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا. جہانگیر کے حکم سے اس کی آنکھوں پر کٹوریاں باندھ دی گئیں اور اس کو حراست میں رکھا گیا۔

عہد جہانگیر میواڑ کی فتح

جہانگیر کا بائیس سالہ دورِ حکومت (۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷ء) جنگی فتوحات کے لحاظ سے بہت زیادہ کامیاب نہیں کہا جا سکتا، لیکن چند واقعات اپنی اہمیت کی بنا پر ذکر کرنے کے قابل ہیں۔ اس عہد کا یادگار کارنامہ میواڑ کی فتح ہے، اکبر کے زمانہ میں وہاں کے راجہ نے مغلیہ حکومت کا اقتدار تسلیم نہیں کیا تھا، اس کے علاقہ کا بڑا حصہ سلطنت میں شامل ہو گیا تھا، لیکن رانا پرتاب دور افتادہ مقامات میں پناہ لیتا پھرتا تھا۔ ۱۵۷۶ء میں مان سنگھ کی سرکردگی میں مغلیہ فوج نے رانا پرتاپ کو ہلدی گھاٹ کے قریب ہزیمت شکست دی لیکن رانا بچ نکلا اور اس طرح میواڑ کا قضیہ ختم نہ ہو سکا۔ آخر زمانہ میں اکبر نے شہزادہ سلیم اور مان سنگھ کو میواڑ کے خلاف پھر روانہ کیا، لیکن یہ مہم بھی نامکمل رہی۔

جہانگیر نے تخت پر بیٹھتے ہی میواڑ کی طرف توجہ کی۔ شاہزادہ پرویز رہنمائی کی سرکردگی میں میواڑ کی مہم شروع ہوئی لیکن خسرو کی بغاوت کی وجہ سے فوجوں کو واپس بلانا پڑا۔ ۱۶۰۸ء کے بعد چند سال کے اندر دوسرا سالاروں کو ادھر بھیجا گیا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے میواڑ فتح نہ ہو سکا۔ بالآخر ۱۶۱۳ء میں بادشاہ نے پختہ ارادہ کیا کہ اس مہم کو سر کیا جائے، وہ خود اجمیر میں خیمہ زن ہوا اور شہزادہ خرم (جو بعد میں شاہجہاں کہلایا) کو رانا کے خلاف فوج لے کر روانہ کیا۔ راجپوتانہ میں لڑائی کی دشواریاں، موسم کی سختی اور ریگستانی علاقہ کے سبب بہت زیادہ بڑھ جاتی تھیں، چنانچہ شہروں اور قصبوں پر مغلوں کا قبضہ ہو جاتا مگر دور افتادہ ریگستانی مقامات تک وہ نہ پہنچ پاتے تھے۔ اس مہم کا ذکر جہانگیر نے اپنی تزک میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

Marfat.com

فرزند سعادتمند بلند اقبال سلطان خرم از
جہت نشاندن تھانجات بسیار خصوصاً در جائے
چندکہ بواسطۂ زبونی آب و ہوا و صعوبت مکان گمان
اکثر مردم آن بود کہ در انجا نشستن تھانجات ممکن نہ
باشد و از جہت دوانیدن افواج قاہرہ متعاقب
یک دیگر بے ملاحظہ شدت گرما وکثرت باران واسیر
شدن اہل وعیال اکثر سکنہ آن دیار کار را برانا بنوعے
تنگ ساختہ بود .... [1]

آخرکار رانا نے صلح کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔ رانا شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سر اس کے قدموں پر ڈال دیا، ایک بہت بڑا لعل اور چند ہاتھی اور گھوڑے اور دیگر قیمتی اشیاء نذر گذرانی۔ خرم بھی "بکمال عنایت" کے ساتھ پیش آیا۔ "چنانچہ وقتیکہ رانا پائے آن فرزند را گرفتہ عذر تقصیرات خود می خواست۔ آن فرزند اقبالمند سر او را در بر گرفتہ او را تسلی بنوعے نمودکہ باعث خاطر جمعی او شد۔"

اس کے بعد رانا کا لڑکا کرن آیا اور اس نے بھی شہزادہ کی قدمبوسی کی، رانا کو باعث ضعیفی دربار کی حاضری سے معاف کر دیا گیا۔ اس لئے خرم صرف کرن کو ساتھ لے کر دربار شاہی میں حاضر ہوا، چوں کہ کرن "وحشی طبیعت و مجلس نادیدہ در کوہستان بسر بردہ بود" اس لئے جہانگیر اس پر برابر مہربانیاں کرتا رہا۔ میواڑ کی فتح بہت اہم ہے، یہ راجپوتانہ کی آخری ریاست تھی جو مغلیہ سلطنت میں شامل ہوئی، اب راجپوتانہ

---

[1] توزک جہانگیری ص ۱۳۳

Marfat.com

کے وسیع علاقہ میں کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو مغلیہ اقتدار حکومت کی حدود سے باہر ہوتا

مغل فتوحات کا راجپوتوں پر اثر

ہندو معاشرہ میں راجپوتوں کو ایک مخصوص اور نمایاں مقام حاصل تھا وہ نہایت بہادر قوم تھی اور حکومت اور جنگ کے فرائض اسی کے ذمہ تھے۔ مسلم فاتحین بالخصوص سلطان معز الدین کی آمد کے وقت ان کا اقتدار اور سیاسی اثر اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ سلطان سے ان ہی کو متعدد لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ اس کی فتوحات کے بعد سلاطین دہلی نے راجپوتانہ کے علاقہ پر اپنا اقتدار تو قائم کر لیا لیکن ان کی قوت کا خاتمہ نہ ہو سکا، علاء الدین خلجی کو اس سلسلہ میں کافی کوشش کر کے چتوڑ اور رنتھمبور وغیرہ کی ریاستوں کو زیر کرنا پڑا تھا۔ سولھویں صدی میں راجپوت راجاؤں کی قوت پھر بڑھ گئی، بابر اور بعد میں اکبر کو ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ اکبر کے زمانہ میں بھی میواڑ نے مغلیہ اقتدار تسلیم نہ کیا۔ چنانچہ جہانگیر کو جنگ کرنے کی ضرورت پڑی۔ اکبر کی فتوحات کے بعد مغلیہ حکومت نے راجپوت خاندانوں سے روابط بڑھانے اور متعدد راجپوت سرداروں اور فوجی دستوں کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ اکبر کے زمانے سے عالمگیر کے عہد تک راجپوت راجہ اور سردار مغلوں کی طرف سے لڑتے رہے۔ ان میں سے بعض مثلاً مان سنگھ اور جے سنگھ نے بہت شہرت حاصل کی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بحیثیت ایک بہادر اور خودمختار قوم کے راجپوتوں کی تاریخ میواڑ کی شکست کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اس قوم کا انحطاط برابر بڑھتا رہا اور اٹھارویں صدی میں راجپوتانہ مرہٹوں کی لوٹ مار کے لئے ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا تھا۔

نور جہاں

جہانگیر کے عہد حکومت کا ایک اہم باب اس کی نور جہاں سے شادی ہے۔ اس کی اہمیت کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہانگیر و نور جہاں کی محبت نے افسانوی شہرت حاصل کر لی ہے۔ کسی تاریخی شخصیت کا افسانوی ہیرو بن جانا

Marfat.com

اس کی انتہائی بدقسمتی ہے، ایک دفعہ جو ہیرو بنا اُس کی اصلی شخصیت افسانوں میں گم ہوگئی، جہانگیر بھی ان ہی بدقسمتوں میں ہے، نہ معلوم کیا کیا لغو واقعات اس کی اور نورجہاں کی محبت کو دلچسپ بنانے کے لئے ایجاد کئے گئے ہیں، من جملہ ان کے جہانگیر پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ اس نے نورجہاں کے شوہر شیر افگن کو قتل کرا کر اس کو اپنے دربار میں بلایا اور شادی کی، تاریخ کے طلباء تو یہ جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ افسانہ ہے لیکن بہت سے لوگ اب بھی ایسے ہیں کہ حقیقت سے بے خبر ہونے کے باعث ان قصوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔

نورجہاں کا باپ مرزا غیاث اپنے آبائی وطن خراسان کو چھوڑ کر ہندوپاکستان بغرض روزگار آیا تھا، راستہ میں جب غیاث کا قافلہ قندھار میں تھا تو اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی (۷۷ھ ۱۵۷۶ء) یہاں اس کو دربار میں رسائی کا موقع مل گیا اور کچھ عرصہ بعد اس نے ترقی کر کے منصب سہ ہزاری حاصل کیا۔ مہرالنساء (نورجہاں کا اصلی نام یہی تھا) کی شادی ایک نوجوان افسر علی قلی استاجلو[1] کے ساتھ ہوگئی۔ اکبر نے استاجلو کو شہزادہ سلیم کے اسٹاف پر مقرر کر دیا، مگر کچھ عرصہ بعد جب سلیم نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تو علی قلی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے استاجلو کا قصور معاف کر دیا اور بردوان میں اس کو جاگیر دیکر وہاں جانے کی اجازت دیدی، دو سال بعد استاجلو پر باغیوں سے ہمدردی رکھنے کا شبہ ظاہر کیا گیا، اس پر جہانگیر نے گورنر قطب الدین کو تحقیقات اور ضروری کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ جہانگیر کو یہ سنکر غصہ آیا کہ علی قلی خاں باوجودیکہ اس کی خطا ایک مرتبہ معاف کی جاچکی تھی پھر بغاوت کا خیال کر رہا تھا، اس نے

---

[1] علی قلی کو ایک شیر مارنے پر شہزادہ سلیم ہی نے شیر افگن کا خطاب عطا کیا تھا۔ دیکھو تزک جہانگیری ص ۴۴

Marfat.com

اس واقعہ کا ذکر توزک میں ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"از انجا اخبار رسید کہ امثال این فتنہ جویان را برین ولایت گذاشتن لایق نیست"

بہرحال قطب الدین خود کچھ آدمی لے کر بردوان پہنچا، علی قلی کو قطب الدین کی طرف سے بدگمانی ہو چکی تھی، چنانچہ اس نے حملہ کر دیا، قطب الدین پر مہلک زخم لگے لیکن اس کے آدمیوں نے شیر افگن کو ختم کر دیا، چونکہ "قطب الدین کوکہ بمنزل فرزند عزیز دسیادر دیار یگجہت من بود" اس لئے ظاہر ہے کہ جہانگیر کو بے حد صدمہ ہوا اور نہایت غصہ میں علی قلی کے متعلق لکھتا ہے کہ "بجہنم فرستادند" علی قلی کے مرنے کے بعد مہر النساء مع اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کے آگرہ آگئی اور سلطان سلیمہ بیگم کی خدمت میں رہنے لگی۔ کئی سال بعد یعنی ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے نورجہاں کو ایک میلے میں دیکھا اور اس پر عاشق ہو گیا، چنانچہ اسی سال شادی ہو گئی، جہانگیر کا نورجہاں سے ابتدائی عمر میں عشق کرنا، اکبر کا ان کی شادی کے لئے راضی نہ ہونا، بالآخر جہانگیر کا شیر افگن کو قتل کرا کر نورجہاں کو آگرہ بلوانا اور اس کا چھ سال تک شادی کے لئے راضی نہ ہونا، یہ سب واقعات دونوں کی شادی کے پچاس سال بعد کی کتابوں میں نظر آتے ہیں، یہ تو واقعہ ہے کہ شادی کے بعد جہانگیر کو نورجہاں سے بے حد محبت ہو گئی تھی اور موخر الذکر نے امور سلطنت میں کافی دخل حاصل کر لیا تھا۔ بعض اوقات وہ جھروکہ میں بیٹھ کر امراء وغیرہ کو احکامات جاری کرتی تھی۔ جہانگیر کے کچھ سکوں پر بھی اس کا نام تھا[1]۔ نورجہاں کے اثر کی خاص وجہ یہ تھی کہ حسن صورت کے

---

[1] نورجہاں کا نام جن سکوں پر تھا ان کی عبارت یہ تھی:۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور

بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

Marfat.com

کے علاوہ فہم وذکا میں بھی وہ ممتاز تھی، زنانہ لباس وزیب وزینت کی اشیاء، آداب و القاب، اور رسوم وغیرہ میں اس نے خوش آیند تبدیلیاں کیں، عطر گلاب تیار کرنے کا طریقہ ایجاد کیا جس کا ذکر جہانگیر نے توزک میں کیا ہے، اور کہتا ہے کہ افسوس ہے یہ عطر میرے والد کے زمانہ میں نہ تھا، کیونکہ ان کو خوشبوؤں سے بہت دلچسپی تھی[1]۔ ایک سنہری کام کا کپڑا جو اس کے نام پر نور محلی کہلاتا تھا، شادیوں میں استعمال ہوتا تھا، اور پچیس روپیہ کے کپڑے میں دولہا اور دلہن کے جوڑے تیار ہو جاتے تھے، زیورات اور کمروں کے سجانے میں بھی اس کی کچھ اختراعات ہیں تقریباً ایک سو سال بعد خافی خان اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ اعلیٰ طبقوں کی پوشاک وغیرہ کے وہی نمونے رائج تھے جو نور جہاں کے زمانہ میں ایجاد ہوئے تھے، اس کی انتظامی قابلیت سے متعلق ایک دلچسپ قصہ خافی خان ہی نے لکھا ہے۔

ایک مرتبہ جہانگیر نے دیکھا کہ ہاتھیوں پر جھولیں جس کپڑے کی پڑی ہوتی ہیں وہ باہر کا برآمد کیا ہوا تھا، اور اس پر بہت عمدہ کام ہو رہا ہے، اس نے دریافت کہ ان جھولوں پر کیا لاگت آئی ہے۔ خانساماں[2] نے جواب دیا کہ وہ محل سے اس کو ملی ہیں، جہانگیر نے نورجہاں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے یہ جھولیں ان خریطوں کی تیار کرائی ہیں جن میں امراء کے خطوط آتے ہیں۔

یہ اسباب تھے جن کی بدولت جہانگیر پر اس نے بےحد اثر قائم کر لیا تھا، اسی وجہ سے اس نے امور سلطنت میں اس کے دخل کو برداشت کیا، بدقسمتی سے جب نورجہاں کے اختیارات بڑھ گئے اور قوت اس کے ہاتھ میں آ گئی تو وہ مناسب حدود سے باہر ہو گئی، اس نے شہزادہ خرم کے خلاف

---

[1] توزک ص ۱۳۲

[2] یہ بہت بڑا عہدہ تھا، خانساماں کے سپرد محل کے انتظامات وغیرہ تھے۔

Marfat.com

سازشوں کا سلسلہ شروع کردیا، لیکن آخر میں اس کی سازشوں کے باوجود خرم کو جو اپنی فتوحات اور کاردانی کی وجہ سے عوام اور امراء میں مقبول تھا۔ تخت حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔

قندھار و دکن

جہانگیر کے عہد میں مغلوں کو ایک یہ پہنچا کہ قندھار ان کے ہاتھ سے جاتا رہا، قندھار کے معاملہ میں اس زمانہ میں ایرانی اور مغل حکومتوں میں زبردست اختلاف تھا، یوں تو دونوں اپنے تعلقات خوشگوار کئے ہوئے یا کم از کم ظاہر یہ کرتے تھے لیکن واقعہ یہ تھا کہ ہر ایک کی خواہش تھی کہ قندھار پر اس کا قبضہ رہے، اکبر کے زمانہ میں قندھار مغلوں کے ہاتھ آگیا تھا لیکن جہانگیر کے زمانہ میں موقع پاکر ۱۶۲۲ء میں شاہ ایران نے اس پر قبضہ کرلیا، اس کا جہانگیر کو بہت افسوس ہوا۔ شاہ عباس نے اپنی اس حرکت پر ایک معذرتی خط لکھا لیکن جہانگیر کو اس سے اطمینان نہ ہوا، وہ چاہتا تھا کہ شہزادہ خرم کی سرکردگی میں قندھار پر حملہ کرنے کے لئے فوج بھیجے مگر خرم اس کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں نورجہاں اس کی تخت نشینی کے خلاف کوشش کرے گی، دکن میں بھی جہانگیر کی کوششوں کے باوجود کوئی خاص کامیابی مغلوں کو نہیں ہوئی، یہ کہا جاسکتا ہے کہ قندھار کو چھوڑ کر جہانگیر کی وفات کے وقت مغلیہ سلطنت کی حدود تقریباً وہی تھیں جو اکبر نے چھوڑی تھیں۔

شاہجہاں کی تخت نشینی

شہزادہ خرم ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوا تھا، اس کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا اور نہایت قابل استادوں کی نگرانی میں اس نے علوم متداولہ حاصل کئے، اس کے علاوہ اس نے تیراندازی، نیزہ بازی، شہسواری اور شمشیرزنی وغیرہ میں بھی مہارت حاصل کی، اس کی بہادری اور سپہ گری کا اندازہ ان فتوحات سے لگایا جاسکتا ہے جو اس نے شہزادگی کے زمانہ میں میواڑ اور دکن

Marfat.com

میں حاصل کیں۔[1] خرم کی فتوحات اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، لیکن جلد ہی خرم کو معلوم ہو گیا کہ تیزی طبع اس کے لئے بلا ثابت ہو رہی ہے، نورجہاں نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کی جو شیر افگن سے تھی جہانگیر کے چھوٹے لڑکے شہریار سے شادی کر کے یہ کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح اس ہی کو تخت کا وارث کرا دے، جہانگیر پر نورجہاں کا اثر بہت زیادہ بڑھ چکا تھا اور اب اس کی عمر کافی زیادہ ہو چکی تھی اور اس پر ضعیفی کے آثار نمایاں ہونے جا رہے تھے۔ نورجہاں نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور باقاعدہ خرم کے خلاف سازش شروع کر دی۔ لیکن خوش قسمتی سے نورجہاں کا بھائی آصف خان جو خود بہت باثر وزیر تھا خرم کا حامی تھا، کیونکہ اس کی شادی آصف خاں کی لڑکی ارجمند بانو بیگم سے ہوئی تھی۔ جلد ہی حالات اس قدر بگڑ گئے کہ خرم نے بغاوت پر کمر باندھ لی اور باقاعدہ فوج لے کر میدان میں آ گیا۔ شاہی افواج سے اس کی پہلی اور سب سے اہم لڑائی دہلی کے قریب بلوچ پور کے مقام پر ہوئی، خرم کو شکست ہوئی اور اس کو جان بچا کر بھاگنا پڑا، ایک عرصہ تک وہ راجپوتانہ، دکن، اڑیسہ اور بنگال کے علاقوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پر جاتا رہا، آخر میں اس کو ہتھیار ڈالنے پڑے، اپنے دو بیٹے یعنی دارا اور اورنگ زیب کو اس نے بطور ضمانت بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا (۱۶۲۶ء) آئندہ تین چار سال میں نورجہاں کا اثر اور زیادہ بڑھ گیا۔ لیکن آصف خان بھی غافل نہ تھا۔ ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کشمیر میں تھا کہ اس کی حالت خراب ہونے

---

[1] ایک مرتبہ شکار میں ایسا اتفاق ہوا کہ شیر نے پارٹی کے ایک رکن پر حملہ کر کے اس کے ہاتھ کو منہ میں لے لیا اور اس کو یقیناً مار ڈالتا لیکن شہزادہ خرم نے بڑھ کر شیر کے جنگھاسے پر تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ شیر پلٹ کر گر گیا، اس بہادری پر جہانگیر نے خرم کو انعام دیا اور منصب بڑھایا۔

Marfat.com

لگی، چنانچہ طے کیا گیا کہ لاہور جا کر علاج کرایا جائے۔ صاحب مآثر جہانگیری لکھتا ہے کہ ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بادشاہ گھوڑے کی سواری سے بھی معذور ہو گیا۔ سفر میں بھی حالت بگڑتی ہی چلی گئی، آخر کار ۲۹ اکتوبر کو راجوری کے مقام پر جہانگیر کا انتقال ہو گیا۔

اس کی خبر جوں ہی شہریار کو ملی اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، ادھر آصف خان نے فوری انتظام کے سلسلہ میں خسرو[1] کے بیٹے داور بخش کو تخت کا وارث قرار دے کر اس کا اعلان کر دیا۔ آصف خان اور نور جہاں دونوں جانتے تھے کہ بغیر جنگ کے معاملہ طے نہیں ہوگا اس لئے دونوں نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آصف خان[2] نے فوراً ہی ایک ہرکارہ بھیج کر خرم کو جو اس وقت دکن میں تھا اطلاع کرائی اور ہدایت کی کہ جلد آجائے، اس عرصہ میں شہریار اور داور بخش میں لاہور کے قریب جنگ ہوئی

---

[1] شہزادہ خسرو بہ سلسلہ بغاوت قید کر لیا گیا تھا، خرم جب دکن جا رہا تھا تو اس خیال سے کہ کہیں اس کی عدم موجودگی میں خسرو کوئی فتنہ برپا نہ کرے، اس نے جہانگیر سے کچھ ایسے احکام لے لئے کہ خسرو اسی کی نگرانی میں رہے۔ وہ دکن ہی میں تھا کہ خسرو کو درد قولنج کا دورہ پڑا اور وہ وفات پا گیا، بعض مورخوں نے شاہجہاں کو متہم کیا ہے کہ اس نے اپنے بھائی کو زہر دیکر مروا دیا۔ یہ غلط ہے اور معتبر شہادتیں اس کے خلاف ہیں، تفصیل کے لئے دیکھو راقم الحروف کا مقالہ جو جرنل آف انڈین ہسٹری مدراس میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] نور جہاں چاہتی تھی کہ اپنے بھائی کو دھوکہ سے بلا کر قید کر لے لیکن آصف خان خود بہت سمجھدار تھا، اپنی بہن کے اصرار کے باوجود وہ نہیں آیا۔ کامگار کے الفاظ یہ ہیں:

"نور جہاں بیگم ہر چند کسان بطلب برادر فرستاد، آصف خان عذرہا گفتہ نزد او نرفت"۔ (مآثر جہانگیری قلمی نسخہ ص ۳۴۷)

شہریار کو شکست ہوئی، آصف خاں نے اس کو قید کیا اور دو دن بعد اندھا کرادیا۔

خرم کو آصف خاں کا پیغام ملا تو اس نے شمال کو روانگی کے انتظامات شروع کردئے اور جواب بھیجا کہ وہ فوراً آرہا ہے، وہ دکن سے گجرات اور راجپوتانہ ہوتا ہوا آگرہ کو روانہ ہوا، راستہ میں اجمیر ٹھہر کر حضرت خواجہ بزرگؒ کے مزار پہ اپنی قیام گاہ سے پیدل چل کر مزار پر حاضر ہوا اور درگاہ میں سنگ مرمر کی ایک مسجد تیار کرنے کا حکم دیا۔ ۱۹ جنوری ۱۶۲۸ء کو شاہجہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، بدقسمت داور بخش کو قتل کرادیا گیا۔ آصف خان کے اس طریقہ کار کو اچھا نہیں کہا جاسکتا۔ اس کو داور بخش کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہئے تھا۔ دس روز بعد وہ آگرہ پہنچا اور ۴ فروری کو رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔ تاجپوشی کے سلسلہ میں رسوم اور خوشیوں کا سلسلہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا، ۲۶ فروری کو آصف خان بھی آگرہ آیا اور نئے بادشاہ کی قدمبوسی کا شرف حاصل کیا۔ شاہجہاں نے آصف کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں سلطنت کا سب سے بڑا عہدہ یعنی وکالت اس کو بخشا۔

دکن میں فتوحات

شاہجہاں کے زمانہ میں مغلوں نے دکن کا کچھ علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کیا، یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ جہانگیر کی وفات کے وقت شاہجہاں دکن ہی میں تھا، گذشتہ پچیس سال میں دکن کے مسئلہ نے اتنی اہمیت حاصل کرلی تھی کہ مغلیہ حکومت اب اس کو نظر انداز نہیں کرسکتی تھی، احمد نگر کا قابل وزیر ملک عنبر وفات پاچکا تھا، اس کے بیٹے اور جانشین فتح خان نے مرتضیٰ نظام شاہ دوم کو قتل کرکے تخت پر ایک دس سال کے لڑکے کو بٹھایا اور شاہجہاں کا اقتدار تسلیم کرلیا، لیکن جلد ہی فتح خان اپنے الفاظ سے پھر گیا اور شاہجہاں کو حملہ کرنا پڑا ۱۶۳۲ء میں احمد نگر کا علاقہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوگیا اور فتح خان مغلوں کی ملازمت میں آگیا۔ نوجوان بادشاہ کو گوالیار کے قلعہ میں قید کردیا گیا، بیجاپور کا رویہ بھی قابل اطمینان

Marfat.com

نہیں تھا۔ ۱۶۳۱ء میں شاہجہاں کی فوجوں نے بیجاپور کا محاصرہ کیا لیکن رسد وغیرہ کی دقتوں کے باعث فوجوں کو واپس بلانا پڑا۔[1] دکن کی سیاست میں مرہٹہ سردار شاہ جی بھونسلہ[2] کی وجہ سے ایک اور پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی، احمد نگر کے خاتمہ پر شاہ جی نے نظام شاہی خاندان کے ایک لڑکے کو سلطان قرار دیکر مغلوں کا مقابلہ جاری رکھا۔ شاہجہاں کی طرف سے گول کنڈہ اور بیجاپور کی حکومتوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ شاہ جی کو کسی قسم کی مدد نہ دیں اور خطبہ مغل بادشاہ کے نام کا پڑھوائیں، گول کنڈہ نے اس پر عمل کیا اور خطبہ و سکہ مغل بادشاہ کے نام جاری کر دیا لیکن بیجاپور نے مقابلہ کی تیاری کی۔ مغلوں کو بھی فوجیں روانہ کرنا پڑیں۔ حکومت بیجاپور کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ مغلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ شاہی فوجوں کا ریاست کے مختلف حصوں پر قبضہ ہو گیا۔ جنگ کی تباہیاں ناقابل برداشت ہونے لگیں تو حکومت بیجاپور نے صلح کا پیغام بھیجا۔ ۱۶۳۶ء میں جس صلحنامہ پر دستخط ہوئے اس کی رو سے بیجاپور نے شاہجہاں کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر لیا اور شاہ جی بھونسلہ کی مدد نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے علاوہ بیس لاکھ روپیہ بطور تاوان ادا کیا۔ دکن کے چار مغل صوبوں یعنی خاندیش، تلنگانہ، برار اور دولت آباد پر شہزادہ اورنگ زیب کو گورنر مقرر کیا گیا۔ اورنگ زیب کے سامنے بہت سی مشکلات تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ بادشاہ

---

[1] دکن میں قحط پڑ جانے کی وجہ سے فوجوں کو یہ دقت پیش آئی۔ ایک دوسرا سبب شاہجہاں کا اس مہم کو نامکمل چھوڑ کر آگرہ واپس ہونے کا یہ تھا کہ جون ۱۶۳۱ء میں اس کی محبوب زوجہ ممتاز محل کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمہ کا شاہجہاں پر بے حد اثر ہوا اور وہ برہانپور میں ممتاز محل کو عارضی طور پر دفن کر کے اس کا شہرۂ آفاق مقبرہ تیار کرنے کی غرض سے آگرہ چلا آیا۔

[2] شاہ جی کا باپ ایک مسلم درویش کا معتقد تھا، اسی سلسلہ میں اس نے اپنے بیٹے کا یہ نام رکھا تھا۔

Marfat.com

کی ناراضگی تھی، وہ دارا کے اثر میں آ چکا تھا اور اس کو خوش کرنے کے لئے ، اورنگ زیب کے ساتھ مناسب ہی نہیں بلکہ غیر منصفانہ اور غیر دانشمندانہ سلوک کرنے لگا تھا، اورنگ زیب نے تنگ آکر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور جنگلوں میں عبادت و ریاضت شروع کردی، تقریباً ایک سال بعد اورنگ زیب دوبارہ گورنر بنا کر دکن بھیجا گیا۔

بلخ و بدخشان اور قندھار

مغل بادشاہوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کسی طرح وسط ایشیا کے ان علاقوں پر جہاں تیمور نے اپنی عالمگیر شہرت کی بنیاد رکھی تھی قبضہ حاصل کریں، شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد ہی بلخ کے ازبک حکمران نذر محمد نے کابل پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ مغل فوج مقابلہ کے لئے روانہ ہو چکی ہے تو وہ واپس چلا گیا۔ چار سال بعد یعنی ۱۶۳۲ء میں نذر محمد نے اپنا سفیر اور کچھ تحفہ جات بھیج کر شاہجہاں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، پانچ سال بعد جب شاہجہاں کابل گیا تو نذر محمد نے وہاں بھی اپنا سفیر بھیجا، شاہجہاں نے بھی دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ۱۶۴۵ء میں نذر محمد خاں کے خلاف اس کے بیٹے عبدالعزیز جو بدخشاں پر حکومت کر رہا تھا صف آرا ہوا، نذر محمد نے شاہجہاں سے مدد طلب کی، چنانچہ ایک مغل فوج بادشاہ کے چھوٹے بیٹے شہزادہ مراد کی سرکردگی میں روانہ ہوئی، مغل فوج نے جلد ہی بدخشاں پر قبضہ کرلیا، اس سے نذر محمد گھبرا گیا اور بلخ کو چھوڑ کر ایران کی طرف بھاگ گیا، بلخ اور بدخشاں پر شاہجہاں کا قبضہ تو ہو گیا لیکن جلد ہی اس کو یہ مشکل درپیش آئی کہ شہزادہ مراد نے واپس آنا چاہا شاہجہاں کو اس پر غصہ آیا اور اس کو منع کیا مگر مراد نے دوسرا خط لکھا اور جواب ملنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا، یہ بگڑے ہوئے حالات سنتے کہ اورنگ زیب کو بلخ کی مہم پر روانہ کیا گیا، راستہ میں چھوٹی چھوٹی فتوحات حاصل کرتا ہوا وہ ۲۵ مئی ۱۶۴۷ء کو بلخ پہنچا۔

Marfat.com

اس عرصہ میں عبد العزیز نے ایک لاکھ سے زیادہ فوج جمع کرلی تھی اور ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار تھا، بلخ و بدخشاں کے قضیہ میں یہ سب سے اہم اور بڑی لڑائی تھی، اسی موقع پر بعین حالت جنگ میں نماز ظہر کا وقت آگیا۔ دشمن کی فوجیں چاروں طرف سے تیر برسا رہی تھیں، یہ استقلال کا دیوتا گھوڑے سے بہ کمال متانت اترا صف قائم کی، سکون و اطمینان کے ساتھ فرائض و نوافل ادا کئے، عبد العزیز خاں یہ حیرت انگیز سماں دیکھ کر لڑائی سے ہٹ گیا کہ ایسے شخص سے لڑنا تقدیر سے لڑنا ہے۔[1]

اورنگ زیب اپنے مشن میں کامیاب ہوگیا، بلخ و بدخشاں پر مغلیہ سلطنت کا قبضہ ہوگیا اور اس کی سرحدیں ماوراء النہر تک پہنچ گئیں، لیکن اب ہر شخص کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ مغلوں کے لئے اس علاقہ پر آگرہ سے حکومت کرنا ممکن نہیں، چونکہ شاہجہاں کو بھی اب اس خیال سے اتفاق تھا اس لئے اس نے اورنگ زیب کو واپس بلانے کے احکام جاری کردئے۔ نذر محمد نے جو ایران سے واپس آگیا تھا اپنے پوتوں کو اورنگ زیب کی خدمت میں بھیج کر معذرت کرلی، اور ۳ اکتوبر ۱۶۴۷ء کو اورنگ زیب وہاں سے ہندوپاکستان کے لئے روانہ ہوگیا، وسط ایشیا میں مغلوں کی لڑائیوں کا صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا، امراء فوج کو یہ اندازہ ہوگیا کہ شہزادہ اورنگ اپنے بھائیوں میں ہمت، بہادری، قابلیت اور کردار کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے اور تخت نشینی کے لئے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ شاہی فوج میں اکثریت سنی مسلمانوں کی تھی، وہ اورنگ زیب کی پختگی ایمان اور پابندی شریعت سے بھی بہت متاثر ہوئے۔

---

[1] مولانا شبلی نعمانی اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر بحوالہ مآثر عالمگیری

Marfat.com

قندھار پر ایرانیوں کا قبضہ مغلوں کی شکست

اوپر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں شاہ عباس نے قندھار پر قبضہ کر لیا تھا اور جہانگیر اس کو واپس لینے کی کوئی موثر کوشش نہ کر سکا، شاہجہاں کی خوش قسمتی سے ۱۶۳۸ء میں قندھار کے ایرانی گورنر علی مردان خان نے اس کو مغل افسروں کے حوالے کر دیا خود مغلیہ حکومت میں منصب قبول کر لیا، شاہ ایران اس نقصان پر خاموش نہیں رہ سکتا تھا، دس سال بعد شاہجہاں کو معلوم ہوا کہ ایرانی قندھار پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں، شاہجہاں نے اورنگ زیب کو جو ملتان کا گورنر تھا، قندھار جانے کا حکم دیا۔ اورنگ زیب کے پہنچنے سے پیشتر ہی ایرانیوں نے حملہ کر کے قندھار پر قبضہ کر لیا، اورنگ زیب طویل محاصرہ کی تیاری کر کے نہیں آیا تھا لیکن حالات نے اس کو محاصرہ کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ کئی ماہ کی سخت کوشش کے باوجود اس کو کامیابی نہ ہوئی لیکن ایک اور جنگ میں جو کھلے میدان میں شاہ میر کے قریب ایرانیوں اور مغلوں میں ہوئی موخر الذکر کو زبردست فتح حاصل ہوئی، تین سال بعد یعنی ۱۶۵۲ء میں اورنگ زیب کو دوبارہ قندھار کے محاصرے کے لئے روانہ کیا گیا، اس مرتبہ محاصرہ کے لئے ضروری سامان ساتھ تھا اور شہزادہ کو یقین تھا کہ اس کو کامیابی ہو گی، لیکن شاہجہاں نے اورنگ زیب کو محدود اختیارات دئے تھے اور یہ ہدایت کی تھی کہ اہم معاملات میں شاہی حکم کے بغیر فیصلہ نہ کیا جائے، مثلاً یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک خاص جانب دمدمے تیار کر کے پہلے قلعہ کی دیوار کو توڑا جائے اور پھر یورش کی جائے۔ دیوار توڑنے میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس حکم کی موجودگی میں اورنگ زیب قلعہ پر یورش نہیں کر سکتا تھا، اس لئے دہلی سے اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔[1] اس مشکل کے باوجود اورنگ زیب کو اپنی کامیابی کا یقین تھا، مگر دربار میں اسکے

---

[1] دیکھو خط اورنگ زیب بنام شاہجہان، رقعات عالمگیر (دار المصنفین اعظم گڈھ) ص ۵۹-۶۰

Marfat.com

خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ شاہجہاں نے عین اُس موقع پر جب کامیابی کی امید نظر آ رہی تھی اس کو واپس بلانے کے احکام جاری کر دیئے۔ اس کی درخواست کہ محاصرہ کچھ عرصہ کے لئے جاری رکھا جائے نامنظور ہوئی۔ اس کی واپسی پر داراشکوہ کی سرکردگی میں ۱۶۵۳ء میں مغل فوجوں نے تیسری مرتبہ قندھار پر حملہ کیا، لیکن ظاہر ہے جو مہم اورنگ زیب جیسا بہادر اور سمجھدار شہزادہ سر نہ کر سکا اس میں دارا جیسے آرام طلب، خود رائے اور خود پسند شہزادہ کو کیسے کامیابی ہو سکتی تھی، محاصرہ پر روانہ ہونے سے پہلے شہنشاہ کا محبوب بیٹا "شاہ بلند اقبال" کے القاب سے سرفراز ہو چکا تھا لیکن میدان کارزار میں نہ بلند بانگ دعوے کام آتے ہیں اور نہ شاہی خطابات و سرفرازیاں۔ قندھار مغلوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ اس شکست سے مغلیہ وقار کو بے حد صدمہ پہنچا، خزانہ پر بڑی زبردست اثر پڑا۔ تینوں محاصروں میں بارہ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ ان نقصانات عظیم کے علاوہ یہ معلوم ہو گیا کہ اورنگ زیب کی ناکامیابی کا باعث بادشاہ کی دخل اندازی [illegible] اور اورنگ زیب کے ساتھ غیر ہمدردانہ سلوک تھا۔ [illegible] دارا کی [illegible] اس کی [illegible] اپنی ناکامیابی [illegible] کا بہت بڑا باعث تھا۔

شاہجہاں کا عہد حکومت مغلوں کی [illegible] فتوحات کے لحاظ سے دکن کی پانچ خود مختار سلطنتوں [illegible] میں قطب شاہی [illegible] شامل ہو گئیں [illegible] کر لیا۔ قندھار ضرور سلطنت سے نکل گیا لیکن [illegible] اور اقتدار کی حدود بہت وسیع ہو گئیں [illegible] سکہ [illegible] ادبی کارنامے [illegible]

باب سیزدہم

علمی ادبی زندگی
جہانگیر و شاہجہاں کے عہد میں

علمی و ادبی سرگرمیاں، عہد جہانگیر میں
تو زک جہانگیری

گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ اکبر یوں تو تقریباً ناخواندہ تھا لیکن، اس کی ذہانت قابل رشک تھی، اس کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی، دینی علوم کو چھوڑ کر اس نے علم کے اور شعبوں کی سرپرستی کی، اکبر نامہ، آئین اکبری اور منتخب التواریخ کے صفحات میں ہم کو متعدد فضلاء، شعراء اور فن کاروں کے حالات ملتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمی و ادبی زندگی نے اس عہد میں بہت زیادہ ترقی کی، جہانگیر کی خود بھی تعلیم اچھی ہوئی تھی اور علم و ادب کی سرپرستی اس کو ورثہ میں ملی تھی۔ بابر کی طرح اس نے بھی توزک تصنیف کی جو اس کے عہد کے حالات کے لئے ایک مفید ذریعہ معلومات کی حیثیت سے استعمال کی جاتی رہی ہے، توزک جہانگیری

Marfat.com

کے متعلق مولانا شبلی کی رائے ہے کہ جس بے تکلفی، بے جستگی اور دلاویزی کے ساتھ جہانگیر واقعات بیان کرتا ہے وہ بڑے بڑے انشاپرداز نہیں کر سکتے۔ مولانا کا بیان قدرے مبالغہ آمیز ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کے طرز ادا میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اکثر اوقات تاریخی واقعات کو ادیبانہ رنگ میں بیان کرتا ہے، اور ساتھ ہی سختی کے ساتھ اس کی پابندی کرتا ہے کہ تاریخی حقائق کو حقائق ہی کی طرح پیش کرے اور جب کبھی محفل جشن وغیرہ کا حال لکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بزم کی قلمی تصویر کھینچ دی ہے۔ جیسے جشن نوروز کے متعلق اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں [۱]

"فرمودم کہ ایوانہائے دولت خانہ خاص و عام
بدستور زمان والد بزرگوارم بہ اقمشہ نفیسہ گرفتہ
آئینے در غایت زیب و زینت بستند و از مبدا اول
نوروز تا نوزدہم، درجہ حمل کہ روز شرف است خلائق
داد عیش و کامرانی دادند، اہل ساز و نغمہ از ہر طائفہ
و ہر جماعت جمع بودند لولیان رقاص و دلبران ہند
کہ بکرشمہ دل از فرشتہ می ربودند ہنگامہ مجلس
را گرم داشتند، فرمودم کہ ہر کس از مکیفات و
مغیرات آنچہ می خواستہ باشد، بخورد۔ منع و مانع
نباشد"

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما
مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما

---

[۱] توزک جہانگیری ص ۲۲

اسی طرح جانوروں، پھولوں اور قدرتی مناظر کی تصویر کشی میں[1] جہانگیر کے بیانات اعلیٰ ادبی نمونوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ جہانگیر کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا، لکھتا ہے کہ ایک خیال ذہن میں آیا اور غزل لکھی۔ اس کا مطلع و مقطع نقل کیا جاتا ہے:

من چون کنم که تیر غمت بر جگر رسد ٭ تا چشم نارسیده دگر بر دگر رسد
وقت نیاز و عجز جهانگیر هر سحر ٭ امید آن که شعله نور اثر رسد[2]

بزم تیموریہ[3] میں چند اشعار اور رباعیات مخزن الغرائب کے قلمی نسخہ سے نقل کئے گئے ہیں، ایک رباعی یہ ہے:-

---

[1] کشمیر کے متعلق لکھتا ہے:-
کشمیر باغیست همیشه بهار یا قلعه ایست آهنین حصار، بادشاهان را گلشنے است عشرت افزا و درویشان را خلوت کده دلگشا، چمن های خوش و آبشارهای دلکش از شرح و بیان افزون، آب های روان و چشمه سارها از حساب و شمار بیرون، چندان که نظر کار کند سبزه است و آب روان، گل سرخ و بنفشه و نرگس خودرو صحرا صحرا، انواع گلها و اقسام ریاحین از آن بیشتر است که بشمار آید، در بهار جان نگار کوه و دشت از اقسام شگوفه مالا مال، در و دیوار و صحن و بام خانها از مشعل لاله بزم افروز، چیلپاهای مسطح دمر برگ های میروج را چه گوید۔

اس کے بعد چند اشعار لکھتا ہے، ان میں سے دو تین بطور نمونہ پیش کئے جاسکتے ہیں:-

شده جلوه گر نازنینان باغ ٭ رخ آراسته هر یکے چون چراغ
غنچه نوائی بلبل صبح خیز ٭ تماشائے میخوارگان کرده تیز
به هر چشمه متقارب آب گیر ٭ چو مقراض زرین بقطع حریر

(دیکھو تزک ص ۲۹۹)

[2] تزک ص ۲۷۰
[3] جلد ص ۱۴۲

Marfat.com

اے آنکہ غم زمانہ پاکت خوردہ ⁂ اندوہ دل وسوسہ ناکت خوردہ
مانند قطرہائے باران بزمین ⁂ جا گرم نکردہ کہ خاکت خوردہ

جہانگیر کو بندگان دین سے عقیدت تھی، ماوراءالنہر کے ایک بزرگ خواجہ ہاشم دہ بیدی نے "کہ در ماوراءالنہر امروز سلسلہ درویشی گرم دارد" اس کو خط لکھا جس میں دعائیں بھیجیں، جواب میں جہانگیر نے ایک رباعی بھی لکھی اور دستخطی درباری شعراء سے کہا کہ وہ بھی رباعیات لکھیں، حکیم مسیح الزمان کی کہی ہوئی رباعی جہانگیر کو بہت پسند آئی اور اس نے ایک ہزار مہر حکیم مذکور کو بطور انعام عطا کیں۔ رباعی یہ ہے:[1]

دارم اگرچہ شغل شاہی در پیش ⁂ ہر لحظہ کنیم یاد درویشان بیش
گر شاد شود ز ما دل یک درویش ⁂ آں را شمریم حاصل شاہی خویش

جہانگیر کو اپنا ایک نعتیہ شعر اس قدر پسند تھا کہ:

بہ چراغچیان و نقارہ خوانان فرمودم کہ در وقت سلام و صلوٰۃ فرستادن وقصہ گذرانیدن در آمد، این بیت کنند:[2]

بلندی آسمان تا جاہ تو دور
مبادا عکس او از تیر رس دور

ایک شاعر جو کلال قوم سے تھا، مستی تخلص کرتا تھا۔ یہ لوگ جو فروشی کے ذرائع انجام دیتے تھے، لیکن کسی ترکیب سے مستی نے نور جہاں تک رسائی حاصل کر لی اور اس کی سفارش سے جہانگیر تک پہنچ گیا، جہانگیر کے سامنے اس نے یہ شعر پڑھا۔

۱؎ توزک ص ۱۰۹

۲؎ توزک ص ۹۶

Marfat.com

من می روم و برق زبانی شعلہ آہم
اے ہم نفسان دور شوید از سر راہم

بادشاہ نے ہنس کر کہا وہ اثر (یعنی چاوشی کا) کہاں جا سکتا ہے[1]

توزک کے اوراق یہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ شعر و سخن سے جہانگیر کو کس قدر دلچسپی تھی اور شعراء کی وہ کس حد تک سرپرستی کرتا تھا، ایک موقعہ پر معزی کا ایک قصیدہ جو اس نے سلطان سنجر کی تعریف میں کہا تھا جہانگیر کے سامنے پڑھا گیا، اس کو سن کر بے حد خوش ہوا اور تعریف کی، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:۔

اے آسمان مسخر حکم روان تو
کیوان پیر بندہ بخت جوان تو

سعیدا زرگر باشی نے اسی قصیدے پر ایک قصیدہ جہانگیر کی تعریف میں لکھا وہ اسکو اس قدر پسند آیا کہ " بصلہ این قصیدہ حکم فرمودم کہ سعیدا را بزر وزن کنند " قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں:۔

اے نہ فلک نمونہ از آستان تو ❊ دوران پیر گشتہ جوان در زمان تو
بادا جہاں بکام تو اے بادشاہ عہد ❊ در سایہ تو خرم شاہ جہان تو
اے سایہ خدا ز تو پر نور شد جہاں ❊ بادا ہمیشہ نور خدا سائبان تو[2]

ایک بزرگ ملا محمد صوفی ایران سے تشریف لائے، جہانگیر کو ان سے ملنے کا شوق ہوا اور ان کو بلوایا، لیکن وہ راستہ میں انتقال فرما گئے، وفات سے پہلے مندرجہ ذیل رباعی لکھی جس کو سنکر جہانگیر پر رقت طاری ہوئی۔

---

[1] دیکھو شعر العجم حصہ سوم۔ ذکر میں

[2] توزک ص ۲۴۰

Marfat.com

اے شاہ نہ تخت و نہ نگیں می ماند ؛ از بہر تو یک دو گز زمیں می ماند

مسند دق خود و کاشہ درویشاں را ؛ خالی کن و شیر کن کہ ہمیں می ماند[1]

شاعری سے بادشاہ کی دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء و وزراء میں بھی یہ ذوق پیدا ہو گیا۔ نورجہاں کا باپ اعتماد الدولہ مرزا غازی خان اور عبدالرحیم خانخانان اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں، اعتماد الدولہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ بستر مرگ پر تھا، جہانگیر اور نورجہاں عیادت کے لئے گئے، نورجہاں نے جہانگیر کی طرف اشارہ کر کے باپ سے کہا کہ آپ نے پہچانا۔ اعتماد الدولہ نے انوری کا یہ شعر پڑھا۔

آنکہ نابینائے مادر زاد اگر حاضر شود

در جبین عالم آرائش بہ بیند مہتری

مرزا غازی بیگ ترخان، مرزا جانی بیگ کا لڑکا تھا، اکبر ہی کے زمانہ میں وہ امرائے دربار میں شامل ہو گیا تھا، جہانگیر کے عہد میں ملتان و ٹھٹھہ کا حاکم تھا، اس کو شعر شاعری سے بہت دلچسپی تھی، اس کے پاس ارباب فن کا مجمع رہتا تھا، وحشت، طالب آملی اور وصلی ابتداء میں اس کی مجلس سے وابستہ تھے، وہ خود بھی شاعر تھا اور وقاری تخلص کرتا تھا[2]۔ شیخ فرید نے ذخیرۃ الخوانین میں اس کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ ان ہی کا بیان ہے کہ کثرت شراب خوری کے باعث جوان العمری مر گیا۔ باوجود اس قدر جلد مرجانے کے کہا جاتا ہے کہ پانچ ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا، شعر العجم میں مولانا نے کچھ منتخب اشعار نقل کئے ہیں۔ ان ہی میں ایک شعر ہے۔

---

[1] ذخیرۃ الخوانین۔ ذکر اعتماد الدولہ۔

[2] کہا جاتا ہے کہ وقاری قندھار میں ایک شاعر تھا، غازی بیگ نے ایک ہزار ہدیہ خلعت اور گھوڑا دے کر یہ تخلص اس سے لے لیا تھا۔

Marfat.com

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب
ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد

جہانگیر کے عہد میں اور بھی کئی شاعر قابل ذکر ہیں۔ قوام الدین جعفری، اکبر کے زمانہ میں عراق سے آیا تھا، اپنی بلند فطرتی اور کمالات کے باعث بڑے عہدہ پر پہنچا۔ نظامی گنجوی کے تتبع میں مثنوی خسرو شیریں لکھی جس کے متعلق مآثر الامراء کے یہ الفاظ ہیں:۔

"با اعتقاد جمع بعد از شیخ نظامی گنجہ مثنوی خسرو شیریں بہ از و کسے نہ گفتہ"[1]

مرزا عبدالرحیم خانخاناں

اکبر اور جہانگیر دونوں کے عہد میں جہاں تک علمی سرگرمیوں کا تعلق ہے۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی شخصیت بہت نمایاں نظر آتی ہے، سیاسی بساط پر بھی اس کے کمالات کچھ کم نمایاں نہیں، یہی سبب ہے کہ اس کو صاحب سیف و قلم کہا گیا ہے۔ اس کی علمی سرپرستی کی یادگار مآثر رحیمی کی شکل میں ہمیشہ زندہ رہے گی، اسی کے اوراق سے ہم عبدالرحیم کے علمی کمالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور اس مبالغہ آمیزی کو چھوڑ کر جس کا اس زمانہ میں رواج تھا، خالص واقعات کی بنیاد پر اس کی علمی خدمات کی تصویر تیار کی جاسکتی ہے، وہ کئی زبانوں میں مہارت رکھتا تھا، اس کی عربی دانی کا ذکر کرتے ہوئے عبدالباقی نہاوندی لکھتا ہے کہ شریف مکہ کا ایک خط ایسی ا ق زبان میں آیا کہ ابوالفضل اور فتح اللہ شیرازی لغت کی مدد سے بھی اس کا مطلب نہیں بتا سکے، چنانچہ مرزا سے کہا گیا اور اس نے بلا تکلف پڑھ کر ترجمہ کر دیا۔[2] عبدالرحیم ترکی بھی خوب جانتا تھا، تزک بابری کا ترجمہ ترکی سے فارسی

---

[1] حالات کے لئے دیکھو مآثر الامراء جلد اول ص ۱۲۳ [2] مآثر رحیمی جلد ۲ ص ۵۵۶

میں اسی نے کیا اور وہ انشاء کا عمدہ نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔ فارسی اور ہندی میں خوب شعر کہتا تھا۔ ہندی کے مسلمان شعراء میں وہ ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، عبدالباقی کے الفاظ میں:-

در زبان ہندی ید بیضا نمودہ اند چندان اشعار متین
و ابیات دلنشین کہ ایشان دران زبان دارند ہیچ
یک از فحول شعرائے آن زبان را نیست ......
وتجمل و انعام و احسانے کہ بشعرائے فارسی نمودہ، برابر
آن بہندی زبان نمودہ باشند۔ وچندان اشعار کہ
آن جماعہ در مدح ایشان گفتہ اند فارسی گویان عشر عشیر
نگفتہ اند[۱]

ضروریات سلطنت کے لئے اکبر نے اس سے کہا کہ یورپ کی کچھ زبانیں بھی سیکھ لے؛ چنانچہ ان میں سے کچھ میں اس نے مہارت حاصل کی، افسوس ہے کہ معاصر مورخین نے اس کی تفصیل نہیں دی، صاحب ماثر الامراء کو بھی کچھ تفصیلات نہ مل سکیں، وہ صرف اس قدر لکھ سکا: گویند کہ باکثر زبان ہا کہ در عالم رائج است حرف می زد۔ شیخ فرید نے بھکری معلومات میں اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ خانخاناں سنسکرت بھی جانتا تھا[۲]۔ عبدالرحیم شعراء کی سرپرستی میں بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا۔ اس عہد کے بہت سے شاعر اس سے وابستہ تھے، نوعی شیرازی کو اس نے سونے میں تولایا۔ ایک [illegible]

۱؎ ماثر رحیمی جلد ۲ ص ۶۲۲

۲؎ ذخیرۃ الخوانین، ذکر عبدالرحیم خانخاناں۔ شیخ فرید بھکری نے خانخاناں کے حالات اور کارنامے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

Marfat.com

نے کہا کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا ہے، خانخانان نے فوراً ایک لاکھ روپیہ منگوایا۔ نظیری نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اتنی رقم کا ڈھیر دیکھا، خانخانان نے سب روپیہ اسی کو انعام میں دیدیا۔

عرفی اس عہد کے ممتاز شعراء میں ایک عرفی تھا، وہ اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا لیکن شہزادہ سلیم اس کی بہت سرپرستی کرتا تھا، شہزادہ نے اس کو پیغام بھیجکر بلوایا تو خوشی میں اس نے ایک قصیدہ لکھا، اس میں اپنی طلبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

ازین پیام دلم شد شگفته و شادان ۞ چنان که باغ ز شبنم چنانکه گل ز نسیم

. . . .

به رہ فتادم و گشتم چنان شتاب زده ۞ که دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم

شہزادہ کی نگاہ شاعر پر پڑی، اس کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے ؎

نگفت و من نشنودم ہر انچہ گفتن داشت

که در بیان نگہش کرد دیر زبان تقدیم

عرفی نے جہانگیر کی تعریف میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں، جہانگیر کے علاوہ عرفی بعض اور شاعروں کی طرح عبدالرحیم خانخانان کی قدرشناسی اور سخن پروری سے بھی مستفیض ہوتا تھا، ذخیرۃ الخوانین کا حوالہ دیتے ہوئے میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ :۔

"خانخانان، ملا عرفی را نادیدہ آن قدر نقد ہر سال می فرستاد کہ محتاج بدر دیگر نبود۔"

انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ خانخانان نے ایک قصیدہ کے صلہ میں اس کو ستر ہزار روپیہ عطا کئے۔ آزاد کی رائے ہے کہ :۔

"قصیدہ گوئی صاحب ید طولیٰ است، با وصف آن مخالص او چندان

Marfat.com

خوب تاقع نہ شدہ، لہذا بہ زبان قلم بیامدہ غزل و مثنوی او مرتبہ مساوی دارد۔[1]

اسی دور کے ایک سخن سنج کا خیال تھا کہ

تنولیش طرز فصاحت نداشت ؛ کان نمک بود ملاحت نداشت

آزاد کے خیال میں شاعر کے ذہن میں وہ رباعی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؛ موج نخست است ز بحر قدیم

کہا جاتا ہے کہ عرفی کو حاسدوں نے زہر دلوادیا اور جہانگیر کی تخت نشینی سے پہلے ہی وہ ختم ہو گیا۔[2]

طالب آملی دوسرا شاعر تھا جس کی جہانگیر نے سرپرستی کی، وہ پہلے مرزا غازی خان حاکم قندھار و ملتان سے وابستہ رہا، بعد میں دربار شاہی میں حاضر ہوا جہانگیر نے بہت نوازا اور آخر میں ملک الشعراء بنا دیا، اس کی خوش حالی اور جہانگیر کی سرپرستی کا ذکر اس کا معاصر عبدالنبی صاحب تذکرہ میخانہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

الحال بہ دولت این خسرو غریب دوست، مسکین نواز و این خورشید ذرہ پرور از ہمہ چیز بے نیاز سرآمد سخنوران و برگزیدہ نکتہ پروران است۔[3]

جہانگیر نے جو اپنے باپ کی سنت ریش تراشی پر عمل کرتا تھا اور شاید اس کو پسند بھی کرتا تھا طالب سے داڑھی منڈوانے کی فرمائش کی، طالب نے ایک قطعہ لکھ کر اس کی خدمت میں پیش کیا اور داڑھی نہ منڈوائی۔ قطعہ کے دو شعر یہ ہیں ؎

---

[1] میر غلام علی آزاد۔ خزانہ عامرہ (نولکشور لکھنؤ) ص ۲۱۸-۲۲۰
[2] بزم تیموریہ ص ۱۵۳
[3] ایضاً

سفر می کنم صاحبا ورنہ من ؛ چہ سر بلکہ گردن تراشیدمے

سر و ریش و ابرو و بروت و مژہ ؛ برسم برہمن تراشیدمے

طالب کی عمر زیادہ نہ ہوئی اور ۱۰۳۶ھ میں وہ ابھی جوان ہی تھا کہ وفات پا گیا۔

مولانا علی احمد نشانی عالم بھی تھے اور شاعر بھی، جہانگیر کے استاد رہ چکے تھے اور وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا، ایک روز جہانگیر کے محل میں محفل سماع گرم تھی، قوال نے امیر خسرو کا یہ شعر پڑھا۔

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

مولانا نشانی کو اس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی، جہانگیر نے اس کا مطلب دریافت کیا، مولانا بحالت وجد ہی جہانگیر کے پاس گئے اور فرمایا کہ ایک روز شیخ نظام الدین اولیا حضرت امیر خسرو کے ساتھ جمنا کے کنارے گئے۔ وہاں ہندو اشنان کر رہے تھے۔ شیخ نے ان کو دیکھ کر کہا۔

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے

امیر خسرو نے فوراً اپنے مرشد کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

اس وقت شیخ نظام الدین اولیا طاقیہ اوڑھے ہوئے تھے اور وہ کچھ کج بھی تھی۔ یہ کہہ کر مولانا نشانی نے اپنی کلاہ کو کج کیا اور رقص کرتے ہوئے زمین پر گر گئے اور ختم ہو گئے[1]

دربار جہانگیری سے جو شعراء وابستہ تھے ان میں حیاتی کاشی بھی قابل ذکر ہے وہ ابتدا میں دکن میں مقیم تھا جہانگیر کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو احمد نگر سے اس کو

---

[1] بزم تیموریہ (بحوالہ ریاض الشعراء) ص ۱۵۸

Marfat.com

بلوا لیا، حضرت امیر خسرو کی مثنوی تغلق نامہ[1] جہانگیر کو پسند تھی۔ اس کا ایک حصہ مفقود تھا۔ ١٠١٩ھ میں جہانگیر نے کئی شاعروں سے کہا کہ وہ حصہ لکھ کر شامل کریں، ان سب میں بادشاہ کو حیاتی کا کلام پسند آیا، چنانچہ انعام میں اس کو سونے میں تلوا دیا، اس طرح ایک ایک ہزار کی چند تھیلیاں اشرفیوں کی اس کو ملیں[2]۔ ان کے علاوہ متعدد شعراء جہانگیر کے دربار سے منسلک تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو اس عہد کے امراء میں سے کسی کی سرپرستی میں رہ کر فن شعری خدمت کرتے تھے۔ ظہیری، شکیبی، لطفی، عتابی، معنوی، حسن بیگ خاکی کے نام قابل ذکر ہیں۔

فضلاء جہانگیر اپنے عہد کے فضلاء و ادباء کا بھی بہت خیال رکھتا تھا۔ ان میں سے چند کا ذکر مختصر یہاں کیا جا سکتا ہے۔ میران صدر جہاں، سے جہانگیر نے چہل حدیث پڑھی تھی، تخت نشینی کے بعد اس نے صدر جہاں کو پنج ہزاری منصب عطا کر کے قنوج کا علاقہ دیا[3]۔ ملا تقیا شیرازی جو مدت سے شہزادہ خرم کے پاس دیوان رہے تھے۔ بعد میں اجمیر کے ناظم مقرر ہوئے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ذکر تزک جہانگیری میں بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ مولانا کی تصنیف اخبار الاخیار کے لئے لکھا ہے کہ "در خیلی زحمت کشیده"۔ جہانگیر کو منجملہ اور علوم کے تاریخ سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس عہد کے دو مورخ قابل ذکر ہیں۔ محمد ہادی نے تزک جہانگیری کا مفصل اور خاصہ طویل مقدمہ لکھا جس سے جہانگیر کے ابتدائی زمانہ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ معتمد خاں نے تزک کے آخری چند سال بھی جاری رکھے ...

---

[1] دیکھو خزانۂ عامرہ ص ١٢٢، تغلق نامہ حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے۔

[2] مآثر الامراء جلد سوم ص ٣٥٠

[3] دیکھو کیٹلاگ برٹش میوزیم جلد اول ص ٢٥٥

Marfat.com

سال کے بعد کے واقعات لکھ کر کتاب کو مکمل کیا، لیکن اس کی شہرت اس کی اپنی تصنیف اقبال نامہ جہانگیری کی وجہ سے ہے، اس کا تیسرا حصہ جو یقیناً سب سے زیادہ مفید ہے، کیونکہ جہانگیر کے عہد پر ہے کلکتہ سے شائع ہو چکا ہے، پہلے اور دوسرے حصوں میں جو کمیاب ہیں اور شائع بھی نہیں ہوئے ہیں، بابر سے اکبر تک کے حالات ہیں جہانگیر کے عہد کی ایک اور تاریخ جو شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد لکھی گئی مآثر جہانگیری ہے، بعض لوگوں کی رائے میں یہ اقبال نامہ جہانگیری سے بہتر ہے، لیکن ابھی تک یہ شائع نہیں ہوئی ہے، علم و ادب کی سرپرستی کے علاوہ جہانگیر نے تعلیمی اداروں کی بھی عطیات وغیرہ دیکر مدد کی، اس کا حکم تھا کہ اگر کوئی مالدار آدمی لاوارث یا اجنبی انتقال کر جائے تو اس کا مال مدارس اور خانقاہوں کی تعمیر و ترقی میں صرف کیا جائے۔

شاہجہاں کے درباری شعراء

قدسی ، کلیم ، صائب

شاہجہاں کی علمی صلاحیت کا اندازہ اس کے بعض مکاتیب اور فرامین سے ہوتا ہے۔ وہ نہ مصنف تھا نہ شاعر لیکن شعر کا ذوق رکھتا تھا، شعراء کی سرپرستی کرتا اور علماء و فضلا کی عزت کرتا تھا، اس کے درباری شعراء میں حاجی محمد جان قدسی مشہدی کا مرتبہ سب سے بلند ہے، میر غلام علی آزاد نے اس کو "صاحب سکہ سخندانی و مقرب پائے تخت شاہجہانی" لکھا ہے وہ ۱۰۴۲ھ میں شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوا اور ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع تھا۔

اے قلم بر خود ببال از شادی و بکشا زبان

در تنائے قبلہ دیں ثانی صاحبقران

شاہجہاں نے اس پر دو ہزار روپیہ اور خلعت عطا کیا ۱۰۴۵ھ میں جشن کے موقع پر ایک اور قصیدہ کے صلہ میں پانچ ہزار روپیہ دئے، نو سال بعد جہاں آرا بیگم کی صحتیابی

Marfat.com

پر بھی انعام پانے والوں میں قدسی شریک تھا، غرضکہ ایک مدت تک وہ شاہی نوازشات سے مشرف ہوتا رہا، ۱۰۵۶ھ میں لاہور میں قدسی کا انتقال ہوا، صاحب خزانہ عامرہ کی رائے میں "قصیدہ و مثنوی او بمعراج بلاغت صعود نمودہ غزل بہ آن مرتبہ نیست"[1]

دوسرا مشہور شاعر کلیم تھا، وہ کاشان کا رہنے والا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں ہند و پاکستان آیا اور سرہند پہنچکر شاہ نوازخاں سے وابستہ ہوگیا، موخرالذکر اس کی بہت قدر کرتا تھا، ۱۰۲۸ھ میں ایران واپس چلا گیا، لیکن وہاں بھی اس کو صغیر بہت یاد آتا تھا، ایک غزل میں اس کا ذکر کرتا ہے۔

ز شوق ہند زان سان چشم حسرت بر قفا دارم ؛ کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را
اسیر ہندم وزین رفتن بیجا پشیمانم ؛ کجا خواہد رسانیدن پرافشانی مرغ بسمل را

لیکن کلیم کی "پرافشانی" بے کار نہ گئی، اس کو ہندوستان آنے کا دوبارہ موقع ملا، جہانگیر کے زمانہ میں طالب کے مقابلہ میں وہ زیادہ فروغ حاصل نہ کر سکا لیکن شاہجہاں کے عہد میں اس کا کلام بدشعلہ طور بن کر چمکا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کی شاعری کلیم کے اشعار سے جگمگا اٹھی، تخت طاؤس کی تکمیل پر جشن منایا گیا تو بہت سے شعراء نے قصیدے لکھے، لیکن کلیم کا قصیدہ بہت پسند کیا گیا، چند بیت بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں:

بوصف تخت مرصع گہرفشان گشتم ؛ ہذا القضیب کند عمر خضر ز طول مثال
ہزار سیلان یاقوت صبح خندان لعل ؛ بہ بند کاری گرفتہ است تا بخود جمال
تو دان ز آتش یاقوت آن چراغ ازد ؛ کہ نہ زباد رسد آفتش نہ از ابر [illegible]
فتادہ پرتو یاقوت و لعل با الماس ؛ چنانچہ عکس چراغان میان آب زلال

---

[1] خزانہ عامرہ ص ۳۰۷

Marfat.com

اس قصیدے کے صلہ میں کلیم کو بادشاہ نے روپیہ میں تلوایا اور وہ اسی کو انعام میں دیدیا۔ کلیم نے ایک تاریخی مثنوی بہ عنوان بادشاہ نامۂ قدسی کی مثنوی ظفرنامہ شاہجہانی کے تتبع میں لکھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

سگ نفس را رفتہ از کار چشم
تو از عینکش کردۂ چار چشم[1]

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ قیصر روم نے اعتراض کیا تھا کہ شاہجہاں صرف ہندوستان کا بادشاہ ہوکر اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ کہتا ہے۔ شاہجہاں اس سے پریشان ہوا اور خیال کر رہا تھا کہ اپنے القاب تبدیل کر دے لیکن کلیم کے اس شعر نے اس کا ارادہ بدل دیا ہے

ہند و جہان ز روئے عدد ہر دو چون یکے است
شہ را خطاب شاہجہانی مبرہن است

کلیم کی اس تاریخی مثنوی ۔۔۔۔ میں ۱۰۴۶ھ تک کے حالات ہیں۔

قدسی کے بادشاہ نامہ میں ۱۰۴۷ھ تک کے واقعات ہیں لیکن جیسا کہ مولانا شبلی کا بیان ہے کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے[2]۔ دربار شاہجہانی سے وابستہ شعراء میں صائب کا ذکر اور کیا جا سکتا ہے:۔

میرزا محمد علی صائب تبریز میں پیدا ہوا اور اصفہان میں تعلیم پائی۔ صائب کے کلام نے اس کو بہت جلد مقبول عوام و خواص کر دیا، آزاد بلگرامی کی نظر میں وہ "امیر الامرا کلام فرازندہ رایات عالیات انکلام، امام ائمہ معانی و مجتہد علماء سخندانی" ہے اور ان ہی کے الفاظ میں:۔

باوصفیکہ سنی المذہب بود در میان ایرانیان بکمال احتیاط عقائد دین و

۱؎ خزانہ عامرہ ص ۳۸۰

۲؎ شعر العجم حصہ سوم۔

Marfat.com

حفظ اسرار علم و یقین مقبول خواص و عام گردیده چنانکہ باید و شاید نظر نگاہی فرمود"

عہد جہانگیری کے آخر میں ہندوستان آیا اور ظفر خان سے جو اپنے باپ کی نیابت میں کابل کا ناظم تھا وابستہ ہو گیا۔ شاہجہاں کی تخت نشینی پر ظفر خان دار الحکومت میں آیا تو صائب بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ۱۰۴۲ھ میں ظفر خان کو کشمیر کا ناظم مقرر کیا گیا وہ اپنے ساتھ صائب کو بھی لے گیا۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے وہ اصفہان واپس چلا گیا اور آخری وقت تک وہیں رہا۔ صائب نے جعفر خان وزیر سے بہت خوشگوار تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ ایران پہنچکر وہاں سے اس نے جعفر خان کو لکھا:-

در هندوستان ملیا خاں یاد کردن همت است
ورنه هر نخلے به پائے خود ثمر می افگند

جعفر خان نے اس پر پانچہزار روپیہ اور بقول بعض پانچہزار اشرفیاں اس کو بھیجدیں معلوم ہوتا ہے صائب کا کلام میر آزاد بلگرامی کو بھی بہت پسند تھا اور بہت سے اشعار منتخب کر کے انہوں نے اپنی بیاض میں لکھ لئے تھے۔ ان میں سے چند خزانہ عامرہ میں نقل کئے ہیں پہلا شعر یہ ہے:

جذبہ عاشق اثر در سنگ خارا می کند
کوہکن معشوق خود از سنگ پیدا می کند[1]

جن شعراء کا اوپر ذکر کیا گیا ، ان کے علاوہ شاہجہاں کے دربار سے نیز اس کے امراء سے بہت سے اور شعراء بھی منسلک تھے۔ محمد طاہر آشنا ابن ظفر خان سے ذوق شعر وراثت میں پایا تھا۔ ماثر الامراء میں اس کے متعلق یہ الفاظ ہیں:

---

[1] خزانہ عامرہ ص ۲۸۷ - ۲۸۸

Marfat.com

"درمعنی بندی و سخن سنجی استاد است، صاحب مثنوی و دیوان"

اس کی دو مثنویاں قابل ذکر ہیں، ایک کشمیر کی تعریف میں اور دوسری شاہجہان نامہ جس میں عہد شاہجہانی کے پہلے بیس سال کے حالات بیان کئے گئے ہیں[1]۔ امان اللہ خان امانی، مہابت خان کا لڑکا تھا۔ بقول آزاد بلگرامی "در وادی شعر بغایت خوش سلیقہ است"۔ سلطان شادمان گھکر قوم کے رؤسا میں سے تھا، اس کی زبان میں لکنت تھی لیکن پھر بھی بادشاہ اس کی وقعت کرتا تھا۔ تخت طاؤس کے جشن پر جو قصیدہ شادمان نے لکھا تھا اور جو پسند کیا گیا تھا اس کا مقطع یہ ہے:

شادمان ظل شہنشہ بر جہان پاینده باد
تا بود درخشش فلک در زیر زین آفتاب

شیخ محمد محسن فانی کشمیری الوطن، صوفی منش عالم تھے، شاہجہان نے الہ آباد کا صدر مقرر کر دیا تھا لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ شیخ نے نذر محمد والی توران کی مدح میں بھی قصیدے لکھے ہیں تو ان کو معزول کر کے وظیفہ مقرر کر دیا، ان کے کلام میں رنگینی اور روانی پائی جاتی ہے، محمد حسین آشوب اپنے وطن مازندران سے یہاں آئے اور شاہجہانی دربار سے وابستہ ہو گئے، ان کا ایک شعر ہے:

سبزه از مژگان من نیز مشق شادابی گرفت
نرگس از چشم ترم تعلیم بے خوابی گرفت

باقیا نائینی شہزادگی کے زمانہ ہی میں خرم کی خدمت میں آ گیا تھا، بادشاہ ہونے کے بعد شاہجہان نے اس کو انعامات دئے ایک مرتبہ روپیہ میں تلوا کر بھی انعام دیا۔

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھو الیٹ اینڈ ڈاوسن۔ تاریخ ہند۔ جلد ہفتم ص ۷۳ اور کیٹلاگ برٹش میوزیم جلد اول ص ۲۶۱۔

Marfat.com

شاعر ہونے کے علاوہ وہ موسیقی کا بھی ماہر تھا۔ شیدا کا باپ مشہد سے آکر یہاں آباد ہو گیا تھا۔ شیدا خود فتحپور میں پیدا ہوا تھا، پہلے خانخاناں سے منسلک رہا بعد میں شہزادہ شہریار سے، آخر میں شاہجہاں کے دربار میں رسائی ہو گئی۔ ایک مرتبہ شراب کی تعریف میں ایک گستاخانہ شعر کہا ۔

چیست دانی بادۂ گلگون مصفا جوہرے

حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

علماء نے اس پر کفر کا فتویٰ[1] دیا۔ شاہجہاں بھی بے حد ناراض ہوا اور جلا وطنی کے احکامات جاری کئے اس سے بہت پریشان ہوا اور مولانا جامی کا ایک شعر استشہاد میں پیش کرتے ہوئے ایک قطعہ معذرت بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ دو شعر اس قطعہ کے یہ تھے ۔

بوصف مے ز صراحی دوبارہ قلقل مے[2]	؎	بہ انجمن چہ ازقلش گفت وداع از تکفیر
مرا چو شاہ براند کجا توانم رفت	؎	بگاہ دامنش از کف کجا بندد شمشیر

شاہجہاں اگرچہ شیدا کے سقم استشہاد کو بآسانی سمجھ گیا ہوگا، لیکن اس نے شاعر کی معذرت قبول کر لی اور اس کو معاف کر دیا، سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ سعیدائی گیلانی ایک اور درباری شاعر تھا۔ عبدالحمید لاہوری کے الفاظ میں وہ "از رسائی طبع و روانی فکر اکثرے بہ نظم معانی می پرداز د"[3]

---

[1] مولانا جامی کا شعر جس کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے:

از صراحی دوبارہ قلقل ست ؎ پیش جامی بہ از ہزار دل است

[2] دیکھو خزانہ عامرہ ص ۲۷۰

[3] بادشاہ نامہ۔ جلد اول۔ حصہ دوم ص ۳۵۶

مرزا رضی دانش مشہدی، مرزا حسن بیگ رفیع قزوینی اور میر صیدی طہرانی بھی قابل ذکر ہیں، اس عہد کا مشہور ہندو شاعر چندر بھان برہمن تھا شاہجہاں نے اس کو وقائع نویس مقرر کر دیا تھا، بعد میں شہزادہ دارا شکوہ نے اس کو اپنی ملازمت میں لے لیا، معلوم ہوتا ہے کہ دارا اور اورنگ زیب کے اختلافات میں چندر بھان نے نمایاں حصہ لیا تھا کیونکہ عالمگیر کی تخت نشینی کے بعد اس نے معافی مانگی۔

شدیم پیر بہ عصیاں و چشم آن داریم
کہ جرم ما بجوانان پارسا بخشد

عالمگیر نے اس کو جہانگیر کے مقبرہ کی نگہبانی پر مقرر کر دیا تھا، وہ شعر لکھتا تھا اور صاحب دیوان تھا، برہمن تخلص کرتا تھا، اس کی نثر نظم کے مقابلہ میں زیادہ قدر کی نظر سے دیکھی جاتی تھی، منشآت برہمن درسی کتابوں میں شامل تھی، چہار چمن میں اس نے شاہی جلوسوں کی تفصیل بیان کی ہے اور ان سے متعلق رسوم و رواج کا ذکر کیا ہے

فضلاء شاہجہاں کے عہد میں اس کے کئی امراء صاحب علم و فضل تھے سب سے زیادہ مشہور اور قابل شخص خود اس کا وزیر علامہ سعد اللہ تھا، وہ ۱۰۵۰ھ میں دربار میں حاضر ہوا اور ملازم ہو گیا، رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا بالآخر سات برس بعد وہ وزارت تک پہنچ گیا ہفت ہزاری منصب، ایک کروڑ دام کے انعام اور علامی و فہامی کے خطابات سے بھی مشرف ہوا[1] شاہجہاں کا ایک اور امیر علی مردان بھی اپنی علم پروری کے لئے مشہور ہے۔

شاہجہاں کے عہد میں علم تاریخ کو بھی فروغ ہوا، مورخوں میں کئی مشہور شخصیتیں ہیں جن کے متعلق چند اشارات ضروری ہیں، محمد امین ابن ابو الحسین قزوینی شاہجہ...

---

[1] دیکھو عمل صالح۔ جلد دوم ص ۳۳۶

Marfat.com

کی تخت نشینی کے پانچ سال بعد مغلیہ سلطنت میں ملازم ہوا، چند سال بعد اس کو سرکاری مورخ مقرر کیا گیا، چنانچہ اس نے اس عہد کی تاریخ ابتدا سے لکھی۔ خود شاہجہاں نے اس کی کتاب کا نام بادشاہ نامہ رکھا، لیکن شاہجہاں چاہتا تھا کہ اس کے عہد کے حالات ابوالفضل کے طرز پر لکھے جائیں۔

اس خدمت کے لئے ابوالفضل کے ایک شاگرد عبدالحمید کا انتخاب ہوا، اس نے بیس سال کے حالات لکھ کر علامی سعد اللہ کو دکھلائے لیکن اب وہ ضعیف ہوچکا تھا اس لئے آخری دفتر اس کے ایک مددگار محمد وارث نے تیار کیا اور فاضل خاں نے نظر ثانی کی، پہلے دو دفتر یعنی وہ حصہ جو عبدالحمید کی تالیف ہے کلکتہ سے شائع ہوچکا ہے، محمد صادق کی تواریخ شاہجہانی اس لئے اہم ہے کہ دارا کی شکست کے بعد شاہجہاں اور اورنگ زیب میں رسل و رسائل کا سلسلہ محمد صادق ہی کے ذریعہ شروع ہوا تھا اور ان واقعات کو اس نے نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ محمد صالح کنبوہ کی تصنیف عمل صالح اس عہد کی مفصل اور مبسوط تاریخ ہے، تین حصوں میں شائع ہوچکی ہے ان کے علاوہ اس عہد کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

ل کیٹلاگ برٹش میوزیم جلد اول ص ۲۶۲

Marfat.com

باب چہاردہم

تبلیغی و اصلاحی کوشش

۱۵۷۵ - ۱۶۵۷ء

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں دینی بے راہ روی کا جو طوفان درباری حلقوں سے اٹھا تھا اور طبقہ امراء کے بعض افراد کی سرپرستی میں بڑھتا جا رہا تھا اس کا رد عمل اسی زمانہ میں شروع ہو گیا تھا، جن علماء اور مشائخ نے کھلم کھلا اور انفرادی طور پر بغیر کسی تنظیم کے بے دینی اور الحاد کا مقابلہ کیا ان کو جان کی بازی تک لگانی پڑی، پھر بھی ان کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی، لیکن اسی زمانہ میں بعض ذہین اور مقدس ہستیاں ایسی بھی پیدا ہوئیں جنہوں نے دینی اصلاح کو تنظیمی حیثیت دے کر تحریک کی شکل دی، بعض تذکرہ نویسوں نے اس تحریک کا بانی حضرت شیخ احمد سرہندی کو قرار دے کر اس کی تاریخی نوعیت کو محدود شکل میں پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کے بیانات کا موجودہ دور کے بعض مصنفین پر گہرا اثر ہوا ہے[1] اس طرح ہماری ثقافتی تاریخ کے ایک اہم باب کو غلط نہیں تو ناکافی طریقے سے پیش کیا جا رہا ہے، اصلاحی تحریک کے اس نامکمل تجزیہ کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تذکرہ نگار اکثر واقعات کی تاریخی ترتیب اور ان کے آپس کے رد عمل کو نظر انداز

---

[1] اس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

Marfat.com

کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سلسلہ میں جزئیات اور تفصیلات کا جس قدر گہرا مطالعہ کیا جائے گا اسی قدر موضوع کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں ہم مسئلہ کے صرف اہم پہلوؤں اور چند نمایاں شخصیتوں کی کوششوں کا ذکر مختصر الفاظ میں کرنا چاہتے ہیں۔

اسلامی دور اقتدار کی ابتدائی منزلوں میں دینی زندگی کے باغ کو سینچنے اور شاداب رکھنے میں صوفیائے کرام کا بہت بڑا حصہ تھا اور اب جبکہ اس باغ کو الحاد کی طوفان خیز ہواؤں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا تو پھر اسی طبقے کے بزرگوں نے اس کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لیا۔[1] ان ہی کی خانقاہوں میں وہ سپاہی تیار ہوئے جنہوں نے باطل کی قوتوں کا کامیاب مقابلہ کر کے دین اور ملت کی شیرازہ بندی کو تباہی سے بچایا۔ علماء خالص[2] کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں، وہ شکست فاش کھا چکے تھے[3]۔ اس منزل پر گوشہ نشین

---

[1] یہ نظریہ صرف ہندو پاکستان کی تاریخ ہی کے لئے صحیح نہیں بلکہ جیسا کہ پروفیسر گب نے آکسفورڈ میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا۔ اسلام کی ساری تاریخ میں ہم کو یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھو اسلامک کلچر حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء ص ۲۶۵

[2] علماء خالص سے مراد وہ حضرات ہیں جو سلسلہ مشائخ سے وابستہ نہ تھے بلکہ صوفیاء پر طعن و تشنیع کرتے تھے اور خود کو ایک علیحدہ طبقہ میں رکھتے تھے۔ ایک روشن مثال اس عہد کے علماء میں شیخ عبد النبی کی ہے جو حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔[3] اوپر کے صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ ۱۵۷۹ء میں مشاہیر علماء بشمول شیخ مبارک کے تیار کردہ اس محضر پر دستخط کر دیئے تھے جس کی رو سے سلطان عادل کا رتبہ مجتہد سے زیادہ ہو گیا تھا۔ یعنی بعض قیود کے ساتھ بادشاہ کا فیصلہ دینی مسائل میں بھی آخری ہو گیا تھا اگرچہ بعض علماء نے اس محضر پر دستخط خوشی سے نہیں کئے تھے لیکن اصولی طور

Marfat.com

فقراء نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بالآخر وہ کامیاب ہوئے، یہاں یہ امر ذہن میں رکھنا چاہئے کہ علماء اور مشائخ کے طریقہ کار میں نمایاں فرق تھا، علماء کو ہر مسئلہ پر شرعی نقطۂ نظر سے فتویٰ دینا پڑتا تھا، اس سلسلہ میں وہ زیادہ تر منقولات سے کام لیتے تھے اور ان ہی پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے تھے۔ اس فن میں شیخ مبارک اور اس کی فوج کے دوسرے سپہ سالار بھی کچھ کم ماہر نہ تھے، چنانچہ اکثر معرکوں میں وہ فتح حاصل کر لیتے تھے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ان کو بادشاہ وقت کی سرپرستی حاصل تھی، برخلاف اس کے مشائخ نے روحانی اثرات سے کام لیا، حکومت کی مشینری میں بادشاہ کے بعد سب سے زیادہ اہم پرزے اس کے امراء اور لشکری تھے، چنانچہ مشائخ نے ان ہی سے کام لیا اور ان میں سے بعض کو اسلام کا اس قدر گرویدہ بنا لیا کہ آخر کار ان کے اثر سے حکومت اور حکمرانوں کا رویہ بدل گیا، بے دینی اور الحاد کا وہ طوفان جو بادشاہی سرپرستی میں بڑھ رہا تھا، اب بڑی حد تک رک گیا، یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ جس طرح موجودہ دور میں دفاع کے بہترین اور جدید ترین ہتھیاروں کی تیاری کے لئے تجربے سائنس کی لیبارٹریوں میں کئے جاتے ہیں اسی طرح ان امراء کا کردار جنہوں نے اس میدان میں جہاد کیا وہ زیادہ تر خانقاہوں کے گوشوں میں سنوارا جاتا تھا۔ اس دور کے امراء میں ہم کو متعدد ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جنہوں نے یا تو بادشاہ کو براہ راست دینی بے راہ روی سے روکنے کی کوشش کی یا ایسے طریقے اختیار کئے کہ غیر اسلامی رسم و رواج عام نہ ہو سکے۔

اکبر کے درباریوں میں خدا ترس اور با ایمان امراء کی تعداد غالباً کم نہ تھی ان میں چند ان نامور شخصیتوں کا ذکر ضروری ہے، جنہوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے کردار کے گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے ہیں، ایک خصوصیت ان امراء کی قابل ذکر ہے: یہ سب علماء اور مشائخ سے وابستہ تھے اور ان ہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ بادشاہ کی خوشنودی پر اسلام اور ایمان کو اور دنیوی جاہ و حشمت پر عقبیٰ کو ترجیح دیتے تھے، امراء

Marfat.com

کے اس طبقہ میں مرزا عبدالرحیم خانخاناںؒ[1] خان اعظم عزیز کوکہؒ نواب میاں محمد خاں نیازیؒ شہباز خان کنبوہ اور شیخ فرید کے نام سرورق نظر آتے ہیں، لیکن ان سب میں آخرالذکر یعنی شیخ فرید کے کارنامے زیادہ نمایاں ہیں۔

شہباز خاں کنبوہ

عبدالرحیم خانخاناں صرف اپنی علم پروری اور ادب نوازی ہی کے لئے مشہور نہیں بلکہ دین و معاشرہ کو بھی اس کی مدد سے بہت تقویت پہنچی، بیرام خاں تو شیعہ تھا مگر یہ خانخاناں مذہب سنت و جماعت را برگزیدہ بود"؛ اس میں ذاتی خوبیاں بہت تھیں لیکن مورخین نے اس کی ایک کمزوری کا بھی ذکر کیا ہے۔ شیخ فرید بھکری کی نظر میں ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ "در لباس دوستی، دشمنی با دشمن باید کرد" خود شریعت کا پابند تھا۔ اگرچہ ایک مرتبہ اکبر نے اس کو شراب پلاہی دی تھی[2] شاہ باز خاں کنبوہ یقیناً داد کا مستحق ہے۔ بادشاہ کے دباؤ سے بھی اس نے لغزش کو پاس نہیں آنے دیا۔ نواب مذکور کے متعلق شیخ فرید کے الفاظ یہ ہیں:-

---

[1] شیخ عبدالحق اور شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات جو مرزا کے نام ہیں اس سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

[2] بعد میں یہ دین الٰہی میں داخل ہو گیا تھا۔

[3] شیخ فرید نے ان کی دینی خدمات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

در ترویج دین متین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سعی داشت و اوقات شریف را قسمت کردہ بود، بعد از نماز فجر تا نماز ظہر بہ تلاوت کلام مجید و تفسیر و مطالعہ کتب تواریخ و سیر و مثنوی شغل داشت۔

Marfat.com

بہ در رسوخ دین اسلام و تعظیم علماء و صلحاء و فقراء نوعے می کوشیدند کہ در تمام عمر نماز خمس گانہ با تہجد و اشراق و ضحیٰ با سنت عصر ان الشان قضا نہ شدہ بود و بے وضو نہ ماندہ و پوشاک خارج از مسنون نہ پوشیدہ و ہمیشہ تسبیح بدست داشت، صلوات بر سرور عالم می خواند و مابین نماز عصر و مغرب مستقل نشستہ تکلم دنیوی نمی کرد۔[1]

شاہ باز خاں کے کردار کا ذکر کر کے مصنف کو ایک دلچسپ واقعہ نقل کرتا ہے :۔

ایک روز شام کو حضرت عرش آشیانی (اکبر) فتحپور میں تالاب کے کنارے ہوا کھا رہے تھے، یکایک انھوں نے شاہ باز خاں کا ہاتھ پکڑ کر اس کو امراء کی قطار میں سے علیحدہ کر لیا اور تالاب کے کنارے پر تنہا لے گئے۔ نواب گھڑی گھڑی سورج کی طرف دیکھتا تھا کہ نماز کا وقت قضا ہوا جا رہا ہے لیکن ہر بار بادشاہ اس کی طرف توجہات خسروانہ فرما کر روک لیتا تھا۔ مجھ سے مرزا محمد سعید ولد میرم قلیچ برادر زادہ قلیچ محمد خان جو میرے پاس دیوان گری پر تعینات تھا کہتا تھا کہ میں اس روز امراء کے حلقہ میں موجود تھا۔ حکیم ابو الفتح[2] و حکیم علی

---

[1] ذخیرۃ الخوانین ص ۱۵۸ [2] ابو الفتح گیلانی، اسلام دشمنی میں اور دہریت نوازی کے لئے مشہور تھا، اہل دین کی توہین کرنے میں وہ ابو الفضل وغیرہ سے بھی کئی درجہ بلند تھا۔ اس کی موت کا واقعہ دلچسپ ہے۔ ۹۹۷ھ میں بادشاہ کشمیر گیا، وہاں ایک بزرگ شاہ عارف حسینی تھے جو منہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے، بادشاہ نے بغرض امتحان ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح کو شاہ عارف کے پاس بھیجا، انھوں نے کہا کہ شاہ صاحب آپ نقاب اٹھا دیں تو ہم بھی آپ کا جمال

Marfat.com

کہہ رہے تھے کہ آج شہباز نے نماز کو قضا نہ ہونے دیا تو ہم اس کے مرید ہو جائیں گے اور یقین کر لیں گے کہ حقیقتاً دین دار آدمی ہے، اور اگر آج عواطف خسروانہ سے مغرور ہو کر نماز قضا کر دیتا ہے تو اس سے ترک تعلقات کر لیں گے اور سمجھ لیں گے کہ دین میں مقلد ہے، اتفاق سے جب شہباز خان نے دیکھا کہ نماز کا وقت بہت تنگ ہو گیا ہے تو بادشاہ سے التجا کی کہ نماز کا وقت جا رہا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ قضا پڑھ لینا، کیا ہم کو تنہا چھوڑ جاؤ گے؟ خان مذکور نے اپنا ہاتھ بادشاہ کے ہاتھ سے چھڑایا اور دوپٹہ کو زمین پر بچھا کر نماز شروع کر دی اور بہت حضور و خشوع کے ساتھ اس کو ادا کیا اور اپنے قدیم دستور کے مطابق قبلہ رو سجدہ کر تسبیح شروع کر دی، تھوڑی تھوڑی دیر بعد حضرت عرش آشیانی اپنا ہاتھ اس کے سر پر مارتے اور کہتے کہ اٹھ لیکن وہ اسی طرح شاغل بحق رہا۔ حکیم ابوالفتح نے کہا کہ واقعی اس شخص نے دین داری کا حق ادا کر دیا، اب بیکار بات ہے، ہم کو چاہیے کہ اس کو نجات دلائیں، حکیم مذکور اور دوسرے

ہم دیکھ سکیں گے، شاہ عارف نے جواب دیا کہ بھائی ہم فقیر لوگ ہیں ہم کو نہ ستاؤ۔ ابوالفتح نے بد تہذیبی کا مظاہرہ کیا اور نقاب کھینچنا چاہا۔ شاہ عارف نے نقاب اتار دیا اور زمین پر پھینک دیا لیکن ساتھ ہی حکیم سے کہا کہ تو نے میرا منہ تو دیکھ لیا اب اس کا نتیجہ بھی دو ہفتہ کے اندر ہی دیکھ لے گا۔ ابھی چند روز نہ گزرے تھے کہ حکیم ابوالفتح مرض اسہال میں مبتلا ہوا اور مر گیا۔ بدایونی نے تاریخ دی ہے:

خدایش سزا دہاد (۹۹۷)۔ دیکھو ص ۲۶۴

دوسرے امراء بڑھ کر بادشاہ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ حضورؐ عنایت خسروانہ تنہا ایک شخص پر مناسب نہیں، دوسرے غلام بھی ان کے امیدوار ہیں۔ حضرت نے اس کو چھوڑ دیا۔ شہباز خاں جب تک زندہ رہا برخلاف دوسرے امراء کے نہ اس نے داڑھی منڈوائی اور نہ شراب پی۔"[1]

شاہ باز خاں کا یہ واقعہ تاریخ کے صفحات پر زرین حروف میں لکھا جائے گا۔ مستبد اور خود سری کی قوتوں کے مقابلہ میں بالخصوص جبکہ ان کو مطلق العنانی کی پوری حمایت حاصل ہو اپنے اصول پر اس طرح قایم رہنا اور جان و مال اور عزت و جاہ کو پرِ کاہ کی برابر بھی نہ سمجھنا کئی لحاظ سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، یہ تو اقتباس بالا کے الفاظ سے ہی ظاہر ہے کہ ابوالفتح جیسے دہریت نواز امیر کا دل بھی جو بادشاہ کے خاص معتمدوں میں تھا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہا، اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عامۃ المسلمین پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا اور بے دینی کے بڑھتے ہوتے اثر کو روکنے میں شہباز خاں کے کردار نے کیا رول ادا کیا ہوگا، شہباز خاں کا تعلق قادریہ سلسلہ سے ہوگا اس لئے کہ یہ شیرینی ہر شب جمعہ بہ ارواح طیبہ طاہرہ حضرت سلطان العارفین محبوب سبحانی شاہ محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز، یک صد اشرفی کہ ہزار و چار صد روپیہ باشد قسمت می کرد۔"

حضرت خواجہ باقی باللہ

جن بزرگوں نے امراء کے کردار کی تعمیر مسلمانوں کو دین پر قایم رکھنے اور معاشرہ کو انتشار سے بچانے کی کوششیں کیں ان سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں، لیکن چند شخصیتیں اس سلسلہ میں اس قدر نمایاں نظر آتی ہیں اور ان کی مساعی نے ہماری تاریخ پر اتنا گہرا اثر کیا ہے کہ ان کے کارناموں کا مختصر حال لکھا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں چشتیہ، قادریہ، اور

---

[1] ذخیرۃ الخوانین ص ۱۶۰

Marfat.com

نقشبندیہ سلسلوں کے بزرگوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اور مخصوص طریقوں سے کوشش کی، چشتیہ حضرات میں شیخ جلال الدین تھانیسری (متوفی ۹۸۹ھ) شیخ عبدالعزیز دہلوی (متوفی ۹۷۵ھ) اور ان کے بعد ان کے لڑکے حضرت شیخ قطب عالم ("عالم و فاضل و صاحب اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ قدم صدق و استقامت بر سجادہ پدر نہادہ اوقات بطاعت و عبادت معمور دارد"[۱]) قابل ذکر ہیں۔

قادریہ سلسلہ میں شیخ موسیٰ گیلانیؒ، شاہ ابوالمعالی جیسے حضرات نے گراں بہا خدمات انجام دیں، لیکن نمایاں طور پر اس فتنہ کو رد کرنے کی کوشش حضرت خواجہ باقی باللہؒ نقشبندی اور بعدہٗ ان کے خلیفہ شیخ احمد سرہندیؒ نے کی۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی اپنی زندگی اسی کوشش کے لئے وقف کر دی تھی۔

خواجہ باقی باللہؒ ۹۷۱ھ / ۱۵۶۴ء میں کابل میں پیدا ہوئے اور اس عہد کے ایک فاضل بزرگ ملا صادق حلوائی کی خدمت میں تعلیم حاصل کی۔ مشہور ہے کہ آپ ابھی درسی کتب کے مطالعے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ ایک مجذوب نے مخاطب کر کے کہا:

در کنز و ہدایہ نتوان دید خدا را
آئینہ دل بین کہ کتابے بہ ازیں نیست

اس کے بعد ان کی طبیعت مطالعے سے اچاٹ ہو گئی اور تلاش حق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر کار وہ برصغیر میں داخل ہوئے اور کچھ عرصہ تک لاہور میں مقیم رہے، یہیں اُن کے تعلقات شیخ فرید بخاری سے قائم ہوئے اور موخر الذکر نے آن کے مصارف کی ذمہ داری لی۔ لاہور میں کچھ مدت قیام کرنے کے بعد وہ دہلی میں آئے اور شیخ قطب عالم کی خانقاہ [illegible] میں رہ کر یاد حق کرنے لگے۔ ایک شب کو شیخ قطب عالم پر منکشف ہوا کہ خواجہ باقی باللہ

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۰۵

کی تکمیل بخارا میں ہوگی، وہ فوراً خواجہ صاحب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ وہ بخارا روانہ ہو جائیں، وہاں وہ ایک بزرگ سے بیعت ہوئے اور تکمیل تعلیم کے بعد پھر ہندوستان آئے۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ خواجہ صاحب کو دہلی میں قیام کئے ہوئے تین چار سال ہی گزرے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی (۱۶۰۳ء) لیکن اس قلیل مدت میں خواجہ باقی باللہ نے جو مقبولیت حاصل کرلی تھی اور ان کا احترام جس درجہ کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جس کا ذکر شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں کیا ہے۔

> شیخ قطب عالم کے بیٹے شیخ رفیع الدین محمود کی شادی تھی، انہوں نے حضرت خواجہ کو مدعو کیا اور اصرار کیا کہ وہ شرکت فرمائیں، ان کی تشریف آوری کی جب خبر عام ہوئی تو بقول شاہ ولی اللہ صوفیائے آن ناحیہ ...... ہمہ جمع آمدند و در نواحی صد کردہ کم کسے باشد از صوفیا کہ در آن صحبت حاضر نشد، مجلس عجیب کہ ہرگز مثل آن مسموع نہ شدہ منعقد گشت![1]

یہ تو ظاہر ہے کہ تین چار سال کی مختصر مدت میں حضرت خواجہ اپنی تحریک کو بہت زیادہ وسعت نہیں دے سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے مریدوں اور معتقدوں میں ایسے لوگ تیار کردئے جنہوں نے ان کے بعد بھی اس کام کو جاری رکھا، ان کے خلفاء میں شیخ احمد سرہندی کا ذکر آگے آئے گا، لیکن ان امراء کے متعلق بھی کچھ کہا جاسکتا ہے جو ان کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلے، ان میں سب سے پہلا نام شیخ فرید بخاری کا ہے۔

شیخ فرید نواب مرتضیٰ خاں بخاری

شیخ فرید بخاری دہلی میں پیدا ہوئے۔ اکبر کے زمانہ میں باوقار امراء کی فہرست میں شامل ہوگئے، جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ان کے مناصب وجاہ میں اور بھی اضافہ

---

[1] دیکھو انفاس العارفین۔ (مطبع مجتبائی) ص ۱۴۳

Marfat.com

ہوا، اکبر نے ان کو کئی بڑی مہموں پر بھیجا جن میں ۱۵۸۳ء میں بنگال کی بغاوت، تین سال بعد کشمیر کی فتح اور اسی صدی کے آخری سال میں اسیر گڑھ کے محاصرے کا ذکر خاص طور پر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ملکی خدمات اتنی اہم سمجھی جاتی تھیں کہ ابوالفضل کو بھی باوجود شیخ فرید کی دین داری کے ان کی تعریف کرنی پڑی، شیخ کا عہدہ تو میر بخشی کا تھا مگر بقول صاحب ذخیرۃ الخوانین "وہ بخشی و وزیر ہندوستان تھے۔" اکبر کو ان پر کس قدر اعتماد تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ دہلی میں خود ان کے یہاں مہمان ہوا، اور بھی واقعات تاریخوں میں موجود ہیں جن سے شیخ کی بلندی مراتب کا پتہ چلتا ہے۔ اکبر کی وفات کے وقت جہانگیر کی تخت نشینی کے سلسلہ میں جو نمایاں کردار ادا کیا وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد شہزادہ خسرو کی بغاوت کے فرو کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا، اسی کامیابی کے صلہ میں جہانگیر نے ان کو نواب مرتضیٰ خاں کا خطاب دیکر گجرات کی گورنری پر ان کا تقرر کیا۔ بعد میں ان کو لاہور کا گورنر بنا دیا گیا اور وہیں ان کا انتقال ۱۶۱۶ء میں ہوا۔ شیخ فرید کے کردار کی تعمیر میں کئی بزرگوں کی تعلیم و تربیت کو دخل ہے۔ یوں تو بقول شاہ ولی اللہ "شیخ فرید جامع بود در میان نجابت و صلاح و اعتقاد مشائخ صوفیا" لیکن جن بزرگوں سے ان کے خاص تعلقات تھے ان میں خواجہ باقی باللہ، شیخ عبدالحق اور شیخ احمد سرہندی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خواجہ باقی باللہ سے شیخ کے تعلقات بہت گہرے تھے، یہاں تک کہ بعض کوتاہ بین سیاہ دل کہتے ہیں کہ حضور کی مشیخت کا مدار یگانہ زمانہ مرجع خلق اولو الالباب ذوی الالقاب شیخ فرید سلمہ اللہ تعالیٰ کی دوستی پر ہے اور ہمیشہ رقعات میں جو شیخ کو لکھتے ہیں ان کا نام فلاں گاہی سلامت باشند تحریر فرماتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم پر شیخ کے بہت حق ہیں اور ان کے وجود کی برکت سے ہم نے بڑی فتوحات

Marfat.com

اور کشائش دیکھی ہیں"[1] حضرت شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات میں بھی شیخ کی خدمات اور ہمدردی کا ذکر متشکرانہ انداز میں ہے اور ساتھ ہی شیخ پر اصرار ہے کہ وہ بادشاہ کو راہِ راست پر جس سے ان کا مطلب پابندی شریعت ہے، چلنے کی ہدایت کرتے رہیں[2] یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیخ فرید کی سرکردگی میں امرا نے جہانگیر سے وعدہ لیا تھا کہ وہ حکومت کے معاملات میں اپنے پیشرو کی دینی بے راہ روی کو دخل انداز نہیں ہونے دیگا[3]۔ ان کوششوں کا نتیجہ کیا ہوا ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے۔ لیکن یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ تخت نشینی کے بعد ہی جہانگیر نے جو "احکام دوازدہ گانہ" صادر کئے ان میں مسجدیں بنوانا ہی شامل نہیں بلکہ "مصارف شرعی" پر زور دیا گیا ہے۔ سلطنت کی پالیسی پر اثر انداز ہونے کے علاوہ شیخ کے اپنے ذاتی کردار کا اثر بھی معاشرہ پر بہت گہرا ہوا ہوگا[4]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۹۵۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے والد محترم مولانا سیف الدین، عالم ہونے کے علاوہ اہل دل بھی تھے۔ اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق نے اپنے والد کے متعلق لکھا ہے:-

"در شعر و فضیلت در لطائف و بے تعلقی و وارستگی و طیب قلب و حضور ذاکر و ذکر لطائف و نکات و فہم دقائق و ارشادات یگانہ روزگار و افسانہ دیار خود"[5]

---

[1] بحوالہ رود کوثر ص ۱۸۴ [2] مکتوبات۔ جلد اول۔ مکتوب ۴۷ [3] دیکھو بینی پرشاد تاریخ جہانگیر (انگریزی) ص ۱۷۷ و سری رام شرما۔ دی ریلیجس پالیسی آف دی مغلز (انگریزی) ۱۲۷

[4] شیخ فرید بخاری کے حالات۔ ذخیرۃ الخوانین میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، یہاں ان کی داد و دہش، زہد و تقویٰ اور ملکی خدمات کے سلسلہ میں متعدد واقعات موجود ہیں

[5] اخبار الاخیار ص ۲۹۱

Marfat.com

ایک اور مقام پر فقر و فنا سے ان کی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

از عالم نیستی و فقر و فنا و توحید و تجرید نصیبہ کامل داشت.......

ہر کرا بعنوان محبت نظر می کرد، بقدر استعداد مناسب حال اثر قبول می آورد۔[1]

سیف الدین اپنے عہد کے ایک مشہور بزرگ شیخ امان اللہ پانی پتی سے بیعت تھے۔ شیخ امان اللہ علمائے صوفیاء موحدین میں سے تھے۔ وہ شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کے نظریہ کے حامی تھے۔[2] مولانا سیف الدین کو اپنے شیخ سے بے حد عقیدت تھی[3] اور ان کے خیالات سے بھی بہت متاثر تھے۔ محبت الٰہی میں وہ ایسے سرشار تھے کہ صرف یہی نہیں کہ جاہ و دولت کی طرف توجہ نہ تھی بلکہ مرض الموت میں ہر آنے والے سے کہتے کہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے جلد از جلد یہاں سے بلا لے۔ کھانا پینا بھی ترک کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ

دوا از برائے این نمی خورم کہ مبادا سبب بقائے من شود، مارا بردہ کہ این جا می رند بگذاشت می برد۔[4]

شیخ عبدالحق نے ابتدائی تعلیم و تربیت آغوش پدری میں حاصل کی [illegible]

---

[1] رسالہ وصیت (قلمی) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۲۷۲

[2] شیخ عبدالحق لکھتے ہیں کہ "در علم این طائفہ مرتبہ بلند و پایہ ارجمند داشت، و در تقریر مسئلہ توحید بیان شافی و تقریر وافی داشت۔ توحید را ناش گفتند" اخبار الاخیار ۲۳۴

[3] مولانا سیف الدین نے اپنے پیر کے کمالات کا ذکر ایک مثنوی میں کیا ہے [illegible] یہ ہے

ہر چہ زمن در سخن آید یقین ❊ ہست ہم از صحبت آن مرد دین

[4] اخبار الاخیار ۲۹۹

معمولی طور پر ذہین تھے اس لئے بہت جلد ترقی کی، ان کے والد کو اس سے خوشی ہوتی تھی اور کہتے تھے کہ: "انشاء اللہ تو زود دانش مند شوی" سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم عقلیہ و نقلیہ سے فراغت حاصل کر لی، شیخ نے اپنی طالب علمی اور کتب بینی کے متعلق جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم میں کمال حاصل کرنا چاہتے تھے، دن بھر تو پڑھتے اور مطالعہ کرتے ہی رہتے تھے لیکن رات کو بھی دیر تک اسی میں مصروف رہتے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے والد تقاضا کرتے کہ اب سو جاؤ، ان کے کہنے سے "فی الحال دراز کشیدم تا دروغ واقع نہ شود و می گفتم کہ خفتہ ام چہ می فرمایند۔ باز برمی نشستم و مشغول می شدم" عرق ریزی کا یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور یہی جانفشانی تھی، جس نے ان کو عالم بے بدل بنا دیا لیکن اس سے بھی زیادہ بلند ان کی نظر میں ایک اور مقصد تھا فرماتے ہیں:۔

"اگر آن قدر ذوق و شوق در طلب مولیٰ و ریاضت باطن می بود تا کار بہ کجا می کشید"[1]

اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ عبادت کا شوق طالب علمی کے زمانہ میں کچھ کم تھا خود ہی کہتے ہیں کہ:۔

"باوجود شوق و شغف تحصیل و تکرار علم در کثرت صلوٰۃ و اوراد شب خیزی و مناجات ہم دران طفولیت ...... بوجود می آمد"[2]

نوجوان دانش مند نے کچھ مدت دار الحکومت میں گذاری اور یہی زمانہ تھا جب کہ ان کے تعلقات فیضی سے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے، اگرچہ بعد میں جب فیضی کی بے دینی

---

[1] اخبار الاخیار ص ۳۰۲

[2] ایضاً ص ۳۰۳

Marfat.com

ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی تو شیخ نے کشیدگی اختیار کرلی، بہرحال شیخ عبدالحق کی علمیت اور ذہانت کی شہرت ایسی تھی کہ اکبر اور اس کے ہم مشربوں نے ان کو جال میں پھانسنے کی کوشش کی، ان کا خیال تھا کہ اگر وہ پھنس گئے تو بہت فائدہ ہوگا لیکن شیخ بچ نکلے اور بہ حالت بے سروسامانی مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"........ جب اللہ کے کرم سے مجھے (علم کا) اچھا خاصہ حصہ مل گیا اور میں نے اپنی ضروریات یہاں کی چیزوں سے پوری کرلیں تو بعض اہل حقوق نے مجھے دنیا دار لوگوں کی طرف بلایا، چنانچہ میں بادشاہ وقت اور امراء کے پاس گیا، انہوں نے بہت توجہ کی، میرا رتبہ بلند کیا اور یہ ارادہ کیا کہ میرے ذریعے اپنی جماعت بڑھائیں اور مجھ کمزور سے اپنی طاقت مضبوط کریں، پس اللہ نے مجھ کو محفوظ رکھا اور ان کے پاس رہنے نہ چھوڑا، اپنے بندے کے دل میں ایک جذبہ پیدا کیا جس نے اس مقام شریف تک پہنچایا۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس صرف اس لئے اہم نہیں کہ اس سے شیخ عبدالحق کی زندگی کے ایک پہلو اور ان کے تصور حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دین الٰہی کے حامی جن میں خود اکبر بادشاہ بھی شامل تھا، فضلاء وقت کو کسی طرح لالچ دے کر اپنی تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ صرف وہ لوگ جو شروع ہی سے بلند کردار ہوتے اس جال میں پھنسنے سے بچ سکتے تھے۔ شیخ عبدالحق ان ہی لوگوں میں تھے چنانچہ وہ اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ اس آزمائش میں

---

[1] زاد المتقین بحوالہ حیات عبدالحق ص ۹۲-۹۱

Marfat.com

پورے اترے اور دین کی خاطر دنیوی جاہ و مال پر انہوں نے ٹھوکر ماردی، اس زمانے میں حالات اتنے بگڑ گئے تھے کہ ان کے دل میں ہجرت کا جذبہ مضبوطی پکڑنے لگا۔ ان کے خیال میں یہاں کی فضا میں ان کا رہنا مناسب نہ تھا، وہ جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتے تھے، عبدالقادر بدایونی نے جو ان سے خوب واقف تھا اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

بوجود وضع زمانہ و زمانیاں کہ ہمہ محل و بر مکارہ طبیعی مشتمل است دیگرگون شد و بر اوضاع آشنایان اعتماد نماند، بصحبت فلانے و فلانے باور است نیامد و توفیق رفتن بہ کعبہ شریف رفیق او شد از دہلی بہ طریق جذبہ بہ ہیچ چیز مقید نہ شدہ بہ گجرات رفت[1]

راستہ میں مانڈو میں مرزا عزیز کوکہ کے پاس رہے اور گجرات میں نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری کے مہمان ہوئے، غرض کہ شیخ ۱۵۸۸ء میں حجاز پہنچے اور چار سال تک وہاں قیام کیا۔ شیخ کی خوش قسمتی تھی کہ مکہ میں ان کو ایک بلند پایہ عالم اور بزرگ۔۔۔ عبدالوہاب متقی[2] سے تلمذ کا موقع ملا اور حدیث ان ہی سے پڑھی، شیخ عبدالوہاب کی نمایاں خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اختلافی مسائل میں میانہ روی کا انداز اختیار کرتے تھے مثلاً ان کا رویہ:۔

درباب کتب حقائق و توحید مثل فصوص و امثال آن توقف و تسلیم است

---

[1] بدایونی ص ۳۱۷

[2] شیخ عبدالوہاب مندو میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۵۵۵ء میں مکہ معظمہ چلے گئے اور شیخ علی متقی کے درس میں شامل ہوئے اور بعد میں خود بھی وہیں مقیم ہو گئے، اخبار الاخیار میں شیخ نے اپنے استاد کا مفصل حال لکھا ہے ص ۲۶۱ - ۲۷۱ -

Marfat.com

"این ہا ما درس نگویند و بدان اشتغال نکنند و انکار ہم نکنند بد نگویند و چنانچہ عادت فقہا است بہ طعن و تشنیع پیش نیایند"[۱]

شیخ عبدالوہاب نے اپنے شاگرد کو درس حدیث کے علاوہ باطنی تعلیم بھی دی۔ تصوف کی کتابیں بھی پڑھائیں، اور "این مسکین را تلقین ذکر نمود و اجازت داد" حجاز جانے سے پیشتر شیخ عبدالحق پہلے اپنے والد اور بعدہ ان ہی کے کہنے سے شیخ موسیٰ گیلانیؒ[۲] سے قادریہ سلسلہ میں بیعت ہو چکے تھے۔ شیخ عبدالوہاب سے چشتیہ شاذلیہ اور قادریہ سلسلہ کی خلافت ملی۔ حجاز سے واپسی پر شیخ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، چند سال بعد خواجہ باقی باللہ تشریف لائے تو شیخ نے نقشبندیہ سلسلہ میں ان سے بیعت کی اور کئی سال تک دونوں حضرات میں بے حد محبت کے تعلقات رہے۔ ابتدا میں وہ غالباً گوشہ نشینی کی زندگی اور درس و تدریس کے شغل ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ زمانہ کی بے راہ روی کا ان پر یہی رد عمل تھا۔ دوسرے ان کا خیال تھا کہ تعلیم کے ذریعہ سے وہ نئی نسل کا کردار سنبھال سکتے ہیں۔ طبیعت میں فقر اتنا اثر کر چکا تھا کہ اہل دنیا کو مدح آمیز القاب لکھنے سے بھی گھبراتے تھے۔ اس کا اظہار شیخ فرید کو ایک خط لکھتے وقت ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

---

۱۔ اخبار الاخیار: ۲۶۳

۲۔ شیخ موسیٰ گیلانیؒ شیخ حامد بن شیخ عبدالرزاق بن شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ کے بیٹے تھے اپنے والد مرشد کی وفات (۱۵...) کے بعد چھوڑ کر آگرہ آ گئے تھے انھیں شہنشاہ باوجودیکہ اکبر نے ان کو منصب عطا کیا تھا۔ ان کی بلند کرداری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ "در حضور پادشاہ در عین دیوانخانہ خاص و عام اگر وقت نماز می رسید خود اذان گفتہ نماز بحضور خلیفہ وقت بجماعت می گذارد و ہیچ کس چیزے نمی توانست گفت"۔
دیکھو منتخب التواریخ ۳: ۳۱۰

"در حفظ مراسم مدح و بیان شوق و محبت بر جادہ وسط و اعتدال ایستادن و از دائرہ احتیاط و نفس الامر بیرون نیفتادن در غایت دشواری است"[1]

اور پھر صاف تبلاتے ہیں کہ:۔

اگر براہ مبالغہ در مدح و ثنا نروند نامہ از خلیفہ عرف و عادت عاطل بود و اگر بروند عزیمت دین و صولت یقین باطل شود، اے کاش این رسم و عادت در عالم نبودے[2]

شیخ کی عزلت نشینی سے یہ نتیجہ نکالنا قطعی غلط ہوگا کہ وہ دنیا سے بے تعلقی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے تو سب سے مناسب مدینۃ الرسول اور اس کے بعد بغداد تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل بھی چاہتا تھا کہ حجاز ہی میں رہیں لیکن شیخ عبد الوہاب متقی نے ان کو ہندوستان کی واپسی پر مجبور کیا اور با دل ناخواستہ وہ یہاں آئے۔ بہر حال یہاں پہنچکر انہوں نے اپنا لائحہ عمل متعین کر لیا، دینی علوم کی تعلیم اور دینی جذبہ رکھنے والے امراء کی تربیت اور ان کو اس کے لئے تیار کرنا کہ اپنے اثر اور رسوخ کو دین کی حفاظت کے لئے کام میں لائیں، امراء میں شیخ فرید بخاری، خانخانان اور نظام الدین احمد سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے اور یہ تینوں اپنی دینی خدمات کے لئے ممتاز ہیں۔ شیخ فرید بخاری کو اس انقلابی قدم کے لئے تیار کرنے میں جو جہانگیر کی تخت نشینی کے وقت انہوں نے لیا اور جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، خواجہ باقی باللہ کے بعد شیخ عبد الحق ہی کا ہاتھ تھا، شیخ کے مکاتیب میں ایک خط شیخ فرید کے نام اکبر کی وفات پر ہے، ایک روایت کے مطابق تو یہ خط جہانگیر تک پہنچانے کی غرض ہی سے لکھا گیا تھا، بہر حال اس

---

[2] مکاتیب بحوالہ حیات عبد الحق ص ۱۴۵

Marfat.com

میں شک نہیں کہ شیخ کے ذہن میں لکھتے وقت یہ خیال ضرور تھا کہ ان کے خیالات نئے شہنشاہ تک پہنچ جائیں تاکہ وہ ان حرکات کا اعادہ نہ کرے جو اس کے باپ سے سرزد ہوئی تھیں، اس مکتوب کے ذریعہ شیخ عبدالحق نے بادشاہ کو دنیا کی بے ثباتی اور اقتدار کے نشہ میں عدل و توازن کو ہاتھ سے کھو بیٹھنے کے نتائج بتانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اکبر اور اس کے ہمنواؤں کی دینی بے راہ روی کا صحیح تجزیہ کیا تھا اگر وہ مطلق العنان بادشاہ اور وسیع اقتدار کا مالک نہ ہوتا تو یقیناً حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے، ابوالفضل وغیرہ کو اس کی خوشنودی کی ضرورت نہ ہوتی اور دین الٰہی کا مضحکہ انگیز ڈرامہ نہ کھیلا جاتا، ابوالفضل، فیضی اور حکیم ابوالفتح مر چکے تھے لیکن جو روایات وہ قائم کر گئے تھے ان پر چلنے والے اب بھی پیدا ہو سکتے تھے، دنیوی اقتدار کے ساتھ دینی پیشوائی کی ہوس کا شکار، اکبر کی طرح اس کا بیٹا بھی ہو سکتا تھا، چنانچہ شیخ عبدالحق سب سے پہلے اس پر زور دیتے ہیں کہ انسان غرور اور اقتدار کے نشہ میں موت کو بھول جاتا ہے

"بہ یقین می دانند کہ رسیدنی است اما چنین زندگی و بسر می برند کہ گویا نمی دانند"

پھر اس انسان کی کیفیت بیان کرتے ہوئے جو ہوس کے جال میں پھنس جاتا ہے فرماتے ہیں کہ اس شراب کی یہ خصوصیت ہے کہ جو گھونٹ پیا جاتا ہے اس سے خواہش اور تیز ہوتی ہے اور آدمی پیتے ہی چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس قدر مست ہو جاتا ہے کہ کوئی نصیحت اس پر اثر نہیں کرتی۔

"مستی و غرور دنیا و حکمرانی بجائے کشد کہ دعوئے خدائی و پیغمبری کنند دیگر چہ توان گفت"

فرعون کی مثال دیتے ہیں کہ "دعویٰ خدائی کرد" مگر ساتھ ہی نہایت اہم اشارہ کرجاتے ہیں کہ "دیگران را چہ گوید" اکبر نے خدائی کا دعویٰ کیا، نہ پیغمبری کا لیکن اس کے دربار کی

Marfat.com

مذہبی ہنگامہ آرائیوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے درباری اس کو دین الٰہی کا بانی یعنی پیغمبر بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ سمجھتے تھے، بادشاہ اس قسم کی خوشامد کا شکار ہوسکتا ہے اس لئے یہ بھی اپنے خط میں واضح کرتے ہیں کہ نشہ اقتدار میں مست یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ پیغمبری کے اوصاف خصوصی کیا ہیں، ان پر شیخ نے قدرے تفصیل سے بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ ان کے بغیر پیغمبری کیونکر حاصل ہوسکتی ہے، چونکہ اس دور میں عقلی دلائل کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اس لئے انہوں نے عقلی دلائل ہی پر زور دیا ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے لئے معصوم ہونا، ظاہر و باطن اور صورت و سیرت کی جملہ خوبیوں میں "از ہمہ کس افزوں تر و بالاتر" ہونا اس کے "نزدیکان" کا علم و عمل، زہد و تقویٰ اور نورانیت میں دوسروں سے ممتاز ہونا اور اس کی متابعت میں جامع کمالات بن جانا وغیرہ وغیرہ، یہ چیزیں ہیں جو پیغمبر کو پیغمبر بناتی ہیں۔

"پیغمبری نہ مجرد دعویٰ و غلبہ و سلطنت و شوکت است"

یہ سب باتیں بالکل صاف ہیں لیکن،

"با ماست چہ توان گفت۔ نعوذ باللہ من الغباوۃ الغوایہ"

اس کے بعد شیخ نفس اور روح کی خصوصیات اور تعلق کا ذکر کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ انسان کو معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے ورنہ جیسا کہ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے۔

"اگر بدانید آنچہ من دانم از احوال مبداء و معاد و آخرت کہ چہا رفتہ است
و چہا پیش آمدنی ست کم بخندید و بسیار بگریید"

لیکن مصلحت خداوندی یہی ہے کہ موت سے پہلے وہ چیزیں معلوم نہ ہوں ؎

خلق تا در جہان اسباب اند
ہمہ در کشتی اند و در خواب اند

آخر میں نہایت لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اس خیر و شر کی دنیا میں انسان کو کیا

Marfat.com

کرنا چاہئے۔ وہ بتلاتے ہیں کہ شر سے بچنے کے لئے ترک دنیا کا علاج بتلایا گیا ہے۔ لیکن ترک دنیا سے مطلب رہبانیت نہیں بلکہ یہ ہے کہ

"خلاف حق نکنند و از جادہ بیرون نروند و راہ و روشے کہ در دین و شریعت قرار دادہ اند از دست نہ دہند"

اس صورت میں وہ

"بظاہر با خلق باشند و بباطن با حق اند و اگر بصورت در دنیا باشند معنی تارک دنیا اند"

سالکان راہ خدا جو نفس کشی کا راستہ اختیار کرتے ہیں اس کی غرض موافقت حق ہے اور اگر کسی کا نفس خود حق کے موافق ہے اور راہ راست پر چلتا ہے تو مخالفت اس کی بے معنی ہے۔ اس اصول کی مزید تشریح کر کے بتلاتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے راہ سلوک بخود اس کے اپنے شغل میں موجود ہے۔ مکتوب کا ماحصل یہی ہے اور شیخ کے الفاظ اتنے اہم ہیں کہ ان کو بجنسہ نقل کرنا ضروری ہے:۔

سلوک ہر طائفہ حرفت اوست یعنی ہر کسے بر حرفتے و کارے کہ باشد اگر بر منہاج قاعدہ و ادب رود سالک است۔ دعوت شریعت فراہم بریں نہج است سرور کائنات و سید رسل صلوات اللہ و سلامہ علیہ ہیچ کس را از حرفتے کہ داشت بیرون نیاورد، مزارعان را در کار زراعت گذاشت و تاجران را در تجارت و متاہلان را با اہل و عیال و مجردان را در ترک و تجرید و اغنیا را با مال و منال و فقرا را با فقر و فاقہ و لیکن ہر طائفہ را دستور العمل مقرر داشت تا ایشان نہ لغزند و از جادہ بیرون نہ نہند بدان کہ آنچہ ایشان را از کفر و معاصی بیرون آورد و دیگر ہمہ را در دائرہ گذاشت۔ سر سعادتہا انقیاد شریعت و اعتقاد مسلمانی است و یقین داشتن بہ آنکہ ہر

Marfat.com

عمل را جزے است و ہر گروہ را جزائے نہ عاقبت عمل نیک، نیک و عمل بد، بد فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ...

.... و ہر کس ہر کارے مشروع کہ برائے خدا کند او را ہم دنیا شود و ہم آخرت فعند اللہ ثواب الدنیا والآخرۃ۔ عاقبت بخیر باد[1]

شیخ عبد الحق کا مذاق طبیعت درویشانہ تھا، وہ صوفی اور درویش تھے اور اگر حالات کا تقاضا اور مسلمانوں کی ضروریات مجبور نہ کرتیں تو شاید درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری نہ رکھتے لیکن ان کے اس مکتوب میں اور نیز دوسرے مکاتیب و رسائل میں شریعت کی ترویج اور اس کے انقیاد پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، یہ زمانہ کی اہم ضرورت تھی اور اصلاح کے لئے سب سے بڑا اقدام یہی تھا، اس کے دو سبب تھے، ایک تو یہ کہ بادشاہ کا ایجاد کیا ہوا نیا دین درحقیقت شریعت اسلام ہی پر جس کو کیش احمدی کہا جاتا تھا ایک ضرب کاری لگانے کی کوشش تھی، لہذا مسلمانوں کے لئے شریعت کی ترویج ہی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا، دوسرا یہ کہ بعض جہلا سمجھنے لگے تھے کہ طریقت اور شریعت متخالف طریقے ہیں اور ایک راہ پر چلنے والا دوسری راہ سے علیحدہ ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف چلتا ہے اس گمراہ کن جہالت نے اسلامی معاشرہ پر خراب اثر ڈالا، سولہویں صدی میں یہ کوئی نیا فساد نہ تھا، اس کی ابتدا بہت پہلے ہو چکی تھی، یہ ہی سبب ہے کہ علماء اور مشائخ دونوں کا تصور کچھ ایسا ہونے لگا تھا کہ عالم صوفی نہیں ہو سکتا، اور صوفی عالم نہیں ہو سکتا یعنی عالم کیلئے طریقت سے نا آشنا ہونا اور صوفی کے لئے شریعت کا احترام نہ کرنا دونوں کی ضروری خصوصیات ہیں، ان حالات سے حامیان دین الہی نے بہت فائدہ اٹھایا، علماء اور شریعت کے خلاف انہوں نے جو محاذ قائم کیا تھا اس میں صوفیاء کو وہ استعمال کرنا چاہتے تھے اور ایک حد تک وہ

---

[1] کتاب المکاتیب والرسائل الی ارباب الکمال والفضائل ص ۹۰-۹۱

کامیاب بھی ہوئے، بعض صوفیاء اپنی نادانی یا سیدھے پن سے اس جال میں پھنس گئے۔ صوفی تاج الدین[1] جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

یہ دو اسباب تھے یعنی شریعت پر دین الٰہی کی شکل میں اکبر اور اس کے ہم مشربوں کے متواتر حملے اور صوفی نما جہلاء کی شریعت کی طرف سے لاپرواہی جن کی وجہ سے خواجہ باقی باللہ شیخ عبدالحق اور بعض اور بزرگوں نے ترویج شرع پر اس قدر زور دیا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں جو کچھ کوشش غیر شرعی مراسم کو بند کرنے کی ہوئی وہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا۔[2] ان حضرات کی کوششوں کا کیا نتیجہ ہوا اس کا اندازہ چند واقعات سے لگایا جا سکتا ہے، جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے ایک سال کے اندر ہی "علماء اور دانایان اسلامیہ" کو حکم دیا کہ "مفردات اسماء الٰہی" کو جمع کریں تاکہ "ورد آنرا ورد خود سازم" اور "در شبہائے جمعہ با علماء و صلحاء و درویشان و گوشہ نشینان صحبت می دارم"[3] چار سال بعد وہ خود لکھتا ہے:۔

> درین روز ظاہر شد کہ کوکب پسر قمر خان بہ سناسی آشنائی پیدا کردہ و رفتہ رفتہ سخنان او کہ تمام کفر و زندقہ است در مذاق آن جاہل حب کردہ۔ عبداللطیف پسر نقیب خان و شریف نام زاہدے خود را درین ضلالت با خود شریک ساختہ بودہ است، چون این معنی شگافتہ شد زنجیرہا ندک ترسانیدن چند مقدمہ خود ماند کہ رساختند کہ ذکر آن کراہیت تمام

---

۱ دیکھو بدایونی، منتخب التواریخ ص ۲۰۲

۲ یہ سلسلہ شیخ احمد سرہندی نے جاری رکھا اور اس میں مزید کوشش کی اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۳ توزک ص ۱۰

Marfat.com

داشت. تادیب و تنبیہ آن را لازم دانستہ کوکب و شریف را بعد از شلاق مقید و محبوس ساختم و عبداللطیف را یک صد درہ در حضور مردم کہ در حضور زدند۔"

اس کے بعد لکھتا ہے اور یہ الفاظ قابل غور ہیں :۔

"این تنبیہ خاص بجہت حفظ شریعت بودہ تا دیگر جاہلان امثال این امور ہوس نہ کنند۔"[1]

اس کے بعد دو سال کے اندر ہی وہ ایک حکم دیتا ہے جس کو انقلابی کہنا بیجا نہ ہوگا، اکبر نے شاہی تعظیم کے لئے سجدہ کی غیر اسلامی رسم جاری کی تھی، چونکہ اسلام سجدہ کی خدا کے علاوہ اور کسی کے لئے اجازت نہیں دیتا، اس لئے اکبری دربار کے غیر اسلامی عناصر کی نظر میں ان کی یہ ایک بڑی فتح تھی، سادہ لوح مسلمانوں کو بہکانے کے لئے سجدہ تعظیمی اور سجدہ عبودیت کا فرق بتلایا گیا تھا، بہرحال دربار میں اکبر کے سامنے سجدہ کیا جاتا تھا، شریعت کو جاننے اور اس پر عمل کرنے والے اس کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن وہ بے بس تھے، جہانگیر پر سجدہ کی شرعی حیثیت ظاہر کی گئی تو اس نے :۔

"میر عدل و قاضی را کہ مدار امور شرعیہ بر ایشان است بجہت خاص حرمت شرع فرمودم کہ زمین بوسی کہ بصورت سجدہ است نکنند۔"[2]

اسی کے ساتھ دربار میں صرف نماز کی اجازت ہی نہیں دی جو اکبر کے زمانہ میں بند کر دی گئی تھی، بلکہ شکار کے ہرنوں کی کھالوں کی جا نمازیں تیار کرا کر دیوان خاص و عام میں رکھوائیں تا کہ مردم بران نماز می گذاردہ باشند۔

---

[1] توزک جہانگیری ص ۸۲

[2] توزک ص ۹۹

Marfat.com

پانچ سال بعد ایک باغی ہندو زمیندار کا لڑکا جس کی تربیت دربار میں ہوئی تھی اسلام قبول کرتا ہے تو اس کے لئے یہ الفاظ استعمال کرتا ہے: "او را بہ شرف اسلام مشرف ساختہ" باوجودیکہ اس کے باپ نے بغاوت کی تھی "راجگی ولایت پدرش باو عنایت نمود"[1] اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ وہ ہے جو کشمیر میں راجوری کا ذکر کرتے ہوئے وہ بیان کرتا ہے کہ اگرچہ اس علاقہ کے لوگ سلطان فیروز کے زمانہ میں مسلمان ہوئے تھے لیکن "ہنوز بدعتہائے ایام جہالت درمیان آنہا مستمر است"

پھر ان بدعتوں کو سمجھاتا ہے کہ ہندو عورتوں کی طرح مسلمان عورتیں بھی ستی ہوتی تھیں یعنی شوہر کے ساتھ زندہ دفن ہو جاتی تھیں، لڑکیوں کو مار ڈالا جاتا تھا اور ہندوؤں کے ساتھ شادی بیاہ کرتے تھے، لڑکی دیتے بھی تھے اور لیتے بھی تھے۔ "گرفتن خوب، اما دادن نعوذ باللہ۔ فرمان شد کہ بعد ازیں پیرامون این امور نگردند وہر کس کہ مرتکب این بدعتہا شود او را سیاست کنند"[2] سلطنت کے مزاج میں تبدیلی کس حد تک ہو گئی تھی اس پر غور کیجئے۔ ستی اور دختر کشی کو سماجی گناہ کہا جا سکتا ہے لیکن مسلمان لڑکی کا ہندو سے شادی کرنا بھی بادشاہ کے نزدیک ایسی بدعت ہے جس کے ارتکاب پر سزا دینا ضروری سمجھا گیا۔ یہ تو یقیناً شرعی گناہ تھا نہ کہ خالص سماجی۔ گرو ارجن کی سزائے موت کا سبب خسرو کی بغاوت میں اس کا ساتھ دینا تھا لیکن جہانگیر اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

مدت ہا بہ خاطر می گذشت کہ این دکان باطل را برطرف باید ساخت
یا او را در جرگہ اسلام در باید آورد[3]

۱؎ تزک جہانگیری ص ۱۴۵
۲؎ تزک جہانگیری ص ۳۱۷
۳؎ ایضاً ۲۴۴

Marfat.com

یہ امر قابل غور ہے کہ باوجود اس خواہش کے اس کو زبردستی مسلمان نہ بنایا گیا، صرف اس لئے کہ یہ اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف تھا، لیکن جہانگیر کے دل میں یہ خیال آنا ہی ایک اہم واقعہ ہے، کیونکہ وہ اس بدلتی ہوئی کیفیت مزاج کا ثبوت ہے جو بادشاہ میں پیدا ہو رہی تھی، اس قسم کے اور واقعات بھی جہانگیر کی زندگی میں نظر آتے ہیں، طوالت کے خیال سے یہاں صرف چند اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے، ان واقعات کے ساتھ ہم کو ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبری عہد کی بعض غیر اسلامی رسوم جہانگیر نے بند نہیں کیں، اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کی تربیت اور تعلیم جس ماحول میں ہوئی تھی اس کا اثر ایک عرصہ تک اس پر رہا ہوگا اور رفتہ رفتہ ہی ان رسوم کو بند کیا جا سکتا تھا جو برسوں سے جاری تھیں، بعض چیزوں میں ذاتی خواہشات اور اغراض کو بھی دخل تھا، شراب کا وہ اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اس کا چھوٹنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ اس کی مقدار تو اس نے کم کر دی تھی لیکن ترک نہ کر سکا۔ گوشت خوری کے سلسلہ میں اپنے باپ کی اس حد تک پابندی کرتا تھا کہ ہفتہ میں دو روز گوشت نہیں کھاتا تھا، جانوروں کو شکار کے علاوہ مارنا اچھا نہیں سمجھتا تھا، سب سے زیادہ نمایاں رسم سورج اور ستاروں کو مقدس سمجھنے کی تھی، لکھتا ہے کہ:-

"تعظیم نیرات را کہ مظاہر نور الٰہی اند بقدر درجات ہر یک باید نمود"

لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ:-

"مؤثر حقیقی در جمیع ادوار و اطوار اللہ تعالیٰ را باید دانست"[1]

بہرحال سورج، چاند، ستاروں کی پرستش نہیں کرتا تھا لیکن ان کی تعظیم بھی مسلمانوں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جشن دسہرہ میں "بدستور معمول اسپان و فیلان را آرائش داده از نظر گذرانیدم"[2] اور ہندوؤں

۱؎ تزک ص ۲۸۲ ۲؎ تزک ص ۱۲۳

Marfat.com

کو خوش کرنے کے لئے "فرمودم کہ بہ ہمان ضابطہ قدیم برہمنان رشتہائے الرشیہا می بستہ باشند"[1]۔ ان واقعات نے جہانگیر کے مذہب کے متعلق عجیب قسم کی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ رواداری کے برتاؤ سے بعض مورخوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ وہ اسلام پر دل سے اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ عیسائی تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ شاید جہانگیر عیسائی مذہب قبول کر لے گا[2]۔ چونکہ یہ واقعات صرف عیسائی پادریوں اور سیاحوں کے بیانات کی بنا پر پیش کئے گئے ہیں اس لئے ان کو قابل اعتبار نہیں مانا جا سکتا، یہ بیانات اکثر و بیشتر بے بنیاد ہیں۔ اسی طرح دوسرے مذہبوں کے پیشواؤں کے ساتھ جب وہ عزت و احترام کے ساتھ پیش آتا ہے[3] اور ان سے مذہبی مسائل پر گفتگو

---

[1] توزک ص ۱۳۰

[2] ایک واقعہ دلچسپ ہے یعنی دانیال کے لڑکوں کا عیسائی ہو جانا اگر اس کی تفصیل کو بغرض محال صحیح بھی تصور کر لیا جائے تو سر ٹامس رو کی شہادت سے ہی اس کا حل مل جاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ جہانگیر سے کسی جوتشی نے کہا تھا کہ تمہارے بعد سلطنت تمہارے نہیں بلکہ اکبر یعنی تمہارے باپ کے ورثا کے ہاتھ میں چلی جائے گی، چنانچہ دانیال کے لڑکوں کو جو اکبر کے ورثا تھے عیسائی بنوا دیا گیا کہ وہ تخت پر بیٹھ ہی نہ سکیں، بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوتشی کی پیشین گوئی کا اثر جلد ہی ختم ہو گیا اور وہ پھر مسلمان ہو گئے۔

[3] جدروپ ایک سنیاسی تھا جو اجین کے قریب ایک پہاڑی کے غار میں رہ کر عبادت کرتا تھا تخت نشینی کے بارھویں سال میں جب جہانگیر کا لشکر ادھر سے گزرا تو جہانگیر نے دو بار آ کر ملاقات کی، دو مرتبہ اس مونح پیادہ بعد ایک دفعہ واپسی میں پہلی ملاقات کا نتیجہ ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے سخنان خوب مذکور ساخت چنانچہ خیلی در من اثر کرد و از صحبت من معا فتاد[illegible] دوسری ملاقات کے بعد مسرور خاطر بودم بدین سند ہم سخنان خوب مذکور گشت" (توزک ۱۷۴-۱۷۵)، [illegible]

کرتا ہے تو اس کے اعتقاد پر لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے۔ یہ بات اور بھی زیادہ دلچسپ ہے کہ ایک عہد حاضر کے ایک عالم نے جہانگیر کو اس پر تو معاف کر دیا ہے کہ جد رب کی باتوں نے "خللے در من اثر کرد"۔ لیکن خواجگان چشت بالخصوص شیخ سلیم چشتی سے جو عقیدت اکبر کو تھی اور ان کی جن کرامات کا ذکر اس نے اپنی توزک میں کیا ہے ان پر گرفت کی ہے اور جوش میں وہ یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ جہانگیر کو جاہل مطلق بنا دیا۔[1]

بہر حال جہانگیر کے زمانہ میں اکبری عہد کی دینی بے راہ روی کی ایک حد تک اصلاح ہو گئی تاہم بہت سی ایسی رسوم باقی تھیں جو اصلاح طلب تھیں، حضرت خواجہ باقی باللہ رح اور ان کے ارادت مند رفیق یعنی شیخ عبدالحق کی کوشش بارآور ہونے لگی تھی لیکن چونکہ ابھی بہت کام باقی تھا شیخ نے اپنی کوششیں جاری رکھیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہانگیر شیخ کے تقدس اور علم سے بہت متاثر تھا۔ ۱۹ سنہ ۱۶ء میں یعنی تخت نشینی کے چودھویں جشن کے بعد

---

[1] واقعہ یہ تھا کہ اکبر نے ایک مرتبہ شیخ سے دریافت کیا کہ آپ کی عمر کتنی ہوگی، شیخ نے کہا کہ عالم الغیب تو خدا ہی ہے لیکن جب شہزادہ سلیم کسی ذریعہ سے کوئی شعر یاد کرے گا تو وہ نشانی ہوگی میری وفات کی۔ اکبر نے خدام کو حکم دے دیا کہ شہزادہ کو کوئی نثر یا نظم نہ یاد کرائے۔ دو سال سات ماہ اسی طرح گذر گئے، لیکن آخر کار ایک عورت نے سلیم کو ایک شعر یاد کرایا، اس نے یہ شعر شیخ کو جا کر سنایا، اسی وقت شیخ بیمار ہو گئے اور آخر کار ان کا انتقال ہو گیا۔ اس پر سید محمد میاں لکھتے ہیں "بوالعجبی!! ملاحظہ ہو ایک طرف وہ پندار عقل اور دوسری طرف یہ درماندگی، شریعت غرا کے احکام و عقائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات (معاذ اللہ) قابل مضحکہ اور شیخ سلیم کا ایک مجذوبانہ مقولہ اکبر کے نزدیک اس قدر واجب احترام کہ جہانگیر کو ہمیشہ کے لئے جاہل رکھا" یہ غلط ہے جہانگیر جاہل نہیں تھا۔ شیخ سلیم چشتی کا انتقال ۱۵۷۱ء میں ہوا جبکہ جہانگیر کی عمر صرف ڈھائی سال تھی۔ دیکھو علماء ہند کا شاندار ماضی از سید محمد میاں ص ۱۲۷-۱۳۲

شیخ سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:-

شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہل فضل و ارباب سعادت است.....
کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند بنظر در آمدہ، خیلے زحمتہا کشیدہ، مدت ہاست کہ در گوشہ دہلی بوضع توکل و تجرید بسر می برد، مرد گرامی است، صحبتش بے ذوق نیست۔[1]

شیخ عبدالحق نے جہانگیر کی ہدایت کے لئے ایک رسالہ نوریہ سلطانیہ تیار کیا تھا جس کا موضوع وہ خود اپنی فہرس التوالیف میں ان الفاظ میں بتاتے ہیں:-

در بیان قواعد سلطنت و احکام ارکان مناصب و آلات تحصیل آن و دفع [illegible] و این کتاب از امر عظیم الشان مزین باسم سامی سلطان العصر [illegible] خلد اللہ ملکہ۔[2]

یوں تو شیخ کی تصانیف بہت زیادہ ہیں لیکن سیاسی اہمیت اس رسالہ کو [illegible] ان کے مکاتیب ہی کو حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی [illegible] بادشاہ و امراء کے کردار اور مغلیہ سلطنت کی پالیسی کو سمجھنے کی کوشش کی [illegible] رسائل کے مختصر مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

این بندہ را معلوم است کہ چند در ابواب [illegible]
شریعت و موجب حفظ [illegible]
وتعلیم [illegible]
[illegible]

---

[1] [illegible]
[2] نوریہ سلطانیہ [illegible]

والدقائق بل يبين للخلق علم المعاملات وما ينتهون به عن العيوب ولا يقدم علم الباطن على الظاهر ولا يكتفي بالظاهر عن الباطن[1]

اس مقصد کے حصول کی غرض سے شیخ عبدالحق نے بڑی تعداد میں اور مختلف مسائل پر رسالے اور کتابیں لکھیں، لیکن ان کی زیادہ تصانیف حدیث اور تصوف پر ہیں) ہند پاکستان میں علم حدیث کی خدمت اور اس کی ترویج کے سلسلہ میں انہوں نے جو کوشش کی وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے جس پر یہاں بحث نہیں کی گئی ہے، لیکن یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ شیخ محدث نے ان تمام مسائل پر موقع بہ موقع اپنی تصانیف میں بحث کی ہے جو اکبر کے مذہبی اس دور کے معاشرہ کی دینی بے راہ روی سے پیدا ہو گئے تھے، مثلاً سب سے نمایاں گمراہی یہ تھی کہ رسالت کو مذہب کے معاملات میں نظر انداز کیا جاتا تھا، اور توحید کے بعد رسوم اور شعائر کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اسی کی اصلاح کے لئے انہوں نے مدارج النبوت تصنیف کی چنانچہ اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

چون از فساد زمان انحرافے در مزاج وقت بعضے درویشان مغرور این روزگار راہ یافت۔ ومارتیرگی آئینہ استعداد وتنگی حوصلہ ادراک ادراک آن پایہ ارفع ومنظم از دس محمدی را ہیچ کس بدرکے در یافت۔ آن را نیست نشناختہ ولقصورے در ادائے حق مؤدہ از جادہ دین وصراط مستقیم برافتادہ بودند، لازم حق مسلمانی آن مؤد کہ احوال وصفات قدسیہ ۔۔۔۔۔ نگارش نماید تا این بے خبران را از حقیقت حال آگاہ گرداند وغافلان را از خواب غفلت بیدار سازد وطالبان را مدد براہ آید[2]

---

[1] کتاب المکاتیب والرسائل ص ۱

[2] مدارج النبوت ص ۳

Marfat.com

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ابوالفضل نے نبوت و سلطنت کو ایک ہی ذات (یعنی اکبر) میں ملانے کی کوشش کی تھی اور بادشاہ کو روحانی پیشوا کی بھی حیثیت دے دی تھی اس لئے شیخ عبدالحق نے ایک مستقل رسالہ نبوت اور سلطنت کا فرق بتلانے کی غرض سے تصنیف کیا۔ اس کے علاوہ اپنی مشہور تصنیف مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین میں لکھتے ہیں :-

چہ داند زمان و چہ بعد از آن چندین عقلاء و حکماء و امراء و سلاطین کہ در حکمت و سلطنت ایشان بفلک بر می رفت، چرا بزور عقل و دانش مانع از ظہور دین و ملت اسلام نیامدند اگر بعضے از ایشان بغرور نفس و غلبۂ ہوا این ہوس کردند باختہ خیال محال بربستند، قواعد و قوانین اختراع نمودند، چرا آن قواعد و قوانین بعد از ایشان باقی نماند و رواج نیافت۔ ازین جا معلوم شد کہ نبوت دیگر است و سلطنت دیگر۔[1]

شیخ عبدالحق کی تصنیفات کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے فقہ اور حدیث میں اور شریعت و طریقت میں جو اختلافات بظاہر نظر آتے تھے ان کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ ان کے استاد محترم شیخ عبدالوہاب نے ان کو ہدایت کی تھی کہ وہ فقیہ صوفی بننے کی کوشش کریں نہ کہ صوفی فقیہ یعنی خود ان کے الفاظ میں اول شرع بعد ازاں طریقت، اول صحت ابتدا آنگاہ تقوی بعد ازاں بد سلوک حقیقت برآید۔ اسی پر انہوں نے خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی ہدایت کی۔

شیخ عبدالحق کی اصلاحی کوششیں ہماری تہذیب و تمدنی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہیں۔ یہاں ان کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کو زوال کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے کیا طریقہ اختیار کیا اور کس حد تک وہ اس میں کامیاب ہوئے۔

[1] بحوالہ حیات شیخ عبدالحق ص ۲۰۱

Marfat.com

ضمیمہ

برصغیر میں علم حدیث کی اشاعت و ترویج

شیخ عبد الحق کے عظیم کارناموں میں ایک قابل ذکر کارنامہ علم حدیث کی ترویج ہے یہاں یہ نامناسب نہ ہوگا کہ ان کوششوں کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جائے جو ان سے قبل اس سلسلہ میں کی گئیں۔ یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد علمی و تبلیغی کوششوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے موسیٰ بن یعقوب ثقفی کو الور کا قاضی مقرر کیا جو علوم دینیہ میں بڑا درک رکھتے تھے[1]۔ سرزمین سندھ میں دو اجل تابعی آئے۔ جن میں سے یزید بن ابی کبشہ اور دوسرے مفضل بن مہلب بن ابی صفرہ ہیں۔ یزید کی روایات صحیح بخاری، کتاب الآثار (محمد شیبانی) مستدرک (حاکم نیشاپوری) میں موجود ہیں[2]۔ مفضل مشہور صحابی نعمان بن بشیر کے حوالے سے روایت کرتے ہیں[3]۔ اسی زمانہ میں بصرہ سے دو نامور محدث سندھ میں آئے جن میں سے پہلے ابو موسیٰ اسرائیل بصری ہیں جو نزیل سندھ کے نام سے مشہور ہیں[4]۔ ابو موسیٰ اسرائیل ایک ثقہ راوی تھے اور وہ

---

[1] تاریخ نامہ ص ۱۸۶-۱۸۷

[2][3] تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی جلد اول ص ۲۶۱

Marfat.com

حسن بصری (ف سنہ ۱۱۰ھ) سے روایت کرتے تھے۔ بصرے کے دوسرے مشہور محدث ابو حفص الربیع بن صبیح ہیں۔ یہ حسن بصری کے نامور تلامذہ میں ہیں اور علم و عمل، زہد و تقویٰ، ذکر و فکر اور جہاد و عزلت میں اپنے استاد کا نمونہ تھے۔ ان کے متعلق کچھ تفصیلات پہلے دی جا چکی ہیں۔ سندھ کے بعض مقامات مثلاً دیبل، منصورہ، ارور، قندابیل وغیرہ بہت علم حدیث کے بڑے مراکز بن گئے۔ محدثین کی ایک ممتاز جماعت ان مرکزی مقامات پر حدیث کی تعلیم و ترویج میں منہمک تھی۔

ہند و پاکستان میں اسلامی فتوحات کا دوسرا دور غزنویوں کی آمد سے شروع ہوا اور شمال مغرب کا بڑا علاقہ ان کی حکومت کے زیر نگین رہا۔ اس زمانہ کے ایک نامور محدث شیخ اسمٰعیل (ف سنہ ۴۴۸ھ / ۱۰۵۶ء) گزرے ہیں مگر افسوس ان کے حالات و واقعات تفصیل سے نہیں ملتے۔ تیرھویں صدی کے شروع میں سلطنت دہلی کا قیام عمل میں آیا۔ اس زمانہ کی ایک نامور اور معروف محدث رضی الدین حسن صغانی صاحب مشارق الانوار ہیں جن کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

امام صغانی

رضی الدین صغانی لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد الصغانی ایک مشہور اور متبحر عالم تھے۔ صغانی نے تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ بعد میں اپنے زمانہ کے نامور محدثین سے حدیث کا درس لیا۔ علامہ صغانی کو حدیث، فقہ اور لغت میں مجتہدانہ حیثیت حاصل تھی۔

رضی الدین حسن صغانی اپنے والد کے انتقال کے بعد غزنی سے لاہور پہنچے۔ لاہور میں ان کو عہدۂ قضا پیش کیا گیا۔[1]

مولانا رضی الدین حسن صغانی بدایوں میں بھی رہے۔ اس زمانہ میں بدایوں علم و فضل

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد اول ص ۱۳۹

کا بڑا مرکز تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء بدایونی فرماتے ہیں[1]

او از بداؤں بود

اسی بنا پر بعض لوگوں نے ان کی پیدائش بھی بدایوں ہی میں بتلائی ہے۔ یہاں سے رضی الدین صغانی کول پہنچے اور وہاں کول کے نائب مشرف مقرر ہوئے اتفاق سے کسی روز مشرف نے نامناسب حرکت کا اظہار کیا، صغانی اس عہدے سے دست بردار ہو گئے[2] اس کے بعد حاکم کول کے لڑکوں کی تعلیم و تدریس پر مقرر ہو گئے اور قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ۵۹۹ھ میں حج کے لئے روانہ ہو گئے، وہاں کے نامور محدثین سے درس حدیث لیا۔ صغانی کا قیام کم و بیش پانچ سال حجاز میں رہا، اس مدت میں ان کا مشغلہ حدیث فقہ اور لغت کے علوم میں تبحر حاصل کرنا تھا۔

وہ ہند پاکستان واپس آ گئے اور بعد میں دوبارہ پھر حجاز تشریف لے گئے اس مرتبہ وہ عدن اور یمن بھی گئے۔ ۶۱۳ھ میں یمن سے حج کرنے کے لئے گئے پھر ہند پاکستان آ گئے دوسرے سال ۶۱۴ھ میں پھر حج کو ہند سے گئے اب کی مرتبہ واپسی میں بغداد بھی گئے اور وہاں شہرت حاصل کی۔

بغداد میں ان کی شہرت کا سبب یہ ہوا کہ ایک بڑے محدث درس حدیث دیتے تھے، ایک مرتبہ وہ بھی گئے۔ انہوں نے الفاظ حدیث میں تصحیح کر دی جب محدث کو معلوم ہوا تو اس نے کہا جو میں نے کہا وہ بھی صحیح ہے اور جو صغانی نے کہا وہ بھی صحیح ہے جب کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا تو صغانی کے قول کو صحیح پایا گیا جب خلیفہ وقت کو معلوم ہوا تو اس نے بڑا اعزاز فرمایا اور صغانی سے حدیث پڑھ کر سند لی، بغداد میں صغانی کا بہت شہرہ ہوا، طلباء کی آمد شروع ہوئی اور درس و تدریس کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۰۳ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۲ھ
[2] ایضاً ص ۱۰۴

Marfat.com

خلیفہ بغداد، رضی الدین صغانی کے علم و فضل، اصابت رائے اور صحت فکر سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ہندوستان کی سفارت کے لئے ان کا انتخاب کیا اور ان کو سفیر بنا کر التمش کے دربار میں بھیجا۔ یہ سفارت کامیاب رہی اور وہ مدت تک یہاں مقیم رہے۔

یہاں سے صغانی بغداد واپس گئے مگر جلد ہی ۶۲۶ھ میں ہند پاکستان واپس آگئے اب کی مرتبہ صغانی ایک وفد کے ساتھ تھے اور دہلی میں شاندار استقبال ہوا۔ منہاج الدین سراج لکھتے ہیں:[1]

"در آن وقت رسل دار الخلافت با تشریفات وافرہ بحدود ناگور رسیدہ بود و در روز شنبہ بیست و دوم ماہ ربیع الاول سنہ ست و عشرین و ستمائہ بحضرت دہلی رسیدند"

مورخین لکھتے ہیں کہ سلطان التمش نے اس وفد کو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا اور خلیفہ بغداد کی خدمت میں کچھ تحائف بھی بھیجے[2] معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رضی الدین حسن صغانی ہند پاکستان ہی میں رہ گئے انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کردیا اور اکابر شیوخ و علماء نے ان سے سماع حدیث کیا سرور الصدور میں ہے[3]۔

بندگان ناگور قاضی حمید الدین ناگوری و قاضی کمال الدین و بندگان دیگر از صدور ملوک از حضرت ایشان سماع کردن و اجازت روایت یافتند

---

[1] طبقات ناصری مرتبہ آغا حبیبی طبع کوئٹہ ـ ص ۲۴۴
[2] تاریخ مبارک شاہی مؤلفہ یحیٰ بن احمد سرہندی ص ۱۹ کلکتہ ۱۹۳۱ء
[3] سرور الصدور قلمی ص ۲۴۱ (ملوکہ نیشنل میوزیم. کراچی)

ایک مدت تک یہاں قیام کرنے کے بعد وہ پھر برصغیر سے چلے گئے۔
سنہ ٦٣٤ھ میں رضی الدین صغانی حج کے لئے تشریف لے گئے۔ پھر بغداد پہنچے اور وہاں رباط مرزبانیہ کے صدر رہے، اور سنہ ٦٥٠ھ میں بغداد میں انتقال ہوا۔[1]

رضی الدین حسن صغانی کے علمی پایہ کو جلیل القدر صلحاء و علماء نے تسلیم کیا ہے ذہبی کا قول ہے کہ وہ علم لغت میں حرف آخر ہیں، شیخ شرف الدین دمیاطی کا بیان ہے کہ وہ لغت، فقہ اور حدیث تینوں فن کے امام تھے، صغانی کو شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔[1]

امام صغانی علم حدیث میں امام فن تھے ان کی سب سے مشہور کتاب مشارق الانوار ہے، اس کتاب کے متعلق حضرت نظام الدین اولیاء بدایونی فرماتے ہیں:-

این کتاب حجت است میان من و خدائے و اگر حدیثے بیاید مشکل شدے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام را در خواب دیدے و تصحیح کردے۔[2]

مشارق الانوار میں مشکوٰۃ کی طرح حدیثیں جمع کی گئی ہیں، اس میں دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثیں ہیں، مشکوٰۃ کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے اور مشارق الانوار کی ترتیب احادیث کے ابتدائی الفاظ پر ہے، علماء محدثین نے اس کتاب کی بہت قدر کی، چنانچہ وہ نصاب میں داخل رہی، کہا جاتا ہے کہ عالم اسلام کے مختار علماء نے اس کے ڈھائی ہزار سے زیادہ شرح اور حاشی لکھے ہیں۔[3]

صغانی کی حدیث میں دوسری تصانیف یہ ہیں:-
التکملہ علی الصحاح، الدر الملتقط، رسالہ فی الاحادیث الموضوعہ
شرح البخاری، الشمس المنیرۃ فی الحدیث، فی الضعفاء المتروکین

١۔ نزہۃ الخواطر جلد اول ص ١٣٩ ٢۔ فوائد الفواد ص ١٠٣
٣۔ بزم مملوکیہ ص ٣٢٢۔

Marfat.com

فی رواۃ الحدیث، کشف الحجاب عن احادیث الشہاب۔ مصباح الدجیٰ فی حدیث المصطفیٰ،

رضی الدین حسن صغانی نے لغت پر ایک معرکۃ الآرا کتاب "العباب الزاخر واللباب الفاخر" بیس جلدوں میں لکھی ہے، اس موضوع پر ان کی دوسری کتاب مجمع البحرین بارہ جلدوں میں تھی، فن لغت میں ان کی دوسری کتابیں۔ النوادر فی اللغات، التراکیب، الاضداد، الشوارد فی اللغات وغیرہ بھی مشہور ہیں۔

شیخ عبد الحق یوں تو ہر دور میں برصغیر پاکستان کے علماء نے علم حدیث سے خاصا اعتنا کیا مگر ان حضرات میں امام صغانی کے بعد جس شخص کی کوششیں اس سلسلے میں خاص طور پر اہم ہیں وہ شیخ عبد الحق ہی ہیں، ان کے اس کارنامے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بحیثیت محدث ہی شہرت حاصل کی، شیخ عبد الحق سے قبل شیخ متقی اور طاہر پٹنی وغیرہ جیسے ممتاز محدثین کے نام ملتے ہیں۔ شیخ متقی، شیخ عبد الحق محدث کے شیخ ہیں، جن سے انہوں نے علم حدیث حجاز میں حاصل کیا، اور یہاں آکر اس کی ترویج و اشاعت کی خافی خان نے ان کے کمالات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

> در کمالات صوری و معنوی و تحصیل علوم عقلی و نقلی خصوص تفسیر حدیث در تمام ہندوستان ثانی نداشت۔[1]

شیخ عبد الحق نے درس میں حدیث کی کتابیں شامل کرنے اور بعض کو فارسی میں منتقل کرنے کی جو کوشش کی اس کے بعض پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

---

[1] منتخب اللباب ص ۵۵۱

Marfat.com

الطریق القویم فی شرح السیرات المستقیم

مجد الدین فیروز آبادی کی مشہور معروف کتاب سفر السعادت کی یہ فارسی شرح ہے اس میں حنفی نقطہ نظر کو خاص طور سے ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و عبادات و معاملات سے متعلق ہے، اس میں شیخ عبد الحق نے فیروز آبادی کے بعض تسامحات پر تعاقب بھی کیا ہے۔ ۱۰۲۳ھ میں یہ کتاب تکمیل کو پہنچی جو شرح سفر السعادت کے نام سے مشہور ہے متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے، ہند و پاکستان اور لندن کے مختلف کتب خانوں میں اس کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ بانکی پور کا نسخہ مصنف کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔

اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ

مشکوٰۃ المصابیح صحاح ستہ کا متداول و مشہور نتیجہ ہے شیخ نے اس پر عربی و فارسی میں دو قابل قدر شرح لکھی ہیں، فارسی کی شرح ۱۰۱۹ھ میں شروع کی اور ۱۰۲۵ھ میں اتمام کو پہنچی یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے شروع میں ایک جامع مقدمہ ہے، یہ کتاب بھی طبع ہو چکی ہے اور تمام بڑے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔

مشکوٰۃ المصابیح کی عربی شرح لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے موسوم ہے، اس میں ان باتوں جو فن علم سے متعلق ہیں ان پر زور دیا ہے اور احادیث سے فقہ حنفی کی تطبیق نہایت کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ لمعات التنقیح ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔

الاکمال فی اسماء الرجال

اس میں مشکوٰۃ المصابیح کے تمام رواۃ کا حال حروف تہجی کے اعتبار سے لکھا گیا ہے شروع میں خلفائے راشدین کا بڑا تفصیلی ذکر ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

Marfat.com

جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین و ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین
اس کتاب میں ایسی چالیس حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں بادشاہوں کو ہدایات درج کی گئی ہیں۔

جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ
شرح مشکوٰۃ کا دو جلدوں میں خلاصہ ہے کتاب طبع نہیں ہوئی ہے۔

ما ثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ
عربی میں ہے اور سال کے بارہ مہینے کے اعتبار سے جو مذہبی مراسم ادا کئے جاتے ہیں ان کو بیان کیا ہے اور مروجہ غیر اسلامی مراسم پر تنقید کی ہے، یہ کتاب متعدد مرتبہ چھپ چکی ہے، اردو میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ بڑی قابل قدر و لائق عمل کتاب ہے۔

ترجمہ مکتوب النبی
حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کے نام جو خط لکھا تھا اس کا فارسی ترجمہ ہے۔ یہ خط المکاتیب والرسائل میں شائع ہو چکا ہے۔

رسالہ در آداب لباس
احادیث کی روشنی میں جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس سے متعلق ایک رسالہ [illegible] انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ اس کا اردو ترجمہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے چند مختصر رسالے مختلف ذاتی کتب خانوں میں بھی علم حدیث سے متعلق ملتے ہیں۔[1]

[1] تفصیل کے لئے دیکھیو حیات شیخ عبدالحق از خلیق احمد نظامی ص ۱۶۳-۱۶۷

ان تصانیف و رسائل کے علاوہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ عبدالحق نے اپنی مشہور تصنیف مدارج النبوت میں احادیث کو اپنا سب سے بڑا ماخذ بنایا ہے۔

Marfat.com

باب پانزدہم

تبلیغی و اصلاحی کوشش (۲)

شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی

اصلاحی کوشش کی ابتدائی منزل میں جن حضرات کی جدوجہد نے تاریخ کا رخ بدلا ان میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو بھی ایک بلند مقام حاصل ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ [illegible] اصلاحی تحریک کے بانی وہی ہیں۔ تاریخی واقعات سے اس نظریہ کی [illegible] عہد کے ایک مشہور [illegible] لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد نے تاریخی حقائق [illegible] اظہار کیا ہے اور [illegible] اعتماد کرنے والوں کی [illegible] الفاظ [illegible] کیا جاتا ہے۔

[illegible] دستار [illegible] بالکل [illegible] کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی [illegible] مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔ معلوم ہے کہ [illegible] عہد میں بڑے بڑے علما و اصحاب خانقاہ موجود تھے، بدایونی و طبقات [illegible]

اخبار الاخیار وغیرہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے اور کوئی نہیں بستا، کوئی شہر و قریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو ..... بایں ہمہ دوسرے گوشوں اور کاموں میں وقت بسر کر گئے، اس راہ میں تو ایک قدم بھی نہ اٹھ سکا ...... ہندوستان میں سب سے بڑی منحوسیت یہ تھی کہ تمام عوام و خواص پر تصوف کا رنگ غالب تھا بحدے کہ اس کے سوا علماً و عملاً کوئی بات مقبول نہیں لیکن تصوف صالح کا جوہر پاک جہل و بدعت کی آمیزش سے یکسر مکدر ہو چکا تھا بلکہ ایک طرح کی اباحت و غلو العرفانی تھی جس کو طریق باطن و اسرار سے تعبیر کیا جاتا تھا، ملک کا ملک شریعت و علوم شریعت سے بیگانہ محض اور اصل حقیقت یک قلم معدوم۔ صرف خانقاہوں اور سجادہ نشینی کے سلسلوں کے جال میں پوری اقلیم جکڑی بند تھی ......" یہ الفاظ ۱۹۱۲ء میں لکھے گئے ہیں، اس وقت مولانا کی زندگی کا وہ دور شروع نہیں ہوا تھا جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آیات و احادیث میں گذرنے والی عمر کو ایک بت پرست پر نثار کرنا ان کے لئے باعث فخر و مباہات تھا لہٰذا سند پاکستانیوں کی جنگ آزادی اس دور میں داخل ہوئی تھی، جب یہ یقین کیا جانے لگا تھا کہ ہندی قیادت و سفارت کی تقسیم گاندھی و نہرو کے ہاتھ میں رہے گی۔ بلکہ ابھی مسلمانوں میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے مولانا موصوف الہلال کے صفحات کے ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہی کی تبلیغ کر رہے تھے، شاید خود کو عالم دین سمجھنے اور کہلوانے میں اس وقت ان کو خوشی بھی ہوتی ہوگی، لیکن باوجود ان دعاوی کے ان کو اس سے ناگواری پیدا ہوئی کہ علماء و مشائخ اور ان کی وجہ سے مدارس و خانقاہ کی تعداد اس قدر زیادہ کیوں تھی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی دو طبقوں کی بدولت اسلامی معاشرہ کی بنیادیں قائم رہیں، ہاں ان لوگوں نے اپنی زندگی کا مقصد مصنف کی طرح یہ نہیں بنایا تھا کہ مسلمانوں کا لیڈر بننے کے لئے پہلے اسلام کی تبلیغ کرتے اور قیادت حاصل کرنے کے بعد لادینی سیاست کو معاشرہ پر مسلط کرتے۔

Marfat.com

بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد کے گمراہ کن بیانات و نظریات نے ہماری تاریخ کے ایک اہم باب کو غلط رنگ دیدیا ہے جن لوگوں نے اس مسئلہ پر بعد میں کچھ لکھا وہ یہی تصور کرتے رہے کہ حضرت شیخ سرہندیؒ کی ایک ذات تھی جو اکبری الحادات سے پیدا شدہ حالات کا مقابلہ کرتی رہی، باقی اور لوگ خاموش بیٹھے رہے، اصلاحی کوشش نے تحریکی شکل اختیار نہیں کی اور شیخ نے تنہا گویا کہ خلاف کام کرتے رہے تھے۔ ہم اس نظریہ کے سلسلہ میں خود حضرت شیخ کا خط نقل کرکے بتلانا چاہتے ہیں کہ شیخ احمد سرہندیؒ نہ تنہا اس کاروبار کے کفیل تھے، اور نہ یہ کہ یہ کوئی تحریک نہ تھی، تحریک تھی اور مشائخ و علماء کی جماعت نے شیخ سے قبل کام کا آغاز کر دیا تھا، شیخ مرتضیٰ نے مجدد صاحب کو جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد خط لکھا اس کا مضمون یہ تھا:۔

شکایت در قرن سابق کہ کفاران استیلا پیدا کردہ بودند و اہل اسلام خوار و بے اعتبار گشتہ و در ترغیب آنکہ مدار اسلام بادشاہ است۔ اگر ترویج این معنی میسر شود بہتر است۔ مبادا فتورے و فشلے در میان آمدہ خللے در کار اہل اسلام اندازد و در رنگ قرن سابق سازد۔

اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً ہی بعد ترویج اسلام کی ضرورت و اہمیت پر شیخ نے حضرت شیخ احمد کی توجہ دلائی ہے اور بادشاہ کے گمراہ ہو جانے کے خطرہ سے ان کو آگاہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک شیخ کی اصلاحی کوشش اپنے تلامذہ تک محدود تھی لیکن شیخ مرتضیٰ کے کہنے پر وہ اپنی خدمات پیش کرتے ہیں:

"امروز کہ خبر زوال مانع دولت اسلام و بشارت جلوس پادشاہ اسلام بگوش خاص و عام رسید اہل اسلام بر خود لازم دانستند کہ ممد و معاون پادشاہ باشند و در ترویج شریعت و تقویت ملت دلالت نمایند این امداد و تقویت خواہ بزبان میسر شود خواہ بدست سابق ترین دولت مدد ہا تبیین مسائل

شرعیہ است و اظہار عقائد کلامیہ بہ طبق کتاب و سنت و اجماع است
تا مبتدعی و ضال درمیان آمدہ از راہ نبرد و کار بفساد نہ انجامد این قسم امداد
مخصوص بعلماء اہل حق است کہ رو بہ آخرت دارند۔ علماء دنیا کہ ہمیشہ ایشان
دنیائے دنیہ است صحبت ایشان زہر قاتل است و فساد ایشان فساد
متعدی ...... اگر کسے باوجود استطاعت امداد ہر قسم مددے کہ باشد
تقصیر نماید و در کارخانہ اسلام فتورے واقع شود آن مقصر معاتب گردد۔

یہ تدبیر بتلا کر شیخ خود اپنی خدمات ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

بناء علی ذالک این حقیر قلیل البضاعت نیز خواہد کہ خود را در جرگہ ممدان دولت
اسلام اندازد و درین باب دست و پائے بزند۔[1]

اس مکتوب سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سترھویں صدی کے شروع میں حضرت شیخ احمد کی اصلاحی کوششوں کا دائرہ محدود تھا لیکن وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ جہانگیر پر اسلام دشمن عناصر کا اثر نہ ہونے دینا چاہئے اور اس جد و جہد میں وہ خود بھی حصہ لینے کے لئے تیار تھے۔ تاریخی واقعات کا ترتیب زمانی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ جہانگیر کا تخت نشینی کے بعد ہی سے رجحان ترویج شریعت کی طرف تھا اور دوسرا نتیجہ یہ بھی ظاہر ہے کہ حکومت کے ابتدائی دور میں جہانگیر پر مجدد صاحب کا اثر کم از کم براہ راست نہیں ہوا تھا، اگر ہوا ہوتا تو وہ ان کے متعلق وہ الفاظ نہ لکھتا جو تزک میں موجود ہیں
اس مسئلہ پر مزید روشنی آئندہ صفحات میں ڈالی جائے گی۔ پہلے حضرت شیخ کی سوانح حیات مختصراً بیان کرنا ضروری ہے۔

شیخ احمد کی پیدائش سنہ ۹۷۱ھ میں قصبہ سرہند میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حفظ کلام اللہ

[1] مکتوب ... جلد اول [2] زبدۃ المقامات از خواجہ ہاشم کشمی (نولکشور پریس ۱۸۹۰ء) ص ۱۲۷

Marfat.com

کے بعد اپنے والد محترم شیخ عبدالاحد[1] سے تحصیل علوم میں مصروف ہوئے اور بیشتر علوم حاصل کئے اس کے بعد دوسرے علماء سے بھی بعض کتابیں پڑھیں، ان اساتذہ میں مولانا کمال کشمیری شیخ یعقوب کشمیری اور قاضی بہلول بدخشانی قابل ذکر ہیں، تحصیل علوم سے فارغ ہو کر شیخ احمد نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور "مدتہا طلبہ علوم را از برکات خویش بہرہ مند گردانیدہ" اسی زمانہ میں خواجہ ہاشم کے بیان کے مطابق "بعضے رسائل شریفہ بہ تازی و بہ فارسی در غایت بلاغت و فصاحت تصنیف فرمودہ" ان ہی میں رسالہ رد مذہب شیعہ ہے، مولف مذکور نے صحیح لکھا ہے کہ اگرچہ اس زمانہ میں "شیعہ امراء کا بادشاہ پر اثر بہت زیادہ تھا اور وہ سلطان نیز بہ دین داربابِ دین در نہایت عداوت بود" لیکن شیخ کی غیرت اسلامی کا تقاضا تھا کہ یہ رسالہ تصنیف کر لیں[2]۔ ان دنوں میں جو حضرت شیخ کی اصلاحی کوششوں سے پہلے

---

[1] شیخ عبدالاحد اس عہد کے مشہور چشتی صابری بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے بیعت تھے ان کی خواہش تھی کہ اپنے مرشد ہی کے آستانہ پر زندگی گزاریں لیکن شیخ عبدالقدوس نے فرمایا کہ پہلے جا کر تکمیل علوم دین و شریعت کرو اس کے بعد یہاں آنا۔ شیخ عبدالاحد نے کہا کہ ممکن ہے اس وقت مجھ کو آپ کی صحبت نصیب نہ ہو، شیخ عبدالقدوس نے فرمایا کہ اگر ایسا ہو تو میرے لڑکے شیخ رکن الدین سے تکمیل طریقت کرنا، یہی ہوا اور شیخ عبدالاحد کی تکمیل شیخ رکن الدین نے کرائی اور خلافت (قادریہ و چشتیہ سلسلہ میں) عطا کی۔ شیخ عبدالاحد کو سیاحی کا بہت شوق تھا، ان کی شادی ضلع ایٹہ کے ایک قصبہ سکندرہ میں ہوئی تھی۔

[2] اس رسالہ کی تصنیف کا سبب خود شیخ نے تفصیل کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے "درین ایام رسالہ کہ شیعہ در وقت محاصرہ مشہد بہ علماء ماوراء النہر نوشتہ بودند و جواب رسالہ آن ہا در باب تکفیر شیعہ و اباحتِ قتل و اموال آنہا مسلمانان را بود باین حقیر قلیل البضاعت رسید کہ حاصلش بعد طے مقدمات ابلہ فریب تکفیر خلفائے ثلثہ است و ذم و تشنیع ام

Marfat.com

کا زمانہ تھا، شیخ بعض دوسرے فضلاء کی طرح ابوالفضل کے پاس جایا کرتے تھے۔

"مکرر در مجلس او در آمدہ بودہ اند و دے بر وفور فضائل کثیرۃ الشان اطلاع یافتہ رعایت ہا نمودہ"

لیکن ابوالفضل کی رعایات کے باوجود شیخ اس کی بیہودگیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ایک مرتبہ اس نے فلاسفہ کی تعریف اس طور پر کی کہ علمائے دین کی توہین ہوتی تھی، شیخ نے فوراً کہا کہ امام غزالی کا قول ہے کہ فلاسفہ کے جو علوم مفید ہیں وہ کتب انبیاء سے سرقہ کئے گئے ہیں اور جو خود ان کی ایجاد ہیں "بہ ہیچ کار دین می آید" ابوالفضل نے یہ سنکر کہا۔ "غزالی نامعقول گفتہ" اس پر شیخ کو غصہ آیا اور اس کی مجلس سے اٹھ کر چلے آئے اور چلتے وقت کہا کہ اگر آپ کو اہل علم کی صحبت کا ذوق ہے تو "بیہودہ ساز ادب" کلمات نہ کہا کریں، اس کے بعد شیخ اس مجلس میں نہیں گئے، چنانچہ ابوالفضل نے ان کو بلوایا اور معذرت کی، اس زمانہ میں ابوالفضل کے دنیوی جاہ و منصب کے پیش نظر یہ طریقہ تنبیہ نہایت جرأت مندانہ تھا، اسی زمانہ کا ایک اور واقعہ بھی زبدۃ المقامات میں موجود ہے۔

حضرت شیخ ایک روز فیضی کے مکان پر حاضر ہوئے، وہ تفسیر کی تالیف میں مصروف تھا، ان کو دیکھ کر خوش ہوا اور کہا کہ آپ خوب آئے، مجھے ایک موقع کے لئے مناسب الفاظ

ص حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا و بعضے از طلبہ شیعہ کہ متردد آن خود بوندہا باین مقدمات افتخار و مباہات می نمودند و در مجالس امراء و سلاطین آن مغالطات را شہرت میدادند....." اس کے بعد شیخ فرماتے ہیں کہ انہوں نے لوگوں کو ان دلائل کے مغالطوں کے متعلق سمجھانے کی کوشش کی لیکن کچھ زیادہ اثر نہ ہوا۔ اس لئے یہ خیال ہوا کہ جب تک ان جوابات کو ضبط تحریر میں نہ لایا جائے گا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

دیکھو رسالہ در رد روافض ص ۱

Marfat.com

نہیں مل رہے ہیں، اس نے کہا۔

من دماغ بسیار سوختم اما عبارت دل خواہ بدست نیامد حضرت ایشان باآنکہ عبارت بے نقط ورزیدہ بودند در ساعت مطالب کثیرہ صفحہ در کمال بلاغت برنگاشتند کہ فیضی در حیرت رفت۔"

اس کے بعد خواجہ ہاشم نے جو فقرے لکھے ہیں وہ نہایت اہم ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:۔

مطلب از تحریر این حکایت آنست کہ آثار حمیت و غیرت ایشان ہم دران ایام کہ بہ سلوک طریقہ صوفیہ نہ درآمدہ بودند بر این قسم مردم چنان بود "[1]

فیضی کی تفسیر سواطع الالہام سنہ ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی، اس کی تاریخ سورہ اخلاص سے نکلتی ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک حضرت شیخ صرف درس و تدریس ہی میں مصروف تھے اور یہی سبب تھا کہ ابوالفضل و فیضی کی مجالس میں شرکت کرتے تھے یعنی ابھی تک دنیوی فلاح و بہبود کی خواہش دل میں موجود تھی، اس کے کچھ عرصہ بعد وہ آگرہ سے اپنے وطن گئے اور وہاں اپنے والد سے "فوائد باطنیہ کثیرہ" حاصل کئے انہی "فوائد" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ:۔

این درویش را مایہ نسبت فردیت از پدر بزرگوار خود حاصل شدہ بود و پدر بزرگوار او را از عزیزے کہ جذبہ قوی داشتند و بہ خوارق مشہور بودند بدست آمدہ بود و نیز این درویش را توفیق عبادت نافلہ خصوصاً اداے صلوٰۃ نافلہ منے انبیسے مے است و پدر بزرگوار او را این سعادت از شیخ خود کہ در سلسلہ چشتیہ بودہ اند حاصل شدہ بود "[2]

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۳۲

[2] ایضاً ص ۱۳۲

Marfat.com

ان واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شیخ احمد کی ابتدائی و بنیادی باطنی تعلیم سلسلۂ چشتیہ میں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے صاحبزادہ کے سلسلہ میں ہوئی اس کے بعد " در خدمت والد ماجد ہموارہ در وطن یکار باطن و درس علوم ظاہری می گذرانیدہ "۔

۱۰۰۷ھ میں شیخ کے والد کا انتقال ہو گیا چنانچہ اگلے سال انہوں نے حج کا ارادہ کیا اور سرہند سے دہلی آئے، یہاں اپنے ایک دوست مولانا حسن کشمیری سے حضرت خواجہ باقی باللہ کی تعریف سنی تو دل میں خواہش ہوئی کہ "بزین مقتدا ذکر و مراقبہ این عزیزا را اخذ نمودہ بیران باشم" بیعت کے بعد بہت جلد " ترقیات عالیہ و عروجات متعالیہ بظہور پیوست"۔ یہاں تک کہ خواجہ ہاشم کاشمی نے ارادہ حج کے التواء کا سبب یہ بتلایا ہے کہ:

"بشوق طواف خانہ کعبہ می شدند۔ در آن اثناء وصول بصاحب خانہ میسر شد بیمائے مدینہ ضیاء از روضہ منورہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم می رفتند بدستیاں سفر اقتباس انوار ساکن آن روضہ مطہر محصل گشت"[۱]

غرض کہ تکمیل تعلیم کے بعد شیخ کو خواجہ باقی باللہؒ نے خلافت عطا فرمائی اور اجازت دی کہ سرہند جا کر دوسروں کو تعلیم دیں چنانچہ " بامر حضرت خواجہ بدان بلدہ بہ تربیت طالبان حق پیدا ختند و در اندک مدت جم غفیر را از سرچشمہ فیوضات خویش شاداب ساختند" اسی زمانہ میں شیخ کو کچھ ترددات پیدا ہوئے تھے جو ان کے مرشد نے رفع کئے[۲]۔ کچھ عرصہ بعد شیخ اپنے مرشد کی خدمت میں پھر دہلی حاضر ہوئے اور تھوڑے دن وہاں قیام کر کے سرہند واپس چلے گئے، تیسری مرتبہ جب وہ دہلی آئے تو خواجہ باقی باللہ نے آثار

---

[۱] زبدۃ المقامات ص ۱۴۰ [۲] ایضاً ص ۱۴۸

Marfat.com

ضعف بدن بسیار ظاہر می شود امید حیات کمتر ماند۔" حضرت خواجہ نے اپنے خورد سال صاحبزادوں کے متعلق شیخ سے کہا کہ وہ خیال رکھیں، مرشد سے رخصت ہو کر شیخ احمد سرہند واپس گئے اور چند روز بعد "بامر و اشارہ متوجہ بلدۂ معظم لاہور گردیدند" یہاں بہت سے لوگ سلک ارادت میں داخل ہوئے اور "صحبت گرم شد" اس زمانہ میں مولانا جمال تلوی بھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے وہ شیخ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے، ایک مرتبہ انہوں نے شیخ سے وحدت وجود کا مسئلہ دریافت کیا تو شیخ نے "سر گوش مولانا بردہ کلمہ چند فرمودند کہ اشک از دیدہ مولانا فرو ریخت و تغیرے در بشرہ او چوں تغیر ارباب حال می گردید...... کسی ندانست کہ لسان گوہر فشان حضرت ایشان چہ گفت و گوش ہوش مولانا چہ شنفت"[1] کچھ عرصہ بعد شیخ نے اپنے مرشد کے انتقال کی خبر سنی "و آن الم را با بے تابی مبدل گشت" اور فوراً دہلی کے لئے روانہ ہو گئے، وہاں وہ "بزیارت روضہ منورہ مشرف گشتند"

قید سلطانی

شیخ احمد سرہندی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ان کی قید سے متعلق ہے اس واقعہ کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے، بالخصوص بعد کے مورخوں نے واقعات کی شکل اور ترتیب کو بہت کچھ بدل دیا ہے۔ اس واقعہ کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے زبدۃ المقامات کے الفاظ کو بغور مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مجدد صاحب کی رائے جہانگیر کے متعلق خراب نہ تھی، وہ اس کو عادل بادشاہ کہتے تھے[2] اور ان کو امید تھی کہ وہ اسلام کی حمایت...

---

[1] زبدۃ المقامات ۱۵۷

[2] مکتوب ۹۲ - جلد دوم فرماتے ہیں:-

حق سبحانہ تعالیٰ چنانچہ عالم را بوجود عدل و عدالت بادشاہ وقت منور ساختہ است شریعت و ملت محمدیہ را نیز بحسن اہتمام ایشان نصرت و عزت بخشند۔

Marfat.com

کرے گا، اس سلسلے میں انہوں نے جو خط اس کی تخت نشینی کے بعد شیخ فرید مرتضیٰ کو لکھا تھا اس کا بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اپنے چودھویں سال جلوس یعنی ۱۶۱۹ء میں وہ شیخ کو قید کر دیتا ہے، واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ناراضگی کا سب سے بڑا سبب شیخ کے ایک خلیفہ شیخ بدیع الدین[1] کا طریقہ وعظ و پند تھا۔ شیخ بدیع الدین کو تعلیم دیکر حضرت مجددؒ نے پہلے سہارنپور اور بعد میں آگرہ بھیجا۔ "اور فرمود کہ دراں مقام استقامت بلیغ نمائی و بے امر ما از آنجا نہ بر آئی"۔ شیخ بدیع الدین کو بہت مقبولیت حاصل ہو گئی۔ وہ ہر قسم کے لوگ ان کی صحبت میں حاضر ہونے لگے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد وہ سہارنپور چلے گئے، ان کی یہ حرکت شیخ کو ناگوار معلوم ہوئی۔ شیخ بدیع الدین مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اگر میری آگرہ سے واپسی باعث ناراضگی ہے تو میں پھر وہیں جاتا ہوں۔ شیخ نے فرمایا تم کو اختیار ہے، وقت وہاں رہنے کا وہی تھا جب تم کو وہاں بھیجا گیا تھا۔ بہرحال شیخ بدیع الدین آگرہ واپس گئے۔ ان کو مقبولیت تو حاصل ہوئی لیکن ہمہ گیر طلب اور خلوص طلب سے محروم لشکریوں کا ایک گروہ ان کے پاس آنے جانے لگا۔ نہ ان کے سامنے اپنے احوال بلند بیان کرتے، اور ان کو خشونت آمیز نصیحتیں کرتے۔ بلکہ:-

> بعض وقائع کشوف کہ اظہار آنہا انفاظ فتنہ می نمود بگوش منکران رسانید تا بجائے رسید کہ دراں شہر بودن نتوانست بلکہ آں شد و شر بہ پیر بزرگوار قدس اللہ سرہ العزیز سرایت نمود و سلطان آں وقت کہ باین طائفہ بے مناسبتی تمام داشت حضرت الشان را طلب نمودہ ایذا نمود و حبس فرمود۔[2]

یہاں تفصیل تو موجود نہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ شیخ بدیع الدین کے طریقہ کار اور ان کے اشارات بالخصوص وقائع و کشوف نے کچھ با اثر لوگوں کو برہم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے

---

[1] شیخ بدیع الدین کے حالات کے لئے دیکھو زبدۃ المقامات ص ۳۴۲-۳۵۱

[2] زبدۃ المقامات ص ۳۴۸

Marfat.com

کہ شیخ بدیع الدین کے پاس آنے والے لوگ "دور از اخلاص و ادب" تھے، ان کی شکایت جہانگیر تک پہنچی۔ جہانگیر سے شکایت کرنے والوں میں صرف امراء اور سیاسی رہنما ہی نہ تھے بلکہ علماء بھی تھے، کیونکہ شیخ احمد کی جن عبارتوں کو قابل گرفت تصور کیا گیا تھا وہ دنیوی نہیں بلکہ روحانی امور سے متعلق تھیں۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ شیخ احمدؒ صوفیاء میں تنہا نہیں ہیں جن کے اقوال پر علماء کا ایک گروہ گرفت کرتا رہا ہے۔ بہرحال مکتوب یازدہم جلد اول کی وہ عبارت جس پر جہانگیر نے قید کا حکم صادر کیا اس نے تزک میں نقل کر دی ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے:-

درین ایام بعرض رسید کہ شیخ احمد نام شیادے در سرہند دام زرق و سالوسی فرو چیدہ بسیارے از ظاہر پرستان بے معنی را صید خود کردہ و بہ ہر شہرے و دیارے یکے از مریدان خود را کہ آئین دکان آرائی و معرفت فروشی و مردم فریبی را از دیگران پختہ تر داند، خلیفہ نام نہادہ فرستادہ و مزخرفاتے کہ بہ مریدان و معتقدان خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ و دران جنگ مہملات بسیار مقدمات لاطائل مرقوم گشتہ کہ بکفر و زندقہ منجر می شود، از انجملہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے سلوک گذارم بمقام ذی النورین افتاد مقامے دیدم بغایت عالی و خوش بصفا۔ ازان جا درگذشتم بمقام فاروق پیوستم و از مقام فاروق بمقام صدیق عبور کردم و ہر کدام را تعریفے در خور آن نوشتہ و ازانجا بمقام محبوبیت واصل شدہ، مقامے مشاہدہ افتاد بغایت منور و ملون۔ خود را با نواع انوار و الوان منعکس یافتم۔ یعنی استغفر اللہ از مقام خلفاء درگذشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخی ہا کہ نوشتن آن طولے دارد و از ادب دور است۔ بنابرین حکم فرمودم کہ بدرگاہ عدالت آئین حاضر سازند حسب الحکم بملازمت پیوست۔ از ہر چہ پرسیدم جواب معقول نتوانست سامان نمود و با عدم خرد و دانش بغایت مغرور و خود پسند ظاہر شد۔ صلاح حال منحصر درین دیدم کہ روزے

چندے در زندان ادب محبوس باشد تا شوریدگی مزاج و آشفتگی دماغش قدرے تسکین پذیرد و شورش عوام نیز فرو نشیند"[1]

اوپر ہم نے دو معاصر شواہد درج کئے، ایک خود جہانگیر کا بیان اور دوسرا حضرت مجدد صاحب کے خلیفہ کے الفاظ دونوں کو سامنے رکھ کر واقعہ قید کی نوعیت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جہانگیر کے سامنے مجدد صاحب کے بیانات کو اس رنگ میں پیش کیا گیا کہ وہ شرعی نقطہ نظر سے قابل گرفت ہیں، اہل دربار نے خواہ امراء ہوں خواہ علماء ان کی مخالفت شیخ بدیع الدین کے غیر متوازن اور بھڑکانے والے بیانات کی بنا پر کی، اس میں شک نہیں کہ جن الفاظ میں شیخ نے مقامات کے عبور کرنے کا ذکر کیا ہے وہ غیر معمولی ہیں، اگر یہ خط شائع نہ ہوتا تو معاملہ شیخ اور ان کے مرشد کے درمیان رہتا کیونکہ خط انہی کو لکھا گیا تھا۔ لیکن خط کے شائع ہونے پر عوام اور جہلاء میں یہ شکوک پیدا ہو گئے کہ مجدد صاحب خود کو حضرت ابوبکر صدیق رض سے زیادہ بلند مقام پر دکھلانے کی کوشش کر رہے ہیں، بعد کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے کہا ہے کہ حضرت مجدد صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ صوفیا کا یہ عروج وقتی ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کہ بادشاہ کسی سپاہی کو کبھی پاس بلا کر شرف گفتگو بخشے، بعد میں وہ سپاہی پھر اپنی جگہ پر آ جاتا ہے۔ جہانگیر اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا جیسا کہ اس نے خود اپنے بیان میں کہا ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ عوام الناس بھی ان بیانات سے بھڑکنے لگے تھے، زبدۃ المقامات میں درج ہے کہ شیخ بدیع الدین کے لئے آگرہ میں قیام کرنا مشکل ہو گیا تھا بلکہ آن شورو شر بہ پیر بزرگوار وے قدس اللہ سرہ العزیز سریان نمودہ" اور جہانگیر نے بھی "شورش عوام" کا ذکر کیا ہے، مولانا آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں ذکر کیا ہے کہ علماء نے بھی قتل کا فتویٰ دیا[2]۔ اگرچہ یہ ذکر معاصر شواہد میں کہیں

---

[1] توزک جہانگیری ص ۲۷۲-۲۷۳

[2] سبحۃ المرجان ص ۴۸

Marfat.com

نہیں ملتا۔ لیکن قرین قیاس ہے کیونکہ دوسرے صوفیا و مشائخ کے اقوال پر بھی جن کا متشابہات واسرار سے تعلق تھا علماء نے یہی فتویٰ دیا ہے۔ منصور حلاج نے بھی تو مقام فنا میں پہنچکر نعرہ انا الحق بلند کیا تھا، جس پر علماء نے قتل کا فتویٰ دیا۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے کہ علماء نے فتویٰ دیا مگر جہانگیر نے اس پر عمل نہیں کیا تو جہانگیر کا فعل قابل تعریف ہے۔[1] جہانگیر نے جو الفاظ حضرت مجدد صاحب کے متعلق استعمال کئے ہیں وہ گستاخانہ ہیں اور ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مخالفین شیخ نے بادشاہ کے سامنے ان کی یہی غلط تصویر پیش کی ہوگی اور اس پر زور دیا ہوگا کہ شورش عوام کو دبانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کو سزا دی جائے، یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، تاریخ کے ہر دور میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ حکومت کی طرف سے ان لوگوں پر الطاف و اکرام کی بارش ہوتی ہے جو اخلاق و کردار میں پست ہوتے ہیں اور بزرگوں کو قید و بند میں رکھا جاتا ہے جو علم و ایمان کے مرتبہ بلند پر فائز ہوتے ہیں۔ کیا دنیا بھول سکتی ہے کہ امام ابو حنیفہ جیسی ہستی کو زندگی کے آخری سال قید میں گزارنے پڑے تھے۔ خود ہند و پاکستان میں سیدی مولا کے قتل کا واقعہ عبرت انگیز ہے۔ مجدد صاحب کے معاملہ میں یہ ضرور ہوا کہ ان کے الفاظ سے ان کو تفوق حضرت ابوبکر صدیقؓ

---

[1] قید کے واقعہ کی تفصیلات بعد کے تذکروں میں بکثرت ملتی ہیں، ان کو قبول کرنے میں احتیاط ضروری ہے، بعض مصنفین بالخصوص وہ حضرات جو تاریخ کا مطالعہ بغور نہیں کرتے ان تفصیلات سے غلط نتائج اخذ کرتے ہیں، علماء ہند کا شاندار ماضی کے مصنف نے ایک نظریہ پیش کیا ہے کہ مجدد صاحب کی قید کے لئے جہانگیر کے دربار میں ملکہ بانو یعنی نور جہاں کی شیعہ پارٹی نے سازش کی، اس سلسلہ میں انہوں نے نور جہاں کی اس کوشش کا بھی ذکر کیا ہے جو اس نے اپنے داماد شہزادہ شہریار کی ولی عہدی کے لئے کی اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خرم کی مخالفت کرنے لگی۔ اس سلسلہ میں صرف یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ شہریار کی شادی نور جہاں کی بیٹی کے ساتھ حضرت مجدد صاحب کی قید سے رہائی کے اگلے سال میں ہوتی ہے۔ قید کا واقعہ چودھویں سن جلوس کے بعد ہوا۔ رہائی پندرہویں سن جلوس کے بعد ہوئی اور شہریار کی شادی سولہویں سن جلوس کے بعد، ان واقعات کے پیش نظر مجدد یا

Marfat.com

افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق اور دوسرے خلفائے راشدین پر ثابت ہوتا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت شیخ نے کبھی جہانگیر کے متعلق ایسے الفاظ نہیں استعمال کئے جن سے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ اس سے ناراض ہیں بلکہ ایک سال بعد جب جہانگیر نے ان کی رہائی کا حکم دیا اور ان کو اجازت دیدی کہ وہ چاہیں تو اپنے وطن واپس جائیں اور چاہیں اس کی ملازمت اختیار کریں تو آپ نے "نقش مراد در ملازمت خواہد بود" کا فیصلہ کیا اور شاہی لشکر میں قیام کو ترجیح دی اور شاہی خلعت و انعام کو قبول فرمالیا[1]۔ جہانگیر نے مجدد صاحب کے جو الفاظ اپنے بیان میں نقل کئے ہیں ان کی تائید خود ان کے مکتوبات سے ہوتی ہے، میر نعمان کو احوال و اتفاق کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

مخفی نماند کہ تا زمانیکہ بعنایت اللہ سبحانہ آن عنایت بصورت جلال و غضب او تعالیٰ انجلی نہ فرمودہ محبوس قفس زندان نگشتیم از منازل شہودی بالکلیہ نرستیم و از سپس کوچہائے ظلال خیال و تمثال تمام نہ برآمدم و در شاہراہ ایمان بغیب مطابق العنان تنجرے نہ نمودم و از حضور بغیب و از عین بعلم و از شہود باستدلال

---

[1] جہانگیر کے الفاظ یہ ہیں:۔

دریں تاریخ شیخ احمد سرہندی را کہ بجہت دکان آرائی و خود فروشی و بے مزہ گوئی روزے چند در زندان ادب محبوس بود بحضور طلب داشتہ خلاص ساختم، خلعت و ہزار روپیہ خرچ عنایت نمودہ در رفتن و بودن مختار گردانیدم، او از روئے انصاف معروض داشت کہ این تنبیہ و تادیب در حقیقت ہدایتے و کفایتے بود نقش مراد در ملازمت خواہد بود۔

توزک ص ۳۰۸

بوجہ کمال نہ پیوستم .... وحقیقت تفرع والتجاء وانابت واستغفار

وقل وانکسار را بدست نیاوردیم و قسطاس رفیع المنزلت استغنائے حضرت

حق سبحانہ را کہ محفوف بسرادقات عظمت وکبریائی است مشاہدہ نمودیم

وخود را بندہ خوار وعاجز وذلیل وبے اعتبار وبے ہنر وبے اقتدار وبے کمال

واحتیاج وافتقار معلوم نساختیم .... اگر محض فضل تواتر فیوض معارفات

الٰہی جل سلطانہ و توالی عطیات وانعامات نامتناہی او سبحانہ درین محنت

کدہ شامل حال این شکستہ بال نمی شد نزدیک بود کہ معاملہ بیاس رسید ورشتہ

امید گسستہ گردد[1]

اسی کے بعد دوسرے خط میں شیخ بدیع الدین کو بھی یہی تحریر فرماتے ہیں، اور مکتوبات میں

بھی اس کا ذکر ہے۔ مجلس سے جو خطوط شیخ نے لکھے ہیں ان میں اس نکتہ کو متعدد طریقوں سے

سمجھایا ہے، شیخ کے بعض احباب اور معتقدین نے ان کی رہائی کے لئے کوششیں کیں لیکن ان میں

ناکامیابی ہوئی، چنانچہ میر نعمان کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا ہے کہ یاران خیر اندیش

در نسبت اسباب خلاصی کوشیدند، سود مند نیامد۔ اس سے بہ تقاضائے بشریت کچھ افسوس ہوا

لیکن جلد ہی یہ "حزن و تنگی سینہ بفرح و شرح صدر مبدل گشت" اس کے بعد سارے خط میں

اسی تصور کی وضاحت کی ہے کہ محب جس طرح انعام محبوب سے متلذذ ہوتا ہے، اسی طرح

ایلام محبوب سے بھی لذت حاصل کرتا ہے۔ اپنے مفہوم کو واضح کرنے اور دلیل کو مضبوط بنانے

کے لئے وہ شیخ محی الدین ابن عربی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "والعارف لاہمۃ لہ" یعنی وہ

ہمت جو دفع بلیات کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ عارف سے مسلوب ہو جاتی ہے۔

---

[1] مکتوبات۔ جلد سوم ص ۱۱-۱۲

Marfat.com

رہائی کے بعد مجدد صاحب نے قید زنداں کو اپنی روحانی کیفیات میں ایک اہم منزل قرار دیا ہے، لیکن جہاں تک ان کی زندگی کے ظاہری واقعات کا تعلق ہے اس میں بھی نمایاں تغیر پیدا ہوگیا۔ سب سے زیادہ تبدیلی یہ نظر آتی ہے کہ آپ کے خیالات میں تلخی کے علاوہ ملائمت کا عنصر نمایاں ہوگیا۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اصلاحی تحریک کی توسیع کے لئے خود کو عوام تک پہنچایا جائے، پہلے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرتے تھے اور ان میں جو اچھی صلاحیتیں رکھتے تھے ان کو اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر بھیج دیا جاتا تھا لیکن اب خود اپنی مرضی سے لشکر میں رہ کر انہوں نے یہ خدمت انجام دینے کا قصد کیا۔ قید کے زمانہ میں بھی معلوم ہوتا ہے وہ اصلاحی تحریک کا کام کرتے رہے، شاید اس تجربہ کے بعد یہ محسوس کیا ہو گا کہ لشکر شاہی میں رہ کر ہی خانقاہ گوشہ نشینی سے زیادہ موثر طریقہ پر کام کیا جا سکتا ہے، اپنے فرزندوں کو لکھتے ہیں :-

"در برکات عسکر که بودن درانجا باختیار است فرزندان گرامی جمعیت باشند"[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ میں جبکہ شیخ کا قیام لشکر میں رہا ان کا فیض بہت عام ہوا اور اصلاحی تحریک نے بہت قوت حاصل کی، اس قیام کی مدت صحیح طور پر نہیں بتلائی جا سکتی لیکن زبدۃ المقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۳۲ھ یعنی ۱۶۲۲ء میں آپ اجمیر میں مقیم تھے اور یہیں آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "آثار قرب انتقال ظاہر می شود"، اسی وقت صاحبزادوں کو خط لکھا کہ اب ایام انقراض عمر نزدیک ہیں چنانچہ وہ سرہند سے ملنے بھی آئے۔

---

[1] مکتوبات۔ جلد سوم ۱۸۵

[2] مکتوبات۔ جلد سوم ص ۱۴۲

Marfat.com

مزار خواجہ معین الدین چشتیؒ پر حاضری

اسی زمانہ میں مجدد صاحبؒ زیارت کی غرض سے حضرت خواجہ بزرگ کے روضہ شریفہ پر حاضر ہوئے اور "مدتے محاذی صدر آں صدر الاولیاء مراقب نشستند" حضرت خواجہؒ نے بہت کرم فرمایا۔ "از برکات خاصہ خود ضیافات بظہور رسانیدند وسخنان واسرار در میان آمد"۔ خواجہ صاحب کا یہ ارشاد تھا کہ "بعد خلاصی خود از ین عسکر سعی مکنند"۔ اس حکم کی اہمیت کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ شیخ کو عسکر میں زندگی گذارتے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے ان کو یہ کبھی محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اب اپنی عمر کی آخری منزلوں میں ہیں۔ اس لئے شاید یہ خیال آتا ہو گا کہ وطن جا کر قیام کریں، لیکن خواجہ اجمیریؒ نے ہدایت کی کہ وہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دیں اور اصلاحی کام جو وہ لشکر میں انجام دے رہے تھے جاری رکھیں۔ مراقبہ کے بعد جب شیخ باہر تشریف لائے تو خادمان درگاہ

قبر پوش متبرکہ حضرت خواجہ را قدس سرہ کہ در ہر سال یکبار ستانہ می گردانند و آن قدیمہ را بہ یکے از کبار مشائخ می فرستادہ اند یا بہ بادشاہ وقت می دادہ یا بہر گاہ عین لآلی وجواہر صندوق می بہادہ، آن روز آن قبر پوش فرسودہ را بیرآوردہ نزد الیشان آوردہ معروض داشتند کہ بہ از شما سزاوار این کہ باشد حضرت الیشاں باادب تمام قبول نمودند وآن را بخادم سپردہ آہ سرا ز دل کشیدہ بزبان آوردند وفرمودند کہ لباسے ازین نزدیک تر بحضرت خواجہ نبود ملا جرم آن را بجا لطف نمودند برائے تکفین یادگاہ می داشتہ باشند[1]

اس کے بعد جلد ہی مجدد صاحب نے سرہند جاکر "دور تر از فرزندان زاویہ اختیار نمودہ انزوا گزیدند" گوشہ تنہائی سے صرف نماز کے لئے باہر تشریف لاتے رجب ۱۰۳۳ھ میں خواجہ محمد ہاشم صاحب زبدۃ المقامات اجازت لے کر چلے گئے۔ تنہ سال یعنی ۱۰۳۴ھ میں ۲۸ صفر

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۲۸۴

کو مجدد صاحب نے انتقال فرمایا۔

اصلاحی کارنامہ

اصلاحی تحریک کا پہلا دور مجدد صاحب پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور بھی ان ہی کے زمانہ میں شروع ہو جاتا ہے، اکبر اور ابو الفضل کی اسلام دشمن تحریک اس حد تک تو ختم کی جا چکی تھی کہ دین اسلام درباری حلقوں اور شاہی محلات میں اب اجنبی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور بہت سی غیر شرعی رسوم اور ضوابط ختم کئے جا چکے تھے، لیکن جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ عمارت کی تعمیر میں اس کے انہدام کے مقابلے میں بہت زیادہ وقت اور کوشش درکار ہوتی ہے، اسی طریقہ پر معاشرتی نظام میں بھی رخنہ اندازی، شیرازہ بندی کے مقابلہ میں بہت سہل ہے۔ اکبری دور کے الحاد و بے دینی نے اسلامی معاشرہ کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں، اب ان کو درست کرنے اور قابل اعتماد بنانے میں وقت کی بھی ضرورت تھی اور متواتر کوشش کی بھی، اس کوشش کی پہلی منزل بادشاہ کو صحیح راستہ پر لانا تھا، اس میں بڑی حد تک کامیابی ہو چکی تھی، اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، پہلی منزل میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس میں مجدد صاحب کی کوشش کو زیادہ دخل نہ تھا، لیکن دوسری منزل میں جب زیادہ تر توجہ عوام کی اصلاح پر تھی، ان کی کوشش خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔

ترویج شریعت

عوام کو صحیح راستہ پر لانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ ترویج شریعت پر زور دیا جائے، مجدد صاحب نے اسی پر زور دیا اور اسی کو اپنی کوشش کا اولین مقصد قرار دیا۔ شریعت کی پابندی اور اس کے نفاذ کے سلسلہ میں ان کو تین طبقوں سے واسطہ پڑا۔ وہ سنی مسلمان جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے غیر شرعی رسوم کو اختیار کر لیا تھا، دوسرے شیعہ لوگ جو اہل سنت والجماعت سے بعض امور میں بنیادی اختلافات رکھتے تھے اور تیسرے غیر مسلم، بالخصوص ہندو جن کو اکبر کی بے راہ روی نے درباری حلقوں ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی شعائر کی مخالفت کے مواقع بہم پہنچا دئے تھے، جہاں تک پہلے طبقہ کا تعلق ہے یعنی سنی مسلمانوں کا جو شریعت کی طرف

Marfat.com

سے بے اعتنائی برتنے لگے تھے اور جن میں بعض جہال صوفیا بھی تھے، مجدد صاحب چاہتے
تھے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر پہلو میں شریعت کی پابندی کو ضروری سمجھیں، مسلمانوں
کے نزدیک شریعت کو نظر انداز کرنے کا جواز کسی صورت میں بھی نہیں۔ شیخ عبدالحق محدث
دہلوی کو بھی ان کے استاد کی ہدایت تھی کہ فقیہہ صوفی بن کر زندگی گذاریں اور صوفی
فقیہہ نہ ہوں۔ صوفیاء نے بعض مسائل کی جو توضیحات کیں ہیں ان پر علماء کا ایک طبقہ
اعتراض کرتا رہا ہے، ان مسائل میں مسئلہ وحدت الوجود خاص طور پر اہم ہے اس
کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی نزاکت کا بھی احساس مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ
کو ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہا ہے، شیخ محی الدین ابن العربی نے اس پر بہت زور دیا ہے، اور
اس کی تشریح بہت مفصل اور مدلل طریقہ پر کی ہے، ان کے علاوہ بڑے بڑے شعراء نے
اس فلسفہ کو مختلف انداز سے اور مختلف مضامین میں ادا کیا، غرض کہ بہت جلد وحدت الوجود
کا تصور فلسفہ کے دائرے سے نکل کر علم و ادب کے حلقوں تک پہنچ گیا اور مسلمانوں کی روحانی
زندگی پر چھا گیا۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی تصور یا مسئلہ مقبولیت حاصل کر لیتا ہے تو
اس میں افراط و تفریط کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ وحدت الوجود کے ساتھ بھی
یہی ہوا۔ مفکرین صوفیاء نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ تصور عوام کی سطح سے بلند رہے، لیکن ان
کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور صوفیاء کے ہر طبقہ تک وہ پہنچ گیا اور وہ لوگ جن میں
اس کی حقیقت جاننے کی استعداد نہ تھی اس میں غلو کرنے لگے اور ان کے بعض اقوال و افعال
شریعت کے اصولوں سے ٹکراتے ہوئے نظر آتے تھے، اس کی روک تھام نہایت ضروری
تھی کیونکہ اس سے انتشار کی قوتوں کو فائدہ پہنچنے کا خطرہ تھا، مجدد صاحب نے اسی ضرورت
کے پیش نظر وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ ظاہری شکل میں تو ان دونوں نظریات
میں تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن جیسا کہ مفکر اعظم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے
رسالہ فیصلہ وحدت الوجود و الشہود میں وضاحت کی ہے، دونوں میں بنیادی فرق نہیں

Marfat.com

اور شیخ اکبر اور شیخ مجدد کے خیالات میں تطبیق ممکن ہے، لیکن شیخ مجدد کو وحدت الشہود پر بہت زیادہ اصرار اس لئے تھا کہ وحدت الوجود کی اشاعت جہلا میں نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتی تھی اور کر رہی تھی۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اختلاف رائے کے باوجود شیخ مجدد شیخ اکبر کا احترام کرتے تھے اور ان کو اولیاء اللہ میں شمار کرتے تھے[1]

تاریخ کے طلباء کو اس کا خوب اندازہ ہے کہ شیعہ سنی اختلافات نے مسلمانوں کی کتنی سلطنتوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے اسباب زوال میں بھی ان اختلافات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زمانہ انحطاط میں تو یہ اختلافات ناگوار حد تک پہنچ گئے تھے لیکن ان کا آغاز اکبری کے زمانہ میں ہو گیا تھا۔ ایران و ماوراءالنہر کے سیاسی تعلقات بھی ان ہی مذہبی اختلافات کی وجہ سے بہت زیادہ خراب ہو گئے تھے، اس کے مضر اثرات ہندوپاکستان کی حدود میں بھی داخل ہونے لگے تھے اور دینی انتشار نے جو ماحول یہاں پیدا کر دیا تھا وہ ان اختلافات کے لئے ساز گار ثابت ہوا۔ مبارک، ابوالفضل اور فیضی تشیع کی طرف مائل تھے۔ ان میں خود تو غلو نہ تھا لیکن شیعہ طبقہ کو ان کے جانے والے اخلاقی مدد و نصرت ملتی تھی۔ وہ اپنے سیاسی اثر کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے قدرتی طور پر خواہش مند تھے۔ سنی امراء سمجھتے تھے کہ شیعوں کا اقتدار در حقیقت ان کی شکست تھی۔ اتنی وسیع سلطنت میں جس کے وسائل تقریباً لامحدود تھے دونوں طبقوں کی فلاح و بہبود کے لئے کافی گنجائش تھی لیکن ذاتی مقاصد اور سیاسی فرقہ بندی نے رواداری اور ایثار کو ختم کر دیا تھا اور مذہبی اختلافات کو سیاسی مقاصد اور دنیوی اقتدار کے حصول کا ذریعہ بنایا جانے لگا تھا۔ ان حالات میں اختلافات کو کم کرنے کی کوشش تو ایک طرف ان کو وسیع تر کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے جاتے تھے۔ تھوڑے سے ذاتی مفاد کی خاطر قومی

---

[1] زبدۃ المقامات میں کئی جگہ اس کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً دیکھو ص ۲۱۱

Marfat.com

نقصان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جاتی تھیں، فرقہ وارانہ اختلافات کو بڑھانے کے لئے بعض "اعتقادات" اور خیالات کی تشہیر کی جاتی تھی ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اہل سنت والجماعت کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے تھے، حضرت مجدد صاحب نے یہ ضروری خیال کیا کہ ان مسائل کو صحیح طور پر پیش کیا جائے۔

سنی مسلمانوں کے بعض طبقوں، اور شیعوں کے خیالات سے زیادہ اہم مجدد صاحب کا رویہ غیر مسلموں کے معاملہ میں تھا، ہندوستان میں اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کے معاملہ میں ہمیشہ رواداری کی پالیسی پر عمل کیا انہیں مذہبی امور میں مکمل آزادی رہی حکومت کے علاوہ جمہور مسلمانان بھی اسی راہ پر گامزن رہے، اس میں بہت بڑا دخل صوفیا کے طریقہ کار کو بھی تھا، ان حضرات کو یقین تھا کہ تبلیغ و اشاعت اسلام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے انتہائی وسعت قلب و رواداری ضروری ہے بڑی حد تک ان کی کامیابی کا راز یہی تھا، کثرت سے غیر مسلم ان کے پاس آتے اور بالآخر ان میں سے بڑی تعداد اسلام قبول کر لیتی، اکبر اور ابوالفضل کی پالیسی نے رواداری کے قابل تحسین اصول کو مسخ کر دیا اور "صلح کل" کی آڑ میں اسلامی وقار کو مجروح کرنے کی امکانی کوشش کی جانے لگی اس پالیسی کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا، یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی نفاق!

دو قومیں

ہندوستان کی اسلامی حکومت کی بنیاد شریعت پر تھی۔ اب صلح کل کے پردے میں شریعت ہی پر حملے ہو رہے تھے اور اسی کا اظہار کیا جانے لگا تھا۔ مورخ بدایونی کے بعض بیانات اس سلسلہ میں پہلے پیش کئے جا چکے ہیں، مجدد صاحب نے ان حالات کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہندوان باعتی کفار برملا بطریق استیلا اجرائے احکام کفر در دارالاسلام می کردند مسلمانان از اظہار احکام اسلام عاجز بودند اگر می کردند بقتل

می رسیدند۔ وا ویلا۔ وا مصیبتا۔ وا حسرتا۔ وا حزنا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم که محبوب رب العالمین است، مصدقان او ذلیل و خوار بودند و منکران او بعزت بودند و معاندان بسخریہ و استہزاء بر جراحت ہائے ایشان نمک پاشیدند"[1]

دوسرے حلقوں میں بھی یہ خیالات موجود ہیں۔ ہندوؤں کی زیادتیوں مثلاً مسجدوں کو شہید کر کے مندر بنانے پر افسوس کرتے ہیں۔ اکبر کی صلح کل پالیسی نے حالات اس قدر بگاڑ دیئے تھے کہ مجدد صاحب کو اس سلسلہ میں سخت گیری کا رویہ اختیار کرنا پڑا اسلام کو مغلوب اور مسلمانوں کے اقتدار کو تدریجاً تباہ کرنے کی کوششیں اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ ان کو ختم کرنے کے لئے سخت ترین اقدامات کی ضرورت تھی۔ اکبر کی "صلح کل" پالیسی نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ ہند پاکستان میں ایک نہیں دو قومیں ہیں۔ نظریاتی اور اصولی حیثیت سے تو مسلمان پہلے ہی اس کے قائل تھے کہ ملت کا تصور وطنیت سے بالاتر ہے لیکن حکومت کا کام چلانے اور مشترک مسائل کو حل کرنے کے لئے وہ ایسے معاشرہ کی تشکیل کے خلاف نہیں تھے جس میں ایک سے زائد قومیں دوش بدوش انسانی فلاح کے لئے کام کریں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کی تکمیل کی کوشش صدیوں سے ہو رہی تھی، چنانچہ دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمان یک جہتی کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن سولہویں صدی کے ربع آخر میں جو الحاد کا طوفان درباری حلقوں سے اٹھا اس نے اتفاق اور یک جہتی کی عمارت کی بنیادیں ہلا دیں۔ شیخ مجدد کی باریک بیں نظر نے اس کو بغور دیکھا اور فوراً طے کیا کہ ملت کو اپنے دفاع کی خاطر ملی نہ کہ وطنی بنیاد پر منظم ہونا چاہئے۔ "صلح کل" کا ردعمل یہی ہو سکتا تھا۔

---

[1] بحوالہ رود کوثر ص ۲۶۸-۲۶۹

ان حالات کو اگر ہم اپنے سامنے رکھیں تو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ غیر مسلموں کی طرف شیخ کے رویہ میں اس قدر تشدد کیوں تھا[1] شیخ مجدد کے معتقدین ان کے اس رویہ کو شانِ جلالی کا اظہار کہتے ہیں، برخلاف دوسرے بزرگوں کے طریقہ کار کے جس کو شانِ جمالی کہا جاتا ہے۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ اکبری دور میں حکومت اور ارکینِ حکومت کی ایک جماعت کی طرف سے ہندوؤں کی جو حوصلہ افزائی کی گئی اس نے اُن کی اس احیائی کوشش کو جو اس وقت تک محدود اور مختصر پیمانہ پر تھی مطلق العنان کر دیا۔ تعلیم یافتہ اور با اقتدار حلقوں میں تو شعائر اسلامی پر حملے کئے جاتے تھے اور مسلمانوں کے اثر اور شیرازہ بندی کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، لیکن دور افتادہ علاقوں بالخصوص قصبات اور گاؤں میں اس کا مظاہرہ مسجدوں پر حملے اور قرآن شریف کی بے حرمتی کی شکل میں ہوتا تھا۔ مورخوں نے اکبر کی پالیسی کو ہندو مسلم اتحاد کی مثالی تصویر بنا کر پیش کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اتحاد سطحی تھا جس کے نیچے نفاق اور تفرقہ کی خلیج برابر بڑھتی جا رہی تھی، میواڑ کے علاقہ میں راجہ پرتاب سنگھ کی سرکردگی میں جو واقعات رونما ہو رہے تھے، وہ مجدد صاحب جیسے ذہین اور باریک بیں رہنما کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے، شریعت کی ترویج، بدعات کو ختم کرنے کی کوشش اور ملت اسلامیہ کی ملت ہی کے اصول پر تنظیم، سب کا ایک ہی مقصد تھا، یعنی یہ کہ مسلمان غافل ہو کر کہیں اپنی ملی اور اجتماعی زندگی کو ختم نہ کر دیں، دو قومی نظریہ کو اگر تاریخ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو دور بین نظریں سولھویں صدی کے آخری حصہ تک پہنچیں گی اگر اس کی جڑیں اتنی گہری اور مضبوط نہ ہوتیں تو اس کے نتائج بھی اس قدر مستحکم نہ ہوتے۔ تاریخی واقعات کا یہ تجزیہ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ طلبا ر تاریخ نے اکبری

---

[1] اس تشدد کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

Marfat.com

اس پالیسی پر ہمیشہ زور دیا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کا خواہاں تھا اور بعض کے نزدیک تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم بنانے کا خواب سب سے پہلے اسی نے دیکھا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلا قدم اسی نے اٹھایا۔ اگر یہ صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس نے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو اقدامات کئے وہ غلط تھے۔ کیونکہ ان کا آخری نتیجہ نہایت خطرناک نکلا۔

Marfat.com

باب شانزدہم

شمال مغربی اور دکن و گجرات کے علاقوں میں اصلاحی کوششیں

روشنیہ تحریک

دین الٰہی کی تقریباً ایک ہمعصر تحریک روشنیہ تھی جس کے بانی بایزید جلندھر میں پہلی جنگ پانی پت (۱۵۲۶ء) سے ایک سال قبل پیدا ہوئے تھے چونکہ اس تحریک نے بہت جلد سیاسی رنگ اختیار کر لیا اور مغلیہ حکومت سے جنگ کا سلسلہ چھڑ گیا، اس لئے سرکاری و نیم سرکاری مورخین نے اس کی جو تصویر پیش کی ہے وہ رنگ آمیزی سے خالی نہیں۔ بایزید ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے والد نے ان کی ماں کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لی تھی، چنانچہ ان کو متعدد تکالیف اٹھانا پڑیں۔ شروع ہی سے ان کو ایسے مسائل سے دلچسپی تھی جو خدا کی ہستی سے متعلق تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے ایک عزیز خواجہ اسمٰعیل کے مرید ہوں لیکن ان کے والد نے منع کیا۔ اس کے بعد خود ہی انہوں نے عبادت و ریاضت کی اور مذہبی مسائل پر غور کیا۔ انہوں نے ہر عمل کو نئے معنی پہنائے اور شریعت و طریقت کے مسائل کو وہ رنگ دیا جو شریعت سے بعید معلوم ہوتا تھا۔ وہ تمام باتیں طریقت کی ادا کرتے تھے۔ ان کو وحدت الوجود میں اس قدر غلو تھا کہ اس کے نہ ماننے والوں کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور ان کے نزدیک حرام تھا۔

دبستان المذاہب میں جس کا ماخذ خود بایزید کی تصنیف حال نامہ[1] ہے، ان کے خیالات کا ذکر اس طرح

---

[1] حال نامہ اب نایاب ہے، اس کا ایک نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے دیکھو رسالہ فکر و نظر (علی گڑھ جنوری ۱۹۶۰ء)

Marfat.com

شروع کیا گیا ہے:۔

او خود را نبی دانستے و مردم را بریاضت فرمودے و نماز بگزاردے، اما جہت تعین را از میان برداشت۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ فرمود غسل بہ آب حاجت نیست چہ ہمین کہ باد رسید تن پاک می شود چہ چار عنصر از مطہرات است و گفت ہر کہ خدا را و خود را نشناسد آدمی نیست اما گر موذی است حکم گرگ و مار و پلنگ و کژدم دارد و پیمبر عربی گفتہ اقتل الموذی قبل الایذا و اگر نیکو کار نماز گذار است حکم گاو و گوسفند دارد کشتن آن جائز است، بنابرین مخالفان خود شناسی را کشتن فرمود، چہ این ہا چو انند چنانکہ در قرآن آمدہ اولئک کالانعام بل ہم اضل و گفت ہر کس خود را نشناخت و خبر از زندگی جاوید و حیات ابدی ندارد، مردہ است و مال مردہ کہ وارثان آن چنین مردہ باشند بزندگان رسد بنابرین نیز حکم بر قتل نادان کرد اگر ہندو را خود شناس یافتندے بر مسلمان ترجیح میدادندے، او با فرزندانش مدتہا ساہ ماخذ اموال از مسلمانان وغیرہ ستدہ خمس اموال در بیت المال میداشت ...... گویند حق با او بے میانجی جبرئیل سخن کردے"[1]

اس اقتباس سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بایزید نے قرآن کی آیتوں، رسول اللہ کی حدیثوں اور بزرگان دین کے اقوال کو کس طرح پیش کیا، بایزید نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے پہاڑی اور بنجر علاقہ کا انتخاب کیا، اس علاقہ میں تعلیم کم تھی اور ایسے علماء موجود نہ تھے جو لوگوں کو یہ بتلا سکتے کہ قرآن و حدیث اور بزرگوں کے اقوال کی کس قدر عجیب توضیح کی جا رہی ہے، بایزید نہایت ذہین شخص تھے انہوں نے بنجر علاقہ کی اقتصادی حالت کے پیش نظر

---

[1] دبستان المذاہب ص ۳۰۸ - ۳۰۹

لوٹ مار کو تعفن کا رنگ دیدیا، ہندپاکستان اور اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں کے درمیان خشکی کے راستہ سے جو تجارت ہوتی تھی اس کا بڑا حصہ اسی علاقہ میں ہو کر گذرتا تھا، اس طرح رہزنی کے مواقع بہت زیادہ تھے، بایزید نے جن کو ان کے پیرو، پیرروشن[1] کہتے تھے اس علاقہ میں ایک نیم خود مختار حکومت قایم کرلی تھی، جب یہ خبریں کابل پہنچیں تو محسن خاں غازی نے حملہ کیا اور بایزید کو گرفتار کرلیا۔ بایزید نے اپنے عقائد سے توبہ کرلی اور ان کو رہا کردیا گیا، لیکن رہائی کے بعد پھر انہوں نے اپنے پرانے طریقے شروع کردئے اور کسی نہ کسی طرح ایک لشکر فراہم کرلیا۔ محسن خان غازی نے دوبارہ حملہ کیا اور روشنیوں کو شکست دی لیکن ان کے پیر اس مرتبہ بچ کر بھاگ گئے۔ اس شکست کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

بایزید کے پانچ بیٹے تھے، ان میں سے تین تو مقامی لڑائیوں میں یوسف زئی قبیلہ کے ہاتھوں ختم ہوگئے، ایک کو اکبر نے قید کرلیا، پانچویں بیٹے جلال الدین کو باپ کا جانشین بنایا گیا، اب مغلوں اور روشنیوں میں جنگ شروع ہوگئی تھی۔ اسی کشمکش میں جلال الدین جن کو اکبر جلالہ کہا کرتا تھا، ایک سردار کے ہاتھ سے مارے گئے، ان کے بعد ان کا ایک بھتیجا جانشین ہوا۔ ۲۰ھ میں جہانگیر کے افسروں کے ہاتھ سے وہ بھی مارا گیا، اس کا بیٹا اور جانشین عبدالقادر شاہجہانی امراء میں شامل ہوگیا۔

اگر روشنیوں کی تحریک اور ان کے خیالات کو غور سے دیکھا جائے تو اصولی طور پر یہ تحریک بھی دین الٰہی ہی کی طرح تھی، جیسا کہ ابوالفضل اکبر کی شخصیت کو نبوت کی بلندی تک لے جانے کی کوشش میں لفاظی سے کام لیتا تھا اور صوفیاء کی اصطلاحات کی

---

[1] مخالفین ان کو پیر تاریک کہتے تھے۔ ابوالفضل اور دوسرے مورخ ان کے معتقدین کو تاریکی لکھتے ہیں۔

Marfat.com

آڑ میں شریعت پر حملے کرتا تھا۔ اسی طرح بایزید بھی جہلاء کو بہکانے کے لئے قرآن، حدیث اور بزرگوں کے اقوال کو اپنے خاص معنی پہنا کر پیش کرتے تھے۔ جس طرح ابوالفضل کا مقصد اولین اکبر کو نبوت بلکہ الوہیت کا خلعت پہنانا تھا اسی طرح بایزید بھی خود کو نبی کہتے تھے بلکہ یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ "حق بادبے میانجی جبرئیل سخن کردے۔"

اخوند بابا درویزہ پشاوری

جس طرح دین الٰہی سے پیدا شدہ نتائج کے مقابلہ میں صوفیاء اور علماء پیش پیش تھے اسی طرح روشنیہ تحریک کو ختم کرنے میں بھی ان ہی لوگوں نے سعی کی، بالخصوص چشتی صابری خاندان کے مشائخ نے جن میں اخوند بابا درویزہ کی کوشش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے خلیفہ اعظم شیخ جلال الدین تھانیسری صاحب رسالہ تحقیق اراضی ہند کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ آپ کے داماد اور خلیفہ شیخ نظام الدین

"جامع علوم ظاہری و باطنی، حاوی کمالات صوری و معنوی، واقف رموز شریعت و طریقت و معرفت و حقیقت...... بود۔"[1]

ان کی بزرگی کی شہرت سن کر شہزادہ سلیم خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے اس کو سلطنت کی بشارت دی، لیکن تخت نشینی کے بعد جہانگیر کو ان کی طرف سے خود غرض مخالفین نے بدگمان کردیا، جہانگیر کا بیٹا خسرو اپنی بغاوت کے زمانہ میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مدد چاہی۔ شیخ نے بغاوت سے باز آنے کی نصیحت کی، لیکن خسرو اس پر کاربند نہ ہوا، بہرحال حاسدوں نے خسرو کی حاضری کو شیخ کی سازش کی دلیل کے طور پر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ جہانگیر نے شیخ کی جلاوطنی کا حکم جاری کردیا، چنانچہ وہ بالآخر اپنے آبائی وطن بلخ میں قیام پذیر ہوگئے۔ یہاں بہت سے لوگ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے۔ ان میں بلخ کا حاکم بھی شامل تھا

---

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۲۴۱

Marfat.com

شیخ کی بڑھتی ہوئی عزت و مقبولیت پر بعض لوگوں کو رشک ہوا اور انہوں نے مقامی حاکم سے شکایت کی کہ شیخ نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد میں حاضر نہیں ہوتے بلکہ اپنی خانقاہ میں جماعت کر کے "تفریق بین المسلمین" کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حاکم نے جب شیخ سے یہ کہا تو آپ نے فرمایا کہ امام رافضی ہے، اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی اس پر شہر میں ہیجان ہو گیا، بہت سے لوگوں نے شیخ اور حاکم کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، حاکم بھاگ کر شیخ کی خانقاہ میں آ گیا، شیخ نے اس سے کہا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ حملہ آوروں میں امام بھی موجود تھا، شیخ نے حاکم سے کہا کہ امام رافضی ہے اور اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے فرمایا کہ امام کے موزے اتروائے جائیں، حاکم نے امام کے موزے اتروائے تو دیکھا کہ ان میں دو کاغذ کے پرچے تھے جن پر شیخین یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے اسمائے گرامی لکھے تھے، اس پر ہجوم بہت برافروختہ ہوا اور امام کو قتل کر دیا۔ شیخ نظام کی عزت اس کے بعد بہت زیادہ بڑھ گئی۔

شیخ نظام کے خلفاء میں ایک بزرگ سید علی ترمذی تھے جن کا شمار اس علاقہ کے اولیاء کبار میں ہوتا ہے۔ سید صاحب کو ان کے مرشد نے یوسف زئیوں کے علاقے میں ارشاد و ہدایت کے لئے بھیجا، یہاں ان کو بہت کامیابی ہوئی۔ اخوند درویزہ جو ایک با اثر عالم اور جامع علوم ظاہری و باطنی تھے، ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے، اخوند درویزہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ :

> در دفع زنادقہ و ملاحدہ در فضائے اجابت می کوشید و باہتمام مباحثہ کردہ ملزم ساختے، خصوصاً با علی ملوتی و بایزید ملحد کہ خود را پیر روشن نام نہادہ بود بحثہا کردہ [1]

۱؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۹

Marfat.com

انہوں نے پشتو میں ایک کتاب مخزن الاسلام کے نام سے لکھی، روشنیہ تحریک کے خلاف یہ کوشش ملا صاحب نے اپنے مرشد سید علی ترمذی کی معیت میں شروع کی تھی چنانچہ اس کی طرف مخزن الاسلام میں اشارہ کیا ہے :۔

"چون حضرت پیر دستگیر این فقیر، شیخ المشائخ والاولیاء سیف السنت سید علی ترمذی درمیان افغانان یوسف زئی در موضع بونیر بودہ، انیا نیز خبر یافتہ دفع دعوی او را بر خود فرض دید .... پس این فقیر ہم ہمراہ برفتم، او را چنان در دعوی خجل و شرمسار ساختم کہ سخن گفتن و دم زدن در حضور نتوانست ...... گاہے با حضرت پیر و قبلہ گاہی و گاہے بہ تنہائی خود حاضر می شدم"

شیخ اخوند کو تجربہ نے بتلایا کہ مکمل کامیابی ان مباحثوں سے نہیں بلکہ علوم اسلامیہ کی اشاعت کے ذریعہ ہو سکتی ہے چنانچہ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں، خاص طور پر پشتو میں تاکہ افغان "جز در تنقلب خولا محبت تمام دارند و دین را جویان اند" الحاد و زندقہ سے محفوظ رہ سکیں۔ ان تصانیف میں اسلامی عقائد کو غیر شرعی باتوں سے پاک رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔

اخوند درویزہ بحیثیت مصنف

پشتو کی ادبی تاریخ میں بھی اخوند بابا ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی متعدد تصنیفات ادبی لحاظ سے بھی بلندپایہ مانی جاتی ہیں، کبھی کبھی اشعار بھی کہتے تھے جن میں سے بعض ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بہارستان میں ان کی ایک پشتو مثنوی صبر کی فضیلت پر موجود ہے۔ اخوند بابا کے بیٹے ملا عبد الکریم بھی ایک "فاضل صوفی مشرب" تھے، انہوں نے علوم ظاہر و باطن اپنے والد بزرگوار سے ہی حاصل کئے تھے اپنی فضیلت کے باعث محقق افغانستان کہلائے، ان کے والد کی تصنیف مخزن الاسلام نامکمل رہ

Marfat.com

گئی تھی، چنانچہ انہوں نے اس کے آخری ابواب مکمل کئے وہ شعر بھی کہتے تھے اور اخوند کریمہ تخلص کے طور پر اپنا نام لکھتے تھے ۱۰۷۲ھ میں وفات پائی[1] روشنیہ تحریک کی مخالفت کر کے اس کے دور رس نتائج کو رد کئے اور قبائلی علاقوں میں اسلامی تحریک کی بنیادیں مضبوط کرنے میں چشتیہ، صابریہ سلسلہ کے ان بزرگوں نے بہت بڑا کام کیا۔

مالوہ، گجرات اور دکن

جنوبی علاقوں میں دینی و اصلاحی تحریکوں کا تذکرہ اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ نہیں کیا جا رہا ہے لیکن یہ بتلانا ضروری ہے کہ علما و مشائخ کی کوششوں نے یہاں بھی بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ خواجہ غریب نواز گیسو دراز کا اثر دکن میں آج تک بہت زیادہ ہے۔ گجرات میں بہت سے بزرگوں نے کام کیا۔ شیخ احمد کھٹو "اعظم مشائخ گجرات است" تغلق سلطنت کے آخری دور میں تیمور کے حملہ کے وقت وہ دہلی ہی میں تھے، مغلوں نے ان کو گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن بعد میں جب ان کی بزرگی کا حال معلوم ہوا تو تیمور نے رہا کر دیا۔ سید برہان الدین اس طرف کے علاقہ میں قطب عالم کے نام سے مشہور ہیں وہ اور ان کے بیٹے شاہ عالم احمد آباد میں مدفون ہیں۔

شیخ علی متقی

بعد کے زمانہ میں شیخ علی متقی چشتی برہانپوری کی شخصیت خصوصی طور پر اہم ہے وہ ۸۸۵ھ میں برہانپور میں پیدا ہوئے۔ شیخ عبدالحکیم بن شیخ باجن سے چشتیہ سلسلہ میں خلافت حاصل کی اور پھر ملتان جا کر شیخ حسام الدین سے علم ظاہر حاصل کیا۔ بعد میں حرمین چلے گئے۔ یہاں شیخ ابوالحسن بکری کی شاگردی میں رہے اور شیخ محمد بن محمد السخاوی سے شاذلیہ و قادریہ سلسلہ میں خرقہ خلافت لیا۔ مکہ معظمہ

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۱

میں مستقل قیام کیا "مدت عالمے را بانوار طاعت ومجاہدات وبآثار افادات علوم دینی وفنون یقینی منور ومستفید ساخت و بہ جمع وتصنیف کتب ورسائل علم حدیث وتصوف پرداخت۔ از انجملہ جامع الصغیر وجمع الجوامع شیخ جلال الدین سیوطی را کہ مرتب بہ حروف ہجا بود منبو بابواب فقیہہ فرمود وبار دیگر ازاں تلخیص گرفتہ آں ہم بہ غایت مہذب ومنقح آمدہ ورسالہ تبئین الطرق ومجموعہ حکم کبیر در تصوف از تصانیف وے است"[1] ان کی چھوٹی بڑی سب تصانیف سو سے زائد ہیں، شیخ علی متقی کو حدیث اور تصوف سے بہت دلچسپی تھی لیکن صوفیاء کے بعض طریقوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے مثلاً سماع کا وہ طریقہ جو ہند پاکستان میں رائج تھا یعنی جس میں اہل ونااہل سب شریک ہوتے تھے لیکن ساتھ ہی اس کے بھی خلاف تھے کہ جن بزرگوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا ہے ان پر نکتہ چینی کی جائے[2] ۹۷۵ھ میں مکہ معظمہ ہی میں وفات پائی۔

شیخ عبدالوہاب متقی

مالوے کے علماء میں شیخ عبدالوہاب متقی نے بہت شہرت حاصل کی، وہ منڈو میں پیدا ہوئے، ان کے والد جنہوں نے منڈو چھوڑ کر برہانپور میں سکونت اختیار کر لی تھی یہاں آکر زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہے اور عبدالوہاب کم عمری ہی میں یتیم ہو گئے لیکن "بہ توفیق الٰہی رفیق حال الشان شدہ در طلب حق بباد فقر وتجرید ومسافرت وسیر عالم کشید" کسی مقام پر تین دن سے زیادہ قیام نہیں کرتے تھے، سوائے ان جگہوں کے جہاں علم ظاہر یا صحبت مشائخ وصلحاء کے لئے زیادہ عرصہ تک رکنا پڑتا۔ ابھی جوان ہی تھے کہ مکہ معظمہ چلے گئے۔ یہاں شیخ علی متقی نے جن کے والد

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۷

[2] اخبار الاخیار ص ۲۶۴، شیخ عبدالحق نے ان کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔

Marfat.com

سے واقفیت رکھتے تھے کہا کہ ان کی صحبت میں کچھ دن گذاریں، چنانچہ تقریباً بارہ سال تک شیخ علی متقی کی خدمت میں علوم شرعیہ حاصل کئے اور ان کی وفات کے بعد چھتیس سال تک مکہ معظمہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ شیخ عبد الحق دہلوی ان کے شاگرد خاص اور خلیفہ ہیں۔

شیخ وجیہ الدین

گجرات کے ایک اللہ بزرگ قابل ذکر ہیں شیخ وجیہ الدین علوی سنہ ۹۱۱ھ میں چاپانیر میں پیدا ہوئے، ملا عماد طارمی سے علوم ظاہری حاصل کئے شیخ غوث سے باطنی تعلیم پائی اور بہت جلد "جامع کمالات ظاہر و باطن" ہو گئے بہت سے لوگ ان کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوتے، لیکن ان مصروفیات کے باوجود درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ شیخ کا دستور تھا کہ جو کچھ فتوحات کے سلسلہ میں ان کے پاس آتا وہ مساکین کو دیتے اور خود اپنے اوپر بہت کم خرچ کرتے، کپڑے بھی معمولی قسم کے پہنتے تھے، شیخ علی متقی نے فتویٰ دیا تھا کہ شیخ غوث گوالیاری شطاری کو قتل کر دیا جائے، کیونکہ ان کی بعض تصانیف اسلام کے خلاف تھیں۔ سلطان محمود گجراتی نے کہا کہ اس فتوے پر اس وقت تک عمل نہ کیا جائے گا جب تک کہ شیخ وجیہ الدین اس کی توثیق نہ کریں۔ وہ جب شیخ غوث سے ملے تو ان کے اس قدر گرویدہ ہو گئے کہ صرف فتوے پر دستخط کرنے سے ہی انکار نہیں کیا بلکہ ایک رسالہ لکھ کر ان اعتراضات کا جواب دیا جو ان پر کئے گئے تھے۔ مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ: "در استفتا را پارہ کرد" بہر حال یہ واقعہ ہے کہ شیخ وجیہ الدین کی عقیدت کے بعد شیخ غوث گوالیاری کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہو گیا ۹۹[illegible] شیخ وجیہ الدین نے وفات پائی، وہ بڑے عالم تھے اور بقول بدایونی کوئی درسی کتاب ایسی نہ تھی جس پر انہوں نے حاشیہ یا شرح نہ لکھی ہو، لیکن ان کی مقبولیت کا بڑا سبب ان کی درویشانہ زندگی تھی۔

Marfat.com

شیخ طاہر پٹنی، بوہروں کی اصلاح

شیخ وجیہہ الدین کے ہم عصر علماء میں شیخ جمال الدین محمد ابن طاہر پٹنی قابل ذکر ہیں۔ وہ ۹۱۴ھ میں نہروالہ میں پیدا ہوئے، بتیس سال کی عمر میں زیارت حرمین کے لئے حجاز گئے اور وہاں مختلف علماء سے علوم ظاہری کی تکمیل کی بعدہٗ "بدست ارادت بدست شیخ علی متقی دادہ در فضل و کمال کامل و مکمل گشت"[1] وہاں سے واپسی پر اپنے وطن گجرات میں اصلاحی کام شروع کیا "خصوصًا در ازالہ بدعات ہم قوم خود کہ ہمہ بوہرہ بودند و مذہب مہدویہ اسمٰعیلیہ داشتند ہمہ تن مستعد بود" اصلاحی کوشش میں اس قدر دلچسپی تھی کہ یہ عہد کرلیا تھا کہ جب تک ان کی قوم بدعت سے پاک نہ ہوجائے وہ عمامہ سر پہ نہیں رکھیں گے۔ اکبر بادشاہ گجرات پر حملہ کے دوران وہاں پہنچا تو اور علماء کے ساتھ شیخ طاہر بھی اس کے پاس ملنے گئے اکبر نے عمامہ سر پہ نہ ہونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے وجہ بتلائی۔ اکبر نے خود عمامہ ان کے سر پہ باندھا اور فرمایا:۔

"کہ نصرت دین متین بذمہ من است، شما در ازالہ بدعت کوشید"

کچھ عرصہ تک تو شیخ اصلاحی کام میں مصروف رہے لیکن بعد میں اسمٰعیلیہ فرقہ کا اثر بڑھ گیا تو انہوں نے عمامہ پھر اتار پھینکا اور بادشاہ سے فریاد کرنے آگرہ کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں اسمٰعیلی فرقہ کے چند لوگوں کے ہاتھوں سے اجین کے قریب قتل ہوئے (۹۸۶ھ) ان کی نعش کو پٹن لاکر دفن کیا گیا۔ شیخ طاہر کی فن حدیث میں کئی تصانیف ہیں جن میں مجمع بحار الانوار سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے علاوہ تذکرۃ الموضوعات، قانون الموضوعات فی ذکر الضعفاء والوضاعین بھی قابل ذکر ہیں[2]۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۵

[2] ان کے حالات کے لئے مزید دیکھو اخبار الاخیار ماثر الکرام۔ جلد اول ص ۱۹۶

Marfat.com

اس علاقہ کے ایک اور شطاری بزرگ جنہوں نے اس سلسلہ کی اشاعت کی سید صبغۃ اللہ بروچی تھے، وہ شیخ وجیہہ الدین کے خلیفہ اور شاگرد تھے، وطن، بڑوچ تھا لیکن انہوں نے مدینہ منورہ کے قریب جبل احد کے قریب خانقاہ تعمیر کی اور وہیں قیام کیا، سید صبغۃ اللہ نے شیخ محمد غوث کے رسالہ جواہر خمسہ کا عربی میں ترجمہ کیا ان کے خلیفہ شیخ احمد شناوی نے شطاریہ سلسلہ کی حجاز میں اشاعت کی، شیخ احمد شناوی نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا ہے جو بلاد روم تک پہنچا اور علماء نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اس کے سوا ان کی اور بھی تصانیف ہیں.......[1]

اکبر و جہانگیر کے عہد میں ایک اور بزرگ یعنی قاضی نور اللہ شستری کا ذکر بھی ضروری ہے، قاضی صاحب شیعہ تھے، ان کی حیات و ممات سے متعلق بہت سے افسانوں نے شہرت حاصل کرلی ہے۔ ان افسانوں کو جن میں سے اکثر صرف بعد کے تذکروں میں موجود ہیں قابل اعتبار نہیں کہا جا سکتا، لیکن بدایونی نے جو چند واقعات ان کے متعلق لکھے ہیں وہ یقیناً مستند سمجھے جا سکتے ہیں۔ اپنے مخصوص انداز میں وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ قاضی نور اللہ شیعہ ہیں۔

اما بسیار بہ صفت انصفت و عدالت و نیک نفسی و حیاء و تقویٰ و عفاف و اوصاف اشراف موصوف است، و بہ علم و حلم و جودت فہم و حدت طبع و صفائے قریحہ و ذکاء مشہور است۔ صاحب تصانیف لائقہ است، تو قیع بر تفسیر مہمل شیخ فیضی نوشتہ کہ از حیز تعریف و توصیف بیرون است، و طبع نظمے دارد و اشعار دلنشین می گوید....... زمانیکہ

---

[1] مولانا عبدالحی۔ یاد ایام بحوالہ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۵-۱۹۶

موکب منصوریہ لاہور رسید ... فرمودند کہ ..... قاضی نور اللہ

بآن عہدہ (قضاء) منصوب و منسوب گردید[1]"

قاضی نور اللہ کی جن تصانیف کا ذکر بدایونی نے کیا ہے ان میں مجالس المومنین سب سے زیادہ مشہور ہے اس میں شیعہ اکابر کے حالات ہیں، جیسا کہ بعض مصنفین کا دستور تھا۔ قاضی صاحب نے مخالفین اور دوسرے مذاہب کے متعلق بدزبانی کو روا رکھا ہے۔ مثلاً مخدوم الملک کو "سگ بچہ معاویہ و یزید خوارہ"[2] لکھنا آداب تصنیف و تالیف سے گری ہوئی بات ہے، بہر حال اس میں بہت کچھ تواریخی مواد موجود ہے اور تاریخ کے طلباء اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دکن و گجرات کے علما اور مشایخ کا ذکر مختلف تذکروں میں موجود ہے، یہاں صرف ان مشایخ کے کارناموں کی طرف چند اشارات کئے گئے ہیں جن کا اثر شمالی علاقوں کی تاریخ میں نمایاں نظر آتا ہے۔

شاہجہاں اور اصلاحی تحریک

شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد اصلاحی تحریک کو مزید مدد ملی کیونکہ وہ اپنے باپ کے مقابلہ میں زیادہ بہتر مسلمان اور پابند شرع تھا۔ مثلاً جہانگیر نے ہر چند چاہا کہ اس کا یہ بیٹا بھی شراب نوشی شروع کر دے لیکن شاہجہاں اس سے ہمیشہ محترز رہا۔ درباری مورخ

---

[1] ص ۳۲۵

[2] بحوالہ رود کوثر طبع سوم (لاہور ۱۹۵۸ء) ص ۵۲-۳۵۱

Marfat.com

عبدالحمید لاہوری کے الفاظ اگرچہ مبالغہ سے خالی نہیں لیکن خود یہ واقعہ کہ بادشاہ کو اپنی شریعت نوازی کا ذکر پسند تھا، اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی خواہش تھی کہ حکومت کی پالیسی شریعت کے اصولوں کے مطابق ہو۔ بادشاہ نامہ کے الفاظ قابل غور ہیں۔ پہلے یہ تمہید باندھ کر کہ سنت سنیہ الٰہی یہ رہی ہے کہ جب کبھی کبھی دین اور شعائر اسلام میں انحطاط اور تنزل پیدا ہونے لگتا ہے تو خدائے تعالیٰ ایک ایسے سعادت مند بندہ کو بھیجتا ہے جس کی مساعی جمیلہ سے دین کو مدد ملتی ہے چنانچہ:۔

چوں معابد اسلام رو بہ انہدام نہادہ بود و مبانی شریعت رخ بہ انعدام، ایزد کارساز این بادشاہ اسلام نواز، کہ از آغاز ما او رنگ آرائے اقبال گرد انید بنیاد اسلام را چناں محکم و مرصوص ساخت کہ تا روز نشور گرد فتور بر دامن دوام نہ نشیند۔[1]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہاں کو ابتدا ہی سے ترویج شرع کا خیال تھا جس طرح جہانگیر نے راجور کے علاقہ میں مسلمان لڑکیوں کی غیر مسلموں سے شادی پر سخت احکام جاری کئے تھے اسی نہج پر شاہجہاں نے کشمیر کے دوسرے مقام یعنی بھمبر اور پنجاب میں ضلع گجرات میں اس رسم کو بند ہی نہیں کیا بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ جن غیر مسلموں کے گھر میں مسلمان عورتیں ہیں اگر وہ مسلمان ہو کر ان عورتوں سے باقاعدہ نکاح کریں تو خیر ورنہ ان سے مسلمان عورتوں کو علیحدہ کرالیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک رئیس زمیندار نے مع اپنے قبیلہ کے اسلام قبول کر لیا، اس کو بادشاہ کی طرف سے راجہ دولت مند کا خطاب عطا ہوا۔[2] اس اقدام کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا کہ اس بادشاہ ...

---

[1] عبدالحمید لاہوری۔ بادشاہ نامہ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء) جلد اول۔ حصہ اول ص ۱۳۶

[2] بادشاہ نامہ۔ جلد اول حصہ دوم ص ۵۷

ان مسلمان لڑکیوں کی تعداد جن کو اس طریقہ سے ہندو بنایا گیا تھا کافی بڑی تھی۔ گجرات میں جس افسر کو ایسی مسلمان عورتوں کی تلاش کا کام سپرد کیا گیا تھا اس نے ستر عورتیں تلاش کریں اور بعض مسجدیں بھی جو ہندوؤں کے قبضہ میں تھیں واگذاشت کرائیں[۱] گجرات کے علاوہ قرب وجوار کے علاقوں میں مزید تلاش سے چار سو عورتیں اس حالت میں ملیں جن کو حکومت نے رہائی دلائی[۲] دوسرے علاقوں میں اس قسم کی معاشرتی اصلاحات کی گئیں مثلاً کابل کے بعض علاقوں میں شرعی نکاح کے بغیر شادیاں کی جاتی تھیں۔ اسی طرح طلاق بھی شرعی طریقہ پر نہیں ہوتی تھی، لڑکیوں کو ترکہ میں حصہ نہیں ملتا تھا۔ ان رسوم کے خلاف شاہی احکامات جاری کیے گئے اور بڑی حد تک ان کا انسداد کر دیا گیا۔

خود دربار میں جن رسوم پر شرعی نقطہ نظر سے اعتراضات ہوتے تھے وہ بھی بند کر دی گئیں، یہ ذکر اوپر کیا جا چکا ہے کہ جہانگیر نے بعض اشخاص و حکام کو سجدہ یا زمین بوسی سے مستثنیٰ کر دیا تھا لیکن بہر حال زمین بوسی کی رسم جاری تھی۔ اس طریقہ میں پیشانی تو زمین پر نہیں رکھی جاتی تھی جو سجدہ میں ضروری ہے، لیکن ہاتھ کو زمین پر رکھ کر اس پر پیشانی رکھتے تھے۔ شاہجہاں نے اس کو بھی خلاف شرع قرار دیا اور اس کو بند کر کے چار تسلیم کی رسم جاری کی۔ یہ امر قابل غور ہے کہ علماء اور مشائخ کو اس سے بھی مستثنیٰ کر دیا تھا۔ وہ مسنون طریقہ پر سلام کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہجہاں تو چہار تسلیم وغیرہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ سب مسنون طریقہ پر بادشاہ کو سلام کریں لیکن مہابت خان نے کہا کہ یہ ضروری ہے اس پر وہ چہار تسلیم کے لئے راضی ہو گیا۔[۳] اسی زمانہ میں الٰہی کلنڈر کی بجائے جو اکبری دور کی ایجاد تھی ہجری کلنڈر جاری کیا گیا۔ گرچہ

---

[۱] بادشاہ نامہ۔ جلد اول حصہ دوم ص ۵۸۔ [۲] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۱۱۰ - ۱۱۲

[۳] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۱۲۷

Marfat.com

بعض مزید تدوں کے ماتحت کچھ چیزیں مستثنیٰ تھیں، یہاں سب اصلاحات کا ذکر ممکن
نہیں لیکن یہ بتلانا ضروری ہے کہ شاہجہاں کی خواہش تھی کہ دربار کا ماحول جو اس وقت
خالص اسلامی نہیں کہا جا سکتا تھا، اس کو بڑی حد تک یہ رنگ دیا جائے۔ رمضان المبارک،
ربیع الاول اور محرم کے مہینوں میں کثیر رقم بطور خیرات ضرورت مند لوگوں کو دی جانے
لگیں۔ عیدین اور شب برأت کے موقعوں پر جشن بڑے پیمانہ پر منائے جانے لگے۔
۱۶۴۲ء میں سید جلال گجراتی کو جب صدر الصدور مقرر کیا گیا تو ان کو چہار ہزاری
اور بعد میں شش ہزاری منصب عطا کیا گیا۔ یہ بھی اہم اقدام تھا۔ اکبر نے صدارت کے
عہدے کی اہمیت کو بہت کم کر دیا تھا۔ شاہجہاں نے سجدہ بند کیا۔ شاہجہاں کو بہت
سے بہت دلچسپی تھی مصوری کی وہ سرپرستی کرتا تھا لیکن بت پرستی کی حد تک نہیں۔ چنانچہ اکبر کے زمانہ
سے جو رسم چلی آتی تھی کہ بادشاہ کی تصویریں امراء اپنی پگڑیوں میں لگا کر پھرتے تھے ان کو اس بادشاہ نے
بند کر دیا۔ موسیقی اور رقص و سرود اس کے عہد میں جاری رہے۔

نظم حکومت کو شرعی احکامات کے مطابق کرنے کی پالیسی سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ شاہجہاں
کے عہد میں ہندوؤں کے خلاف تعصب سے کام لیا جاتا تھا۔ بعض مورخین غلط فہمی میں مبتلا ہوئے
ہیں اور متعدد بادشاہوں کو متعصب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو غلط ہے۔ شاہجہاں کی دینی
خصوصیات اور بعض شرعی احکام مثلاً رسالہ پر پابندی، کھانا [illegible] اور مندروں کی ممانعت [illegible]
منانا، بادشاہ کو سجدہ کرنے کے بجائے اصحاب شرف نوشی کو معطل کرنا، شرعی میں بادشاہ کی تصویر [illegible]
وغیرہ وغیرہ۔ ان کا تعلق ہندو رعایا سے نہیں بلکہ مسلم کی پالیسی سے [illegible]
[illegible] پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ سب سے زیادہ [illegible]
[illegible] اور امراء کے حلقے میں شامل کر لینے سے تھا۔ [illegible]
میں ہندو امراء کی تعداد کافی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شاہجہاں کی حکومت کے [illegible] میں ایک ہزار یا اس سے
زیادہ کے منصب داروں کی کل تعداد ایک سو [illegible] تھی۔ ان میں [illegible] یعنی [illegible]

Marfat.com

کا تناسب تھا، جلوس کی تیئسویں سال میں کل تعداد دو سو اکتالیس تھی جس میں باون ہندو تھے یعنی اکیس فیصد سے زیادہ۔ ایک ہزار سے کم کے منصب داروں میں ان کا حصہ اس سے بھی زیادہ تھا جلوس کے دسویں سال سے بیسویں سال تک چونتیس نئے منصب دار بنائے گئے ان میں سے اکیس ہندو تھے مختلف حکومت کے اس دور میں پانچ ہزار سے زیادہ کا منصب بہت مخصوص تھا اور شہزادوں کے علاوہ باقی امراء کو بہت ہی کم دیا جاتا تھا، لیکن شاہجہاں کے آخر زمانہ میں جسونت سنگھ چھ ہزار کا منصب دار تھا ۱۹۴۶ء میں ایک ہندو مورخ نے لکھا ہے کہ

> شاہجہاں کے عہد میں ہندوؤں کی حیثیت (بہ لحاظ اعلیٰ مناصب کے) اس سے بہتر تھی جیسے کہ سارے ہندوستانیوں کی آج انگریزی راج میں ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے اور اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہندوؤں کی حیثیت اس عہد میں اس سے کہیں زیادہ بہتر تھی جو آج بھارت کی لادینی حکومت میں مسلمانوں کی ہے، ایک اہم تبدیلی جو شاہجہاں نے کی وہ شاہی خاندان کے افراد کی ہندو لڑکیوں سے شادی کے سلسلے میں تھی اکبر کے زمانہ سے یہ دستور تھا کہ شادی ہونے کے ساتھ یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ لڑکی مسلمان ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد اکبر نے اپنے حرم کی ہندو عورتوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ ہندوانی رسوم ادا کر سکتی ہیں اور ہندو تہوار وغیرہ باقاعدہ منائے جاتے تھے۔ جہانگیر نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ کی لیکن شاہجہاں نے یہ قاعدہ جاری کیا کہ شادی سے پہلے لڑکی کو اسلام قبول کرنا چاہئے اور اس کے بعد نکاح کیا جائے۔ شاہجہاں کے چند اور اقدامات جو قوانین شرع کے نفاذ کے سلسلہ میں کئے گئے اہم ہیں لیکن یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کو عالمگیر کی پالیسی کے ساتھ بیان کیا جائے۔ کیونکہ ان کی تکمیل اسی دور میں ہوئی۔

شاہجہاں کے علماء و مشائخ سے تعلقات شاہجہاں اپنی شہزادگی ہی کے زمانہ سے اسلام کی طرف مائل تھا اور شریعت کی پابندی کرتا تھا، چنانچہ وہ علماء اور مشائخ کی صحبت سے فیضیاب ہوتا تھا اور ان کی تعلیم کا بھی اس پر اثر تھا۔ اس کی حکومت کے ابتدائی دور کے سر برآوردہ مشائخ میں حضرت شاہ میاں بالا پیر بہت نمایاں شخصیت کے بزرگ ہیں

Marfat.com

وہ ۹۵۷ھ میں سیہوان (سندھ) میں پیدا ہوئے، سات برس کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا اس کے بعد والدہ ماجدہ کی تربیت میں رہے، علوم دینی حاصل کرنے کے بعد شیخ خضر سوستانی سے بیعت ہوئے خلافت عطا کرنے کے بعد آپ کے مرشد نے فرمایا کہ لاہور جا کر عوام الناس کو تلقین و ہدایت کریں اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی، انہوں نے عمر کے بقیہ ساٹھ سال لاہور ہی میں صرف کئے ملا عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ:-

"قریب چہل سال در کنج ناکامی و زاویہ گمنامی بصرف ریاضت و سپر توجہ فرمودند۔
نشیب و فراز این طریق دشوار عبور را طے نمودہ چنان بسر برد کہ مدتی مدید و
عہد بعید ہیچ یکے بر چگونگی حالاتش نگاہ نبرد"

لیکن بالآخر آپ کی بزرگی کی شہرت ہو گئی اور بہت سے "طالبان حق بدرگاہ وہ صاحب مقامات بلند و درجات رفیعہ گردیدند"[1] جب شہرت ہوئی تو اس قدر بڑھی کہ جہانگیر لکھتا ہے کہ ان کی بزرگی کے متعلق سن کر:-

"خاطر حق طلب بہ ملاقات ایشان تقاضا نمود و بہ دیدن ایشان رغبت افتاد۔
چنانچہ ... کبر سنی ... تشریف آوردند
مدتی تنہا بایشان صحبت داشتہ [illegible]
استماع افتاد [illegible]
[illegible] خاطر را بالماس طلب رخصت [illegible]
فرمایند"[2]

جہانگیر کی وفات کے بعد [illegible]

---

1. بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۰۳
2. تزک ص ۲۹۰

دیگر خداوندان ثروت نظر تربیت نینداختہ و از مخالطت و مجالست این طائفہ نفور بودے"

شاہجہاں بھی آپ کی بے حد عزت کرتا تھا اور معترف تھا۔ "کلبہ شیخ را بقدوم فیض لزوم منور ساختہ اند"[1] صالح کنبوہ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کو آپ سے اس قدر زیادہ عقیدت تھی کہ مرید بدان معصومیت باشد اور ہمیشہ آپ کی تعریف کرتا تھا۔ داراشکوہ نے اپنی کتاب میں شاہ میر کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں اور آپ کی بہت سی کرامات کا بھی ذکر کیا ہے۔ بہرحال یہ امر قابل ذکر ہے کہ شاہجہاں کی تربیت اور دین پسندی کی خواہش جن اثرات کا نتیجہ تھی ان میں شاہ میاں میر کی صحبت خاص طور پر اہم ہے۔ آپ کی وفات ۱۰۴۵ھ میں ہوئی۔ زہد و فقر کے علاوہ شیخ کی علمی قابلیت بھی بہت زیادہ تھی۔ صالح کنبوہ لکھتا ہے:

"در فنون علوم معقول و منقول کمال تبحر اندوختہ و در جمیع ابواب دانش بہ معنی لغات مستحضر بودند چنانچہ اکثر دانشوران عصر جہت حل مطالب مشکلہ بایشان رجوع می نمودند و صاحب اطلاع بر حقائق و معارف متصوفہ و اصطلاحات این طائفہ خود بحر تمام بودند اکثر عبارات فتوحات مکی شیخ الموحدین ابن عربی بخاطر داشتند و نقد فصوص الحکم حضرت مولوی جامی را از بر می نمودند"[2]

لاہور کے ایک دوسرے بزرگ جن سے شاہجہاں کی ملاقات ہوئی شیخ بلاول قادری تھے۔ جلوس کے ساتویں سال میں شاہجہاں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور:

"بعد از استفادہ صحبت رنگین کہ بخوشی و دلکشی بر آمد خیر باد شیخ بجا آوردہ مبلغ دہ ہزار روپیہ بمجاوران و نتیجہ لفقرائے شیخ قسمت فرمودند"[3]

شیخ بلاول صرف یہی نہیں کہ "عزلت گزین زاویہ عزلت و طالب وحدت در کثرت" تھے بلکہ خوش تقریر

۱؎ اس ملاقات کا ذکر بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۳۳۲ پر ہے۔

۲؎ عمل صالح جلد سوم ص ۳۳۴   ۳؎ عمل صالح جلد دوم ص ۲۷

Marfat.com

اندازِ تحریر یوں تھا "دیوان سخنان بلند و فوائد ارجمند و نصائح و مواعظ دلپسند را متذکر بوده مطلب صحبت بہ مناسبت مقام بر سبیل وعظ و تذکیر ایراد می نمود و وقائع کلامش صدق بہ واقع تمام یافتہ خود در نظر ما وقر کلی داشت"[۱]

اس عہد کے اور بزرگوں میں شیخ عبدالرشید جونپوری بھی قابل ذکر ہیں۔ ایک مدت تک درس و تدریس میں مصروف رہے بعد میں تصنیف و تالیف اور ریاضت و عبادت میں وقت صرف کرتے تھے۔

"بہ تصانیف شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ تتبع کلی بہم رسانده عبارات شیخ را کہ محل طعن علمائے ظاہر است بر محمل نیک فرود می آورد"[۲]

شاہجہاں نے ان کے تقدس کی شہرت سن کر ملاقات کی خواہش کی اور ایک پیغام بھیجا لیکن شیخ کنج عزلت سے باہر نہیں آئے۔ [illegible] میں وفات پائی۔ ان کے علاوہ عمل صالح میں حسام الدین، شیخ ناظر، شیخ رجب، شیخ محمد صادق برہانپوری، سید شاہ [illegible] ہدایت اللہ کے بھی تذکرے [illegible] مشائخ کرام اور مشائخ عظام کے تحت بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت شیخ مجددؒ کے خلفاء میں دو بزرگ قابل ذکر ہیں۔ شیخ آدم بنوریؒ اور خواجہ محمد معصومؒ[۳]۔ شیخ آدم ابتدائی زندگی میں [illegible] توفیق ایزدی کی بدولت ملازمت ترک کر کے شیخ [illegible] کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ بعد میں ان کے مرشد نے ان کو مجدد صاحب کی خدمت میں بھیج دیا جہاں شیخ آدم کی روحانیت [illegible] کی تکمیل ہوئی۔ شیخ آدم نے ظاہری تعلیم زیادہ حاصل نہیں کی تھی، لیکن [illegible]

---

۱ عمل صالح۔ جلد سوم ص ۳۶۷

۲ میر غلام علی آزاد۔ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۰۳

۳ خواجہ محمد معصومؒ کے حالات آئندہ صفحات میں بیان کئے جائیں گے۔

Marfat.com

تھا۔ ۱۰۴۲ھ میں شاہجہاں کی خواہش پر حجاز چلے گئے اور بقیہ عمر وہیں گزاری۔[1]

شیخ محب اللہ الہ آبادی

صابریہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ محب اللہ الہ آبادی بھی اس عہد کے مشاہیر میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ حضرت شیخ نظام الدین بلخی کے خلیفہ شیخ ابوسعید گنگوہی کے خلیفہ تھے۔ وطن صدر پور تھا جو ضلع خیرآباد میں ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ "شیخ محب اللہ در علم تصوف بر [illegible]، بلکہ می سزد کہ شیخ محی الدین عربی را شیخ اکبر دانند و را شیخ کبیر گویند"[2]

اُن کی تصانیف جن کو "گنجینۂ حقائق اسرار الٰہی" کہا گیا، زیادہ تر تصوف پر ہیں۔ مولوی رحمٰن علی نے جن تصانیف کا ذکر کیا ہے ان کے نام یہ ہیں: "شرح فصوص عربی، شرح فصوص فارسی، رسالہ ہفت احکام، غایت الغایات، مغالیط العامہ، سر الخواص، عبادۃ الخواص، طرق الخواص، عبادۃ اخص الخواص، مناظر اخص الخواص، رسالہ تسویہ، رسالہ سہ رکنی، رسالہ وجود مطلق" ۱۰۵۸ھ میں شیخ نے وفات پائی اور الہ آباد میں دفن ہوئے۔ ان کے جانشینوں کا علمی مرکز یعنی دائرہ شاہ حجت اللہ آج بھی موجود ہے۔ شاہ محب اللہ کے ایک مرید شیخ محمد محسن فانی تھے جن کو شاہجہاں نے الہ آباد کی صدارت پر فائز کیا لیکن بلخ کے حملہ کے دوران جب نذر محمد کا سامان مغلیہ افواج کے ہاتھ آیا تو اس میں فانی کا ایک دیوان بھی تھا جس میں نذر محمد کی تعریف میں ایک قصیدہ تھا۔ شاہجہاں کو یہ ناگوار معلوم ہوا اور ان کو عہدہ سے علیحدہ کر دیا۔ لیکن پنشن دے کر کشمیر میں رہنے کی اجازت دے دی۔ ان کے کلام میں ہر جگہ لطافت اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کی ایک مثنوی مصدر الآثار ہے جس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے؂

---

[1] شاہجہاں کو خبر ملی تھی کہ شیخ آدم کی خانقاہ میں بکثرت لوگ قیام کرتے ہیں جن میں بڑی تعداد میں پٹھان بھی ہیں۔ اس پر بادشاہ نے علامی سعد اللہ اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو تحقیق حال کے لئے بھیجا۔ ان کی رپورٹ پر شاہجہاں نے شیخ سے مدینہ جانے کی خواہش کی اور شیخ نے بخوشی اس کی تعمیل کی۔

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۵

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — ثر — تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را / تازہ نہالے است نہ باغ قدیم

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی

علماء میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا نام سرفہرست ہے، ملا صاحب نے اس عہد کے مشہور عالم ملا کمال الدین جنھوں نے کشمیر کی سکونت ترک کرکے سیالکوٹ کو قیام گاہ بنا لیا تھا، کی خدمت میں رہ کر تعلیم مکمل کی، ملا کمال الدین کے دوسرے مشہور تلامذہ میں شاہجہاں کا وزیر علامی سعد اللہ اور شیخ محمد و سرہندیؒ جیسے حضرات ہیں، لیکن ان کا علمی فیض ملا عبدالحکیم کی ذات سے جاری ہوا، ان کا سلسلہ درس و تدریس جہانگیر کے زمانہ میں شروع ہو گیا تھا لیکن شاہجہاں کے زمانہ میں انکی شہرت بہت بڑھ گئی۔ بادشاہ نے ان کو دارالحکومت میں بلوا لیا اور انعامات و اکرامات سے نوازا چنانچہ دو مرتبہ ان کو چاندی میں تلوا کر رقم عنایت کی اس کے علاوہ جاگیر بھی دی اور ایک گراں رقم ہر ماہ ملتی تھی، ملا صاحب نے آخر عمر تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ۱۰۶۷ھ میں وفات پائی۔ ملا صاحب کی تصانیف بکثرت ہیں جس میں حاشیہ تفسیر بیضاوی، ترجمہ فارسی زینۃ الطالبین، حاشیہ مطول، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح تفتازانی، حاشیہ شرح عقائد دوانی وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان تصانیف کی شہرت ہندوپاکستان کے باہر بھی بہت زیادہ تھی۔

علوم و فنون کے لحاظ سے شاہجہاں کا دور مغلیہ تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے لیکن اس کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہیں، تاریخ کے طلباء جانتے ہیں کہ اس [illegible] زمانہ [illegible] سال ترست میں گذرے، فنون سے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن [illegible] ترقی [illegible] کے جانشین کے زمانہ میں کسی طرح کم نہیں ہوئی۔

Marfat.com

باب ہفتدہم

مغلیہ سلطنت وسعت و ترقی کے بام عروج پر

(عہد عالمگیر)

جنگ تخت نشینی تاریخ کے اس دور میں جس کو خاندانی حکمرانی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، تخت نشینی کا فیصلہ اکثر جنگ سے ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر ان لڑائیوں میں قریبی رشتہ دار اکثر بھائی، بھائی اور گاہ بہ گاہ باپ بیٹے ایک دوسرے کے خلاف سینہ سپر ہوتے تھے۔ شاہجہاں کے بیٹوں کی جنگ تخت نشینی ایک خاص پس منظر رکھتی ہے۔ اورنگ زیب اور دارا میں جنہوں نے اس لڑائی میں اہم کردار ادا کیا ہے، سیاسی سے زیادہ مذہبی اختلافات تھے۔ یہاں اس پس منظر کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں۔ لیکن یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دارا اس مکتب خیال کا نمائندہ تھا جس نے اکبر اور ابوالفضل کی سرپرستی میں قبولیت حاصل کی تھی، اورنگ زیب میں وہ خصوصیات موجود تھیں جو مسلم رہنماؤں کے نزدیک مثالی بادشاہ میں ہونی چاہئیں[1]۔ اورنگ زیب کی کامیابی اس امر کا ثبوت ہے کہ مشائخ و علماء کی اصلاحی کوششیں کامیاب ثابت ہوئیں۔

---

[1] جنگ تخت نشینی کے واقعات اور اس کے پس منظر کا تفصیلی ذکر راقم الحروف نے اپنی انگریزی کتاب "پرنس اورنگ زیب" (شائع کردہ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی) میں کیا ہے۔

Marfat.com

عہدِ عالمگیر کا نصفِ اوّل
۱۶۵۸ — ۸۱ء

سموگڑھ کی لڑائی میں کامیابی کے بعد عالمگیر کی تخت نشینی تو یقینی ہو گئی لیکن حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اس کو عظیم مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہجہاں کی معزولی کا ردِ عمل بعض طبقوں پر ظاہر ہے بہت گہرا ہوا ہو گا۔ دارا شکوہ کے تعاقب اور بالآخر اس کو شکست دینے میں وقت بھی صرف ہوا اور مالی و جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ بہرحال رسمِ تاجپوشی کے فوراً بعد عالمگیر نے کچھ اصلاحات کیں جن کا ذکر دوسری جگہ کیا گیا ہے۔ ابتدائی عہد ہی میں مشرقی علاقے کے فتح کرنے کی غرض سے میر جملہ کی سرکردگی میں اراکان کی طرف ایک مہم روانہ کی گئی جس کے نتیجہ میں مغلیہ سلطنت کی مشرقی حد اراکان تک پہنچ گئی۔

اراکان کی فتح کا واقعہ دلچسپ ہے۔ پرتگیزوں کی قابلِ اعتراض حرکات نے شاہجہاں کو ان کی گوشمالی پر مجبور کیا تھا لیکن یہ مسئلہ ختم نہیں ہوا۔ پرتگیزوں کی مدد اراکان کے حکمران کرتے تھے۔ [illegible] جو اس وقت اراکان میں شامل تھا ان لوگوں کا مرکز تھا اور [illegible] اراکان کے ہر قسم کے جرائم پیشہ لوگ خاص طور سے پرتگیزی یہاں جمع ہوتے رہتے۔ ان لوگوں نے سمندری ڈاکہ زنی اپنا مستقل پیشہ بنا لیا تھا۔ [illegible] باشندوں کو گرفتار کر کے لے جاتے اور غلام بنا کر فروخت کرتے [illegible] ۱۶۶۴ء میں ختم کیا [illegible] کے قریب [illegible] یہاں ایک عیسائی راہب کی [illegible] کی مدت شہزادہ شجاع بھاگ کر اراکان گیا۔ ۱۶۶۶ء میں شائستہ خاں بنگال کے صوبہ دار [illegible] انہوں نے پرتگیزی [illegible] کو ختم کر کے ان لوگوں کو ڈھاکہ میں آباد کیا۔ یہ علاقہ فرنگی بازار [illegible] خاں نے اراکان کو فتح کر کے سلطنت میں شامل کیا اور چاٹگام کا نام اسلام آباد رکھا۔

یہاں عالمگیری عہد کی سب لڑائیوں کا ذکر ممکن نہیں لیکن بعض واقعات اس قدر اہم ہیں کہ ان کا تذکرہ چاہے کسی قدر مختصر کیوں نہ ہو ضروری ہے۔ ۱۶۷۹ء میں شہنشاہ کو راجپوتانہ میں

Marfat.com

کرناٹک جودھپور کا راجہ جسونت سنگھ جمرود میں متعین تھا اس کے مرنے کے بعد اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ عالمگیر نے حکم جاری کیا کہ بچہ کو دہلی لاکر رکھا جائے لیکن بچہ کے اتالیق درگاداس نے بادشاہ کی طرف سے بدگمانی کرتے ہوئے یہ خیال کیا کہ شاید عالمگیر اس شیر خوار بچہ کو جس کا نام اجیت سنگھ رکھا گیا تھا مسلمان کر لیگا یہ بتلانا غیر ضروری ہے کہ درگاداس کا یہ خیال حماقت پر مبنی تھا، بہرحال درگاداس نے سازش کر کے ایک رات کو معہ بچہ کے دہلی سے بھاگ گیا اور راجپوتانہ پہنچ گیا، عالمگیر کو بتلایا گیا کہ درگاداس راجہ اجیت سنگھ کو تو نہیں لے جا سکا لیکن راجپوتانہ پہنچکر اس نے ایک اور بچہ کو اجیت سنگھ نام دیکر راجپوتوں کے سامنے پیش کیا۔ عالمگیر نے فوراً راجپوتانہ پر حملہ کیا، لڑائی کا سلسلہ ایک سال سے زیادہ مدت تک جاری رہا۔ اس جنگ کا ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ عالمگیر کا بیٹا شہزادہ اکبر، جو زیب النساء کا حقیقی بھائی تھا، مغلیہ فوج کی کمان کر رہا تھا، اور خود بادشاہ شہر اجمیر میں ایک مختصر دستہ کے ساتھ مقیم تھا، درگاداس نے اکبر کو بہکا کر بغاوت کرا دی، اس کو یہ لالچ دیا کہ ہم تم کو بادشاہ تسلیم کئے لیتے ہیں۔ جوان العمر اکبر دھوکے میں آگیا اور تخت طاؤس پر بیٹھنے کے خواب دیکھنے لگا، بہرحال عالمگیر اس وقت نہایت نازک حالات سے دوچار تھا، لیکن اس نے ہمت و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ عین اس وقت جبکہ اکبر پوری مغلیہ فوج لے کر راجپوتوں کی مدد کے ساتھ باپ پر حملہ کرنے کے لئے اجمیر کی طرف آ رہا تھا تو عالمگیر نے اپنے ایک فوجی افسر سے اس کے ایک تیری رشتہ دار کو جو اکبر کی فوج میں افسر تھا خط لکھوا دیا جس میں اس بات کی تعریف کی گئی تھی کہ شہزادہ اکبر نے راجپوتوں کو خوب دھوکا دیا۔ یہ خط درگاداس کے ہاتھ لگ گیا اس لئے کہ تدبیر ہی کی گئی تھی کہ خط اس کے ہاتھ میں پہنچے، درگاداس فوراً اکبر کے خلاف ہو گیا اور شہزادہ کو جان بچا کر راجپوتانہ سے بھاگنا پڑا

لے یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شہزادی زیب النساء اور اس کے بھائی اکبر میں خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا، اکبر کی بغاوت کے زمانہ میں بھی زیب النساء نے خط وکتابت بند نہیں کی بلکہ بعض ایسی شہادتیں ملی ہیں جن سے زیب النساء کا اکبر کی باغیانہ کوششوں میں ملوث ہونا ثابت ہوتا تھا چنانچہ زیب النساء کو قید کر دیا گیا اور آخر دم تک اس کو قید ہی میں رکھا گیا۔

Marfat.com

اس کے بعد راجپوتوں کی امیدوں پر پانی پڑ گیا، ان کو معلوم ہو گیا کہ آخر کار ان کو شکست ہوئی، چنانچہ انہوں نے عالمگیر کی شرائط قبول کر لیں، ریاست میواڑ نے جزیہ دینا قبول کر لیا، اس کے عوض میں ایک علاقہ مغلوں کو دیدیا گیا، اس کے بعد عالمگیر مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے دکن کی طرف ۱۶۸۱ء میں روانہ ہو گیا، ریاست مارواڑ پر مغلوں کا قبضہ رہا۔

فتح دکن

دکن اور جنوبی ہند کی فتح درحقیقت عالمگیر کے عہد کا اہم ترین واقعہ ہے، اس کا نسبتاً زیادہ تفصیل سے ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دکن کو فتح کرنے کا خیال سب سے پہلے اکبر نے کیا اور یہ سلسلہ اس کے بعد جہانگیر و شاہجہاں دونوں کے عہد حکومت میں جاری رہا، شاہجہاں کی دکنی مہموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مغلیہ سلطنت کی سالمیت قائم رکھنے اور مسلمانان ہندوستان کی زندگی میں یکجہتی اور جمعیت کو مستحکم تر بنانے کے لئے دکن کی اسلامی سلطنتوں کا اشتراک عمل ضروری تھا، بدقسمتی سے دکن کے سیاست دانوں نے اس نکتہ کی اہمیت کو نہ سمجھا اور اپنی ساری کوشش مغلوں کی مخالفت میں صرف کر دی، شاہجہاں کے زمانہ میں جن اصولوں پر مغلوں نے دکنی سلطنتوں سے صلح کی ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغلیہ حکومت ان سلطنتوں کے وجود کو ختم کرنے پر مصر نہ تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ دکن کے سیاست دان اندرونی و بیرونی طاقتوں سے مغلوں کے خلاف [illegible] کیا کریں اور مغل حکمران خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے رہیں، شاہجہاں کے زمانہ میں دکن میں ایک نئی طاقت بساط سیاست پر رونما ہوئی تھی، مرہٹہ خاندان کا بانی شاہ جی بھونسلہ پہلے احمد نگر اور بعد میں بیجاپور میں ایک بااثر سردار کی حیثیت رکھتا تھا، اس کے ذہن میں خود مختار ریاست قائم کرنے کا خیال تو نہ تھا لیکن مغلوں کے خلاف دکنی سلطنتوں کو ابھارنے اور ان کو جنگ کے لئے تیار کرنے میں شاہ جی نے بہت نمایاں حصہ لیا، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سلاطین دکن اور ان کے صلاح کاروں نے کبھی متنبہ ہو کے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ مغلیہ سلطنت کی مخالفت اور اس سے سلسلہ جنگ قائم رکھنے میں خود ان کے وسائل اور استقلال کو کن خطرناک حالات کا

Marfat.com

مقابلہ کرنا پڑے گا، سلاطین دکن کی ان غلط پالیسیوں کے نتائج جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔

شیواجی

شیواجی ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا، ابھی وہ سولہ سال ہی کا تھا کہ اس نے لوٹ مار کا سلسلہ شروع کردیا اور اس مقصد کے لئے اس نے اسی قسم کے لوگوں کو ساتھ ملا کر ایک جماعت تیار کرلی، کانکن کا علاقہ جہاں شاہ جی کی جاگیر تھی بیجاپور کی ریاست میں تھا اور نسبتاً اس علاقہ میں سلطان بیجاپور کے فوجی انتظامات کمزور تھے، اتفاق سے سلطان بیجاپور کی وفات کے بعد حکومت بیجاپور میں بھی انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی، اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر شیواجی نے اپنی قوت کو بڑھانا شروع کیا۔ ۱۶۴۶ء میں اس نے دھوکے سے تورنا کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ رفتہ رفتہ قرب و جوار کے علاقوں اور قلعوں کو یا تو دھوکے سے یا طاقت سے حاصل کرتا رہا، بیجاپور کی حکومت جب شاہ جی سے اس کے بیٹے کی شکایت کرتی تو وہ کہہ دیتا تھا کہ یہ سب کچھ شیواجی اس کی مرضی کے خلاف کر رہا ہے لیکن جب شیواجی کی حرکتیں ناقابل برداشت ہوگئیں تو حکومت نے ۱۶۴۸ء میں اس کو گرفتار کرکے قید کردیا، شیواجی اپنے باپ کا احترام نہیں کرتا تھا اور نہ اس کی ہدایت پر عمل کرتا، لیکن یہ سوچ کر کہ شاید اس کی دست درازیوں کی وجہ سے اس کے باپ کو قتل کر دیا جائے اس نے شاہ جی کے زمانہ قید میں خاموشی اختیار کرلی۔ جوں ہی شاہ جی کو بیجاپور کی حکومت نے رہا کیا شیواجی نے پھر لوٹ مار اور علاقے غصب کرنے کا سلسلہ شروع کردیا۔ لوٹ مار کے لئے شیواجی کے نزدیک ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہ تھا چنانچہ اس نے جاولی کے راجہ کو جو سلطان بیجاپور کا باجگذار تھا دھوکے سے قتل کیا، پہلے اس نے کوشش کی کہ راجہ اس کے ساتھ اتحاد کرلے اس میں وہ ناکام رہا، پھر اس نے یہ چال چلی کہ اپنے دو ایجنٹ راجہ کے پاس اس بہانہ سے بھیجے کہ وہ ان کے ذریعہ سے راجہ کی لڑکی سے شادی کرنے کی درخواست کرے گا، راجہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، شیواجی کے ایجنٹوں نے راجہ سے درخواست کی کہ وہ تنہائی میں ان سے ملے تاکہ وہ راز کی گفتگو کرسکیں، راجہ نے اس کو منظور کرلیا اور ان کو تنہائی میں بلالیا، ان دونوں نے راجہ کو قتل کردیا اور فوراً بھاگ کر شیواجی کی فوج سے جا ملے جو پہلے ہی سے پوشیدہ طور پر قرب و جوار میں چھپی ہوئی تھی، اب شیواجی

Marfat.com

نے قلعہ پر حملہ کر دیا، راجہ کے بیٹوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ گرفتار ہو گئے اور قتل کر دیے گئے۔

شیواجی کی بغاوت اور گرفتاری

اورنگ زیب اس وقت دکن کا صوبیدار تھا، ۱۶۵۷ء میں حالات نے اس کو مجبور کر دیا کہ بیجاپور پر حملہ کرے، شیواجی کو یہ خیال ہوا کہ کہیں مغل افواج اس کو بھی ختم نہ کر دیں، چنانچہ اس نے اورنگ زیب کی خدمت میں درخواست بھیج کر اس کی سیادت کو مان لیا، لیکن جوں ہی اس نے دیکھا کہ مغلیہ فوجیں بیجاپور سے لڑائی میں مصروف ہیں تو اس نے جنیر کو جو مغلوں کی سلطنت میں تھا لوٹ لیا، اورنگ زیب اس کو سزا دینے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ شاہجہاں کی علالت کے باعث اس کو دکن چھوڑ کر آگرہ جانا پڑا، ان حالات نے شیواجی کو اپنی طاقت بڑھانے کا مزید موقع دیا، بیجاپور میں امرا کی خانہ جنگی حکومت کو یہ اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ شیواجی کے خلاف کوئی موثر کارروائی کر سکے، ۱۶۵۹ء تک شیواجی چالیس قلعوں اور کوکن کا مالک بن چکا تھا، اب اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ حکومت بیجاپور نے اپنے ایک بڑے سردار افضل خاں کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا، شیواجی کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا اس نے سازش کی تیاری کی اور افضل خاں کو اس پر راضی کر لیا کہ دونوں تنہائی میں مل کر جھگڑا طے کر لیں، افضل خاں نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی، غالباً اس کا خیال تھا کہ بغیر جنگ کے اگر شیواجی بیجاپور کی اطاعت قبول کر لے تو بہت بہتر ہوگا، جس وقت دونوں ملے افضل خاں شیواجی سے بغلگیر ہوا تو اس نے شیر پنجوں سے جو چھپا کر ساتھ لایا تھا افضل خاں کو قتل کر دیا[1] اس کے بعد بھی حکومت بیجاپور نے شیواجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کی کوشش [illegible]

---

[1] شیواجی نے جس سازش کے ذریعہ افضل خاں کو دھوکہ سے قتل کیا اس کا مفصل ذکر مستند تاریخوں میں موجود ہے لیکن بعض ہندو مورخین جن میں جادو ناتھ سرکار پیش پیش ہیں [illegible]

لیکن اب وہ اس کے قبضہ سے نکل چکا تھا۔ ۱۶۶۲ء میں اس نے مغلیہ سلطنت کے علاقہ میں رہزنی کی، عالمگیر نے شائستہ خاں کو اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ شائستہ خاں نے اہم شہر پونا پر قبضہ کرلیا۔ شیواجی نے حسب معمول پھر دھوکہ سے کام نکالا، وہ ایک بارات کے بہانے سے بھیس بدل کر پونہ کے اندر داخل ہوگیا اور رات میں شائستہ خاں کے کیمپ پہ حملہ کردیا۔ شائستہ خاں خود تو بچ گیا لیکن اس کا لڑکا اور بعض لوگ مارے گئے۔ بعض مورخین کا جن میں بھیم سین مصنف نسخہ دل کشاہ بھی شامل ہے خیال ہے کہ شیواجی کی سازش میں جسونت سنگھ بھی شامل تھا۔ بہر حال عالمگیر نے شائستہ خاں کو وہاں سے ہٹا کر بنگال بھیج دیا اور شہزادہ معظم کو دکن کا صوبیدار مقرر کیا، وہ بھی زیادہ کامیاب نہ رہا کیونکہ ۱۶۶۴ء میں شیواجی نے سورت پر حملہ کرکے اس کو لوٹا۔ اس پہ عالمگیر نے ایک زبردست فوج کے ساتھ راجہ جے سنگھ کو دکن روانہ کیا، جے سنگھ نے یکے بعد دیگرے سارے اہم مقامات اور بہت سے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ شیواجی مغلوں کی اس کامیابی سے اس قدر خوف زدہ ہوگیا کہ اس نے صلح کی درخواست کی، جے سنگھ نے کہا کہ وہ خود آکر یہ درخواست کرے تو غور کیا جائے گا۔ چنانچہ

عام کرنے کی کوشش کی ہے کہ افضل خاں نے خود سازش کی تھی اور شیواجی نے اس کو اپنے دفاع میں قتل کیا۔ تاریخی حقائق کو جھٹلانے اور اخفائے حق کی یہ متواتر کوشش اس حد تک تو کامیاب ہوچکی ہے کہ طلباء تاریخ ان کے دلائل پر غور کرنے کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں چونکہ اب اس قسم کی غلط بیانیاں بچوں کی کتابوں میں شامل کی جانے لگی ہیں اس لئے اس میں کیا شک ہے کہ ایک زمانہ آئیگا جبکہ لوگ سازش اور دھوکہ سے مخالف کو قتل کرنے کا سہرا شیواجی کے سر سے اتار کر یقینی طور پر افضل کے سر باندھ دیں گے۔ تقریباً ہر ہندو مورخ جو اس مسئلہ پر بحث کرتا ہے۔ اس معاملہ میں شیواجی کو پاک دامن ثابت کرنے کے لئے قلم توڑ دیتا ہے۔

کنکیڈ اور سرکار کے دلائل کا سب سے بہتر تجزیہ ظہیر الدین فاروقی کی اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز میں پڑھا جاسکتا ہے۔

Marfat.com

شیواجی خود راجہ کے کیمپ میں آیا، جے سنگھ بہت اخلاق سے ملا، شیواجی نے اپنے پینتیس قلعوں میں سے تیئس قلعے مغلوں کو دینے کا وعدہ کیا اور نیز یہ کہ وہ مغلیہ افواج کے ساتھ سلاطین دکن کے خلاف لڑے گا

شیواجی مغل دربار میں

جے سنگھ نے شیواجی کو مشورہ دیا کہ وہ خود شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہو، چنانچہ ۱۶۶۶ء میں شیواجی دربار میں حاضر ہوا، عالمگیر نے جے سنگھ کے بیٹے رام سنگھ اور ایک امیر مخلص خاں کو استقبال کے لئے بھیجا اور جب شیواجی دربار میں حاضر ہوا تو کہا: آؤ راجہ شیواجی![1] اور پنج ہزاری منصب داروں کی قطار میں اس کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔[2] شیواجی نے دربار میں ایک تماشا کیا، وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا اور بعد میں یہ شکایت کرنے لگا، عالمگیر کو یہ حرکت بری معلوم ہوئی اور اس نے دربار کی حاضری سے اس کو محروم کر دیا اور راجہ جے پور کے محل پر جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا پہرہ لگا دیا، [illegible] جے سنگھ کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ اس کو کیا [illegible] وعدہ شیواجی سے کیا ہے، جے سنگھ نے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

---

[1] [illegible]

[illegible]

بڑے بڑے ٹوکروں میں یہ مٹھائی بھیجی جاتی تھی ایک دن اس نے خود کو ایک ٹوکرے میں چھپایا اور دوسرے میں اپنے بیٹے شنبھاجی کو اور اس طرح سے شہر کے باہر چلا گیا پہرہ دار جیسا کہ اکثر ہوتا ہے دروازے بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور ٹوکروں کو باہر جانے کی اجازت دیتا رہا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد بھیس بدل کر شیواجی غیر معروف راستوں سے ہوتا ہوا دکن پہنچ گیا۔ شیواجی کی اس سازش میں بعض مورخین[۱] کے بیان کے مطابق رام سنگھ بھی شریک تھا۔ عالمگیر کو رام سنگھ پر غصہ آیا اور سزا کے طور پر اس کا منصب واپس لے لیا گیا۔

بہرحال دکن پہنچ کر شیواجی نے مغلیہ حکومت سے معافی مانگنے کا سلسلہ شروع کیا عالمگیر تو اس کی پالیسی سے واقف ہو گیا تھا لیکن مقامی حکام اس کی باتوں میں آجاتے تھے، چنانچہ تین چار سال اس نے اسی طرح گزارے اور رفتہ رفتہ اپنے قلعوں پر دوبارہ قبضہ کرتا رہا۔ ۱۶۷۰ء میں اس نے سورت کو دوبارہ لوٹا، عالمگیر کے سردار شہروں اور قصبوں پر تو قابض تھے لیکن پہاڑی علاقوں میں شیواجی اکثر شب خون مارتا اور لوٹ مار مچاتا، اس طرح اس نے اپنی طاقت اتنی پھیلائی کہ ۱۶۷۴ء میں وہ راجہ بن گیا اور باقاعدہ اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔[۲]

سوراجیہ

جس علاقہ پر شیواجی کی حکومت تھی اس کو وہ سوراجیہ کہتا تھا۔ شیواجی کے چھ سالہ دور حکومت (۱۶۷۴-۱۶۸۰ء) کا سب سے اہم واقعہ اس کا اور گولکنڈہ کا اتحاد ہے ۱۶۷۷ء میں شیواجی نے کرناٹک پر جو بیجاپور کے علاقہ میں تھا حملہ کرنے کا ارادہ کیا حملہ سے پہلے اس

۱؎ ان میں فتوحات عالمگیری کا مصنف ایشر داس اور اطالوی سیاح منوچی خاص طور پر قابل ذکر ہیں

۲؎ شیواجی کی تاجپوشی میں ایک الجھن یہ پیدا ہو گئی تھی کہ جو پنڈت اس کام کے لئے بلائے گئے تھے ان کو یہ اعتراض تھا کہ شیواجی راجپوت نہیں ہیں اس لئے وہ حکومت کے فرائض کیونکر انجام دے سکتا ہے۔ بہرحال یہ مشکل دوسرے پنڈتوں کے ذریعہ حل کر لی گئی اور ایک ایسا شجرہ بھی وضع کر لیا گیا جس میں شیواجی کے اجداد کو راجپوت دکھلایا گیا تھا۔ اس کی تفصیل کے لئے دیکھو جادوناتھ سرکار شیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۲۰۰

Marfat.com

نے گولکنڈہ کے ہندو وزیر مدنا کے ذریعے وہاں کے سلطان ابوالحسن سے ملاقات کی سلطان نے اس کو ساڑھے چار لاکھ کی رقم اور کچھ فوج حملے کے لئے دی اور امید ظاہر کی کہ وہ بھی ہر موقعہ پہ گول کنڈہ کی مدد کرے گا۔ شیواجی نے قسم کھا کر اس کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد کرناٹک پر حملہ کیا لیکن جو مال اور علاقہ اس کے ہاتھ آیا اس میں سے اس نے ابوالحسن کو کچھ بھی نہ دیا۔ اس کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہا اور ۱۶۸۰ء میں وفات پا گیا۔ ایک مسلمان مورخ نے کافر بہ جہنم رفت سے تاریخ نکالی۔ (۱۰۸۶ھ)

دکنی ریاستوں کا لفتنہ ۱۶۸۰ء میں

شیواجی اور ابوالحسن کے سیاسی اتحاد کی اہمیت کا اکثر مورخین نے صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے۔

کم و بیش اسی سال سے دکن کی سلطنتیں جن میں اب صرف دو باقی تھیں مغلوں سے برسر پیکار تھیں، جنگ کی ابتدا جن حالات میں بھی ہوئی ہو یہ واقعہ تھا کہ بیجاپور اور گول کنڈہ کے حالات اب ایسے نہ تھے کہ وہ مغلیہ سلطنت سے مخاصمانہ رشتہ رکھ کر زیادہ مدت تک زندہ رہ سکیں۔ اگر ان ریاستوں میں سمجھدار مدبروں کا فقدان نہ ہوتا تو شاہجہاں کے عہد ہی میں وہ مغلوں کی بالادستی کو قبول کر کے بڑی حد تک علاقائی خود مختاری کو قائم رکھ سکتی تھیں ہم ہیٹہ سلطنت کے قائم ہو جانے کے بعد تو اس میں شک کی ذرا بھی گنجائش باقی نہ تھی کہ مغلوں کے لئے دکن پر مکمل قبضہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ عالمگیر یا کوئی اور بادشاہ جو اس کی جگہ تخت دہلی پر متمکن ہوتا، وہ یہ نہیں برداشت کر سکتا تھا کہ مرہٹوں کی سیاست جس کی بنیاد مغلوں کے خلاف بغاوت پر رکھی گئی تھی قوت اور اقتدار میں بڑھتی رہے۔ بیجاپور اور گول کنڈہ کے سیاست دانوں نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا۔ برخلاف اس کے انہوں نے خیال کیا کہ مرہٹوں کے ساتھ مل کر ان کی اپنی قوت میں اضافہ ہو جائے گا اور اس طرح وہ مغلوں کا مقابلہ زیادہ اعتماد کے ساتھ کر سکیں گے۔ عالمگیر تو ایک غیر معمولی ذہین بادشاہ تھا لیکن اس وقت تو دہلی کا کوئی حکمران شیواجی اور ابوالحسن کی دوستی و اتحاد کے خطرناک نتائج کو مستقبل کے آئینہ میں دیکھ سکتا تھا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیس سال کی مدت میں جو اورنگزیب کی دکن سے

واپسی کے بعد گنڈی جنوبی ہند کی سیاست میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا اس انقلاب سے سیاسی نقشہ میں جو تبدیلیاں ہوئی تھیں ان کو نظر انداز کرنا مغلیہ حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا شیواجی کی وفات سے ایک سال پہلے ہی کا واقعہ تھا کہ خود عالمگیر کا بیٹا شہزادہ اکبر راجپوتوں کے بھڑکانے سے بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور جب وہاں سے وہ بھاگا تو دکن میں آ گیا، عالمگیر اس واقعہ کو کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا، اس نے تو ۱۶۷۵ء ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ دکن کے علاقہ میں کوئی خود مختار سلطنت خواہ اس کا سربراہ مسلم ہو یا غیر مسلم نہیں ہونی چاہئے اگر ایسا ہوگا تو مغلیہ سلطنت کی سالمیت ہمیشہ خطرہ میں رہے گی۔

صفوی حکمران اور مغلیہ سلطنت

اپنی دکنی پالیسی کو تشکیل دیتے وقت مغل بادشاہوں کو ایک اور پہلو پر بھی غور کرنا پڑتا تھا، صفوی خاندان کے حکمرانوں سے مغلیہ سلطنت کے تعلقات شاید خوشگوار نہیں تھے بعض اوقات بادشاہوں میں خط و کتابت اس انداز میں ہوتی تھی گویا دونوں میں بے حد خلوص ہے لیکن سیاسی مفاد کے سلسلے میں اکثر شکر رنجی رہتی تھی، ایک مدت تک تو قندھار کا قضیہ چلتا رہا، بالآخر ایرانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور مغل افواج باوجود انتہائی کوشش کے اس کو واپس لینے میں ناکام رہیں۔ دونوں حکومتوں کی رقابت کبھی ختم نہیں ہوئی۔ شاہان صفوی سلاطین دکن کے ہم عقیدہ یعنی شیعہ تھے اور وہ اس واقعہ سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ مغلوں کا پیچیدہ مسائل میں الجھا رہنا ان کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

اس سلسلہ میں یہ امر قابل غور ہے کہ جس وقت اورنگ زیب جنگ تخت نشینی میں مصروف تھا تو شاہ ایران نے بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں کے حکمرانوں کو خط لکھ کر مشورہ دیا کہ اس وقت مغل شہزادے آپس میں الجھے ہوئے ہیں مغلوں کے ان جھگڑوں سے ان کو فائدہ اٹھانا چاہئے[1]

---

[1] یہ خطوط منشآت طاہر وحید میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

Marfat.com

اس کے علاوہ اس نے دارا کو دعوت دی کہ ایران آئے اور وہ اس کو مدد دے گا۔ اسی طرح اس نے شہزادہ مراد کو لکھا کہ اورنگ زیب کے خلاف جنگ کرے اور وہ قندھار سے اس کے لئے فوج بھیجے گا۔ لیکن جب اورنگ زیب تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے اس کو مبارکباد کا خط لکھا۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ جب عالمگیر نے تربیت خاں کو بحیثیت سفیر ایران بھیجا تو شاہ نے اس کے ساتھ بدسلوکی نہیں کیا بلکہ خود مغل بادشاہ کا بھی مذاق اڑایا۔ یہ چند واقعات ہیں جو صفوی مغل تعلقات پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ ان حالات میں سلاطین دکن کا مغلوں سے لڑائی کے لئے تیاریاں کرنا اور ساتھ ہی صفویوں سے دوستی و اتحاد بڑھانا مغلیہ سلطنت کے لئے ایک نہایت نازک مسئلہ تھا۔ اگر واقعات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور نتیجوں کی تفصیل [illegible] پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ مغلوں کو اپنی سلطنت کے قیام و استحکام کے لئے ضروری تھا کہ سلاطین دکن کو خود مختار رہنے کی اجازت نہ دی جائے اور اگر وہ اس پر تیار نہ ہوں تو [illegible] مغل بادشاہ کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ [illegible] اپنی سلطنت میں شامل کر لے۔

بیجاپور کا الحاق شہزادہ اکبر راجپوتانہ [illegible] کر کے [illegible] جا کر بیٹھا [illegible] شہزادہ [illegible] نے اس کو [illegible] پناہ دی [illegible] ماہ پیشتر یعنی جنوری ۱۶۸۱ء میں مغلوں نے برہانپور کے قریب [illegible] علاقے پر [illegible] حملہ کیا تھا۔ وہاں کے باشندوں نے بادشاہ کو ایک درخواست بھیجی تھی کہ [illegible] کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ ان حالات میں عالمگیر [illegible] زیادہ [illegible] ملتوی نہیں کر سکتا تھا یہی سبب تھا کہ اس نے [illegible] کیا اور نومبر ۱۶۸۱ء میں برہانپور پہنچا اور چار مہینے وہاں قیام کر کے [illegible] روانہ [illegible] دو فوجیں شہزادہ معظم اور شہزادہ اعظم کی سرکردگی میں [illegible] کے خلاف روانہ کی گئیں۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات پر حفاظتی دستے متعین کئے گئے تین سال تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا اور

Marfat.com

اور مرہٹوں کے متعدد قلعے اور قصبے مغلوں کے قبضے میں آ گئے۔

اس وقت سلاطین بیجاپور و گولکنڈہ کے رویہ کی پوری تاریخ عالمگیر کے سامنے تھی۔ لیکن پھر بھی اس کو امید تھی کہ بیجاپور کی حکومت نے اس خطرہ کو جو مرہٹوں کی طرف سے اس کو تھا محسوس کر لیا ہوگا لہذا اس نے سلطان کو ایک اور موقع دیا اور لکھا کہ وہ مرہٹہ قوت کے استیصال میں مغلوں کی مدد کرے مگر سکندر عادل شاہ کی حکومت نے یہی نہیں کہ مغل بادشاہ کو مدد نہیں دی بلکہ خفیہ طور پر شیواجی کو مدد بھیجتا رہا۔ اس کے بعد عالمگیر کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ پہلے بیجاپور کو فتح کرے، چنانچہ اس نے یہی طے کیا، جب سکندر کے دشمن سے مل جانے کی خبریں متواتر بادشاہ تک پہنچیں اور ان کے نصیحت آمیز فرامین کا کوئی اثر نہیں ہوا تو شہزادہ اعظم کو بیجاپور فتح کرنے کی خدمت سپرد کی گئی[1] سنہ ۱۶۸۵ء کے شروع میں اعظم نے شہر کا محاصرہ کیا لیکن جب کئی مہینے گذر گئے تو بادشاہ خود فوج لے کر بیجاپور کی طرف روانہ ہوا۔ اب سکندر کو اپنے تاریک انجام کا یقین ہو گیا، اس نے آخری کوشش یہ کی کہ علماء کا ایک وفد بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ ان لوگوں نے بادشاہ سے کہا کہ مسلمانوں کا خون بہانا مناسب نہیں۔ یہ شریعت میں کہیں جائز نہیں کہ ان کا خون بہایا جائے، عالمگیر نے جواب دیا کہ جو کچھ انہوں نے کہا صحیح ہے، اس کا مقصد بھی مسلمانوں کا خون بہانا نہیں، حقیقت یہ ہے کہ کفار نے ان پر قبضہ کر لیا ہے اور دکن سے دہلی تک مسلمانوں کی زندگی خطرے میں ہے، غریب اور بے کس دن رات فریاد کرتے ہیں اس لئے ان کی امداد ضروری ہے، میں اتنی دور سے چل کر اسی غرض سے یہاں آیا ہوں۔

"ہر کافر فاجر حربی شقی ...... در بغل شما جا گرفتہ و در پناہ شما آمدہ فسادات و خرابیہا می کند۔"

جس وقت میں اس کو ختم کر دوں گا، واپس چلا جاؤں گا، علماء کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔[2]

---

[1] خافی خان جلد دوم ص ۳۱۷

[2] بساتین سلاطین ص ۵۴۴

Marfat.com

اب دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور خود عالمگیر کے پاس حاضر ہوا۔ عالمگیر نے نہایت شفقت اور مہربانی سے اس کے ساتھ برتاؤ کیا پہلے اس کو دولت آباد میں رہنے کی اجازت دیدی اور بعد میں اپنے ساتھ لشکر میں رکھا۔ بیجاپور کی فتح مغلوں کے لئے لازمی ہو گئی تھی جب تک اس کو سلطنت میں شامل نہ کیا جاتا مرہٹہ قوت برابر بڑھتی رہتی۔ شیواجی کے متعلق جادو ناتھ سرکار کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ :۔

"وہ (یعنی شیواجی) صرف بیجاپور ہی کے علاقہ میں اپنی ریاست کے حدود بڑھا سکتا تھا اور اسی کے خلاف سر اٹھا سکتا تھا"[1]

شیواجی کے بعد بھی اس صورت حال میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی، مرہٹوں کا سب سے بڑا جولان گاہ اب ریاست بیجاپور ہی تھی۔ اس کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی کی وفات ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء میں واقع ہوئی تو بیجاپور کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، بساتین سلاطین کے مصنف نے اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے "کوئی شخص دلجمعی کے ساتھ نہ کھا پی سکتا ہے اور نہ سو سکتا ہے"[2]

اگر بیجاپور کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً حالت بد سے بدتر ہو جاتی۔ ان حالات کے پیش نظر عالمگیر کا اس ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا با آسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

گول کنڈہ کا الحاق

گول کنڈہ کا الحاق اگرچہ بعد میں ہوا لیکن واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیجاپور سے زیادہ ضروری تھا۔ بیجاپور میں تو حکومت کی کمزوری کے باعث امراء میں نفاق اور گروہ بندی شروع ہو گئی تھی، برخلاف اس کے گول کنڈہ میں سلطان ابوالحسن نے اپنی ساری ذمہ داری اپنے ہندو وزیر مدنا کو سپرد کر کے خود کو عیاشی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ مدنا کی حکومت ہر طرح سے مغلوں کے لئے ناقابل برداشت تھی، وہ صرف گول کنڈہ اور مرہٹوں کو

---

[1] ہسٹری آف اورنگ زیب جلد چہارم ص ۹

[2] بساتین ص ۲۳۵

دوستی اور اتحاد ہی کا حامی نہ تھا بلکہ علانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کرتا تھا۔ خافی خان کے الفاظ قابل غور ہیں:۔

"از آن کہ ابو الحسن قطب الملک فرمانروائے حیدر آباد با فعال قبیح از سپردن ملک به مادنا و اکنا کہ ہر دو کافر شدید العداوت بودند و سختی و ظلم بر مسلمانان علانیہ میگذاشت و فسق و فجور علانیہ از رواج مسکرات و لہو و لعب زیادہ بعرض رسید"[1]

ابو الحسن اور اس کی حکومت نے حالات کی نزاکت کا صحیح اندازہ نہیں کیا اور مغلوں سے تعلقات بہتر بنانے کی بجائے انہوں نے عالمگیر کو تقریباً مجبور کر دیا کہ وہ گولکنڈہ پر حملہ کرے۔ جس وقت مغل افواج بیجاپور پر حملہ آور ہو گئیں تو ابو الحسن نے اپنے حاجب کو جو مغلیہ لشکر کے ہمراہ تھا ایک خط لکھا جس میں عالمگیر کو سیاہ کھلا کہا گیا تھا۔ مآثر الامراء میں خط کا مضمون نقل کر دیا گیا ہے۔ ابو الحسن نے لکھا تھا:۔

"درین حال با تمام اسم بزرگی داشت می نمودیم حالا کہ الشان سکندر را یتیم و ناتوان دانستہ بیجاپور را محاصرہ نمودند کار بر ایشان تنگ آمدہ بود واجب آمد کہ سوائے جمعیت موفورہ بیجاپور را جانب از طرفے یا فوجہائے قشون از شمار افزون جھنگ کہ آن بیکس کسی بر سر زند، وہ به سرداری خلیل اللہ خان پلنگ حملہ چہل ہزار سوار متعدد پیکار نعین نمودیم و بلیتیم کہ ایشان کدام کدام طرف مقابلہ و مقاومت خواہند کرد"[2]

---

[1] خافی خان جلد دوم ص — مدنا کے عہد میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا اس کا اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ظہیر الدین فاروقی نے حدائق العالم کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک ہندو تہوار کے موقع پر مدنا اور اس کا بھائی اکنا ایک جلوس کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے۔ سادات اور علماء کو حکم دیا گیا کہ وہ بھی ہمراہ جائیں۔ راستہ میں مدنا نے ان لوگوں کو ذلیل کرنے کی غرض سے کہا کہ تمہارے بزرگ بھی پہلے بت توڑتے ہیں، اب یہ ہمارا موقع ہے کہ تم کو ان کے یعنی بتوں کے پاس اس طرح لیجایا جائے

ص ۳۰۵   [2] جلد سوم ص ۶۲۹

Marfat.com

یہ خط پکڑا گیا، یہ ہی نہیں عالمگیر کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سیرم اور رام گیر کے ضلع جو مغلیہ علاقے میں تھے، ان پر گول کنڈہ کی فوجوں نے قبضہ کر لیا ہے، ان حالات میں اس نے وہی کیا جو کوئی بھی دوسرا شخص کرتا یعنی گول کنڈہ پر فوری حملے کا حکم دیدیا، چنانچہ جولائی ۱۶۸۵ء میں شہزادہ معظم کی سرکردگی میں مغلیہ افواج حیدرآباد کی طرف بڑھیں، شہزادے نے آخری لڑائی سے پہلے دکنیوں کو ایک اور موقع دیا کہ وہ دونوں ضلع جن پر انہوں نے قبضہ کر لیا تھا چھوڑ دیں اور ساری رقم خراج کی جو بقایا ہے وہ ادا کریں، لیکن دکنی سرداروں کو اپنی طاقت پر ناز تھا کیونکہ کم از کم اس جنگ میں ان کی فوجیں مغلوں سے بہت زیادہ تھیں، لہٰذا انہوں نے لڑائی ہی کو ترجیح دی۔ بالآخر گول کنڈہ کی فوجوں نے شکست کھائی اور حیدرآباد پر سلطان معظم کا قبضہ ہو گیا (اکتوبر ۱۶۸۵ء) ابوالحسن کو اب اطاعت کے علاوہ چارہ نہ تھا، معظم کی سفارش پر عالمگیر نے ابوالحسن سے صلح کر لی اس کی شرائط یہ تھیں کہ وہ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ بقایا ادا کرے گا، سالانہ خراج پابندی سے دے گا، دو ضلع مغلوں کو واپس کرے گا اور مادنا اور اکنا کو برخاست کیا جائے گا۔ ابوالحسن نے ان شرائط کو مان لیا لیکن وہ مادنا وزیر کو الگ کرنا نہیں چاہتا تھا چند ماہ بعد بعض امراء نے مادنا اور اکنا کو قتل کروا دیا اب مغلیہ افواج نے گول کنڈہ علاقہ خالی کر دیا اور واپس چلی گئیں۔

اس صلح کے بعد عالمگیر کو امید تھی کہ ابوالحسن اپنا رویہ بدل دیگا لیکن دکنیوں کی ذہنیت ... سے دوستی ... کا عقیدہ اس قدر پختہ ہو گیا تھا اور بڑھتے ہوئے حالات ... تبدیلی کے لئے تیار نہ تھا چنانچہ اب سیاست ... ختم ہو چکی تھی لیکن ابوالحسن کی ... کے اظہار کے لئے یہی طریقہ رہ گیا تھا کہ وہ سنبھاجی کو مدد دیتا رہے، اس نے ایسا ہی کیا ... اس کو بھی حالانکہ مغلوں کے تاوان جنگ اور بقایا رقوم ادا کرنے کے لئے ... کے پاس روپیہ نہیں، جب عالمگیر کو اس کی یہ حرکات معلوم ہوئیں تو اس نے ... کہ گول کنڈہ پر حملہ کیا جائے[1] یہ فیصلہ پختہ تھا اور اب اس میں عالمگیر کسی حالت میں تبدیلی کے لئے

۱؎ عالمگیر کا سفیر گول کنڈہ میں سعادت خان تھا، اس نے اس واقعہ کی خبر بادشاہ کو پہلے بھی بھیجی تھی ...

Marfat.com

تیار نہ تھا، مغل افواج ۱۶۸۷ء کے جنوری میں گول کنڈہ کے قریب پہنچیں، ابوالحسن میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی، چنانچہ اس نے معافی کی درخواست کی عالمگیر نے جواب میں جو فرمان بھیجا اس کے چند فقرے اس قابل ہیں کہ ان کو نقل کر دیا جائے۔ اس نے ابوالحسن کو لکھا:-

اگرچہ افعال قبیح آن بد عاقبت از احاطہ تحریر بیرون است از صدیکے واز بسیارے اندکے بہ شمار می آید۔ اولاً اختیار ملک و سلطنت بہ کف اقتدار کافر، فاجر، ظالم مادن و سادات و مشائخ و فضلا را منکوب و مغلوب ساختن و رواج فسق و فجور باقرار علانیہ کوشیدن و خود از بادہ پرستی بہ ریاست و بدمستی دولت در انواع کبائر شب و روز مستغرق بودن، بلکہ کفر از اسلام و ظلم از عدل، فسق و فجور از عبادت فرق نہ نمودن و در اعانت کفار حربی اصرار ورزیدن، خود را در عدم اطاعت اوامر و نواہی الٰہی..... چنانچہ مکرر درین باب فرامین نصیحت آمیز مصحوب مردم آداب دان مزاج گرفتہ معلوم، صادر شد و پنبہ غفلت از گوش نہ کشید بلکہ درین نزدیکی فرستادن لک ہون برائے شنبھاجی بدکردار بہ عرض رسید۔ باین ہمہ غرور و مستی بادہ ناکامی نظر بر افعال زشت و اعمال خود نہ نمودہ امید رستگاری و بہبود جہاں داشتن۔ ع

زہے تصور باطل، زہے خیال محال![1]

ابوالحسن اب دفاع کے لئے مجبور تھا، اس کے غرور اور کم عقلی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے سرداروں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ عالمگیر کو زندہ گرفتار کر کے اس کے سامنے لائیں اور گرفتار کرنے کے بعد اس کے ساتھ عزت کا برتاؤ کریں، سرداروں کے گھمنڈ کو بھی ملاحظہ کیجئے اس کے جواب میں وہ سلطان سے کہتے ہیں کہ ہمارے دل میں عالمگیر کے لئے نفرت کے جذبات اس قدر گہرے ہیں کہ ہم سے یہ امید نہ رکھی جائے کہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ

---

[1] خافی خان۔ جلد دوم ص ۳۲۸

Marfat.com

کر سکیں گے۔[1]

بہرحال مغل افواج نے گول کنڈہ کے قلعہ کا باقاعدہ محاصرہ شروع کر دیا (۷ فروری ۱۶۸۷ء) یہ قلعہ نہایت مستحکم تھا یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ محاصرہ طویل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ عالمگیر کے بعض شیعہ سردار قطب شاہیوں کی تباہی نہیں چاہتے تھے اور ان سے ہمدردی رکھتے تھے خود شہزادہ معظم بھی ابوالحسن سے ہمدردی رکھتا تھا ایک مرتبہ اس سے قبل بھی اس پر عالمگیر ناراض ہوا تھا لیکن اس محاصرہ کے موقع پر بھی شہزادہ نے ابوالحسن سے خفیہ ساز باز کی کوشش کی، عالمگیر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے معظم کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور کئی سال تک وہ محبوس رہا۔ ایک اور دشواری موسم برسات کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، سارے کیمپ میں پانی بھر جاتا تھا اور بارود وغیرہ بھیگ جاتی تھی لیکن باوجود شدید نقصانات کے عالمگیر اپنے ارادے پر پختہ رہا مغلوں نے تین بڑی سرنگیں تیار کیں مگر جب ان کو بارود سے اڑایا گیا تو خود اپنی فوج کو زیادہ نقصان پہنچا۔ عالمگیر جانتا تھا کہ محاصرہ طویل ہوگا اور نقصان شدید لیکن اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اس مرتبہ گول کنڈہ فتح کئے بغیر واپس نہ جائے گا۔ حیدرآباد اور دوسرے مقامات پر اس نے اپنے افسر مقرر کر کے گول کنڈہ کی فتح کا اعلان بھی کرا دیا تھا۔ محاصرہ امید سے پہلے ختم ہو گیا کیونکہ ایک افغان سردار نے [illegible] سے غداری کر کے دروازہ کھول دیا اور ۲۱ اکتوبر کو مغل فوج اندر داخل ہو گئی۔ ابوالحسن کو پچاس ہزار کی پنشن دیکر دولت آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔[2]

۱؎ خافی خان جلد دوم ص ۳۲۹

۲؎ ابوالحسن کے سرداروں میں عبدالرزاق خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ آخری لمحہ تک مغلوں سے لڑتا رہا آخرکار زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا، گرفتار ہونے کے بعد عالمگیر کے حکم سے اس کا باقاعدہ علاج کیا گیا جب صحت ہو گئی تو اس کو اطلاع دی کہ عالمگیر بادشاہ اس پر مہربان ہے، اس کے لڑکوں کو منصب دے دئے گئے ہیں اور اگر وہ خدمت قبول کرے تو ان کے باپ کو بھی منصب عطا کیا جا سکتا ہے۔ عبدالرزاق نے اس پر کہا کہ جس شخص نے ابوالحسن کا نمک کھایا ہے اس کے لئے عالمگیر کی ملازمت ممکن نہیں، عالمگیر نے اس پر کچھ نہیں کہا سوائے اس کے کہ جب وہ صحتیاب ہو تو اس

عالمگیر کی فتوحات اور شنبھاجی کی گرفتاری

بیجاپور و گول کنڈہ کی فتح کے بعد عالمگیر نے اپنی پوری توجہ مرہٹوں پر دی، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے مرہٹہ قلعوں پر مغلیہ افواج نے قبضہ کر لیا۔ ۱۶۸۹ء میں شنبھاجی بھی گرفتار ہو گیا۔ شنبھاجی نہایت عیاش، بدزبان اور ظالم حکمراں تھا اور لوگ اس کے مظالم سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ جب مقرب خان نے اس کو گرفتار کر کے شاہی لشکر میں بھیجا تو:

> بہر قصبہ و دہات و سر راہ اطراف خبری رسید، دہل شادی نواختہ می گردید، بہ جا گذری می نمودند و در و بام پر از زن و مرد گشتہ شادی کنان تماشا می کنند[1]

بعض مغل سرداروں کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے تمام قلعے شاہی افواج کے سپرد کر دے اور مکمل اطاعت کر لے تو اس کو معاف کر دیا جائے، لیکن شنبھاجی نے بجائے معافی مانگنے کے شہنشاہ اور رسول اللہ صلعم کی شان میں گستاخانہ جملے کہنے شروع کئے، یہ حرکت ناقابل برداشت تھی، چنانچہ پہلے اس کی زبان نکلوائی گئی اور پھر قتل کرا دیا گیا، لیکن عالمگیر کی رواداری اور وسعت قلب کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ اس نے شنبھاجی کے بیٹے ساہو کو عزت کے ساتھ اپنے لشکر میں رہنے کا حکم دیا۔

شنبھاجی کی گرفتاری کے بعد اس کا سوتیلا بھائی راجہ رام مرہٹہ سردار تسلیم کر لیا گیا لیکن جلد ہی اس کے پایہ تخت رائے گڑھ کو مغلیہ افواج نے اپنے قبضہ میں کر لیا، مگر راجہ رام بھاگ نکلا اور جنجی کے مضبوط قلعے میں پناہ گزین ہو گیا، یہیں اور مرہٹے سردار بھی بھاگ کر اس کے پاس آ گئے، عالمگیر نے فوج

صحت کی رپورٹ کی جائے، عالمگیر کے دل میں عبدالرزاق کے اوصاف اور کردار کی عزت تھی، چنانچہ جس وقت وہ گرفتار ہو کر آیا تھا تو بادشاہ نے کہا تھا کہ اگر ابوالحسن کے ملازموں میں ایک بھی عبدالرزاق کی طرح اور وفادار سردار ہوتا تو فتح گول کنڈہ میں کافی تاخیر ہو جاتی۔

[1] خافی خان جلد دوم ۳۸۷

Marfat.com

کا ایک دستہ ذوالفقار خاں کی سرکردگی میں جنجی کی طرف روانہ کیا، راستہ میں ذوالفقار خان پر کوم کنڈہ کے قریب ایک زبردست مرہٹہ فوج نے حملہ کر دیا۔ باوجودیکہ ذوالفقار خاں کی فوج تعداد میں بہت کم تھی اس نے مرہٹوں کا مقابلہ کیا اور شکست دیکر بھگا دیا۔ لیکن اس علاقہ میں مغلوں کی فوج اس قدر ناکافی تھی کہ ۱۶۹۱-۹۲ء میں مرہٹوں نے کئی قلعوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جب عالمگیر کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے شہزادہ کام بخش اور اسد خاں کی سرکردگی میں ایک فوج اس طرف روانہ کی، کام بخش کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ اسے اسد خان کے تحت رکھا گیا، چنانچہ اس نے سردارانہ کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ راجہ رام سے خفیہ گفت و شنید شروع کر دی۔ اسد خان کو جب اس کی خبر ملی تو اس نے کام بخش کو گرفتار کر لیا، ان حالات سے مغلوں کی فوج میں انتشار شروع ہو گیا۔ [illegible] مرہٹوں کی ایک فوج نے مغلوں کے ایک سردار کو گرفتار کر لیا اور شاہی کیمپ [illegible] منقطع کر دیا۔ ساتھ ہی یہ خبر اڑا دی کہ عالمگیر کی وفات ہو گئی [illegible] وہ اس کو بادشاہ تسلیم کر لیں گے مغلوں کے [illegible] ذوالفقار [illegible] خان کا خیال تھا کہ [illegible] وجوہات سے جنجی کا محاصرہ مدت تک طول کھینچتا رہا [illegible] میں [illegible] زبردست [illegible] سے زیادہ [illegible] نے [illegible] اور [illegible] بھگا دیا [illegible] کر دیا

[illegible] ذوالفقار [illegible] گفت و شنید [illegible]

چکا تھا[1] لیکن اس کی چار بیویاں اور پانچ بچے فاتحین قلعہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔

اس عرصہ میں عالمگیر نے اپنی فوج کو نئی ترتیب دیکر دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ ایک حصہ شہزادہ بیدار بخت اور ذوالفقار خاں کی سرکردگی میں مرہٹوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسرا حصہ خود بادشاہ کی نگرانی میں مغرب کی جانب بڑھا۔ اس فوج نے بسنت گڑھ کے قلعے کو ایک روز میں فتح کر لیا اور آگے جا کر ستارہ کا محاصرہ کر لیا جہاں راجہ رام نے پناہ لے رکھی تھی، عالمگیر کے پہنچنے کے بعد وہ زیادہ نہ ٹھہر سکا، بلکہ بھاگ کر سنگڑھ پہنچا اور یہیں ۱۷۰۰ء میں اس نے وفات پائی، راجہ رام کے بعد اس کا بیٹا جو تارا بائی کے بطن سے تھا، راجہ تسلیم کر لیا گیا، تارا بائی نے صلح کی درخواست کی لیکن عالمگیر نے یہ شرط پیش کی کہ مرہٹے مکمل اطاعت قبول کریں اور سب قلعے مغلوں کے حوالے کر دیں۔ اب مغل افواج نے قلعوں پر قبضہ کرنا شروع کیا، پہلے ستارا اور پھر اور کئی قلعے ان کے قبضے میں آ گئے۔ پہالہ، پاون گڑھ، پر گڑھ، نندگیر، چاندن اور واندن وغیرہ ۱۷۰۱ء میں مغلوں کے پاس آ گئے۔ کونڈانہ اور سنگڑھ ۱۷۰۳ء میں اور راج گڑھ اور تورنا ۱۷۰۴ء میں فتح ہوئے اس کے بعد مغلیہ فوج واکنکھیڑہ کی طرف بڑھی اور ۱۷۰۵ء میں اس کا محاصرہ کیا۔ یہاں کا سردار پدیا نائک تھا، اس نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن بعد میں غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ ہو گیا تھا (۱۶۸۹ء) جس زمانہ میں مغل افواج مرہٹوں سے لڑنے میں مصروف تھیں، پدیا نے اپنی طاقت میں اضافہ کر کے واکنکھیڑہ میں اپنا مستقر قائم کر لیا تھا۔ اب عالمگیر نے طے کیا کہ اس کو بھی ختم کیا جائے، پدیا زیادہ عرصہ شاہی افواج کے سامنے نہیں ٹھہر سکا لیکن جب انہوں نے واکنکھیڑہ پر قبضہ کیا تو معلوم ہوا کہ پدیا بھاگ چکا تھا، شبہ یہ کیا جاتا تھا کہ اس کو بھگا دینے میں مغل سردار نصرت جنگ کا ہاتھ تھا، جنوری ۱۷۰۶ء میں عالمگیر احمد نگر آیا اور سال بھر تک یہیں

---

[1] عالمگیر اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے:۔

"جنجی فتح شد و رانائے حربی گریخت۔ گرفتش چنداں کار نبود، اما از اغماض بعضے کہنہ عملان از دست رفت۔" (دستور العمل آگہی)

Marfat.com

قیام کیا۔ عالمگیر اب نوے برس کا ہو چکا تھا، اس عمر میں بھی جس طرح اس نے فوج کی کمان کر کے مخالفین سے لڑائیاں لڑیں اس پہ حیرت ہوتی ہے لیکن اب اس کی تندرستی بہت گر گئی تھی۔ ۲۸ فروری ۱۷۰۷ء کو اس کو بخار آیا، چار روز تک اسی بخار میں دربار بھی کیا، اپنے فرائض منصبی بھی انجام دیتا اور نماز بھی ادا کرتا، ۳ مارچ کو فجر کی نماز کے بعد ورد و وظائف ادا کئے اور اسی وقت اسی حالت میں روح پرواز کر گئی۔ شیخ زین الحق کے مقبرہ میں جو دولت آباد سے چار میل ہے اس کو دفن کر دیا گیا۔ عالمگیر کی وفات ہماری تاریخ کا عظیم المیہ ہے، وہ ایک شہنشاہ کی وفات نہ تھی بلکہ ایک عظیم الشان تہذیبی و تمدنی دور کا خاتمہ تھا، اسلامی اقتدار کو اس سے جو صدمہ پہنچا اس سے وہ کبھی جانبر نہ ہو سکا۔

Marfat.com

باب ہجدہم

ادب و معاشرہ عہد عالمگیر میں

اورنگ زیب کی تعلیم اور اس کے اساتذہ

توسیع سلطنت کے علاوہ علمی اور ادبی کارناموں کے لحاظ سے بھی عالمگیر کا عہد حکومت مسلمانوں کی تاریخ کا زرین باب ہے اس کے مختلف اسباب تھے جن میں خود بادشاہ وقت کی ذاتی صلاحیت، ادبی ذوق اور علم پروری کو بہت زیادہ دخل تھا شہزادہ اورنگ زیب کی تعلیم نہایت لائق اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی تھی ان کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

ملا عبداللطیف سلطانپوری، منقولات و معقولات دونوں میں ماہر تھے، دارا اور اورنگ زیب دونوں کے استاد تھے ۱۰۳۶ھ میں وفات پائی۔ میرزا ہاشم نے منقولات و معقولات کے علاوہ طب میں بھی کمال حاصل کیا تھا وہ بھی اورنگ زیب کے استاد تھے انہوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھ کر شاہجہاں کے نام معنون کیا تھا۔ مولانا تقی الدین المعروف بہ ملا موہن، وغیرہ بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ شاہ حبیب اللہ پیرو شاہ وجیہہ الدین گجراتی سے بیعت تھے ۱۰۶۰ھ میں وفات پائی۔

مولانا سید محمد قنوجی نے صرف شہزادگی ہی کے زمانہ میں اورنگ زیب کو تعلیم نہیں دی بلکہ تخت پر بیٹھنے کے بعد بھی وہ ان سے استفادہ کرتا تھا۔ اس کو امام غزالی کی احیاء العلوم آپ ہی نے پڑھائی تھی عالمگیر کی علمی مجلس میں جو ہفتہ میں تین روز منعقد ہوتی تھی مولانا سید محمد قنوجی ضرور شرکت فرماتے

Marfat.com

بعض اہم خانگی معاملات بھی عالمگیر ان ہی کو سپرد کرتا مثلاً شاہجہاں کی تجہیز و تکفین کا انتظام انہوں نے ہی کیا تھا۔[1] اورنگ زیب کے اساتذہ میں ملا جیون کو بہت شہرت حاصل ہے، یہ لکھنؤ کے ایک قصبہ امیٹھی میں پیدا ہوئے تھے، عالمگیر نے ان سے بہت سی کتابیں پڑھی تھیں اس لیے ان کا بے حد احترام کرتا تھا، ملا صاحب ساری عمر درس و تدریس میں مصروف رہے، حرمین شریفین کی زیارت کو گئے تو وہیں مدینہ منورہ میں منار کی شرح نور الانوار لکھی، ان کی تفسیر احمدی آج بھی معروف کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ۱۱۳۰ھ میں دہلی میں انتقال کیا لیکن دفن اپنے وطن ہی میں ہوئے۔[2]

شیخ عبدالقوی صدر کا قتل

شیخ عبدالقوی برہانپوری اپنے علم و فضل کے لیے مشہور تھے عالمگیر کو ان پر بہت اعتماد تھا اور ان سے معاملات پر مشورہ بھی لیتا تھا چنانچہ جلوس کے چوتھے سال میں ان کو اعتماد خاں کا خطاب عطا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ سرمد کے متعلق تحقیقات کا کام ملا عبدالقوی ہی کی سپرد ہوا تھا، انہوں نے جب سرمد سے دریافت کیا کہ وہ برہنہ کیوں رہتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ شیطان قوی است اور اس کے بعد یہ رباعی پڑھی۔

خوش بالا کردہ چنین پست مرا
از چشم بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش
دزد عجبے برہنہ کردہ است مرا

یہ ظاہر ہے کہ ملا صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے بالخصوص "شیطان قوی است" کا ذو معنی جملہ سننے کے بعد ان کے نزدیک شرعی نقطہ نظر سے سرمد قابل تعزیر ہوں گے۔ ان کی مندرجہ ذیل رباعی سے ان کا معرکہ ثابت ہوتا ہے، وہ رباعی یہ ہے:۔

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۹۳۴

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۵۹۔ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۰۱

[3] عالمگیر نامہ ص ۶۱۹

Marfat.com

آن کو بسر حقیقتش یاور شد ؛ خود پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بفلک ؛ سرمد گوید فلک با احمد در شد

عبد القوی نے دوسرے فقہا کے اتفاق رائے سے سرمد کے قتل کا حکم دیا۔ جس وقت جلاد قتل کے لئے آیا تو سرمد غیر معمولی طور پر مطمئن معلوم ہوتے تھے، تلوار کے نیچے گردن رکھنے سے پہلے انہوں نے یہ شعر پڑھا ؎

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم ؛ دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

بعض روایتوں کے مطابق سرمد نے اپنے قتل کی ایک طرح سے پیشین گوئی کی تھی، مثلاً سرخوش لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ اور مرزا عبد القادر بیدل اور ناصر علی جامع مسجد دہلی میں حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے تو سرمد آئے اور یہ شعر پڑھا ؎

عمریست کہ افسانہ منصور کہن شد ؛ من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

۱؎ یہ تو ظاہر ہے کہ سرمد نے یہ رباعی نعت میں لکھی، انصاف پسندوں کی نظر میں یہ انکار معراج تو نہیں کہا جاسکتا بلکہ مقام رسالت کی بلندی بیان کرنے کا شاعرانہ انداز ہے۔ سرمد کی ایک اور نعتیہ رباعی یہ ہے:-

ای از رخ تو شگفتہ خاطر گل سرخ ؛ باطن ہمہ خون دل و ظاہر گل سرخ
زان دیر بیآمدی ز یوسف کہ بباغ ؛ اول گل زرد آمد و آخر گل سرخ

سرمد کی رباعیاں توحید اور عشقیہ مضامین کے لئے مشہور ہیں اور بلند پایہ سمجھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دو رباعیاں نقل کی جاتی ہیں:-

سرمد تو حدیث کعبہ و دیر مکن ؛ در کوچہ شک چو گمرہان سیر مکن
رو راہروی ز شیخ ما نے آموز ؛ یک قبلہ گزین و سجدہ غیر مکن

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند ؛ سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار ؛ این دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

Marfat.com

صاحب مآثر الامراء، مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے مصنفین نے غیر مسلم مورخوں کی طرح یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عالمگیر نے سرمد کو اس پاداش میں قتل کرایا کہ وہ دارا سے تعلقات رکھتا تھا، مولانا اس الزام کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

"ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں، انہیں مذہب کی چادر اڑھا کر چھپایا گیا ہے۔"[1]

تاریخ کا کس قدر ظلم ہے کہ جو شخص شہنشاہ ہند ہوکر فقیرانہ زندگی بسر کرے اور سنت نبوی کی اتباع میں موٹے کپڑے پہنے، ہر ہفتہ میں تین دن روزہ رکھے، جو کی روٹی کھائے، جس کا کردار مثالی ہو اور جو اسلام کی خدمت کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوت یا منفعت کو کوئی حقیقت نہ سمجھتا ہو اس پر یہ تہمت لگائی جائے کہ یہ شخص مذہب کو سیاسی اغراض کی آڑ بنا رہا تھا [illegible] تعجب تو ہوتا ہے کہ عالمگیر جیسے صحیح الفکر حکمراں نے فقہا کے اس فیصلہ کو نافذ کیوں [illegible] کی وابستگی کا اس سے تعلق نہیں [illegible] اسی بنا پر ختم کرنا ضروری تھا [illegible] دارا کے ہیرو تھے یہ رعایت کیوں برتی گئی کہ ان کو تہہ تیغ نہیں کیا، یہ ضرور ہے کہ انہوں نے عالمگیر کی تخت نشینی کے وقت ایک رباعی کہی تھی، لیکن کیا یہ رباعی لکھنا عالمگیر کی [illegible] کو ختم کرنے کے لئے کافی تھی؟ کم از کم پہلے بادشاہ سے معافی مانگنا تو ضروری تھا۔

عہدِ عالمگیری کے علماء و فقہاء

فتاوٰی عالمگیری کی تدوین کے سلسلہ میں متعدد علماء و فقہاء [illegible] دربار سے وابستہ تھے ان [illegible] علاوہ بھی بڑی تعداد ایسے علماء کی تھی جو یا تو کسی خاص خدمت پر مامور تھے یا عالمگیر نے ان کی مدد کی تھی، سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں، ان کے متعلق بعض اشارات کئے جا سکتے ہیں۔

ملا قطب نواح ملتان کے رہنے والے تھے ان کو ملا لاکھو [illegible]

---

[1] بحوالہ رود کوثر ص ۴۹۱

جو بعد میں قطب آباد کہلانے لگا، شیخ قطب برہانپوری نہایت متورع ہونے کے علاوہ حافظ بھی تھے، عالمگیر تراویح ان ہی کے پیچھے پڑھتا تھا، ملا عوض وجیہہ سمرقندی شاہجہاں کے عہد میں ہندو پاکستان آئے اور مفتی لشکر مقرر ہوئے، عالمگیر کے زمانہ میں محتسب مقرر ہوئے اور بقول صاحب مآثر عالمگیری:-

"اس میں شبہ نہیں کہ ملا عوض نے بے حد انقیاد و پرہیزگاری کے ساتھ احکام شرع کی پابندی کی اور عوام کو اس راہ پر قائم رکھنے و نیز بدعات کا قلع قمع کرنے میں پوری سعی و کوشش سے کام لیا اور یہ کہنا قطعی مبالغہ نہیں ہے کہ ملائے مرحوم کے ایسا محتسب کوئی دوسرا نہیں ہوا!"

شاہی ملازمت کے اختتام پر وہ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے بہ سنہ ۱۰۸۷ھ میں وفات پائی، ملا عبداللہ پسر ملا عبدالحکیم، عالم ہونے کے علاوہ عارف بھی تھے ۱۰۸۶ھ میں وہ عالمگیر سے ملاقات کیلئے تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی اور خلعت عطا فرمایا، سات سال بعد عالمگیر کو ملا صاحب کی تنگدستی کا حال معلوم ہوا تو اس نے عہدہ صدارت پیش کیا لیکن اس عارف کامل کا جواب یہ تھا۔

"اب زمان فراق ہے نہ کہ وقت تحصیل شہرۂ آفاق!"

کچھ عرصہ کے بعد ملا صاحب نے وفات پائی، عالمگیر نے ان کی بیوہ اور لڑکوں کے لئے وظائف مقرر کر دئے۔[1]

قاضی عبدالوہاب شیخ محمد طاہر پٹنی کے پوتے تھے "در علم فقہ و اصول مہارتے تمام داشت" یا نفاذ شریعت میں بے حد سختی برتنے کی وجہ سے بعض امراء نے ان کے خلاف شکایت کی، لیکن عالمگیر کو ان پر اعتماد کلی تھا اور آخر عمر تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے، ان کے انتقال کے بعد عالمگیر چاہتا تھا کہ ان کے بیٹے شیخ الاسلام کو یہ عہدہ عطا کرے، لیکن وہ جذبۂ محبت الٰہی کی وجہ سے دنیا سے بے تعلقی کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے، بادشاہ کے اصرار کے باوجود عہدہ قضا قبول نہیں کیا۔[2]

---

[1] مآثر الامراء۔ جلد اول ص ۲۳۶ [2] عالمگیر کے عہد میں جن علماء کو بادشاہی سرپرستی حاصل تھی یا جو کسی نہ کسی سرکاری خدمت پر مامور تھے ان کی تعداد کافی ہے، یہاں چند علماء کا ذکر اس غرض سے کیا گیا ہے کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ عالمگیر کس قسم اور کس اہلیت کے علماء کو منتخب... قضاء و صدارت کے عہدوں پر فائز کرتا تھا، کثیر تعداد میں شریعت کی پابندی کرنے والے علماء کو با اختیار عہدے دیکر اس نے حکومت کو شرعی طریقہ پر لانے کی کوشش کی۔

عالمگیر کا ادبی ذوق

عالمگیر دینی علوم کے علاوہ ادب کے دوسرے شعبوں سے بھی دلچسپی رکھتا تھا، وہ خود کئی زبانیں جانتا تھا محمد کاظم لکھتا ہے :-

"اگرچہ اکثر اوقات بزبان سلیس فصیح فارسی تکلم می نمایند لیکن ترکی چغتائی را بغایت خوب میدانند وبا ترکان بہمان زبان سخن می کنند۔ وبا جمیع اناس اہل ہند کہ فارسی نمی دانند یا نیکو نمی توانند گفت، بفرصت زبان بلغت ہندی می کشایند"[1]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہندی" زبان جو یقیناً اردو تھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان بن چکی تھی۔ لیکن عالمگیر کا جوہر انشاپردازی فارسی نثر میں نمایاں ہوا اور درجہ کمال تک پہنچا۔ عالمگیر کی مصروفیات یعنی ریاضات و عبادات کے علاوہ انتظام حکومت اور لڑائیوں میں ذاتی طور پر شرکت، کو دیکھتے ہوئے اس نے جس تعداد میں خطوط لکھے ہیں وہ معمولی قابلیت کا انسان نہیں لکھ سکتا تھا، تعداد کے علاوہ طرز نگارش کے لحاظ سے بھی اس کے مکاتیب نے ہر طبقہ کے ادباء سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ درباری مورخ کے مبالغہ آمیز الفاظ اور طرز تحریر کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ہم مندرجہ ذیل اقتباس سے عالمگیر کی انشاپردازی کے متعلق رائے قائم کر سکتے ہیں۔

نکتہ دانی و معنی شناسی و ربط و مناسبت فطری و کیشی آن حضرت بمراتب نثر و انشائے انواع کلام در مرتبہ ایست کہ سخن سنجان معنی طراز و فصاحت پیشگان نکتہ پرداز از فیض تعلیم و ارشاد آن مظہر کمالات قدسی عمرہا استفادہ دقائق و رموز سخن می توانند کرد، ہرگاہ بادائے منشور منشیان بلاغت گستر انشاء نامہ می فرمایند بہ حسن تقریر دل پذیر بنوعے تمہید مطلب و تلقین مدعا می نمایند کہ اگر نگارندہ قوت حافظہ را در رنج آن در رشتہاء و لآلی آبدار ساختہ بہ نگارش ہمان الفاظ کہ بزبان علم و لطائف

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵

کہ از زبان حق بیان استماع نمودہ، اکتفا نماید از تجشم فکر و تکلف انشاء مستغنی است
و چون مسودۂ آن درست می شود بمطالعہ اشرف رسیدہ از قلم بدائع رقم آن شہنشاہ
نکتہ رس ہوش مند چیدان بہ تصرفات مرغوب و اصلاحات دل پسند زینت می یابد
کہ ادیب اریب از ملاحظۂ آن بعجز و قصور معترف گشتہ سرمایہ بصیرت در اسلوب
قواعد سخن و پیرایہ خبرت و مہارت در ان فن می اندوزد" [1]

محمد کاظم کے اس بیان کی تائید دور جدید کے ممتاز مورخ انشا پرداز اور نکتہ سنج یعنی مولانا شبلی نے کی
ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کے رقعات میں :-

ادائے مطلب کی قدرت، عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطالب کا اختصار
پہلو بہ پہلو چھجے دلنشین ترکیبیں نہایت حیرت انگیز ہیں" [2]

عالمگیر کے خطوط طرز نگارش کو چھوڑ کر یوں بھی دلچسپ ہیں، امرا اور عہدہ داروں کو خطاب کرتے
وقت وہ انتظامی امور سے متعلق نصیحت کرتا ہے، مشورے دیتا ہے اور ضرورت کے وقت ان پر سخت
تنقید کرتا ہے، شہزادوں کو ان کی غلطیوں اور بے راہ روی پر نہایت موثر الفاظ میں اعتراض کرکے
نصیحت کرتا ہے۔ اس کا بڑا لڑکا محمد اعظم ایک سید کی لڑکی سے محبت کرتا تھا، ایک روز بحالت غضب
اس نے لڑکی کے باپ سید ممتاز کو پاجی کہہ دیا، عالمگیر کو خبر ہوئی تو خط لکھا :-

صبحدم مرغ چمن با گل نو خاستہ گفت ۞ ناز کم کن کہ درین باغ بسے چون تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولے ۞ ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نگفت

بان لو سالا لابصار واضع باد کہ در ایام جوانی کہ باصطلاح پوچ مصاحبان شما جوانی دیوانی
می گویند، ما را ہم دران ایام این تعلق با شخصیکہ نہایت تنجر داشت بہم رسیدہ بود

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۴

[2] مضامین عالمگیر بحوالہ بزم تیموریہ ص ۲۵۶

Marfat.com

تا بیان محبت ورزی و بانجام رسانیدیم و گاہے آزردہ نکردیم۔ دیگر آن کہ با سادات لفظ پاجی گفتن محض پاجی گری است، کسے اگر سید را پاجی گوید، البتہ پاجی نخواہد شد، اگر از نوشتہ محللات ناظر رضامندی آن سیدہ نشود بعتاب بلکہ بہ عقاب گرفتار خواہد شد جزاءً بما کانوا یعملون۔[1]

بعض اوقات اپنے خطوط میں شہزادوں اور امراء کو سخت الفاظ میں تنبیہہ بھی کرتا ہے۔ شہزادہ اعظم کو لکھتا ہے:-

عجب از آن فرزند کہ صحبت ما ہیچ اثر نہ کردہ؟ از احتیاط دور تر ہزار مرحلہ دور افتادہ۔ الحزم سوء الظن بخاطر نیاوردہ و از آیت لا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ بہرہ نیافتہ۔

اس کے بعد دو شعر نقل کرکے کہتا ہے کہ:-

"مردی در بہ زوری و بے باکی نیست بلکہ در خود شکنی است

کمال مردی و مردانگی است خود شکنی ۔۔ ہوس درست کسے را کہ این کمان شکند"

عالمگیر کے دربار کے شعراء

اس کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشہور شعراء فارسی کے اشعار بہت دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ سعدی، حافظ، نظامی، ... شاہ اور فانی کشمیری کے دواوین عالمگیر خاص طور سے پڑھتا۔ دواوین کے اشعار زبانی یاد تھے۔ ... الممالک مخلص خان نے ایک بار دیوان صائب پیش کیا جس میں ایک لاکھ شعر تھے۔ عالمگیر صائب کے ایسے اشعار پسند کرتا جو مخلوط ہوتے یعنی حقیقت و تصوف کا رنگ لیے ہوتے تھے اور اس دیوان کو اپنے ساتھ رکھنے لگا۔[2] ایک غزل صائب کی اس کو بہت پسند تھی، اس کا مقطع ہے:-

این سفر ہیچو سفرہائے دگر صائب نیست ۔۔ رخت ہستی ز خود انداختہ می باید رفت

---

[1] وقائع عالمگیر مرتبہ چودھری نبی احمد ص ۸۹

[2] بزم تیموریہ ص ۲۶۱

جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا، عالمگیر بھی اپنی پسند کے اشعار ایک بیاض میں لکھ لیتا تھا اور بعض اشعار خود اپنے بیٹوں کی بیاض میں درج کراتا تھا۔

بہ ہدایت اقدس دین رقم بگویند کہ این رباعی در بیاضے کہ بہ بادشاہ زادہ کام بخش مرحمت می شود، بخط خود بنویسد ؎

آتش بہ دوست خویش در خرمن خویشم ٭ من خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش ٭ اے وائے من و دست من و دامن خویش[1]

یہ امر قابل غور ہے کہ عالمگیر ان اشعار کو پسند نہیں کرتا تھا جس میں اس کی خوشامد یا تعریف کا پہلو نکلتا ہو۔ مآثر عالمگیری کے الفاظ ہیں کہ:

جہاں پناہ اگرچہ نظم و نثر کے سمجھنے اور لکھنے میں کمال قدرت رکھتے تھے لیکن بے فائدہ اشعار اور خصوصاً کاذب مدح سرائی کے سننے سے پرہیز فرماتے تھے نصیحت آمیز اشعار سے البتہ بے حد ذوق تھا، بیماری کی حالت میں یہ اکثر شعر پڑھ کر دل بہلایا کرتا تھا بستر مرگ پر یہ شعر اکثر پڑھتا تھا ؎

بیک لحظہ یک ساعت یک دم ٭ دگرگوں می شود احوال عالم

بیان کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی عالمگیر خود بھی طبع آزمائی کر لیتا تھا لیکن اس کے اشعار کا پتہ نہیں چلتا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے بہت ہی کم شعر کہے ہوں گے بہرحال ایک شعر مولوی ذکاء اللہ نے اس کا نقل کیا ہے، وہ یہ ہے ؎

غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم ٭ چسان در شیشہ ساعت کنم ریگ بیابان را[2]

نواب صدیق حسن خان نے شمع انجمن میں یہ رباعی بھی عالمگیر کی نقل کی ہے:۔

دی روز پئے گلاب می گردیدم ٭ پژمردہ گلے بر سر آتش دیدم

گفتم کہ چہ کردہ کہ می سوزندت ٭ گفتا کہ درین باغ دمے خندیدم

---

[1] وقائع عالمگیر ۵۲۳

[2] بحوالہ بزم تیموریہ۔ ص ۲۶۲

منصب یا ادا قواعت کی بنا پر یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ عالمگیر سخن شناسی اور نکتہ سنجی سے بے بہرہ تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ شعر گوئی کو وہ کار بیکاراں نہیں بنانا چاہتا تھا ورنہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ اس کو پیشہ بنالیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شعرا کی وہ اس حد تک سرپرستی کرنے کے لئے تیار نہ تھا جیسے کہ اس کے اجداد نے کی تھی۔ چنانچہ اس نے ملک الشعراء کا عہدہ ختم کر دیا اور دربار سے جو شاعر ملحق رہے کوئی اور خدمت بھی ان کو سپرد کر دی گئی تھی۔ ان حالات میں یہ امر تعجب انگیز نہ ہونا چاہئے کہ عالمگیر کے عہد سے ہندوستان میں فارسی شاعری کا زوال شروع ہوتا ہے فیضی، طالب، قدسی اور کلیم کے مقابلہ کے فارسی گو شعراء ہم کو اس عہد میں یا زمانہ مابعد میں نظر نہیں آتے۔ بہر حال اس دور کے چند شعراء قابل ذکر ہیں:۔

نعمت خان عالی۔ ابتدا میں اپنا آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا لیکن بعد میں عالمگیر کی ملازمت اختیار کرلی ۱۰۸۰ھ میں باورچی خانہ شاہی کا داروغہ مقرر ہوا آخر عمر میں مقرب خان کے خطاب سے سرفراز ہوا، بہادر شاہ کے زمانہ میں دانشمند خاں کا خطاب ملا۔ نعمت خان کے اشعار کو بے مزہ کہا گیا ہے، اگر ہجو لکھنے میں اس کو کمال تھا چنانچہ مآثر الامراء کا مصنف اس کو ہجو گو کہتا ہے اور کہتا ہے کہ "بہیچ یکے از زبانش نرستہ" حتیٰ کہ وقائع نعمت خان عالی میں اس نے خود عالمگیر کی بھی ہجو ملیح لکھی ہے، عاقل خان رازی کا نام میر عسکری تھا۔ عہد شاہجہانی میں یہ صغیر آیا اور شہزادہ اورنگ زیب کے تخت دکن میں ملازم ہو گیا، اورنگ زیب سے اس کے تعلقات خوشگوار تھے تخت نشینی کے بعد عالمگیر نے اس کو دوآبہ کا حاکم مقرر کیا اور عاقل خان کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اس کے بعد وہ برابر ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ آخر عمر میں وہ دہلی کا صوبیدار مقرر ہوا، بادشاہ کو اس کی دیانتداری اور خلوص پسند تھے اور اس پر بہت اعتبار کرتا تھا۔ اس نے جنگ تخت نشینی کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ وقائع یا ظفرنامہ عالمگیری کے نام سے لکھے ہیں۔ دیوان کے علاوہ اس کی چند مثنویاں بھی ہیں مرقع منقبت رازی مولانا رومی کی مثنوی کے طرز پر لکھی گئی ہے

ثمرات الحیوۃ۔ اس کے مرشد شیخ برہان الدین رازی کی تصنیف ہے جس کو عاقل خان نے مرتب کیا ہے۔ اس کو مولانا رومی کے کلام سے گہری دلچسپی تھی اور صاحب مآثر عالمگیری لکھتا ہے کہ وہ ان کے

Marfat.com

کلام کے دقائق حل کرنے میں خود کو یکتا خیال کرتا تھا۔[1] ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں ؎

منتظران یار را جلوہ ہر صورنکوست ؛ سرمہ بود غبار رہ دیدہ انتظار را
چند غم جہان خوری دل چہ نہی برین چمن ؛ باد خزان چو در پے است جلوہ این بہار را

روشن ضمیر۔ ایران سے ہند پاکستان آئے، یہاں عالمگیر نے ان کی سرپرستی کی اور کچھ مدت کے لئے ان کو ایک عہدہ پر بھی مقرر کیا، عالمگیر نے کلام اللہ حفظ کیا تو اس نے یہ رباعی لکھی :۔

محی الدین و مصطفےٰ حافظ تو ؛ صاحب سیفی و مرتضیٰ حافظ تو
تو حامی شرع و حامی تو شارع ؛ تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

اس پر عالمگیر نے خوش ہو کر سات ہزار روپیہ انعام میں دئے۔ ضمیر نے یہاں ہندی سیکھی اور اس کا بہت اچھا شاعر ہو گیا۔ اس عہد کے ہندی گو شعراء میں اس کی امتیازی حیثیت تھی، فن موسیقی کا بھی ماہر تھا نغمہ اور رقص پر ایک ہندی تصنیف پارجاتک کا فارسی میں ترجمہ کیا۔[2] مراۃ الخیال کا مولف جو صرف ہمعصر ہی نہیں بلکہ ان سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا کہتا ہے کہ "مرزا روشن ضمیر آسمان فضل و کمال کے بدر منیر تھے"۔[3]

مرزا محمد علی ماہر اکبر آبادی، اپنے زمانہ کے مشہور اساتذہ میں تھے، وہ کلیم اور قدسی کی صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے، عالمگیر کی مدح میں ایک رسالہ گل اورنگ لکھا جو ظہوری کے طرز پر ہے، وہ قناعت پسند درویش تھے اور بعد میں عزلت نشین ہو گئے تھے، ان کے ایک شاگرد محمد افضل سرخوش نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ آپ کسی منصب کی کوشش کیوں نہیں کرتے، تو جواب دیا کہ اب فقیری لے لی ہے، اگر دنیا کی طرف لوٹا تو وہ حال ہو گا جو اس ہندو بیوہ کا ہوتا ہے کہ شوہر کی چتا پر جلانے کے لئے اس کو

---

[1] ماثر عالمگیری (ترجمہ اردو) ص ۲۷۴
[2] ید بیضا بحوالہ بزم تیموریہ ص ۲۷۰
[3] مراۃ الخیال ص ۲۲۸

لے جلتے ہیں تو وہ آگ سے ڈر کر بھاگتی ہے بھنگی اس کا سر لکڑیوں سے کچل دیتے ہیں اور اس کو آگ میں
ڈال دیتے ہیں۔ آخر تک قناعت ہی کی زندگی بسر کی۔ دیوان کے علاوہ ماہر کی ایک مثنوی جامع نشاتین
ہے جو تحفۃ العراقین کی بحر میں لکھی گئی ہے۔

محمد افضل سرخوش ۱۰۵۰ھ میں کشمیر میں پیدا ہوئے، دربار سے وابستہ ہو کر داروغہ خانہ زادان شاہ
عالمگیرؒ ہوئے اور ۱۰۸۰ھ میں حسن ابدال میں مشرفی عدالت کے عہدہ پر فائز کئے گئے ۱۱۲۶ھ میں دہلی
میں وفات پائی۔ ہندی نژاد فارسی گو شعراء میں سرخوش ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، سرخوش کے
شاگردوں نے بھی شہرت حاصل کی جن میں بندرابن خوشگو، حکم چند ندرت، حافظ محمد جمال تلاش
ہیمبرا گی اور کم گو کشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سرخوش کے دیوان میں جس کو اس نے خود ہی
مرتب کیا تھا چھیالیس ہزار شعر تھے۔ اس کے علاوہ کئی مثنویاں بھی ان کی یادگار ہیں مثلاً نور علی نور
حسن و عشق، قضا و قدر جس میں بعض خصوصیات ہند کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ جنگ نامہ اعظم شاہی
قابل ذکر ہے۔ مولانا جامی کی نفحات کے تتبع میں ایک رسالہ روائح لکھا لیکن جس تصنیف نے اس کی شہرت
کو عام کیا وہ کلمات الشعراء ہے جس میں جہانگیر تا عالمگیر کے زمانہ تک کے شعراء کا مفصل حال ہے۔ بعد کے
تذکرہ نگاروں نے جن میں آزاد بلگرامی بھی شامل ہیں سرخوش کے تذکرہ سے بہت استفادہ کیا۔ کلمات الشعراء
لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

بہ شماری ما حجاب یاری دانیم ما ؛ بیخودی را نسبت اظہاری دانیم ما
تیز می سازد بقتل عاشقان شمشیر را ؛ این قدر رحم از دل یاری نی دانیم ما

خواہی کہ قدم براہ حق بگذاری ؛ باید کہ بکف دامن پیری آری
بے آئینہ نیست در نگیری ہرگز ؛ یک عمر اگر دست تماشیش داری

از بادہ مرا افزون شود عقل و شعور ؛ ساغر خضر بہ نشاط است دست مرا

Marfat.com

مے روشنی طبع بود سر خوشش ما ؛ روغن ہمہ در چراغ گردد نور

باشی لب پر حساب اگر اے ہمدم ؛ وحدت نخورد ز جوشش کثرت ہم

در ہندسہ نہ ۹ را چو مضاعف سازی ؛ ہر چند کہ بشمرے نہ آید بہ رقم[1]

اس عہد کے ایک مشہور شاعر جن کی طبع غنا پسند نے ان کو دربار سے وابستہ نہ ہونے دیا غنی کشمیری تھے، وہ ملا محسن فانی کشمیری کے شاگرد تھے، شاعری میں ان کا مرتبہ یہ تھا کہ صائب ان کے کلام پر تضمین کیا کرتا تھا چنانچہ اس کا شعر ہے ؎

این جواب آن غزل صائب کہ می گوید غنی ؛ یاد ایامے کہ دیگ شوق ما سرپوش داشت

۱۰۷۹ھ میں انتقال کیا، غنی کا دیوان شائع ہو چکا ہے، چند شعر یہ ہیں :-

با تو نزدیکم ولے دورم ز فیض عام تو ؛ موم در زیر نگین خالی ست از نقش نگین

رفتیم سوئے یار و ندیدیم روئے یار ؛ مانند ہر دے کہ رود سوئے آفتاب

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر ؛ دام ہم رنگ زمین بود گرفتار شدم

نمی کند بمن ناتوان نگہ آن شوخ ؛ ز بیم آنکہ بگویند ناتوان بین است

از کنارم دختر رز کردہ تا پہلو تہی ؛ کار من اکنون غنی با طفل اشک افتادہ ست

---

[1] تذکرہ شمع انجمن ص ۲۰۷

Marfat.com

ان کے علاوہ تذکروں میں اس عہد کے اور بہت سے شعراء کا ذکر ہے۔ مثلاً اکبر لاہوری، اسیادت لاہوری، منبر لاہوری، اعجاز اکبرآبادی، عنایہ خیرآبادی، عارف، غریب، قیصر مشرقی، نسبتی، وحدت، ناصر علی سرہندی وغیرہم۔

امرائے عالمگیری کا ادبی ذوق

شہنشاہ کے علاوہ کئی سربرآوردہ امراء بھی فضلاء و شعراء کی سرپرستی کے لئے مشہور ہیں اور ہمارے ادبی سرمایہ کی تعمیر میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ خود عالمگیر کا پہلا وزیر فاضل خان علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت رکھتا تھا اور اہم شاہی فرمان وہ خود لکھتا تھا۔[1] عالمگیر کے آخری وزیر اسد خان کا لڑکا ذوالفقار خان نصرت جنگ بھی شعراء کی سرپرستی کرتا تھا۔ ناصر علی سرہندی کچھ مدت تک اس سے وابستہ رہے۔ منعم خان نے حضرت شیخ کلیم اللہ سے تعلیم پائی تھی اپنی خدمات کی بدولت خانخاناں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ شیخ محمدؒ سے بیعت تھا، چنانچہ اس کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ معرفت میں الہامات منعمی ایک رسالہ اس کی تصنیف کردہ ہے۔ اسلام خان اورنگزیب کے ابتدائی متوسلین میں سے تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے ترقی کی اور بلند پایہ امراء میں اس کا شمار ہونے لگا والا تخلص کرتا تھا۔ ماثر الامراء میں اس کے یہ دو شعر موجود ہیں ؎

بے تو شام غم بروز من شبیخون می زند ⁂ مردم چشم ز گریہ غوطہ در خون می زند

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب ز غمش ⁂ لشکر آہ من از دل خیمہ بیرون می زند

اسلام خان کی طرح میر عیسیٰ ہمت خان بھی شروع ہی سے اورنگزیب کی سرپرستی میں تھا۔ اسی کی نوازشات کی بدولت وہ جامع فضل و کمال ہو کر مختلف عہدوں پر فائز ہوا۔ آخر میں امیر الامراء بخشی تھا۔ ماثر الامراء کا مولف اس کو از مستعدان روزگار شمار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ:۔

فصاحت و بلاغت از نظم و نثر بر صفحہ یادگار نگاشتہ۔

وہ فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا اور اس میں میرن تخلص کرتا تھا۔ فارسی کے دو شعر یہ ہیں:۔

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۳۹۵

Marfat.com

بجز خارے کہ مجنون داشت در دل ؛ بیابان جنون خارے ندارد

من چہ گویم کہ چہ مقدار بدل نزدیکی ؛ چشم بد دور کہ بسیار بدل نزدیکی

احمد یار خاں یکتا ٹھٹھہ کے صوبیدار تھے، لاہور کے ایک شاعر محمد عاقل بھی یکتا تخلص کرتے تھے ان کا اصرار تھا کہ احمد یار خاں اپنا تخلص بدل دیں، لیکن انہوں نے تجویز کیا کہ ایک طرحی غزل دونوں کہیں جس کی غزل کو استادان فن بہتر بتلائیں وہی یہ تخلص کرے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ احمد یار خان کی غزل کے بعد محمد عاقل کی ہمت پڑھنے کی نہیں ہوئی اور ان کا ہی تخلص رہا۔ اس طرحی غزل کا ایک شعر یہ ہے

بامیدیکہ شود جلوہ گر آن سرو روان ؛ خاک شد جبہہ در راہ قدم بوسی ریخت

یکتا کے دو شعر اور ہیں سے

از بس کہ سراپا زغم عشق تو داغم ؛ چون کاغذ آتش زدہ یک شہر چراغم

چہ پرسی از سر و سامان من عمریست چون کاکل ؛ سیہ بختم پریشان روزگارم خانہ بر دوشم

سنہ ۱۱۴۷ھ میں خوشاب میں وفات پائی، یکتا کو تذکرہ نگاروں نے یکتائے ماثل لکھا ہے۔ ان کی دو مثنویاں گلدستہ حسن و شہر آشوب ہیں۔

مرزا معز الدین محمد فطرت موسوی خان سنہ ۱۰۸۲ھ میں ایران سے ہند پاکستان آیا، عالمگیر نے سرپرستی فرمائی، شاہ نواز خان کی لڑکی یعنی شہزادہ اعظم کی خالہ سے شادی ہوئی سنہ ۱۰۹۹ھ میں دیوان تن مقرر ہوا اور موسوی خان کا خطاب عطا ہوا سنہ ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ موسوی خان کے شاگرد سرخوش نے اپنے استاد کی بے حد مدح کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ موسوی خان کا شمار اعلیٰ ترین شعرا میں کیا جانا چاہیئے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں سے

شدم خاک و ہنوز از عشق آتش بجان دارم ؛ در آغوش کفن جسمے چو تب در استخوان دارم

چو سوز عشق را کامل کنی عیبت ہنر گردد ؛ شود یاقوت ہر سنگے کہ لبریز شرر گردد

Marfat.com

مرد حق در عین دنیاداری از دنیا بری ست ؛ ملک در دست سلیمان نیست در انگشتری ست

این سیہ مستی مرا از بادۂ خود پرور لیست ؛ شیشہ تا موج شکستن می زند بال پر لیست

عشق در مصر جنون لاف ضرائی می زند ؛ حسن گر یوسف شود در کسوت پیغمبر لیست

دربار عالمگیری سے کئی ہندو شعراء و فضلاء بھی متعلق تھے، وامق کھتری، رائے بندرابن، ایسر داس، بھیم سین اور سوجان رائے کھتری قابل ذکر ہیں، اس عہد میں ہندوؤں کے علوم و فنون پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً تحفۃ الہند جس کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت ہے اور کتابیں بھی تیار ہوئیں جن سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ عالمگیر ہندوؤں کے علوم و فنون کی سرپرستی بھی کیا کرتا تھا[1]

عہد عالمگیری میں فن تاریخ نویسی

دوسرے مغل بادشاہوں کی طرح عالمگیر نے بھی سرکاری طور پر اپنے عہد کی تاریخ تیار کرنے کے لئے ایک کہنہ مشق منشی کو مقرر کیا لیکن محمد کاظم نے جو اس خدمت پر مامور کیا گیا تھا اور جس کے طرز نگارش کو بادشاہ نے پسند کیا دس سال کے واقعات مرتب کر کے کتابی شکل میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے تو عالمگیر نے بجائے انعام و اکرام کے اس کو حکم دیا کہ یہ سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ مرزا محمد کاظم کو نا اہل قرار دیا گیا تھا بلکہ جیسا کہ مستعد خان ساقی، مؤلف مآثر عالمگیری لکھتا ہے:-

> "محمد کاظم عہد سلطانی کے بیشتر واقعات اس وجہ سے قلمبند کر سکے کہ بادشاہ دین پناہ باطنی آرائش کے مقابلہ میں ظاہری نام و نمود کو قطعاً ہیچ تصور فرماتے تھے اس لئے راقم مرحوم کو عہد عدالت کے حالات لکھنے سے ممانعت فرمادی گئی۔"

عالمگیر کا یہ اقدام ایک لحاظ سے انقلابی حیثیت رکھتا ہے سرکاری تاریخ نگاری کی بنیاد اکبر کے زمانہ میں ابوالفضل سے ہوئی، لیکن افسوس ہے کہ اس نے اس سلسلہ میں جو روایات قائم کیں وہ نہیں

---

[1] دیکھو مضمون مولانا شبلی۔ مقالات ادبی جلد دوم ۲۳-۹ مطبع معارف ۱۹۵۵ء نیز بزم تیموریہ ۲۷۳-۲۷۴

آفرین نہیں سمجھی جا سکتیں۔ اس میں شک نہیں کہ زبان کے لحاظ سے اکبرنامہ فارسی تاریخی لٹریچر کی صف اول میں بھی امتیازی مقام رکھتا ہے اور مواد و معلومات کے لحاظ سے ہندو پاکستان کی تاریخ کے لئے ایک گنج گراں مایہ ہے لیکن بادشاہ کو ممدوح بنا لینا شاعر کے لئے مناسب سمجھا جا سکتا ہے مگر مورخ کے لئے کسی صورت میں اس کا جواز پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ ابوالفضل کی بلند پایہ نثر نگاری سے لوگ اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ اسی کے طرز کی اتباع کرنا چاہتے تھے اور اسی کو انتہائے کمال سمجھتے تھے، شاید تخت نشینی کے پہلے سال میں مرزا کاظم کو سرکاری تاریخ مرتب کرنے کا حکم دیتے وقت عالمگیر کے ذہن میں یہ نہ ہو گا کہ اس کا سرکاری مورخ بھی بادشاہ کو ممدوح بنا کر اس کی تعریف میں قلم توڑ دے گا۔ یہ صحیح ہے کہ عالمگیر نامہ میں اکبرنامہ کی طرح ہم کو واقعات کی جس قدر تفصیل ملتی ہے نہ وہ دوسری کتابوں میں موجود نہیں، لیکن اس میں کبھی شک نہیں کہ واقعات بیان کرنے کے سلسلہ میں عالمگیر کی تعریف جن مبالغہ آمیز الفاظ میں کی گئی ہے وہ ایک درویش صفت بادشاہ کو ہرگز پسند نہیں آ سکتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مطلق العنان بادشاہوں میں اکثر و بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تعریف کے کلمات سنکر خوش ہوتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے کمالات اور صلاحیتوں کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے، لیکن بعض حکمرانوں کی غیور طبیعت اس بناوٹی تعریف اور بے جا خوشامد کو پسند نہیں کرتی تھی[1] عالمگیر

---

[1] یہاں بے محل نہ ہو گا اگر سکندر کے واقعہ کا ذکر کیا جائے، اس کے ایک درباری مورخ نے سکندر اور پورس کی جنگ کی کیفیت لکھ کر اس وقت اس کے سامنے پیش کی جبکہ وہ کشتی میں دریائے جہلم میں سفر کر رہا تھا۔ یہ کیفیت غلط بیانیوں سے اس قدر پُر تھی کہ سکندر نے اس کو فوراً دریا میں پھینک دیا، مثال کے طور پر ایک غلط بیانی یہ تھی کہ سکندر نے چند ہاتھیوں کو بھالے سے مار ڈالا تھا۔ مورخ کی نادانی حیرت انگیز ہے وہ بھول گیا کہ اگر پورس کے ہاتھی کسی کے ہاتھ سے مارے جانے کے لئے میدان جنگ میں موجود رہنے کی ہمت رکھتے ہوتے تو پھر پورس کو شکست ہی کیوں ہوتی، اس کے ہاتھیوں ہی نے تو بھاگ کر اپنی ساری فوج کو منتشر کر دیا تھا۔

Marfat.com

کا شمار ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے، مرزا کاظم نے واقعات بیان کرنے میں تو غلطی نہیں کی لیکن الفاظ مدحیہ ضرور ہیں اور کہیں کہیں بادشاہ کی تعریف میں مبالغہ بھی ہے، عالمگیر کو یہ پسند نہ تھا؛ افسوس ہے کہ مغربی مورخین نے بالعموم اور بعض برصغیر کے مصنفوں نے بھی اس واقعہ کو جو عالمگیر کے بلند کردار ہونے کی بہترین اور مثبت دلیل ہے، ایسے رنگ میں پیش کیا ہے جس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ان لوگوں نے عالمگیر کے حالات پڑھتے وقت تعصب اور تنگ نظری کے پردے اپنی آنکھوں پر اس طرح ڈال لیے تھے کہ وہ حقیقت کو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ عالمگیر کے کارنامے اس قدر سیاہ تھے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کا تذکرہ کتابوں میں باقی رہے ان میں سے بعض اپنے جوش میں یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ عالمگیر کے عہد میں کوئی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ ایسی کھلی موٹی غلطی ہے کہ اس پر تفصیلی تنقید کی کوئی ضرورت نہیں۔

بختاور خان، مصنف مراۃ العالم اس عہد کا بہت ذی علم اور باوقار امیر تھا۔ عالمگیر اس سے بہت خوش تھا اور اس کے خلوص و کارگزاری کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۰۹۵ھ میں جب بختاور خان کا انتقال ہوا تو بادشاہ خادم نواز نے حکم دیا کہ اس کا جنازہ عدالت گاہ کی طرف لایا جائے، اس نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور چند قدم جنازہ کے ساتھ بھی گیا۔ بختاور خان کے علم و فضل اور علم پروری کا ذکر مستعد خان نے جو اس کا دیوان اور منیم تھا ان الفاظ میں کیا ہے:

> "بختاور خان مرحوم۔ علماء، فقراء و شعراء کو بے حد عزیز رکھتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اہل ہنر و باکمال حضرات کا ہمیشہ معاون و مددگار رہا کرتا تھا۔ فن انشاء و تاریخ دانی میں اچھی مہارت رکھتا تھا، مرحوم کی تصنیف و تالیف میں نسخہ مراۃ العالم پر دیگر منظور و مقبول خاص و عام ہے۔ یہ امیر تہذیب و اخلاق و خیر خواہی خلق میں عدیم المثال تھا۔[۱]

لہ ترجمہ مآثر عالمگیری (حیدرآباد ایڈیشن) ص ۲۷۱

Marfat.com

مراۃ العالم ایک مستند کتاب ہے جس میں آنحضرتؐ کے بعد سے اسلام کی تاریخ شامل کی گئی ہے لیکن زیادہ توجہ مشائخ، علماء، شعراء، فضلا، خوشنویس اور دوسرے اصحاب فنون کے حالات پر دی گئی ہے، دس سال کی عہد عالمگیری کی تاریخ کے علاوہ مغلیہ دور کے مشائخ و علماء کے حالات اس میں موجود ہیں۔

بعض مورخوں نے جن میں مسٹر ہنری ایلیٹ بہت نمایاں ہیں، یہ بحث کی ہے کہ مراۃ العالم کا اصلی مصنف بختاور خاں نہیں بلکہ اس کا دوست محمد بقا سہارنپوری ہے، الیٹ کا یہ خیال محمد بقا کے بھانجے محمد شفیع کے بیان پر مبنی ہے، لیکن مستعد خاں کے بیان پر اس کو ترجیح نہیں دی جا سکتی[1]

مراۃ العالم کے علاوہ بختاور خاں کی اور تصانیف بھی ہیں، جیسا آئینہ جس میں جنگ تخت نشینی کی چار لڑائیوں کا حال ہے، ریاض الاولیاء (مشائخ کے حالات) سوانح اعظم (مجموعہ اشعار) حدیقہ سنائی منطق الطیر، مثنوی مولانا رومؒ اور روضۃ الاحباب کے ملخص۔

بختاور خاں کے متوسلین میں شیخ محمد بقاء کا نام قابل ذکر ہے وہ ۱۰۳۷ھ میں پیدا ہوئے شیخ نور الحق ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے شاگرد تھے، ان کی مشہور تصنیف مراۃ جہاں نما ہے جو مراۃ العالم کے طرز پر ہی لکھی گئی ہے ایک عرصہ تک شیخ محمد بقاء اپنے وطن میں درس و تدریس میں مصروف رہے، بعدہٗ درویشانہ گوشہ گیری کی زندگی اختیار کی، کچھ مدت کے لئے وہ شاہی ملازمت میں بھی رہے لیکن اس زمانہ میں بھی وہ دنیوی امور میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے، غالباً یہی سبب تھا کہ عالمگیر ان سے بہت خوش تھا۔

محمد مستعد خاں ساقی مصنف مآثر عالمگیری، بہادر شاہ کے وزیر عنایت اللہ خاں کا منشی تھا۔ اس نے وزیر مذکور کی خواہش پر عالمگیر کے پورے دور حکومت کی تاریخ تیار کی، وہ مختصر ہے لیکن نہایت معتبر ہے، یہ کتاب ۱۷۱۰ء میں مکمل ہوئی تقریباً چالیس سال تک مصنف دربار عالمگیری سے متعلق رہنے

---

[1] مفصل بحث کے لئے دیکھو الیٹ کی تاریخ ہند جلد ہفتم ۱۴۵۲

Marfat.com

کی بدولت چشم دید شاہد کی حیثیت رکھتا ہے، عالمگیر کے عہد کی سب سے مفصل تاریخ خافی خاں کی منتخب اللباب ہے، لیکن چونکہ اس کی تکمیل عالمگیر کی وفات سے تقریباً چالیس سال بعد ہوئی اس لئے اس کا ذکر یہاں تفصیل سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور کی جن اور کتابوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

زینۃ التواریخ مولفہ عزیز اللہ، وقایع نعمت خان عالی، جواہر التواریخ مولفہ سلیمان قزوینی، منتخب التواریخ مولفہ جگ جیون داس، فتوحات عالمگیری مولفہ ایسر داس، نسخہ دلکشا مولفہ بھیم سین، خلاصۃ التواریخ مولفہ سجان رائے، لب التواریخ مولفہ بندرابن[1]

تاریخ کے طلباء کے لئے اس کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ اگرچہ کتب ہائے مذکورہ بالا میں بہت کچھ مواد عالمگیر کے کارناموں کا ملتا ہے لیکن اس کی تاریخ کی صحیح تصویر خود اس کے خطوط ہی سے فراہم کئے ہوئے معلومات کی بنیاد پر تیار کی جا سکتی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری

سیاسی فتوحات اور معاشرتی و دینی اصلاحات کے علاوہ عالمگیر کا ایک عظیم الشان کارنامہ فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی حکومت قایم ہونے کے بعد یہاں شریعت کے قانون کا نفاذ شروع ہو گیا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شریعت کے قوانین نافذ کرنے والوں کو اس خطہ ارض میں نئی نئی مشکلات پیش آتی ہوں گی، اس لئے کہ ہندوستان کے اور بعض رسمی قوانین جو یہاں اسلامی حکومت سے پہلے رائج تھے بنیادی طور پر اسلامی قوانین سے مختلف تھے۔ اسلام نے معاشرہ کا جو تصور پیش کیا تھا اس کی بنیاد "انما المومنون اخوۃ" پر تھی۔ برخلاف اس کے ہندو معاشرہ کی تنظیم ذات کی تفریق پر قایم تھا۔ یہی نہیں، اسلام نے مسلم اور غیر مسلم کو قانون کی نظر میں ایک حیثیت [illegible]

---

[1] ان مورخوں کے حالات ایلیٹ کی تاریخ اور برٹش میوزیم کے فہرست مخطوطات فارسی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

Marfat.com

مصلحت کے پیش نظر بعض معاملات میں کسی وقت غیر مسلموں پر کوئی پابندی لگانا ضروری ہو جاتا تھا لیکن بنیادی طور پہ انسانی مساوات کا اصول کارفرما تھا، ان حالات میں حکمرانوں کو مجتہدین اسلام کی مدد لینی پڑتی تھی تاکہ وہ شریعت کی رو سے فتوے دے سکیں تاریخ کے طلباء جانتے ہیں کہ محمد بن قاسم کو شروع ہی میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ برصغیر کے غیر مسلموں کی اسلامی معاشرہ میں کیا حیثیت ہوگی، چنانچہ مجتہدوں نے فتویٰ دیا کہ ان کی وہی حیثیت ہونا چاہئے جو دوسرے اسلامی ممالک میں اہل کتاب کی تھی، یہ نہایت اہم اور بنیادی فیصلہ تھا اور اس سے ایک طرف تو اسلامی رواداری اور دوسری طرف مجتہدین عہد کی وسیع النظری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس کے بعد بھی مفتیان عہد اور مجتہدان عصر مختلف مسائل پر فتویٰ دیتے رہے، بعض جزئیات میں کبھی کبھی بادشاہوں نے اپنی مرضی سے بھی فیصلے کئے، مثلاً علاء الدین خلجی اور سلطان محمد بن تغلق نے سزائیں دینے وقت شرعی حدود سے تجاوز کیا لیکن جیسا کہ علاء الدین خلجی نے قاضی مغیث سے گفتگو کرتے وقت اعتراف کیا ہے، یہ اقدامات اشد سیاسی ضرورت کے وقت کئے گئے ورنہ بالعموم شرعی قوانین ہی نافذ رہے۔

سب سے پہلے شرعی قوانین کی باقاعدہ تدوین سلطان فیروز شاہ کے عہد میں محسوس کی گئی، اس سلسلہ میں فقہ فیروز شاہی قابل ذکر ہے، یہ مولانا امام ہمام صدر الملة والدین یعقوب مظفر کرمانی کی تصنیف ہے اور انھوں نے یہ کتاب عربی میں لکھی تھی اور ساتھ ہی اس کا فارسی ترجمہ تھا، لیکن ان کا جلد ہی انتقال ہوگیا، بعد میں سلطان فیروز شاہ نے اس کو مع اضافہ کے تیار کرایا، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے، یہ کتاب اس وجہ سے اہم ہے کہ اس کو فیروز شاہ نے مکمل کرایا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اس عہد میں ان ہی فتاویٰ پر عمل ہوتا تھا، بہرحال بعد کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ دوسری کتابوں سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا تھا

عالمگیر کی خواہش تھی کہ حکومت کا نظم مکمل طریقے سے شریعت کی بنیادوں پر قائم ہو اور اس لئے اس نے ضروری سمجھا کہ ایک مجموعہ فتاویٰ کا تیار کرایا جائے تاکہ قضاۃ وغیرہ کے علاوہ

Marfat.com

عام مسلمان بھی اپنی زندگی کے لئے اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں، عالمگیر نامہ میں اس کی تالیف کے اسباب و مقاصد بالتفصیل بیان کئے گئے اور ہمارا خیال ہے کہ باوجود طوالت اس کی عبارت کو یہاں نقل کرنا ضروری ہے کیونکہ مختصر اقتباسات سے صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی، محمد کاظم لکھتا ہے:-

"بادشاہ سلامت کو اس کا خاص خیال ہے کہ تمام مسلمان ان دینی مسائل پر عمل کریں جن کو حنفی مذہب کے علماء و اکابر واجب العمل سمجھتے ہیں لیکن یہ مسائل فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں فقہاء و علماء کے اختلاف کی وجہ سے روایات ضعیفہ اور اقوال مختلفہ سے مل جل گئے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ کسی ایک کتاب میں موجود بھی نہیں ہیں اور جب تک مبسوط کتابیں جمع نہ کی جائیں اور ایک شخص کو احکام علم فقہ میں کامل مہارت حاصل نہ ہو وہ مفتی بہ مسئلہ کو ان سے اخذ نہیں کر سکتا اس لئے بادشاہ سلامت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پایہ تخت کے علماء کی ایک جماعت شاہی کتب خانہ کی ان فقہی کتابوں کو جو ایک مدت میں تمام اطراف عالم سے جمع کی گئی ہیں، سامنے رکھ کر نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان مسائل کو ایک کتاب میں جمع کریں تاکہ ہر شخص اس کتاب سے مسئلہ مفتی بہ کو آسانی سے معلوم کر سکے اور اسلام کے قاضی اور مفتی بہت سی کتابوں کے جمع کرنے اور پڑھنے سے بے نیاز ہو جائیں، اس کام کی ذمہ داری اور اس کا اہتمام شیخ نظام کے سپرد کیا گیا کہ تمام علماء کی اتفاق رائے سے ان مسائل کو ایک کتاب میں جمع کریں، علماء و فضلاء کا ایک گروہ جو پایہ تخت میں موجود تھا اس کام میں مشغول ہوا اور ہندوستان کے اطراف میں جو شخص علم فقہ میں شہرت

بیں مال رکھتا تھا، شاہی فرمان کی رو سے طلب کرکے ان کا شریک کار بنایا گیا اور یہ تمام علماء و فضلا معقول وظیفہ کے ساتھ اس کام میں مشغول ہو گئے اور اس کام کے لئے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ شاہی کتب خانہ سے ان لوگوں کے حوالے کی گئیں اور ہر سال اس کام کے اسٹاف کے لئے ایک بہت بڑی رقم خزانۂ شاہی سے صرف کی جاتی تھی کہ جب یہ کتاب مکمل ہو جائیگی تو دنیا تمام فقہی کتابوں سے بے نیاز ہو جائے گی اور اس کا ثواب بادشاہ کے اعمال نامہ میں درج ہو گا۔[1]

فتاوی عالمگیری نہایت اہتمام سے تیار کی گئی تھی، محمد کاظم کے یہ الفاظ تو یقیناً مبالغہ آمیز ہیں کہ اس نے دنیا کے لوگوں کو جملہ کتابوں سے مستغنی کر دیا (جہانیاں را از سائر کتب فقہی مستغنی خواہد نمود[2]) لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ دور جدید کی فقہی تصانیف میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے اسلامی دنیا میں وہ کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مصر میں بھی طبع ہوئی ہے اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ مآثر عالمگیری نے بھی محمد کاظم کا اتباع کرتے ہوئے فتاوی کی تعریف ان ہی الفاظ میں کی ہے کہ "اس کتاب نے علماء و طلباء کو تمام کتب فقہ سے بے نیاز کر دیا" بہر حال اس قدر تو صحیح ہے کہ آج بھی وہ فقہ اسلامی پر مبسوط ترین کتابوں میں ہے، تدوین فتاوی کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ ہر حصہ کے لئے ایک صدر مقرر کیا گیا اور اس کو چند معاونین دے گئے، تمام علماء پر شیخ نظام کو صدر بنایا گیا، بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب کی تالیف اور فتاوی کی تدوین کا کام ایک بورڈ یا کمیشن کو سپرد کیا گیا تھا اور اس کمیشن نے مختلف حصوں کے لئے کمیٹیاں مقرر کر دی تھیں، بختاور خان کے بیان سے معلوم ہوتا

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۶۔ اردو ترجمہ بزم تیموریہ سے لیا گیا ہے۔

[2] عالمگیر نامہ میں مستغنی کی جگہ مغنی چھپ گیا ہے۔

Marfat.com

ہے کہ شیخ نظام ہفتہ میں تین روز تیار شدہ حصہ بادشاہ کو دکھلاتے اور بعض مسائل میں عالمگیر ان سے باقاعدہ بحث کرتا تھا، شیخ نظام عرصہ تک دربار سے منسلک رہے اور اپنی خدمت گذاری کے صلہ میں الطاف شاہانہ سے سرفراز ہوئے، شیخ نظام کے ساتھ جن علماء نے اس سلسلہ میں کام کیا ان کی صحیح تعداد بتلانا مشکل ہے، لیکن بعض شہادتوں کی بناء پر کہا گیا ہے کہ تقریباً پچاس علماء اس میں کام کرتے تھے، انہوں نے آٹھ سال کی مدت میں یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچائی اور اس پر دو لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس زمانہ میں روپیہ کی قیمت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ عالمگیر نے اس کام کے لئے زبردست رقم دی اور اس کو کام کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ تھا، قدرتی طور پر تدوین فتاوی کے کام سے جو لوگ متعلق تھے ان کو حسب قابلیت اور خدمت کی نوعیت کے لحاظ سے مشاہرہ دیا جاتا تھا، مثلاً ماثر عالمگیری میں ہے :-

> شیخ رضی الدین بھاگلپوری بہار کے شرفاء میں تھے، یہ فاضل مولفین فتاوی عالمگیری میں شامل تھے اور تین روپیہ یومیہ ان کی تنخواہ مقرر تھی۔[1]

محمد رفیع بحیثیت معاون کے ملا وجیہہ الدین گوپاموی کے ساتھ تھے۔ ان کو ایک روپیہ یومیہ مع تین پاؤ فیلا ؤ روزانہ ملتا تھا۔[2] تدوین فتاوی کے کام سے دوسرے علماء کے ساتھ کچھ مدت کے لئے شاہ ولی اللہ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم بھی متعلق رہے لیکن آپ کی درویشانہ طبیعت پر یہ ایک بار تھا، چنانچہ آپ نے اس تعلق کو جلد ہی ختم کر دیا اور عزلت نشینی اختیار کر لی۔

عالمگیر کو شاہ عبدالرحیم سے عقیدت تھی، وہ چاہتا تھا کہ کچھ زمین آپ کی نذر کرے اس

۱؎ ماثر عالمگیری ص ۶۲

۲؎ منشور عالمگیر مورخہ یازدہم شہر ذیقعدہ سنہ ۱۱ جلوس۔ یہ منشور مفتی انتظام اللہ شہابی نے اپنی تالیف زیب النساء (مرتضائی پریس آگرہ ۱۳۴۹ھ) میں نقل کر دیا ہے دیکھو ص ۶۳

Marfat.com

کو ملاقات کا بھی شوق تھا چنانچہ اس نے جب پیام بھیجا تو شاہ صاحب نے ایک معمولی کاغذ پر جس میں آپ کا جو تار کھا تھا یہ جواب لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیجا:۔

اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو امیر کے آستانہ پر جائے حق سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے،۔ وما متاع الحیوٰۃ الدنیا الا قلیل یعنی دنیا کی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے، تم کو قلیل ترین جز ملا ہے۔ اگر بالفرض مجھے دو گے تو وہ جزء لا یتجزیٰ ہی ہو گا، اس ٹکڑے کے لئے میں پھر ٹکڑا نہ ہو سکے گا، میں اپنے نام کو خدا تعالیٰ کے دفتر سے کیوں نکلواؤں، چشت کے بعض ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے، حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے![1]

خط کا یہ حصہ نقل کر کے شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ عالمگیر اس خط کو جیب میں رکھتا تھا اور جب کپڑے تبدیل کرتا تھا اس کو نکال کر پھر جیب میں رکھ لیتا، جب وہ اس خط کو دیکھتا تو پڑھ کر رونے لگتا تھا، اس واقعہ سے ہم کو دونوں کے کردار معلوم ہوتے ہیں، ایک صحیح العقیدہ مسلمان بادشاہ، علم اور تقویٰ کی کس حد تک عزت کرتا ہے اور ایک سچا فقیر دنیا کی جاہ و منزلت کی کیا حقیقت سمجھتا ہے۔[2]

شاہ عبدالرحیم کے ہم سبق اور دوست ملا حامد جونپوری بھی تدوین فتاویٰ سے متعلق تھے اور شاہ صاحب انہی کے معاونین میں سے تھے، جن علماء کے متعلق معاصر یا بعد کی تصانیف میں حوالے ملتے ہیں کہ انہوں نے اس عظیم الشان علمی کام میں حصہ لیا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

---

[1] انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ ص ۶۹ [2] عالمگیر کے متعلق یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ مشائخ کا زیادہ احترام نہیں کرتا تھا یہ غلط ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ وہ شریعت کی توہین یا خلاف ورزی کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ ہر راسخ العقیدہ مسلمان کا عقیدہ یہی ہے ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید ؛ کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

Marfat.com

سید علی اکبر سعد اللہ خاں، سید نظام الدین ٹھٹھوی، جلال الدین محمد، مولانا محمد شفیع
ملا وجیہہ الرب، مولانا محمد فایق، ملا محمد اکرم، ملا محمد غوث، امیر میراں، سید معدن، ملا غلام محمد
قاضی سید عنایت اللہ۔

مدوین فتاویٰ کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ عامۃ المسلمین اس سے فائدہ اٹھا سکیں، چنانچہ عالمگیر نے اس کو فارسی لباس پہنانے کی خدمت مولانا چلپی عبداللہ رومی کے سپرد کی مراۃ العالم میں ان کے اوصاف کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

> چلپی عبداللہ رومی علوم ظاہری اور معارف باطنی سے بہرہ ور ہیں، صوفیہ کی مصطلحات سے پوری واقفیت رکھتے ہیں، عربی فارسی اور ترکی عبارت خوب لکھتے ہیں اور اکثر فنون میں یگانہ اور بے مثل ہیں، تصوف اور حکمت میں ان کی اچھی تصانیف ہیں۔ فردوس آشیانی کے عہد میں روم سے ہندوستان آئے۔ فقیرانہ زندگی کے عادی تھے۔ علامہ سعد اللہ خاں ان کی ضروریات پوری کرتے تھے، اس عہد (یعنی عہد عالمگیری) میں ان کو مناسب وظیفہ ملتا ہے ان کے لئے نوکری معاف کر دی گئی ہے۔ فتاویٰ عالمگیر شاہی کے ترجمہ پر مامور ہیں۔[1]

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ فتاویٰ کا فارسی ترجمہ مقبول نہیں ہوا اور آج اس کے مخطوطے نہیں ملتے۔ اسلامی حکومت کے دور میں تو لوگ اس کے احکام پر عمل کرتے تھے لیکن آج بھی اس کی اہمیت کم نہیں کیونکہ ایک طرف تو ہمارے لئے وہ اس عہد کے معاشرہ کی آئینہ دار ہے اور دوسرے یہ کہ ہم خود اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، اس لئے اس سے فائدہ

---

[1] اردو ترجمہ بزم تیموریہ سے لیا گیا ہے۔

Marfat.com

اٹھا سکتے ہیں بہر حال یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ فتاویٰ عالمگیری کی تیاری ایک عظیم الشان علمی کارنامہ تھا، اگر تاج محل اور دوسری شاندار عمارتیں شاہجہاں کی دائمی شہرت کی ضامن ہیں تو عالمگیر کی یاد فتاویٰ سے قائم رہے گی، تاریخ شاہد ہے اور ہمارے علم میں متعدد مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پتھر کی یادگاریں، کاغذ کی یادگاروں سے عمر میں کم ہوتی ہیں۔

شریعت کا اقتدار

عالمگیر کی تعلیم کے متعلق صاحب مآثر عالمگیری[۱] کے یہ لفظ ہیں:۔

"قبلۂ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ و تفسیر و حدیث کی تحصیل ہے۔"

ان کو امام غزالی کی تصانیف سے بے حد دلچسپی تھی، چالیس سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا۔ شہزادگی کے زمانہ ہی سے اورنگ زیب نے اپنے اخلاق کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی رقص و سرود سے اس قدر نفرت تھی کہ سوائے ان مجالس کے جن میں "با قتضائے آئین شہنشاہی و رعایت آداب جہانبانی از نکاب سازو نوا ضرور است"، اس کی موجودگی ضروری تھی وہ کبھی ایسے جلسوں میں شریک نہ ہوتا، درباری مورخ محمد کاظم نے اسی کی طرف ایک شعر میں اشارہ کیا ہے

نکرده بہر رضائے خدائے عز و جل ؛ نہ چشم سوئے غزال و نہ گوش سوئے غزل

وہ ہر وقت با وضو رہتا، نماز بر وقت ادا کرتا، رمضان میں روزے رکھتا، تراویح میں شرکت کرتا اور آخری عشرہ میں اعتکاف میں بیٹھتا جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا اور یہ کوشش کرتا کہ جمعہ کا دن شہر ہی میں گذارے تزکیہ نفس کے لئے عبادات بدنی کے علاوہ تقلیل غذا کو بھی ضروری سمجھتا اور وہ جزیات صحبت فقراء و عرفاء و صاحبدلان" رہتا، کثرت عبادات اور لذائذ جسمانی سے اس قدر سختی کے ساتھ پرہیز کا صرف ایک ہی سبب تھا اور وہ اسلام کی تعلیمات اس

---

[۱] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ حیدر آباد دکن) ص ۳۸۸

Marfat.com

سلسلہ میں اگر ہم محمد کاظم کے ان الفاظ پر غور کریں جو اس نے عالمگیر کے تصور حکومت اور مقصد حیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھے ہیں تو شاید صحیح اندازہ لگا سکیں گے کہ اس کی جاری کردہ معاشرتی اور دینی اصلاحات کا کیا مقصد تھا اور ان کے نفاذ کے لئے وہ کس قدر بے چین تھا۔ محمد کاظم کے الفاظ یہ ہیں :-

"غرض از سلطنت و سروری اعلائے اعلام دین پروری و مقصود از خلافت و برتری تشئید ارکان شریعت گستری دانستہ در ترویج قوانین دین مبین و تنفیذ احکام ملت متین و محو رسوم ضلالت و جہالت و دفع آثار بدع و اہوا و منع ظہور مناہی و ملاہی منہج مقدس حضرت رسالت پناہی را صلوات اللہ و سلامہ علیہ و آلہ و اصحابہ از خود خشنود می سازند"[1]

عالمگیر کے عہد کو ہم اقتدار شریعت کی انتہائی منزل کہہ سکتے ہیں۔ پچاس سال سے اکابر مشائخ و علماء اور مسلمانوں کے دوسرے رہنما معاشرہ و سلطنت اسلامی کو جس مقام پر پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے وہ مقصد اس دور میں حاصل ہوا۔ یہ خیال کہ عالمگیر کے عہد میں سلطنت اور معاشرہ کا شرعی بنیاد پر قائم ہونا صرف عالمگیر کے ذاتی عقائد اور کردار کی وجہ سے تھا صحیح نہیں۔ دور جدید کے بعض مورخوں نے اس پر بہت زور دیا ہے اور اس سلسلہ میں اس پر اعتراضات بھی کئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر قوم کے دوسرے رہنما اس کام میں اس کے شریک کار نہ ہوتے تو اس کی کامیابی مشکل تھی۔ رہنمایان ملت لوگوں کو عرصے سے اس کے لئے تیار کر رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ دارا کی افواج، عالمگیر پر فتوحات حاصل نہ کر سکیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ عالمگیر کے قواعد و ضوابط کی کسی گوشہ سے مخالفت نہ ہوئی۔ ان اصلاحات کا یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۷۴، کلکتہ ۱۸۶۸ء

Marfat.com

جس قدر رسوم اسلام کی روح اور احکامات کے خلاف باقی تھیں وہ عالمگیر کے عہد میں قائم نہ رہ سکتی تھیں، جشن نوروز بڑے دھوم سے منایا جاتا تھا، یہ ایرانی رسم تھی، چنانچہ اس کو بند کر دیا گیا[1] کچھ دنوں تک موسیقی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن بعد میں یہ بھی بند کر دیا گیا، جھروکا درشن کی رسم اکبر نے جاری کی تھی۔ جہانگیر و شاہجہاں کے عہد میں وہ برابر قائم رہی۔ عالمگیر نے یہ کہہ کر کہ درشن میں عبودیت کے شائبہ کا امکان ہے، اس کو بند کر دیا[2]۔ یوم ولادت کے جشن کے سلسلہ میں مغل شہنشاہ کو سونے، چاندی اور دوسری قیمتی اشیاء میں تولا جاتا تھا اور یہ اشیاء غرباء میں تقسیم کر دی جاتی تھیں، یہ رسم تولا دان کہلاتی تھی، اس کو بھی بند کر دیا گیا۔ لیکن صدقہ دینے کا سلسلہ جاری رہا، سکوں پر کلمہ طیبہ درج ہوتا تھا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس سے کلمہ کی توہین ہوتی ہے، اس نے حکم جاری کر دیا کہ سکوں پر کلمہ کندہ نہ کیا جائے سونے کے سکہ پر یہ عبارت ہوتی تھی:۔

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر ٭ شاہ اورنگ زیب عالمگیر

دربار میں جوتشی بھی موجود رہتے تھے تاکہ وہ ہر کام کے لئے مبارک وقت اور دن بتلائیں۔ عالمگیر نے ان کو غیر ضروری سمجھ کر علیحدہ کر دیا[3]۔ سونے اور چاندی کے برتن اور دوسری چیزوں کی بھی ممانعت کر دی گئی، بعد میں ان کپڑوں کے تیار کرنے کی بھی ممانعت کر دی جن میں سونا استعمال ہوتا تھا[4]۔ ان اصلاحات سے کہیں زیادہ اہم اور دور رس وہ اصلاحات تھیں جو معاشرہ کے کردار پر اثر انداز ہوئیں اور جن کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں زبردست انقلاب رونما ہوا

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۳۹۰

[2] پروفیسر سری رام شرما کو افسوس ہے کہ یہ اصلاح کیوں کی گئی، دیکھو ریلیجس پالیسی آف دی مغل ایمپررز ص ۱۱۹ [3] خافی خان، منتخب اللباب۔ جلد دوم ص ۲۱۴

[4] مآثر عالمگیری ص ۱۶۲

Marfat.com

سب سے پہلے اس نے شراب اور دوسری نشہ آور اشیاء کی ممانعت کی، شراب فروش کے پہلے تو کوڑے مارے جاتے تھے، لیکن اگر اس پر بھی وہ باز نہ آتا، تو پھر اس کو طویل مدت کے لئے قید کر دیا جاتا، عالمگیر کی خواہش تھی کہ اس برائی کو سختی سے روکا جائے لیکن پھر بھی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے شراب نوشی بند کرنے میں اس کو مکمل کامیابی نہیں ہوئی۔[1] اور تاریخوں میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں شراب نوشی پر سزا دئے جانے کا حکم ہوا۔

منوچی سیاح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپین ملازمین سلطنت کو شراب نوشی کی اجازت تھی، لیکن یہ انتظام کیا گیا تھا کہ وہ لشکر سے علیحدہ رکھے جائیں تاکہ سپاہیوں کے اخلاق پر ان کی عادات کا اثر نہ پڑے، عصمت فروشی بند کرنے کی بھی عالمگیر نے بہت کوشش کی، اس زمانہ میں یہ اصلاح آج کل کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشکل تھی، کیونکہ بہت سے با اثر امراء کے پاس عصمت فروش عورتیں بکثرت ہوتی تھیں، بہر حال تاریخ کے صفحات میں اس کی شہادت ضرور ملتی ہے کہ عصمت فروشی بہت کم ہو گئی تھی اور علانیہ اس کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔
مغل بادشاہوں کی یہ خواہش ہمیشہ رہی کہ غیر مسلم قومیں بھی ایسے افعال سے پرہیز کریں جو انسانیت کے لئے مضر ہیں مثال کے طور پر ہندوؤں کی رسم ستی کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن ہندوؤں نے بدقسمتی سے اس کو مذہبی تقدس کی حیثیت دیدی تھی اور اس کے انسداد کو مذہب میں مداخلت سمجھتے تھے۔ مغلوں کی رواداری کی پالیسی یہ اجازت نہ دیتی تھی کہ اس کو جبریہ

---

[1] مشہور مغربی سیاح منوچی نے تحریر کیا ہے کہ عالمگیر کا خیال تھا کہ ساری سلطنت میں دو شخص ایسے ہیں جو شراب نہیں پیتے، ایک تو خود بادشاہ اور دوسرا قاضی عبدالوہاب، اس کے بعد منوچی کہتا ہے کہ عبدالوہاب کے متعلق بادشاہ کو غلط فہمی تھی، کیونکہ میں خود اس کو شراب بھیجا کرتا تھا۔
سر جادو ناتھ سرکار عالمگیر کی ان اصلاحات سے بھی ناراض ہیں، اس عنوان کے تحت ان کا پہلا جملہ یہ ہے:
اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد کچھ عرصے کے لئے دارالحکومت میں زندگی ناقابل برداشت ہو گئی [illegible]
ہسٹری آف اورنگ زیب جلد سوم ص ۸۹

روک دیں، بہر حال پھر بھی وہ اس حد تک گئے کہ بیوہ کو جلنے سے پہلے یہ اختیار دیا جانے لگا کہ وہ اپنی جان ہلاک کرنے پر راضی نہ ہو تو مجبوراً لوگ اس کو نہیں جلا سکتے تھے۔ ستی کے وحشتناک منظر اور اس رسم کی بربریت کا آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اصول تو یہ بتلایا جاتا تھا کہ عورت کو اپنے شوہر سے اس قدر محبت ہوتی تھی کہ وہ اس کے مرنے کے بعد زندگی کو موت سے بدتر جانتی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اکثر عورت کو مار مار کر مجبور کیا جاتا تھا اور زبردستی آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ حیرت یہ تھی کہ راجاؤں اور امراء کی چتا پر بڑی تعداد میں عورتیں جلا دی جاتی تھیں جو ان کی حرم میں ہوتی تھیں، ایک اطالوی سیاح نکولو کانٹی نے دجے نگر کے راجاؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ راجہ کی بارہ ہزار بیویاں تھیں جن میں سے کم از کم دو یا تین ہزار کو جلانا ضروری تھا۔[1]

عالمگیر نے اپنے پیشروؤں کے احکامات پر ہی عمل نہیں کیا بلکہ ایک مزید پابندی یہ لگا دی کہ جن بیواؤں کے بچے ہوتے تھے ان کو نہیں جلنے دیا جاتا تھا، اس کا یہ سبب بتلایا گیا کہ بچوں کی پرورش ضروری ہے اور وہ ماں ہی کر سکتی ہے۔ بھنگ کا استعمال اور جوئے کو بھی بہت سختی سے بند کیا گیا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا تو ان قوانین کے علاوہ بھی شرعی احکامات جاری کئے گئے۔ چنانچہ احتساب کا محکمہ بہت مضبوط کر دیا گیا محتسبوں نے سختیاں بھی شروع کر دیں، چند دلچسپ واقعات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ رقص و سرود کی محفلیں بند کرنے کے سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں، علماء کا ایک مخصوص طبقہ سماع یعنی صوفیہ کا گانا سننے کی مخالفت کرتا رہا ہے اس عہد میں ایک بزرگ سید مرتضیٰ شرعی احکام کے سلسلہ میں سخت گیر تھے منجملہ اور چیزوں

---

[1] دیکھو وی۔ اے۔ اسمتھ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا (تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۸) ۳۱۰۴

Marfat.com

کہ وہ سماع کو بھی ناجائز تصور کرتے تھے اور ان صوفیہ کی شان میں جو سماع سنتے تھے نامروا الفاظ کہنے کے عادی تھے۔ سید مرتضیٰ پاکباز اور زاہد منش تھے وہ ان بزرگوں میں تھے جن کا عالمگیر کا بہت احترام کرتا تھا اور بقول خافی خان ان کے ایک رسالہ حق گو کو پڑھ کر اس نے کہا تھا:

"الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ در عہد چنان مردم حق گو ہستند"

لیکن جب اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے وعظوں میں کہا کرتے ہیں کہ جن بزرگوں کے مزاروں پر سماع بالمزامیر ہوتا ہے "استخوان آن بزرگ را برآوردہ باید سوخت" تو بادشاہ نے کہا "ما نا این جا بمراد نیستیم" اس پر سید صاحب نے کہا تھی کہ یہ غلط ہے لیکن ان کی یہ کوشش بے نتیجہ رہی اور "آبادئے کہ بسبب بخدمت پادشاہ بہم رسانیدہ بودند بحال نہ ماند"[1]

مراۃ احمدی میں شیخ یحییٰ چشتی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ سماع سنتے تھے، وہاں کے محتسب مرزا باقر نے روکنا چاہا اور کچھ سختی کی۔ لیکن جب عالمگیر کو معلوم ہوا تو اس نے محتسب کو ڈانٹا اور حکم دیا کہ شیخ سے کسی قسم کا تعارض نہ کیا جائے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عالمگیر خود شیخ کے عقیدت مندوں میں تھا۔ شرعی احکامات جاری کرنے کے سلسلے میں جو اقدامات اس عہد میں کئے گئے ان میں دارا شکوہ کے قتل کا واقعہ بہت اہم ہے۔ اس کا قدرے تفصیلی ذکر بے محل نہ ہوگا۔

دارا کا قتل

عالمگیر پر جو الزامات عاید کئے گئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اس کی پالیسی اور احکامات میں رواداری کا عنصر مفقود تھا لیکن یہ دوسرے اعتراضات کی طرح یہ بھی بے بنیاد ہے۔ شرعی احکامات کے اجراء میں جو زیادتیاں ہوئیں ان میں مخصوص حالات، حکام کے خیالات اور طریقہ کار کو بھی دخل ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات وہ فقہاء کے ایسے فیصلوں پر حکم جاری کر دیتا تھا جن پر زیادہ تحقیق اور تجزیہ

---

۱ منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۶۱۔۵۶۳

Marfat.com

کی گنجائش نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں اگر ہم اس کے کسی حکم سے اتفاق نہ بھی کریں تب بھی اس کی نیت یا پالیسی پر حملہ کرنا بیجا ہوگا، اس کے ان احکامات کو اجتہادی غلطیاں کہا جا سکتا ہے جن کا مرتکب ہر انسان ہو سکتا ہے، دارا کے قتل پر مورخوں نے بہت کچھ اعتراضات کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں برنیر اور منوچی وغیرہ نے جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بڑی حد تک ناقابل تسلیم ہیں اور انہوں نے مورخ کے لئے کچھ مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ تفصیلات سے قطع نظر ہم کو دارا کے قتل کے سلسلہ میں سلطنت کے مفاد پر بھی غور کرنا چاہیئے، ایک مدت تک دارا نے اورنگ زیب کی ہر نہج اور ہر گوشہ سے مخالفت کی، تخت حاصل کرنے کے لئے اس نے ہر ممکن کوشش کی، جنگ تخت نشینی میں اس کی شکست سے پہلے شاہجہاں ہی نہیں بلکہ امراء اور شاہی خاندان کے با اثر افراد کی بڑی تعداد اس کے ساتھ تھی، بادشاہ نے اورنگ زیب کے ساتھ سخت ناانصافی کا برتاؤ کیا، یہ اورنگ زیب کے کردار کی خوبی تھی کہ وہ شاہجہاں کی ہمیشہ عزت کرتا رہا اور نہ کبھی اس کے احکامات کی خلاف ورزی کی اور نہ علم بغاوت بلند کیا، شاہجہاں نے جو برتاؤ اورنگ زیب کے ساتھ کیا اس سے کہیں زیادہ بہتر جہانگیر کا خود اس کے ساتھ تھا، لیکن پھر بھی شاہجہاں نے علم بغاوت بلند کیا، خود جہانگیر کو بھی اپنے باپ سے شکایت تھی، اور اس نے بھی بغاوت کی تھی، بیٹوں کا باپ کے خلاف اور بھائیوں کا بھائیوں کے خلاف جنگ کرنا اور شکست خوردہ فریق کا قتل کیا جانا، خاندانی اور موروثی حکومتوں کی تاریخ میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، مغلیہ سلطنت ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کی تاریخ میں بھی ہم کو ایسے واقعات ملتے ہیں، دارا کے معاملہ میں اورنگ زیب کو یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ ایک طبقہ اس کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے، خود شاہجہاں اور اس کی بڑی لڑکی جہاں آرا بھی دارا سے ہمدردی رکھتی تھی، یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر تھا اور کسی کو اس میں شک نہ تھا کہ اگر کسی وقت بھی دارا سے ہمدردی رکھنے والے طبقہ کی طرف سے کسی تحریک کا آغاز ہوا تو شاہجہاں کے تمام عقیدت مند دارا ہی کا ساتھ دینے لگے، ان حالات میں عالمگیر کا اس مسئلہ پر غور کرنا در

اپنے صلاح کاروں سے مشورہ کرنا کہ دارا کو قید کیا جائے یا اس کو ختم کر دیا جائے، ایک فطرتی بلکہ ضروری امر تھا، اس کو یہی مشورہ دیا گیا کہ دارا کا زندہ رہنا خطرہ سے خالی نہیں، عالمگیر نے یہی فیصلہ دیا، اور ہر حکمراں جس کو ان حالات کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ہوتا یہی فیصلہ کرتا حقیقت یہ ہے کہ ایک روایت کے مطابق عالمگیر نے دارا سے دریافت کرایا کہ اگر قسمت اس کا ساتھ دیتی اور خود وہ (اورنگ زیب) اس کے پاس گرفتار ہو کر آتا تو وہ کیا برتاؤ کرتا، دارا کا جواب نہایت دلچسپ ہے، اس نے کہا کہ اس سوال کا جواب شہر کے چار بڑے دروازے دیتے جن پر اس کے (اورنگ زیب کے) جسم کے چار ٹکڑے لٹکائے جاتے[1]

یہ روایت اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ دارا بھی اورنگ زیب کو اسی طرح قتل کراتا جس طرح موخر الذکر نے کیا۔ اس نظریہ کی روشنی میں دارا کے قتل کو جانچا جائے تو اس میں کوئی بات غیر معمولی نظر نہ آئے گی، اور برنیر و منوچی وغیرہ نے جو حکایتیں بیان کی ہیں کہ اورنگ زیب نے دارا کے سر کی مختلف طریقوں سے توہین کی وہ قابل اعتبار نہیں کم از کم اس مسئلہ پر تو سر جادو ناتھ سرکار نے بھی بیرونی سیاحوں کے بیانات کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

عہد عالمگیر کے پہلے دس سال کی سرکاری تاریخ عالمگیر نامہ میں دارا کی موت کے دو اسباب بتلائے گئے ہیں:

۱۔ بحکم دین پروری و شریعت گستری دوم ۔ انتضائے مصلحت دولت و سروری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

---

[1] یہ روایت منوچی (جلد اول ص ۳۵۷) نے بیان کی ہے۔ عام طور پر سیاحوں کے بیانات اسی صورت میں قابل تسلیم ہوتے ہیں جب ان کی توثیق کسی دوسرے مستند ماخذ سے ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ دونوں صحیح ہیں، دارا نے مسلمانوں کے دینی رہنماؤں یعنی علماء اور مشائخ کے اکثر طبقوں کو اپنا مخالف بنا لیا تھا، اس میں شک نہیں کہ بعض صوفیاء اور مشائخ سلف سے اس کو عقیدت تھی، لیکن یہ عقیدت صرف اقوال تک محدود تھی، اس کا اثر اس کے افعال میں نظر نہیں آتا تھا، مثلاً مسئلہ توحید میں وہ اس حد تک بڑھ جاتا تھا کہ ملحدانہ الفاظ کہنے لگتا تھا، یہی نہیں کہ وہ شریعت کے احکامات کی پابندی سے خود کو آزاد سمجھتا تھا بلکہ ان گناہوں کا بھی مرتکب ہوتا تھا جو اسلام کی نظر میں سخت قابل نفرت تھے، مثلاً شراب نوشی، یہ صحیح ہے کہ بہت سے شہزادے اور امراء کی بڑی تعداد بھی شراب پیتی تھی، لیکن یہ لوگ خود کو عارف نہیں کہتے تھے اور نہ وہ توحید کے اسرار بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے، مثال کے طور پر دارا کے دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں، قادری دارا کا تخلص تھا:۔

قادری گشت قادر مطلق ؎ از پے ہر فنا کمال بقاست

دوسرے مصرعہ میں فنا اور بقا کے جس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے لیکن ان الفاظ کا جواز کہ "قادری، قادر مطلق ہو گیا" کہیں موجود نہیں اور جب یہ الفاظ ایسے شخص کی زبان سے نکلیں جس کی دینی علوم سے دلچسپی صرف قیل و قال تک محدود ہو تو وہ کسی حلقہ میں بھی پسند نہیں کئے جا سکتے۔ اس سے بھی زیادہ گرناخانہ شعر یہ ہے:۔

ہم محمد تو ئی و ہم اللہ ؎ این عنایت ترا است ارزاں

اس قسم کی تحریر اور کلمات کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کئے جا سکتے اور یقیناً علماء کی نظر میں ان کا مصنف مرتد تھا۔

Marfat.com

یہ امر بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ بعض اوقات عالمگیر کے سامنے فقہاء کے ایسے فیصلے توثیق کے لئے آتے تھے۔ جن پر اس کو آخری حکم دینے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا سرمد کے قتل کا حکم دینے سے پہلے مزید تحقیق اور غور ضروری تھا، اگر مراۃ الخیال کا بیان صحیح ہے اور قتل کا فتویٰ اسی رباعی پر دیا گیا تھا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے تو فقہاء کی رائے اور عالمگیر کے فیصلے سے اتفاق کرنا مشکل ہے اور اگر عاقل خاں رازی کے اس قول کو کہ "فتویٰ ارباب شرع بہ علت برہنگی کہ اصلاً بہ ستر عورت متوجہ نبود و از لباس حیات عاری گردید" صحیح تسلیم کیا جائے (اور بظاہر اس کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی) تو عالمگیر کا فیصلہ اور بھی زیادہ قابل اعتراض ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ برہنگی، شرعی نقطۂ نظر سے سخت معیوب ہے لیکن اس کی سزا موت کے علاوہ اور بھی ہو سکتی تھی، سرمد کو قید کیا جا سکتا تھا۔ ان کو جسم ڈھانکنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ اگر شاہ نواز خان نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

> "صحیح بات تو یہ ہے اس کے قتل کا بڑا سبب مصاحبت دارا شکوہ تھی، ورنہ اس کی طرح ننگے مجذوب اور بے زبان گو، ہر گلی کوچہ میں پھرتے ہیں"

تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ عالمگیر کے احکامات کے متعلق اس قسم کی غلط فہمیاں ہوتی رہی ہیں اور جب سرمد کے اکثر مورخوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ دارا کی دوستی سرمد کے قتل کا باعث تھی۔ ممکن سرمد کے واقعہ کے علاوہ اور بھی ایسے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سید محمدی اکبر آبادی کا قید کیا جانا۔

سید محمدی اکبر آبادی صابری سلسلہ کے ایک شیخ تھے۔ وہ شاہ محب اللہ الہ آبادی کے خلیفہ تھے اور زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بعض لوگوں نے شاہ محب اللہ کے رسالہ تسویہ کی طرف عالمگیر کو توجہ دلائی اور کہا کہ اس میں بعض عبارتیں

Marfat.com

ملحدانہ ہیں، شہنشاہ کو یہ بھی بتلایا گیا کہ خود شیخ محب اللہ کا تو انتقال ہو چکا ہے لیکن ان کے دو خلفاء موجود ہیں، ایک سید محمد قنوجی اور دوسرے سید محمدی، عالمگیر نے ان دونوں کو ہدایت کی کہ یا تو یہ ثابت کریں کہ رسالہ کی مشکوک عبارتیں قوانین شریعت کے خلاف نہیں ورنہ اپنے شیخ کی ارادت سے دستبردار ہو جائیں اور رسالہ کو جلا دیں، سید محمد قنوجی درباری عالم تھے، وہ بادشاہ کو ناراض کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے انہوں نے شیخ کی ارادت سے انکار کر دیا، اس کے بعد عالمگیر نے یہی پیغام سید محمدی کو بھیجا انہوں نے کہا کہ میرے شیخ نے جس مقام پر پہنچکر یہ باتیں لکھی ہیں، میں ابھی وہاں نہیں پہنچا ہوں، جس وقت اس مقام پر پہنچ جاؤں گا میں ان کی صحت شرعی نقطۂ نظر سے ثابت کردوں گا، ارادت سے توبہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا رہا اس کا جلانا تو اگر حضرت والا نے یہ طے فرمالیا ہے کہ اس کو جلا دیا جائے تو میری جھونپڑی کے مقابلہ میں شاہی باورچی خانہ میں کہیں زیادہ آگ موجود ہے اور وہاں جلایا جا سکتا ہے، بادشاہ جواب سن کر خاموش ہو گیا (از جواب درماند ساکت گردید[1]) اس موقع پر تو عالمگیر نے سید محمدی سے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں ان کو سلطنت سے باہر جانے پر مجبور کر دیا، وہ حجاز گئے اور دو سال سے زیادہ وہاں قیام اور دو حج ادا کرنے کے بعد پھر واپس آ گئے، لیکن حاسدوں نے پھر ان کی شکایت کی اور ان کو قید کر دیا گیا، اور آخر کار قید ہی میں انہوں نے وفات پائی[2] سید محمدی

---

[1] مراۃ الخیال ص ۲۲۵-۲۲۶، اس واقعہ کو بعد کے مصنفین (مثلاً ماثر الامراء، جلد سوم مطبوعہ کلکتہ) نے بھی نقل کیا ہے، میر آزاد بلگرامی کے ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں عالمگیر نے بہت سے مشائخ کو دارالخلافہ طلب کیا تھا، دیکھو ماثر الکرام ص ۸۸،

[2] مفتاح الخزائن ص ۳۶، نیز انوار العارفین ص ۱۲ اھ ۴۴۲،

Marfat.com

کے قید کئے جانے کی تفصیلات مستند تاریخوں میں موجود نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کو فقہا کی شکایت پر تنبیہ کیا گیا ہوگا، سید محمد ایک گوشہ نشین درویش تھے اور ظاہر ہے کہ سیاسیات سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا، ان حالات میں اگر ان کے عقائد بعض فقہا کے نزدیک غلط بھی تھے تو ان کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا، لیکن ایسا نہ کیا گیا، اس قسم کے فیصلوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دینی رہنماؤں کے دو طبقوں میں اختلافات کی خلیج وسیع ہو گئی۔[1]

ان چند مخصوص مثالوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ تاریخ کے طالب علم کے سامنے حکومت کی پالیسی کا یہ گوشہ بھی آجائے، ان چند واقعات سے پالیسی کی بنیادی حیثیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عالمگیر فقراء کی عزت نہیں کرتا تھا، خواجہ معین الدین چشتیؒ سے اس کی عقیدت اور پیدل چل کر مزار پر حاضری کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے، اس کے معاصر درویشوں میں کئی ایسے حضرات موجود تھے جن سے اس کو عقیدت تھی، شاہ عبدالرحیم اور شیخ یحییٰ مدنی کا ذکر کیا جا چکا ہے خافی خان نے شیخ برہان کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ دکن سے جنگ تخت نشینی کے موقع پر آگرہ جاتے ہوئے اورنگزیب انکی خدمت میں حاضر ہوا، شیخ اس سے ملنے کو تیار نہ تھے چنانچہ اس کو ملاقات کے لئے کوشش کرنا پڑی[2] اسی مورخ نے ایک اور بزرگ شیخ بایزید کا ذکر کیا ہے، انہوں نے ایک موقع پر جامع مسجد میں عالمگیر کو مخاطب کر کے کہا کہ اے بے عمل

---

[1] سید محمد کی اہمیت ہماری تاریخ میں اس سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ان ہی کے سلسلہ میں چند واسطوں کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب کا نام آتا ہے یہ سب جانتے ہیں کہ حاجی صاحب کے مریدوں میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے علما تھے

[2] منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۲

Marfat.com

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادیوں کی شادیاں کیں تو تمہارے لئے اس کا کیا جواز ہے کہ تم اپنی لڑکیوں کی شادی نہ کرو۔[1]

یہ صحیح ہے کہ بعض حالات میں فقہا اور محتسب ضرورت سے زیادہ سختی اور تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ عالمگیر میں بھی بشری کمزوریاں موجود تھیں؛ لیکن ان چند مخصوص واقعات سے اس کے کارنامے کی عظمت میں کمی نہیں آتی۔ انفرادی اور اجتماعی کردار کو بلند کرنے کے لئے اس نے جو اصلاحات جاری کیں اور ان کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں جس استقلال کے ساتھ اس نے اپنے فرائض انجام دئے ان کا مطالعہ مکمل طور پر ابھی تک کسی مورخ نے نہیں کیا، دور جدید کے اکثر مورخوں نے سطحی انداز میں تنقید کرتے ہوئے اس پر اعتراضات کی بوچھار کی ہے اور مختلف طریقوں سے اس کو مطعون کیا ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے سیاحوں اور مصنفوں نے اسلامی عہد کی تاریخ کو ایک خاص نقطہ نظر سے پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کے قوانین اور معاشری تصورات کی تصویر کو مسخ کرنے کی جو روایات قائم کی تھیں، ان کا اثر ہم کو جدید مورخوں کے بیانات اور طرز تحریر میں ہر قدم پر ملتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں ان کا ازالہ نہایت ضروری ہے، اس سلسلہ میں عالمگیری اصلاحات کا حقیقت پسندانہ مطالعہ بہت اہم ہے۔ اسلامی معاشرہ کا جو انحطاط اکبری عہد کے آخری دور میں شروع ہوا تھا، اس کے اثرات مصلحین کی کوششوں کے باوجود ختم نہیں ہوئے تھے، عالمگیر نے اپنی اصلاحات ان ہی اثرات کا قلع قمع کرنے کی غرض سے جاری کیں اس کو اپنے مقصد میں مکمل کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی معاشرہ کی عمارت کو استحکام بخشنے میں اس کی کوششیں رائگاں نہیں گئیں۔

---

[1] منتخب اللباب۔ جلد دوم ص ۵۵۱

Marfat.com

باب نوزدہم

تعلیم

ابتدائی دور، سندھ

اسلام نے علم کی اہمیت پر جس قدر زور دیا ہے اس کی مثال دوسری اقوام و مذاہب میں ملنا مشکل ہے کلام مجید کی آیات اور رسول پاکؐ کے متعدد ارشادات گرامی جن میں علم کی فضیلت اور تعلیم حاصل کرنے کی ہدایات صاف طور پر کی گئی ہے بہ آسانی جمع کی جاسکتی ہیں۔ حصول علم کو آنحضرتؐ کس قدر اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ ان احکامات سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ نے بدر کے جنگی قیدیوں کے متعلق جاری فرمائے۔ ان قیدیوں میں جو لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ بارہ بارہ مسلمان بچوں کو لکھنا سکھلائیں اور یہی خدمت ان کی آزادی کا معاوضہ سمجھی جائے گی، تعلیم اور اشاعت علم کی یہ اعلیٰ روایات مسلمان اپنے ساتھ ہر اس ملک کو لے گئے جہاں وہ بحیثیت فاتح یا بہ غرض تبلیغ و تجارت وغیرہ گئے، برصغیر میں بھی اسلامی فتوحات کے پہلے دور یعنی سندھ و ملتان کی فتح کے بعد اسلامی علوم کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس زمانہ کے علماء و فضلاء کی فہرست پر نظر ڈالئے تو آپ دیکھیں گے کہ درس و تدریس کا سلسلہ یہاں کس قدر وسیع تھا۔ ان فضلاء و علماء میں بعض نے بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی تھی چند

Marfat.com

کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ مفتوحہ علاقہ میں کافی تعداد میں مسجدیں تعمیر کی گئی ہونگی[1] اور ان میں سے اکثر کے ساتھ ملحقہ مدارس ہوں گے، کیونکہ مسجد کے ساتھ مدرسہ کا رواج مسلمانوں کے معاشرہ میں عام تھا۔ چچ نامہ اور دیگر تاریخی تصانیف میں ہم کو حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم کی وہ مراسلت ملتی ہے جس میں اول الذکر کی اشاعت اسلام اور تعلیم سے متعلق ہدایات موجود ہیں چنانچہ بلاذری نے ذکر کیا ہے کہ محمد بن قاسم نے دیبل فتح کرنے کے بعد وہاں مسلمانوں کی آبادی قائم کی اور مسجد تعمیر کرائی۔ اسی طرح ارور کی فتح کے بعد وہاں بھی مسجد کی تعمیر کا ذکر کیا گیا ہے، ملتان فتح ہونے پر وہاں بھی نہایت شاندار مسجد تیار کی گئی جس کے مینار بہت بلند تھے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں مرکز خلافت میں سازشوں کی وجہ سے محمد بن قاسم کو تو جلد ہی واپس بلا کر قید کر دیا گیا لیکن سندھ میں علمی و تعمیری کاموں کا سلسلہ جاری رہا، اس سلسلہ میں منصورہ اور محفوظہ، دو شہروں کی تعمیر قابل توجہ ہے، یہ خالص اسلامی شہر تھے، عباسی حکومت کے بعد یہاں بھی نئے حاکم مقرر ہوئے، اس مختصر سے دور میں علمی زندگی نے یہاں پر کافی ترقی کر لی تھی، مثلاً دیبل کے کئی علماء و فضلاء کا ذکر ہم کو رجال کی کتابوں میں ملتا ہے[2]

---

[1] یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حال ہی میں کراچی سے کچھ فاصلہ پر بھنبور میں کھدائی کرنے سے ایک قدیم مسجد کے آثار نکل آئے ہیں، یہ اسلامی فتوحات کے ابتدائی زمانہ کی عمارت ہے اور اس امر کی صریح شہادت ہے کہ مسلمان فاتحین اپنی آبادی میں مسجدیں تعمیر کرتے تھے۔

[2] مزید تفصیلات کے لئے دیکھو نزہۃ الخواطر از مولوی عبد الحئی جلد اول ص ۴۴ تا ۴۷

Marfat.com

شہروں کی آبادی اور قیام امن کے بعد فضلاء باہر سے بھی یہاں آکر آباد ہوئے، محمد بن ابی الشوارب ۲۸۳ھ میں منصورہ کے قاضی ہو کر عراق سے آئے وہ یہیں آباد ہو گئے اور ان کے لڑکے علی بن محمد ابن ابی الشوارب بھی ان کے بعد قاضی مقرر ہوئے، منصورہ میں جامع مسجد کے علاوہ ایک مدرسہ بھی حکومت کی طرف سے قائم کیا گیا، قاضی القضاۃ ابو محمد منصوری اس مدرسہ کے نگراں تھے، یہ بڑے عالم تھے، اروڑ اور ملتان کے علماء و فضلاء کا ذکر بھی کتابوں میں ملتا ہے، ایک اور سندھی عالم ابو معشر بھی قابل ذکر ہیں، اگرچہ وہ یہاں نہیں بلکہ دوسرے مقامات میں رہے، ان کے اساتذہ میں ہشام بن عروہ اور نافع جیسے مشہور علماء تھے اور شاگردوں کی فہرست میں امام وکیع اور امام سفیان ثوری کے نام ملتے ہیں، جامع ترمذی میں ان کی روایت موجود ہے، وہ مستقل طور پر مدینہ منورہ میں مقیم رہے، لیکن ۱۶۱ھ میں خلیفہ مہدی ان کو بغداد لے گیا اور درس حدیث کا کام ان کے سپرد کیا، آٹھ سال بعد یہیں ان کی وفات ہوئی۔

فتح سندھ کے بعد مسلمانوں نے اشاعت تعلیم کے سلسلہ میں جو کوشش کی اس کے متعلق ہمارے پاس بہت محدود معلومات ہیں، ان کی بنیاد پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سلسلہ میں وسیع پیمانہ پر کوشش کی گئی، یہی سبب تھا کہ یہاں کے علماء و فضلاء نے ہی نہیں بلکہ اس علاقہ نے عالم اسلام میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔

سلطان محمود غزنوی

امیر سبکتگین اور اس کے بعد اس کے لائق بیٹے سلطان محمود کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ درۂ خیبر کی جانب سے شروع ہوا، یہ فتوحات پہلے دور کے مقابلہ میں زیادہ وسیع اور زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں، بعض مورخین نے جن میں زیادہ تر مغرب کے اہل قلم اور مستشرقین ہیں سلطان محمود کی اس قدر غلط تصویر پیش کی ہے کہ اگر حقائق و واقعات کی تحقیق کیے بغیر اس کو مان لیا جائے تو وہ خونریزی اور جنگجوئی کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہ تھا اور مال و دولت

Marfat.com

لوٹنے کے لئے اس نے بہت سی جانیں لیں اور بہت سے مندر منہدم کرائے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سلطان کی دوامی شہرت وعظمت کا انحصار اس کی ہندپاکستانی فتوحات پر نہیں بلکہ اسکی علم دوستی اور ہنرپروری پر ہے جس کی بدولت تاریخ کے صفحات میں اس کا نام آج بھی چمکتا ہوا نظر آتا ہے، علماء، ادباء اور شعراء کی اس نے جس طرح حوصلہ افزائی کی اس کا ذکر مختصراً پہلے کیا جاچکا ہے، یہاں یہ امر یاد دلانا مقصود ہے کہ غزنین میں جو عالیشان مسجد اس نے بنائی تھی اور جس کو عروس فلک کہا جاتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس نے ایک زبردست یونیورسٹی بھی قایم کی تھی، اس کے ساتھ ایک وسیع کتب خانہ تھا جس میں مختلف مقامات سے کتابیں لاکر جمع کی گئی تھیں۔ عروس فلک اور اس سے ملحق مدرسہ کے قیام کا ذکر فرشتہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

در غزنین مسجد جامع بنیاد نہادند و اصل عمارت مسجد از سنگ مرمر و رخام مربع و مسدس و مثمن و مدور بر آوردند، بطرزے کہ بینندگان از متانت و طراحی آں متحیر شدند و بعد از اتمام عمارت بموجب حکم بہ نوعے آن را بہ انواع زینت و فروش و قندیل مزین ساختند کہ ظرفاء وقت شناس آن مسجد را عروس فلک می گفتند و در جوار آں مسجد مدرسہ بنا نہادہ و بہ نوادر کتب و غرایب نسخ موشح گردانیدہ دیہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود و چوں سلطان محمود را ذوق بہ بنائے مسجد و مدرسہ شد

لہ اسلامی دنیا میں مدرسہ کا لفظ اس قدر جامع تھا کہ ہر درس گاہ کو اس نام سے پکارا جاسکتا تھا، یعنی آج کل کے پرائمری اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہر ادارہ کو مدرسہ کہا جاسکتا تھا۔ جن مدرسوں میں متعدد شعبوں میں تعلیم وتدریس کا انتظام تھا، ان کو دور حاضر کی اصطلاحی زبان میں یونیورسٹی ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

Marfat.com

بمقتضائے الناس علیٰ دین ملوکھم، ہر یکے از امراء و اعیان دولت بہ بنائے مسجد و مدارس و رباطات و خوانق مبادرت نمودہ و ساندک فرصت آن مقدار عمارات عالیہ باتمام رسید کہ از حیز شمار بیرون گشت"[1]

اس اقتباس سے چند ایسے مسائل پر روشنی پڑتی ہے جو دوسری تاریخوں میں نظر نہیں آتے، سلطان محمود کا ایک اعلیٰ مدرسہ قایم کرنا اس کے کردار اور افتاد طبع کو دیکھتے ہوئے کوئی غیر معمولی اقدام نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ امر کہ مسجد مدرسہ کے لئے دیہات بسیار... وقف فرمود اس کی بین شہادت ہے کہ مدرسہ ایک بڑا ادارہ تھا جس کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہاتوں کی ضرورت تھی، حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا ہوگا۔ جس میں متعدد شعبے ہوں گے۔ اس سے بھی زیادہ اہم واقعہ فرشتہ کے بیان میں یہ ہے کہ امراء اور اعیان نے بکثرت مدارس، مساجد اور دوسری عمارتیں بنوانا شروع کیں اور بالآخر ان کی تعداد "از حیز شمار بیرون گشت"، اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ غزنوی سلطنت کے مختلف حصوں میں بکثرت مدارس بھی قایم کئے گئے۔

سلطان محمود کے دل میں تعلیم کی اہمیت اور علم کی وقعت بہت زیادہ تھی، تاریخوں میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک رات کو سلطان جا رہا تھا، ایک شخص سونے کا شمع دان ساتھ لئے ہوئے آگے آگے تھا، راستہ میں اس نے دیکھا کہ ایک نادار طالب علم جو اپنی مفلسی کے سبب چراغ بھی مہیا نہیں کر سکتا تھا، ایک بقال کی دوکان پر کھڑا ہوا اس کے چراغ کی روشنی میں مطالعہ کر رہا ہے، سلطان پر اس کا گہرا اثر ہوا اور اس نے فوراً طلائی شمع دان اس طالبعلم کو عطا کر دیا، شب میں رسول اکرمؐ نے سلطان کے اس فعل کو پسندیدہ قرار دیتے ہوئے اس

---

[1] تاریخ فرشتہ، بمبئی ایڈیشن۔ جلد اول ص ۵۱

Marfat.com

کو نجات کی خوش خبری دی۔[1] اس واقعہ سے سلطان کا جذبہ علم پروری ظاہر ہوتا ہے، یہ یقینی امر ہے کہ امراء نے سلطان کو خوش کرنے کے لئے بہت سے مدارس بنوائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزنین علم و ادب کا ایک عظیم مرکز بن گیا۔

سلطان محمود کے بعد محمود کا بیٹا اور جانشین سلطان مسعود بھی تعلیم سے دلچسپی رکھتا تھا، یہ سب جانتے ہیں کہ مشہور و معروف عالم اور محقق البیرونی اسی کے دربار سے منسلک تھا، اس نے اپنی ریاضی و ہیئت کی اعلیٰ تصنیف کو اسی سلطان کے نام پر قانون مسعودی کا نام دیا اور بقول فرشتہ "درخلعے از نقرہ صلہ یافت"، ایک دوسرے عالم قاضی ابو محمد ناصحی نے فقہ حنفی پر کتاب لکھی اور سلطان کے نام پر اس کا نام کتاب مسعودی رکھا۔

مسعود نہایت بہادر، سخی اور علم دوست بادشاہ تھا اور تخت نشینی کے بعد ہی ممالک محروسہ میں "در چنداں مدارس و مساجد بنیاد نہاد کہ زبان بیان از تعداد آن عاجز و قاصر است"[2] مسعود کی حکومت زیادہ عرصہ تک نہیں رہی اور اس کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مسعود کا لڑکا سلطان ابراہیم نہایت متقی اور پرہیزگار تھا، سال میں رمضان کے علاوہ رجب و شعبان کے مہینوں میں بھی روزے رکھتا تھا، ہر سال ایک مشہور عالم امام یوسف

---

[1] سلطان محمود کو تین چیزوں کے متعلق تردد رہتا تھا (۱) کہ وہ واقعی سبکتگین کا بیٹا تھا۔ (۲) اس حدیث کی صحت کے متعلق کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور (۳) قیامت آئے گی یا نہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت نے خواب میں جو الفاظ ارشاد فرمائے ان سے اس کے یہ تینوں شکوک رفع ہو گئے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔ اے ابن سبکتگین، اللہ تعالیٰ تجھ کو دونوں جہان میں اسی طرح عزت دے جس طرح تو نے میرے وارث (یعنی طالب علم) کی عزت کی

[2] فرشتہ جلد اول ص ۷۵

Marfat.com

سجاوندی کو وعظ و پند کے لئے بلاتا تھا، سلطان ابراہیم بہت خوش خط تھا اور ہر سال ایک قرآن لکھتا، ایک سال مکہ اور دوسرے سال مدینہ بھیجتا تھا غزنوی خاندان کا ایک اور سلطان یعنی بہرام شاہ بھی قابل ذکر ہے، سیاسی حیثیت سے تو اب غزنوی حکومت رو بہ زوال تھی لیکن علم و ادب کی تاریخ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ شیخ نظامی جیسے عظیم المرتبت عالم و شاعر اسی دربار سے منسلک تھے اور انہوں نے مثنوی مخزن الاسرار کو اسی سلطان کے نام سے منتسب کیا ہے، ایک دوسرے مشہور شاعر جو اس کے دربار سے وابستہ تھے سید حسن غزنوی ہیں، غزنویوں کی علمی خدمات کا ذکر ختم کرنے سے پہلے یہ بتلانا ضروری ہے کہ اسی دور میں ایک عالم شیخ اسمٰعیل لاہوری تبلیغ اسلام و اشاعت علم کے سلسلہ میں برصغیر میں آئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، صاحب تذکرہ علمائے ہند کا بیان ہے کہ یہ پہلے عالم ہیں جو علم حدیث و تفسیر کو لاہور میں لائے[1]

سلطان معز الدین محمد بن سام

سلطان معز الدین کی شخصیت اور کارناموں کی تصویر ہم کو اکثر تاریخوں میں نامکمل ملتی ہے اس کی فتوحات اور اس کا عہد حکومت برصغیر کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہونا شروع ہو گیا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر کو اپنا مستقر بنا کر اسلام کی روشنی پھیلانا شروع کر دی تھی، اسی زمانہ میں معز الدین نے رائے پتھورا کو شکست دیکر دہلی سے راجپوتانہ تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کیا اور مساجد و مدارس تعمیر کرائے۔

سلطان معز الدین ایک متقی، بہادر اور عدل پرور بادشاہ تھا، علماء و فضلاء کی بڑی تعداد اس کے دربار سے وابستہ تھی، ان میں سب سے زیادہ مشہور عالم، امام فخر الدین رازی تھے

---

[1] دیکھو تذکرہ علمائے ہند۔ مطبع نولکشور پریس

Marfat.com

جو ہر ہفتہ اس کے محل میں وعظ فرماتے، ایک اور عالم سید کمال الدین عثمانی ترمذی اسی سلطان کے ساتھ یہاں آئے اور کیتھل میں توطن اختیار کیا، ان کے علاوہ اور بھی علماء کا تذکرہ کتابوں میں موجود ہے جو سلطان کی علم پروری کے سایہ میں اشاعت علم کی خدمت انجام دیتے تھے۔

سلطنت دہلی کا ابتدائی دور

سلطان معزالدین کے کوئی لڑکا نہ تھا لیکن اس نے اپنے غلاموں کی تعلیم و تربیت کا ایسا ہی انتظام کیا تھا جیسے اپنے لڑکوں کا کرتا، ان میں تین قابل ذکر ہیں، کیونکہ یہ وسیع علاقوں پر حکمراں ہوئے، تاج الدین یلدوز نے غزنین کو اپنا مستقر بنایا، قطب الدین ایبک دہلی کا سلطان ہوا اور ناصر الدین قباچہ کا قبضہ سندھ اور قرب و جوار کے علاقہ پر رہا، قطب الدین ایبک کا دور حکومت (بحیثیت سلطان) بہت مختصر تھا اور اس مدت میں اس کو مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اس زمانہ کے مشہور عالم امام صغانی تھے جن کا ذکر دوسری جگہ کیا گیا ہے، ایک اور "غلام" نے بہار و بنگال کے علاقے فتح کئے، محمد بن اختیار خلجی کے سیاسی و فوجی کارناموں کا ذکر کیا جا چکا ہے، یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ بنگال کے پایہ تخت نادیہ کو فتح کر کے بختیار نے اپنا دار الحکومت تیار کیا۔ صاحب طبقات ناصری کے الفاظ یہ ہیں:-

"در بر موضع کہ لکھنوتی است دار الملک ساخت و اطراف آں ممالک را در تصرف آورد و خطبہ و سکہ در ہر خطہ قایم کرد و مساجد و مدارس و خانقاہات دراں اطراف بہ سعی جمیل او و امرائے او بنا شد"

اس طرح بنگال میں اسلامی علوم کی درس گاہوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا جو اس کے بعد برابر ترقی کرتا رہا۔

قطب الدین کی وفات کے بعد ایک مدت تک برصغیر کے مغربی و شمالی علاقے جن میں سندھ میں شامل تھا ناصر الدین قباچہ کے زیر حکومت رہے ابتدا میں اس کا دار الحکومت

Marfat.com

ملتان تھا، بعدہٗ اچھ کو اس نے اپنا مستقر بنایا، اول الذکر مقام پر اس نے مدرسے بنوائے جن میں سے ایک کا تاریخی کتابوں میں ذکر موجود ہے، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کے تذکرہ میں مشہور مورخ فرشتہ لکھتا ہے :۔

"گویند چوں مولانا قطب الدین کاشانی از ماوراء النہر بہ ملتان رسید، شاہ ناصر الدین قباچہ والی ملتان سرائے با مدرسہ برائے او بنا نمود و مولانا کہ علامہ روزگار بود نماز بامداد دران مدرسہ گزاردہ وعظ گفتن می پرداخت و شیخ بہاء الدین زکریا کہ ابتدائے حال او بود ہر روز بامداد آنجا حاضر شدی و نماز فجر در پس او گزاردے"

قباچہ کے عہد حکومت میں اچھ کے مدرسہ فیروزی کا ذکر قاضی منہاج الدین نے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ جمادی الاول ۶۲۴ھ میں اچھ پہنچا اور اسی ذی الحجہ میں مدرسہ فیروزی اچھ حوالہ این داعی شد۔[1]

سلطان شمس الدین التتمش

۱۲۱۰ء میں التتمش دہلی کے تخت پر بیٹھا، اس کا چھبیس سالہ دور حکومت ہر لحاظ سے اسلامی حکومت کے استقلال، ترقی و توسیع کا ایک درخشاں باب ہے، یہاں صرف اس دور کے ایک پہلو پر نظر ڈالنا مقصود ہے، التتمش نہایت علم دوست اور ہنر پرور سلطان تھا، وہ علماء، فضلاء و دیگر اہل کمال کی مدد سے ہندوستان کی ترقی کے لئے نئے نئے راستے نکالتا، مگر اسی زمانہ میں منگولوں کا طوفان وسط ایشیا سے اٹھا اور اسلامی دنیا کے اکثر علاقوں کو تباہ و برباد کر ڈالا، اسلامی تہذیب کو اس سے جو صدمہ پہنچا اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی، منگولوں کے حملوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ تباہ شدہ علاقوں سے علماء، فضلاء، مشائخ اور صنعت کار اپنی جانیں بچانے کی غرض سے برصغیر آ گئے، چنانچہ دہلی ایک پر رونق

---

[1] طبقات ناصری (لاہور ایڈیشن ۱۹۵۴) ص ۵۷

Marfat.com

اور بین الاقوامی شہر بن گیا، عصامی نے اس کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا ہے۔[1]

بسے سیدان صحیح النسب ؛ رسیدند در وے ز ملک عرب

بسے کاسبان خراسان زمیں ؛ بسے نقش بندان اقلیم چین

بسے عالمان بخارا نژاد ؛ بسے زاہد و عابد از ہر بلاد

پہلے شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ منگولوں کے حملوں سے بچنے کے لئے جو لوگ آتے تھے ان کے علاوہ کچھ لوگ سلطان کی علم پروری اور قدر شناسی کی شہرت سن کر بھی آتے تھے، بہر حال کثیر تعداد میں فضلاء علماء کا دلی میں آنا اور اس کو اپنا وطن بنانا، علم و ادب کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ ان کی موجودگی کا لازمی نتیجہ اشاعت علم تھا۔

ساتویں صدی ہجری کے شروع میں دو بڑے مدرسوں کا ذکر موجود ہے، مدرسہ معزی غالباً التتمش کا قایم کیا ہوا تھا کیونکہ اسی نام سے ایک مدرسہ اس نے بدایوں میں بھی قایم کیا تھا، یہ دونوں مدرسے سلطان معز الدین کے نام پر تھے، طبقات ناصری میں اس کا ذکر قرامطہ کی یورش کے سلسلے میں ہے جو سلطان رضیہ کے زمانہ حکومت میں ۶۳۵ھ میں واقع ہوئی تھی، دوسرا مدرسہ ناصریہ التتمش کے لڑکے کے نام پر تھا، ۶۳۵ھ میں ہی اس مدرسہ میں سلطان رضیہ نے قاضی منہاج کا تقرر کیا تھا سلطان فیروز شاہ فتوحات فیروز شاہی میں ذکر کرتا ہے کہ:۔

"سلطان التتمش کا مدرسہ برباد ہو چکا تھا، میں نے اس کو دوبارہ بنوایا اور اس پر صندل کے کواڑ چڑھوائے۔"

---

[1] فتوح السلاطین ص ۱۱۴

التمش کا بیٹا سلطان ناصر الدین جس کے نام پر قاضی منہاج نے اپنی کتاب کا نام طبقات ناصری رکھا ہے بے حد علم دوست اور سادہ مزاج سلطان تھا۔ ناصر الدین کے بعد غیاث الدین بلبن تخت پر بیٹھا، حقیقت یہ ہے کہ ناصر الدین کے عہد میں بھی حکومت کی باگ اسی کے ہاتھ میں تھی، بلبن کی علم دوستی اور علماء و صلحاء کے ساتھ اس کے تعلقات کا ذکر متعدد موقعوں پر آتا ہے، یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بیٹے سلطان شہید کے دربار سے بہت سے فضلاء وابستہ تھے، ان میں امیر خسرو اور امیر حسن کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ منگولوں کے ہاتھوں اسلامی ممالک کی تباہی نیز سلاطین دہلی کی علم پروری کے باعث علماء اور دیگر اکابر کے آنے کا سلسلہ جاری تھا اور بقول امیر خسرو دہلی خود بخارا کا ہمسر ہو گیا تھا، لیکن علماء کی کثرت اور بادشاہ کی علم دوستی کے باوجود مورخوں نے کسی بڑے مدرسہ کا ذکر نہیں کیا جس کی بنیاد بلبن نے رکھی ہو۔[1] بادشاہ یا امراء کے قائم کئے ہوئے مدرسوں کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ تعلیمی ترقی کی رفتار میں کمی واقع ہو رہی تھی، واقعہ یہ ہے کہ سو سال کے اندر اسلامی معاشرہ کی بنیادوں میں کافی استقلال پیدا ہو چکا تھا اور اہل کمال حکومت کی سرپرستی سے بے نیاز ہوتے جا رہے تھے، علماء بھی اپنے طور پر درس کا انتظام کرنے لگے تھے۔ اس کا ثبوت ہم کو خلجی دور کی حیرت انگیز ترقی اور خوش حالی میں ملتا ہے۔

---

[1] نرندرناتھ لا نے اپنی کتاب پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول (لندن ۱۹۱۶ء) میں فرشتہ کے حوالے سے سیدی مولا کی اکیڈمی کا ذکر کیا ہے (دیکھو ص ۲۰۸) لیکن فرشتہ کی خود عبارت یہ ہے۔ "سیدی مولہ چوں بہ دہلی رسید، متوطن شدہ خانقاہ عظیم ساخت وبنہ اطعام و انفاق فقرا و مساکین کوشید ہر روز آن مقدار مردم درویش از مسافر و مجاور کہ بہ خانقاہ او می آمدند محروم نمی ساخت" (۱۶۱)

Marfat.com

خلجی عہد :- شیخ نظام الدین اولیاء کا حصہ تعلیمی ترقی میں

مغلیہ حکومت سے پیشتر سلطنت دہلی پر پانچ خاندانوں نے حکومت کی، ان میں سب سے مختصر دور خلجیوں کا تھا لیکن ترقی اور خوشحالی اور توسیع سلطنت کے لحاظ سے اس کو اولیت کا فخر حاصل ہے جہاں تک نئی فتوحات اور سلطنت میں امن و امان قائم رکھنے کا تعلق ہے علاء الدین کی کامیابی اور اس کی ذاتی کوشش و قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شمال میں راجپوتانہ اور جنوب میں دکن اور انتہائی جنوبی علاقوں کی فتوحات ایسے عظیم الشان کارنامے ہیں کہ ان پر کوئی بھی فاتح فخر کر سکتا ہے، جنوبی علاقوں میں اسلامی افواج کا پہلی مرتبہ جانا اور باوجود دشوار گذار راستوں اور مقامی حکومتوں اور فوجوں کی مخالفت کے ان کو فتح کرنا آسان کام نہ تھا۔ ان دشواریوں کا اور ان کی موجودگی میں علائی جرنیلوں اور فوجوں کے کارناموں کا اندازہ لگانے کے لئے حضرت امیر خسرو کی خزائن الفتوح[1] کے صفحات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ علمی و دینی زندگی میں جو ترقی ہم کو اس عہد میں نظر آتی ہے، اس میں علاء الدین کا حصہ براہِ راست بہت کم ہے۔ اس کا سہرا اس عہد کے مشائخ و علماء کے سر ہے اور ان میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمہ کا نام سرورق ہے۔ شیخ کی ذات کو شہرت بحیثیت ایک صوفی بزرگ کے ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا علماء میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے[2] فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں متعدد واقعات ملیں گے جن سے قرآن و

---

[1] اس کتاب کا متن راقم الحروف نے (بہ زمانہ طالب علمی) پروفیسر محمد حبیب کی خواہش پر طباعت کے لئے تیار کیا تھا۔ یہ ۱۹۲۷ء سے پہلے شائع نہ ہو سکا اور پھر بھی لاتعداد غلطیاں رہ گئیں، علامہ شیرانی نے ان اغلاط کی مکمل فہرست لاہور سے شائع کی ہے۔ [2] مولانا فخرالدین زرادی کو توشیخ سے ارادت ہی فقہ کی کتاب کی ایک عبارت کا صحیح مطلب بیان کرنے کی وجہ سے ہوئی، دیکھو سیر الاولیاء ص ۲۶۳

Marfat.com

علوم حدیث میں ان کی وسعت نظر کا اندازہ ہو سکتا ہے[۱]

قرآن کا مطالعہ در حقیقت چشتیہ مشائخ کے مشاغل میں ایک خاص اہمیت رکھتا تھا حضرت محبوب الٰہی بھی اس پر بہت زور دیتے تھے، فوائد الفواد میں تلاوت قرآن کے متعلق چند قواعد کا ذکر موجود ہے:۔

"در آنچہ می خواند معانی آن بر دل گذراند" اس لئے کہ "در حالت قرآن خواندن، جلال و عظمت حق بر دل بگذراند"

صوفیاء اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ عبادات میں خلوص و حضوری قلب ضروری ہے چنانچہ آپ کا قول ہے کہ

در وقت خواندن قرآن باید کہ دل خوانندہ را تعلق باشد[۲]

اس سلسلہ میں ان کی نصیحت تھی کہ کلام اللہ کو جلدی جلدی بغیر سمجھے ہوئے نہ پڑھا جائے۔ میر خورد نے اس ہدایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

"یک سی پارہ بہ سکونت حرفاً بعد حرف خواندن بہتر از پانزدہ سی پارہ بہ سرعت خواندن است"

اس کی وجہ یہ تھی کہ "در چنین خواندن نور تلاوت بیشتر باشد، اگرچہ در روانی خواندن ہم از نور خالی نبود"، اسی طرح حدیث کی تعلیم بھی بہت مکمل تھی، میر خورد لکھتے ہیں کہ "مشارق الانوار را یاد گرفت"[۳] سیر الاولیاء کے علاوہ شیخ کے ملفوظات میں جا بجا علوم حدیث سے متعلق

---

[۱] ان واقعات میں سے بہت سے مولانا مناظر احسن گیلانی کی تصنیف نظام تعلیم و تربیت میں موجود ہیں۔

[۲] فوائد الفواد ص ۱۴۷ [۳] سیر الاولیاء ص ۱۰۱، مشارق الانوار میں صحیحین کی دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثیں (بحذف اسناد) جمع کر دی گئی ہیں۔ شیخ نظام الدین اولیاء کو صحیحین کی اتنی حدیثیں حفظ تھیں۔

Marfat.com

اقوال موجود ہیں، جن سے آپ کی وسعت علمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں شیخ نظام الدین اولیاء سے متعلق جو چند واقعات لکھے گئے ہیں ان سے ہم یہ نتیجہ بہ آسانی نکال سکتے ہیں کہ ان کی خانقاہی تعلیم صرف روحانی تربیت اور تصوف کی تعلیم ہی تک محدود نہ تھی بلکہ ظاہری تعلیم پر بھی یہاں اسی قدر زور دیا جاتا تھا جتنا کہ روحانی تربیت پر۔ اس سلسلہ میں آپ کے مرید شیخ اخی سراج کا واقعہ دلچسپ ہے یہ اوائل عمر ہی میں اپنے وطن یعنی بنگال سے آکر حضرت کی خدمت میں رہنے لگے تھے، آخر زمانہ میں ان کو قدرتاً یہ امید تھی کہ چونکہ ان کی تربیت مکمل ہو چکی ہے، شیخ ان کو خلافت عطا کریں گے لیکن ایسا نہ ہوا اور شیخ نے ان کو خلافت دینے سے صرف اس بنا پر انکار کیا کہ وہ ظاہری علم سے محروم تھے، شیخ کے الفاظ تھے:-

"اول درجہ دریں کار علم است"

اخی سراج کو آزردہ خاطر دیکھ کر ان کے پیر بھائی مولانا فخر الدین زرادی نے یہ وعدہ کیا کہ چھ ماہ کی مدت میں ان کو وہ تعلیم دیں گے، اور ایسا ہی ہوا، یہ ہی شیخ سراج تھے جن کو بعد میں ظاہری علم سے اس قدر دلچسپی ہو گئی کہ شیخ نظام الدین اولیاء کی وفات کے بعد آپ کے کتب خانہ کا بڑا حصہ وہ اپنے ہمراہ بنگال لے گئے[1]

میر خورد نے ظاہری تعلیم کے مقابلہ باطنی تربیت سے متعلق واقعات زیادہ بیان کئے ہیں، لیکن ضمناً وہ کہیں کہیں اس کا بھی ذکر کرتے ہیں، مثال کے طور پر خود ان کے والد نے جو مدرسہ قایم کیا تھا اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

والد کاتب این حروف رحمۃ اللہ علیہ نزدیک خانہ سلطان المشائخ بکرایہ ستدہ بود و درس ساختہ و متعلمان خوب طبع جمع گردانیدہ تا کاتب حروف چیزے بخواند[2]

---

[1] دیکھو سیر الاولیاء ص ۲۸۹ [2] سیر الاولیاء ص ۲۰۸

Marfat.com

ہم کو اس امر کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ آخر کیا سبب تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں علماء وفضلاء عصر شیخ نظام الدین اولیاء اور دیگر مشائخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے ان میں سے اکثر وہ تھے جو درس وتدریس میں مصروف تھے لیکن ان کا ذکر اس سلسلہ میں نہیں بلکہ شیخ کے ارادت مندوں کے سلسلہ میں کیا گیا ہے[1] بہرحال اتنا تو یقینی ہے کہ اس زمانہ میں مدرسوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی، کیونکہ بقول فرشتہ:-

> از علمائے ظاہری کہ جامع انواع علوم بودند وبہ درس وافادہ اشتغال داشتند چہل وشش کس بودند[2]

مورخین نے ان میں سے بعض کے نام بھی دئے ہیں، غرض کہ یہ دور تعلیمی ترقی کا تھا اور تعلیمی ادارے بہ کثرت اس زمانہ میں وجود میں آ گئے ہوں گے، اس کی ایک بالواسطہ شہادت ہمیں اس سے بھی ملتی ہے کہ صاحب مسالک الابصار نے محمد بن تغلق کے عہد کی دہلی کے متعلق لکھا ہے کہ ایک ہزار مدرسے صرف دہلی کے شہر میں ہیں[3]

فیروز شاہ

تغلق خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق علماء فضلاء کا احترام کرتا تھا لیکن اس کے چار سالہ مختصر دور میں تعلیمی ترقی کی رفتار میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکا، اس کا بیٹا سلطان محمد بن تغلق اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران تھا اس کی قابلیت میں تو کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا، ضیاء الدین برنی نے جو سلطان سے زیادہ خوش نہیں تھا اس کی علمی صلاحیتوں کا ذکر کئی صفحوں میں کیا ہے، لیکن اس کے دور حکومت

---

[1] میر خورد نے مولانا فخر الدین زرادی کے درس ہدایہ کا ذکر کیا ہے، دیکھو ص ۲۶۸ گیلانی جلد اول ص ۱۱۱

[2] فرشتہ جلد اول ص ۲۱۳

[3] مسالک الابصار انگریزی ترجمہ علی گڈھ ص

Marfat.com

میں حکومت کچھ ایسے پیچیدہ مسائل سے دوچار رہی کہ سلطان کا زیادہ تر وقت اور کوشش ان ہی کے حل کرنے میں صرف ہوئے، پھر بھی دہلی میں کم از کم ہم کو معلوم ہے کہ مدرسوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کتنے مدرسے ایسے تھے جو اس سلطان کے عہد میں قایم ہوئے، اگر شہاب الدین العمری کی بتلائی ہوئی تعداد یعنی ایک ہزار صحیح ہے تو یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ان میں سے اکثریت ایسے مدرسوں کی ہوگی جو پہلے سے وجود میں آچکے ہوں گے۔

بہرحال اس کی شہادت تو موجود ہے کہ جب سلطان نے نیا دارالسلطنت تعمیر کرایا تو اس میں مدرسہ اور مسجد خاص طور پر نمایاں عمارتیں تھیں، بدرچاچ نے ان کی تعریف میں جو قطعہ پیش کیا ہے اس کے دو شعر یہ ہیں:-

رئیس مدرسہ او معلم ؛ امام مسجد او طوطی شکر گفتار

تمام گشت بتاریخ وادخلوا فیہا ؛ کشادہ باتو بگویم کہ بفصد وچل وچار

(۷۴۴)

محمد بن تغلق پر جیسا کہ اس کے خود نوشت سوانح سے معلوم ہوتا ہے ایک دور ایسا گذرا تھا جب کہ اس کا ایمان متزلزل ہوگیا تھا، اس کا ایک سبب یہ تھا کہ کچھ دنوں تک اس کو فلسفہ ومنطق سے بہت شغف رہا اور اس زمانہ میں علماء منطق و فلسفیوں کی وہ بہت سرپرستی کرتا رہا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سلطان کے اس دور گمراہی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہوگا کہ فلسفہ سے لوگوں کو دلچسپی بڑھ گئی ہوگی اور معقولات کی طرف توجہ زیادہ کرنے لگے ہوں گے۔

محمد بن تغلق کا جانشین فیروز شاہ اس سے بہت مختلف تھا اور جہاں تک تعلیم اور تدریس کا تعلق ہے تو اس کا عہد سلطنت دہلی کی تاریخ میں یادگار عہد کہا جاسکتا ہے، ضیاء الدین برنی نے سلطان کے اقدامات کا ذکر کیا ہے جو تعلیم کی ترقی کے لئے اس سلطان نے کئے، اس کے الفاظ اس قدر دلچسپ ہیں کہ طوالت کے باوجود ان کو یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، برنی لکھتا ہے:-

Marfat.com

"و ادرارات و انعامات و وظائف علماء و مشائخ و مدرسان و مفتیان و مذکران و متعلمان و حافظان و مقربان (مقریان؟) و ارباب مساجد و آستانہ داران و حیدیان و قلندران و مسکینان دار الملک دہلی از ہزار ہا گذشت و بہ لکھا رسید و مساجد و مدارس قدیم و جدید کہ خالی و مندرس گشتہ بود از مدرسان و مذکران و متعلمان مشحون و مملو گشت و رونق علم و رواج تعلیم از سر پیدا آمد و بہ ہزار ادرار استادان دیہا انعام یافتند و مبجل و معظم شدند و آنان را کہ صدگان و دویستگان تنکہ ادرار بودہ است و آن ادرار مندرس گشتہ و آن دفاتر محو شدہ چہار صدگان و پانصدگان و ہزارگان تنکہ ادرار تعین فرمود و طوائفے کہ از طالبان علم محتاج دہ تنکہ بودند صدگان و دویستگان و سیصدگان تنکہ ادرار معین گشت و علماء و متعلمان شہر از خرد و بزرگ با نعمت و ثروت شدند و از فقر و فاقہ و احتیاج و خواست خلوص یافتند و بیشترے از طوائف مذکور کہ کفش در دست نداشتند از مراحم سلطان فیروز شاہی جامہائے لطیف می پوشند و بر اسپان چیدہ سواری شدند و بیشتر در علوم دین و بہ تعلم احکام شرع مشغول می باشند"[1]

فرشتہ نے سلطان مذکور کی بنوائی ہوئی عمارتوں وغیرہ کی تعداد دی ہے۔ خود سلطان نے بھی فتوحات فیروز شاہی میں ان کا ذکر کیا ہے، ان میں مدرسوں کی تعداد تیس بتلائی ہے۔ بعض مورخین نے پچاس لکھی ہے۔ بہرحال ان میں سب سے بڑا مدرسہ فیروز شاہی تھا جس کی تعریف برنی نے کئی صفحوں میں کی ہے۔ اس کو وہ "بس بو العجب عمارتے بر سر حوض علائی"، کہتا ہے کہ

"ہر کہ از مقیمان و مسافران در مدرسۂ فیروز شاہی در می آید ہمچنین تصور می کند کہ مگر در بہشت عدن در آمدہ"

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۹

اس کی دلکش عمارتیں دیکھ کر آنے والے کا غم دور ہو جاتا ہے، مغموم دل مسرور ہو جاتا ہے وہ اپنے گھر کو اور کاموں کو بھول جاتا ہے، سیاح جو اس کو دیکھتا ہے تو تعریف کرتا ہے کہ اگرچہ میں نے بہت سے شہروں کی سیر کی ہے اور ہزاروں عمارتیں دیکھی ہیں لیکن ”در مثل شیرینی عمارت و ہوائے روح افزائے مدرسہ مذکور در بسیط عالم عمارتے و بنائے ندیدہ ام“ عمارت ہی کی تعریف نہیں بلکہ برنی نے اس کی تعریف میں یہ بھی کہا ہے کہ

”در و او ہم عبادت لازمہ و ہم عبادت متعدیہ مودی می شود و فرائض خمسہ بہ جماعت مسنون می گذارند و صوفیان نماز چاشت و اشراق و فی زوال و اوابین و تہجد ادا می کنند و لیلاً و نہاراً ذکر می گویند....“

برنی کے اس بیان کی کہ لوگ بہ کثرت اس کو دیکھنے آتے ہیں، دوسرے ہمعصر مورخ بھی تصدیق کرتے ہیں، سیرت فیروز شاہی نے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

از پے نظارہ دیدارہ و شرق و غرب ☆ کارواں در کارواں و قافلہ در قافلہ

اس مدرسہ کی بنیاد فیروز شاہ کی تخت نشینی کے فوراً ہی بعد یعنی ۷۵۳ھ / ۱۳۵۲ء میں رکھی گئی، حوض علائی جس کے کنارے پر یہ عمارت بنائی گئی خشک ہو گیا تھا اور اس میں کاشت ہونے لگی تھی، فیروز شاہ نے اس کو صاف کرا کر پھر حوض کی شکل دی، اس میں اس قدر زیادہ مرمت کی گئی تھی کہ تیمور نے تو یہ ہی کہہ دیا ہے کہ فیروز شاہ نے اس کو بنوایا، اس کی وسعت کا اندازہ تیمور کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ اس کی ہر سمت تیر کی ایک پرواز سے زیادہ تھی، مدرسہ کے ساتھ ہی اساتذہ و طلباء کے لئے مکانات یعنی دارالاقامہ تھے، اس کے علاوہ جو لوگ مدرسہ میں باہر سے آتے تھے ان کے لئے مہمان خانے بھی تھے، جن مضامین کی تعلیم یہاں دی جاتی تھی ان کا ذکر برنی نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

”متعلمان را ہموارہ تعلیم می کنند و تفسیر و حدیث و فقہ می خوانند و ہر روز حافظان در ختمہائے قرآن مشغول می باشند“

Marfat.com

مولانا جلال الدین رومی مدرس اعلیٰ تھے، مدرسہ فیروزی کے متعلق اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی بنا پر بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت یہ کالج نہیں تھا بلکہ یونیورسٹی تھی، اس کو فیروز شاہ کی یونیورسٹی کہنا بیجا نہ ہوگا، اس مدرسہ کے ایک استاد کا ذکر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کیا ہے، ان کا نام سید یوسف بن سید جمال الحسینی مشہدی (متوفی ۷۹۰ھ) نہایہ صاحب تصنیف تھے۔[1]

اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ فیروز شاہ کو غلاموں سے بہت دلچسپی تھی، چنانچہ بڑھتے بڑھتے اس کے غلاموں کی تعداد ایک لاکھ اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی، ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا وہ خاص طور پر خیال رکھتا تھا، اور حسب ضرورت ان کو باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی اور ہر ایک کسی فن کی تربیت کے لئے ان کا انتخاب کیا جاتا تھا، اس طرح سے ہزاروں کی تعداد میں تربیت یافتہ اہل حرفہ تیار ہو گئے۔[2]

فیروز شاہ کی وفات کے دس سال بعد یعنی ۱۳۹۸ء میں تیمور برصغیر پر حملہ آور ہوا اور دہلی کو تاراج کیا، تیمور علم دوست بادشاہ تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کی قتل و غارت گری اور خونریزی سے تہذیب و تمدن کے ذخیرہ ہائے گراں مایہ کو جو نقصان پہنچا اس کے لئے تاریخ اس کو معاف نہیں کر سکتی، تغلقوں کے زوال کے بعد دہلی کے تخت پر سید خاندان کے چار سلطان بیٹھے یہ سب کمزور حکمران تھے اور باوجودیکہ بعض میں ذاتی خوبیاں تھیں، وہ سلطنت کی حالت کو زیادہ نہ سنبھال سکے، آخری سید بادشاہ سلطان علاء الدین عالم شاہ نے بدایوں میں سکونت اختیار کر لی اور دہلی کا تخت بہلول کو دیدیا، بہلول تخت دہلی پر قبضہ تو کر ہی چکا تھا، عالم شاہ کی اس اجازت کے بعد اس نے باقاعدہ حکومت سنبھال لی۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۵۰

[2] تفصیل شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

لودھیوں کے تین سلاطین میں سے پہلے دو یعنی سلطان بہلول و سلطان سکندر قابل ذکر ہیں بہلول خود تو زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا، لیکن وہ علماء کی قدر کرتا تھا اور ان کی صحبت سے مستفیض ہونے کی کوشش کرتا تھا عبد الباقی نہاوندی لکھتا ہے:۔

سلطان بہلول بظاہر صلاح آراستہ و بہ متابعت شریعت غرا کمال تقید داشت ...... بیشتر اوقات بمجالست علماء و مصاحبت فقراء گذرانیدے" [1]

سلطان بہلول کا بیٹا اور جانشین ہماری علم و ادب کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے، یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس نے دار الحکومت دہلی سے تبدیل کر کے آگرہ کو اپنا مستقر بنایا، اسی وقت سے یہ نیا دار الحکومت ترقی کر کے دہلی کی طرح علم و فن کا بھی مرکز بن گیا

جونپور

فیروز شاہ کے بعد سلطنت دہلی کا زوال شروع ہو گیا، اس زمانہ میں چند نئی خود مختار سلطنتیں مختلف علاقوں میں وجود میں آئیں ان میں سے بعض نے بہت ترقی کی، یہ نامناسب نہ ہوگا کہ تعلیم کی ترقی کے لئے جو کوششیں یہاں کی گئیں ان کی طرف مختصر اشارے کر دئے جائیں۔

دہلی سے مشرق کی جانب جونپور کی سلطنت تھی جس کو اکثر شرقی سلطنت بھی کہا جاتا ہے دہلی کے علاوہ جو شہر بحیثیت مراکز علمی مشہور ہوئے ان میں جونپور کا نام صف اول میں نظر آتا ہے، اس نے سب سے زیادہ ترقی سلطان ابراہیم شاہ کے عہد میں کی وہ علماء و مشائخ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا اور ان کو انعامات و وظائف دیتا تھا، جونپور کی شہرت تعلیمی مرکز کی حیثیت سے اس قدر بڑھ گئی تھی کہ فرشتہ نے اس کو دار العلم جونپور لکھا ہے [2] ابراہیم شاہ کے بعد اس کا بیٹا محمود شاہ تخت پر بیٹھا اس کی بیوی بی بی راجی نے ایک عالیشان مسجد اور مدرسہ و خانقاہ

---

[1] مآثر رحیمی، جلد اول ص ۴۳۸

[2] جونپور نامہ بحوالہ نزہۃ الخواطر ۱۰۱۴

بنوائے اسان سب کو مجموعی نام نماز گدھکا دیا، مدرسہ میں اساتذہ وطلباء دونوں کے لئے وظائف کا انتظام تھا۔[1]

جونپورنامہ کی ایک روایت کے مطابق سکندر لودھی نے جب حسین شاہ مشرقی کے عہد میں جونپور پر قبضہ کیا تو مقدس عمارتوں کے علاوہ باقی سب کو تباہ کردیا، اس میں مدرسے بھی شامل تھے، لیکن جلد ہی جونپور نے اپنی کھوئی ہوئی علمی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرلیا اور مغلوں کے عہد میں وہ پھر ایک عظیم علمی مرکز بن گیا۔

بنگال

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ بنگال کے پہلے مسلم فاتح یعنی محمد بن بختیار خلجی نے اس علاقہ میں مساجد ومدارس تعمیر کرائے فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

> در سرحد بنگالہ در عوض شہر لندیا شہرے موسوم بہنگ پور بنا کردہ دار الملک خود ساخت و مساجد و خانقاہ و مدارس دراں شہر و ولایت ...... برسم شعار اسلام بر رونق و رواج تمام مزین و محلی گردانید[2]

سلاطین بنگال میں سے اکثر علم دوست اور ہنر پرور تھے۔ ان کا ایک عظیم تاریخی کارنامہ یہ تھا کہ بنگلہ کو ترقی دینے کے لئے انہوں نے موثر اقدامات کئے، یہاں اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی نہیں ڈالی جاسکتی، لیکن نرندرناتھ لا کے قول کے مطابق بنگلہ کو ادبی درجہ پر پہنچانے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے[3] ابتدائی دور کے مدارس کے علاوہ اور بھی آثار ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلاطین بنگال تعلیم کی ترقی کے لئے کیا کیا کوششیں کرتے رہے، قریہ عمرپور کے متصل ایک مقام درس باڑی کہلاتا ہے اس کا نام ظاہر کرتا ہے کہ یہ مدرسہ ہوگا، اگرچہ کہ یوسف شاہ کے عہد کا جو کتبہ موجود

---

[1] جونپورنامہ بحوالہ نرندرناتھ لا ص ۱۰۱

[2] جلد دوم ص ۵۷۲

[3] لا ص ۱۰۷

Marfat.com

ہے، اس میں مسجد کا ذکر ہے لیکن محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ (جلد ۱۵ ص ۷۶) کا یہ بیان کہ یہ مسجد ایک مدرسہ سے ملحق تھی قطعی طور پر قرین قیاس ہے، اسی رپورٹ کی جلد ۱۴ میں ایک اور مدرسہ کا ذکر ہے جو ستھی پورہ میں واقع تھا۔ یہ جگہ ابھی آج تک مدرسہ ٹیلہ کے نام سے مشہور ہے، پانڈوہ میں حضرت قطب العالم کے مزار سے ملحق ایک مدرسہ اور دار الشفاء تھا جس کے لئے حسین شاہ نے جائداد وقف کی[1] اسی سلطان کا بنوایا ہوا ایک اور مدرسہ عوز میں تھا اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمارت نہایت وسیع اور خوشنما تھی[2] پروفیسر لا نے خورشید جہاں نما مصنفہ الٰہی بخش الحسینی (مخطوطہ دیش بنگ سوسائٹی بنگال) کے حوالہ سے گھوڑا شہید کے ایک مدرسہ کا ذکر کیا ہے، قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ بھی حسین شاہ کا تعمیر کردہ تھا، ان چند حوالجات اور اشاروں کی بنا پر ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بنگال کے مسلم سلاطین نے دینی و دنیوی دونوں علوم کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، یہ دلچسپ موضوع ہے اور اس پر ریسرچ کی کافی گنجائش ہے۔

کشمیر کشمیر میں اسلامی حکومت چودھویں صدی عیسوی کے ابتدا میں قائم ہوئی اور بانی سلطنت شاہ میر یعنی سلطان شمس الدین کا خاندان ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت تک حکمرانی کرتا رہا، ان سلاطین میں کئی بادشاہ اپنی علم دوستی کے لئے مشہور ہیں، مختصراً ان میں سے کم از کم دو تین کے متعلق یہاں کچھ لکھا جا سکتا ہے، سلطان سکندر کی علم پروری کی طرف فرشتہ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

"سلطان سکندر بمرتبہ سخاوت داشت کہ از شنیدن آوازہ آن دانشمندان عراق وخراسان و ماوراء النہر بملازمتش آمدند و علم وفضل و اسلام در مملکت کشمیر رواج تمام پیدا کردہ نمونۂ عراق وخراسان گردید"

---

[1] اسٹورٹ، ہسٹری آف بنگال ص ۱۱۳

[2] ریون شا، گور بحوالہ لا ص ۱۱۰

Marfat.com

اس کے علاوہ یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ

"از جملہ علما سید محمد نام عالمے را کہ سر آمد روزگار بود بسیار تعظیم نمود و آداب دین از وے می آموخت"[1]

سلطان زین العابدین کی کوششوں کا ذکر فرشتہ میں ملتا ہے، یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کشمیر کی مشہور تاریخ راج ترنگینی اسی زمانہ میں لکھی گئی[2] دوسرا سلطان جس نے تعلیمی ترقی کے لئے نمایاں کوشش کی حسین شاہ چک تھا، اس کے قائم کئے ہوئے مدرسہ کا فرشتہ نے ذکر کیا ہے

"حسین چک مدرسہ بنا نمود و با علماء و صلحاء آنجا صحبت می داشت و پرگنہ زین پور را بجاگیر این طائفہ مقرر کرد"[3]

گجرات و مالوہ

سلطنت گجرات کی تاریخ بادشاہوں، امیروں اور علماء و مشائخ کی علمی ادبی کوششوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں متعدد مدرسے قائم ہوئے اور مجموعی طور پر گجرات علم و ادب کا گہوارہ بن گیا[4] اس سلسلہ میں بعض واقعات اور شخصیتوں کا ذکر دوسرے ابواب میں کیا جا چکا ہے۔

گجرات کی طرح مالوہ کی سلطنت میں بھی علوم کی اشاعت بہت وسیع پیمانہ پر ہوئی اس خاندان کے کئی حکمران علم و ادب کے دلدادہ تھے، مالوہ کے دارالحکومت منڈو میں جس کو شادی آباد کہا جاتا تھا بڑا مدرسہ تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔ سلطان محمود شاہ

---

[1] فرشتہ۔ جلد دوم ص ۶۵۳

[2] فرشتہ۔ جلد دوم ص ۶۶۰

[3] فرشتہ۔ جلد دوم ص ۶۹۲

[4] مولانا ابوالحسنات ندوی نے اپنے مختصر رسالہ "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" میں چند مدرسوں کے نام وغیرہ دئے ہیں ص ۴۰-۴۹

Marfat.com

کی وفات کے بعد اس کے دفن کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

"نعش سلطان ہوشنگ را برداشتہ متوجہ مدرسہ شادی آباد شدند

و روز غرہ نہم ذی الحجہ آنجا بہ خاک سپردند"[1]

ہوشنگ کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ تخت پہ بیٹھا، اس کا دور حکومت ایک سال سے کچھ زیادہ تھا، اس کے بعد سلطان محمود خلجی تخت نشین ہوا، سلطان محمود کا شمار اس سلطنت کے بہترین حکمرانوں میں کیا جاتا ہے، شروع ہی سے اس نے علم کی سرپرستی کی، فرشتہ کا بیان ہے

"چوں سلطنت بروقرار گرفت ہمت بر تربیت علماء و فضلاء گماشتہ ہر جا از ارباب کمال کسے را می شنیدند فرستادہ او را طلب می نمود و در ولایت خود مدرسہ ساختہ علماء و فضلاء و طلاب را وظیفہا مقرر کردہ با فادہ و استفادہ مشغول گردانید"[2]

عبد الباقی نہاوندی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کے عہد میں مالوہ "یونان ثانی" بن گیا تھا۔[3] اسی مورخ نے ذکر کیا ہے کہ راجپوتانہ کی جنگ کے زمانہ میں بعض بت خانوں کو توڑ کر "مساجد و مدارس ساخت"، راجپوتانہ میں شاندار فتوحات حاصل کرنے کے بعد وہ جب منڈو واپس آیا تو "در آخر ذی الحجہ سال مذکور یعنی ۸۴۶ھ) مدرسہ و بینارہ ہفت منظرے محاذ مسجد جامع ہوشنگ شاہی طرح انداخت"[4]

---

[1] فرشتہ۔ جلد دوم ص ۴۷۵

[2] فرشتہ۔ جلد دوم ص ۴۸۰

[3] مآثر رحیمی۔ جلد اول ص ۱۲۵

[4] فرشتہ جلد دوم ص ۴۸۸ نیز مآثر رحیمی جلد اول ص ۱۳۳

Marfat.com

ایک اور مدرسہ کے آثار سارنگپور میں موجود ہیں[1] محمود کا بیٹا سلطان غیاث الدین عورتوں کی حالت بہتر کرنے اور ان کو تربیت دینے میں بہت دلچسپی لیتا تھا، فرشتہ لکھتا ہے کہ :-

"ہمچنین کنیزان را صناعت و ہنرہا کہ در جہان شایع و متعارف است بیاموخت"

پھر آگے وہ ان صنعتوں کو گنواتا ہے، ان میں آہن گری، زرگری، مخمل بافی، تیرگری، خیاطی، کفش دوزی، نجاری، کشتی گری وغیرہ شامل تھے، ان عورتوں کو سپہ گری میں تربیت دلوائی تھی فرشتہ کی شہادت ان الفاظ میں ملتی ہے :-

"پانصد کنیز ترک را لباس مردان پوشانیدہ تیر اندازی و نیزہ داری بیاموخت و ایشان را سپاہ ترک نامیدہ در میمنہ خود جائے داد تا نیزہا در دست گرفتہ ترکش بر میان بستہ بایستند و پانصد کنیز حبشی را از لباس زنان بر آوردہ تفنگ اندازی و شمشیر بازی تعلیم کردہ سپرد بایشان حوالہ نمود"[2]

غیاث الدین نہایت نیک اور باعمل مسلمان تھا، خود بھی تہجد گذار تھا، اور تاکید کرکے محل کے دوسرے لوگوں کو بھی نماز پڑھواتا، وہ مجلس ادا ملاّنا مشروع و آنچہ غم آورد نمی گفتند و بہ مسکرات ہرگز رغبت نمی نمود"

---

[1] اس کے کتبہ کا ایک ٹکڑا موجود ہے، مولانا ابوالحسنات نے اس کی کچھ عبارت نقل کردی ہے اس میں صاف ذکر ہے :-

بناء ہذہ المدرسہ فی عہد السلطان الاعظم معین الدنیا والدین محمود شاہ الخلجی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ ..... دیکھیو ۶۷

[2] فرشتہ جلد دوم ص ۵۰۴

سلاطین مالوہ کے عہد کے اور مدرسوں کے آثار و شواہد بھی ملتے ہیں، مثلاً اجین کے ایک مدرسہ کا ذکر تزک افغانی میں اور ظفرآباد کے مدرسہ کا آثار خیر میں ہے۔[1]

دکن

دکن کی پہلی خود مختار سلطنت سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں وجود میں آئی تھی، اس وقت سے لیکر عالمگیر کے عہد تک دکن کا بیشتر علاقہ عملی طور پر خود مختار رہا اور اس دوران میں وہاں کئی سلطنتیں قائم ہوئیں سلاطین دکن اور وہاں کے علماء و فضلاء نے تعلیم کی ترقی میں اس قدر نمایاں کوشش کی ہے کہ اس کے مختصر ذکر کی بھی اس کتاب میں گنجائش نہیں، لیکن تعلیمی زندگی کی تصویر مکمل کرنے کی غرض سے بعض سلاطین کی کوششوں اور چند مدرسوں کا ذکر ناگزیر ہے۔

بہمنی سلطنت کا بانی علاءالدین حسن علم دوست بادشاہ تھا، اگرچہ ابتدائی زمانہ میں اس کی مصروفیت غیر معمولی تھی لیکن پھر بھی وہ علماء و فضلاء کا خاص خیال رکھتا تھا۔ اس سے دریافت کیا گیا کہ اس کی ترقی کے کیا اسباب تھے تو اس نے جواب دیا کہ:

"با دوست و دشمن طریق احسان مسلوک داشتیم...... و از جملہ علماء و مشائخ کہ معاصر سلطان بودند"[2]

طلبہ تاریخ یہ جانتے ہیں کہ عصامی کی فتوح السلاطین جس کو وہ شاہنامہ ہند کہتا ہے علاءالدین کی سرپرستی میں لکھی گئی ہے[3] سلطان مجاہد شاہ کے متعلق فرشتہ نے لکھا ہے کہ زبان ترکی نیکو

---

[1] بحوالہ قدیم درس گاہیں ص ۷۰

[2] فرشتہ جلد اول ص ۵۳۴

[3] قاضی بہاءالدین کے ذریعہ عصامی کی رسائی سلطان علاءالدین تک ہوئی، اسی کے نام کتاب کا انتساب کیا گیا، دیکھو مقدمہ فتوح السلاطین از پروفیسر یوشع مدراس ۱۹۴۸ء ص ۵۔ انتساب ان اشعار میں کیا گیا

شہا چون توئی ختم شاہان ہند ٭ بنامت من، این نامہ شد پسند
کنم ختم اے ختم جملہ شہان ٭ بدان تا جنامت بگیرد جہان

فتوح السلاطین ص ۶۰۹

Marfat.com

می گفت و مدار مجالست و مصاحبت او بر ترکان و فارسی زبان بود[1]۔" اس کے بعد محمود شاہ بہمنی بھی قابل ذکر ہے:۔

"باعلماء مجالست نموده کما ینبغی رعایت خاطر ایشان می نمود و در عهد فجسته وے شعرائے عرب و عجم به دکن آمده از سر چشمه انعام و احسانش مستفید گردیدند[2]"

محمود شاہ نے خاص طور پر یتیموں کے لئے مدرسہ بنوایا، جس میں نادار طلباء کی تعلیم اور خورد و نوش کا سارا انتظام حکومت کی طرف سے تھا۔[3] اس مدرسہ کے علاوہ اس نے دوسرے مقامات پر بھی یتیموں کے لئے مدارس قائم کئے، فرشتہ کا بیان ہے:۔

"از برائے یتیمان در گلبرگہ و بیدر و قندھار و ایلچپور و دولت آباد و جنیر و چیول و دابل و دیگر شہر ہا و قصبہائے بزرگ معلمان نشانده اخراجات معین کرده در تعلیم ایشان می کوشید۔"

اسی بیان کو جاری رکھتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ نابیناؤں کے ساتھ خاص سلوک کرتا تھا بلکہ لوگ اس کی اس سخاوت سے فائدہ اٹھانے کے لئے جان کر اندھے بن جاتے تھے[4]۔

سلطان فیروز شاہ بہمنی اس خاندان کے عظیم حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے، فرشتہ نے خاجی محمد قندھاری کی روایت بیان کی ہے کہ ہر روز وہ ایک جزو کلام اللہ کا لکھتا تھا و ساعت کو دریا تین پہر روز باعلماء و مشائخ و شعراء و قصہ خوانان و افسانہ گویان و ندیمان و خوش طبعان طبیعت شگفتہ می داشت۔ ان لوگوں کو اس نے اجازت دے رکھی تھی کہ ان مجالس میں

---

[1] جلد اول ص ۲۴۴

[2] فرشتہ جلد اول ص ۲۷۶

[3] تاریخ قندھاری بحوالہ ص ۸۴

[4] فرشتہ جلد اول ص ۲۷۸

Marfat.com

بالکل بے تکلف ہو جائیں اور اس کو بادشاہ تصور نہ کریں، اس کا حافظہ بہت عمدہ تھا اور اشعار بکثرت یاد تھے، خود بھی شعر کہتا، کچھ عرصہ تک عروضی اور پھر فیروزی تخلص تھا اس کو تفسیر، اصول، حکمت طبیعی و نظری سے دلچسپی تھی، اصطلاحات صوفیہ سے بھی واقف تھا اس کے حرم میں مختلف قسم کی عورتیں تھیں جن سے وہ ان ہی کی زبان میں گفتگو کرتا تھا ان میں ترک و فرنگ و خطائی و افغان و راجپوت و بنگالی و گجراتی و تلنگی و کنہری و مرہٹی و غیر ذالک کا ذکر کیا گیا ہے[1] اس کو غیر مسلم فضلاء سے بھی دلچسپی تھی، علم ریاضی و ہندسہ سے بھی واقفیت تھی اور فلکیات کا بھی شوق رکھتا تھا چنانچہ ۸۱۰ھ میں اس نے حکیم حسن گیلانی اور سید محمد گازرونی کو متعین کیا کہ وہ بالاگھاٹ دولت آباد میں رصد بنائیں، لیکن اول الذکر کی وفات کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہو سکا[2] فیروز شاہ کے بعد اس کا بھائی احمد شاہ تخت پر بیٹھا علم پروری میں وہ فیروز شاہ کے قدم بہ قدم چلتا تھا احمد شاہ حضرت سید محمد گیسو دراز کا بہت معتقد تھا اور گلبرگہ میں ان کے لئے مکان اور مدرسہ اسی نے بنوایا تھا۔[2]

مدرسہ محمود گاواں | سلطان محمد شاہ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، لیکن سلطان سے زیادہ علم کی خدمت اس کے وزیر خواجہ محمود گاواں[3] نے کی۔ یہ وزیر نہایت قابل اور علم دوست تھا وہ خود بھی علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت رکھتا تھا، تصنیف و تالیف سے اس کو بے حد دلچسپی تھی، روضۃ الانشاء اور ایک دیوان اس کی یادگار ہیں اس کے

۱؎ فرشتہ جلد اول ص ۳۰۲

۲؎ ایضاً ص ۳۸

۳؎ خواجہ محمود گاواں کے خلاف کچھ لوگوں نے سازش کی اور محمد شاہ کو جو سخت عیاش و شراب خوار تھا بہکا کر اس کو قتل کروا دیا اس وقت خواجہ کی عمر ۷۸ سال تھی، اس کے کارناموں اور شہادت کے عبرت انگیز واقعات پر اس کے ایک شاگرد ملا عبدالکریم ہمدانی نے ایک کتاب لکھی جو فرشتہ کا خاص ماخذ ہے۔ دیکھو فرشتہ جلد اول ص ۳۶۹

Marfat.com

ذوق علمی کی سب سے بڑی شہادت حدیقۃ الاقالیم[3] کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ وفات کے وقت اس کے مکان سے پینتیس ہزار کتابیں مختلف علوم و فنون پر نکلیں، فرشتہ لکھتا ہے :-

"وصیت سخاوتش عالمگیر شد، ہیچ بلدہ و قریہ در ربع مسکون نماند کہ انعام او در انجا باہل استحقاق رسیدہ باشد و بحسن خلق با دم زندگانی می کرد و بکمال شگفتگی با خلایق سلوک می نمود"[1]

محمود کے کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں بیدر کے مدرسہ کی تعمیر ہے، اپنی خوبی و افادیت کے لحاظ سے برصغیر کی علمی تاریخ میں اس مدرسہ کا ایک اعلیٰ مقام ہے۔ ۱۰۲۳ھ تک جبکہ فرشتہ اپنی تاریخ لکھ رہا تھا۔

"در آن عمارت مسجد و چار طاق بازار بزرگ باقی است و از لطافت و پاکیزگی چنان در نظر می آید کہ حالا بنایان دست از تعمیر ان باز داشتہ اند"[2]

اتنا زمانہ گزرنے کے بعد اور مختلف انقلابات کے باوجود آج بھی اس مدرسہ کے کھنڈر سیاحوں کے لئے ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں اس کے استحکام اور وسعت کا اندازہ ان آثار سے آج بھی لگایا جا سکتا ہے، ایک انگریز مصنف میڈوز ٹیلر اپنی تاریخ ہند میں اس مدرسہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے۔

بیدر میں محمود گاواں کا عمدہ مدرسہ تھا یا اس عہد کی سب سے شاندار عمارت ہے، ایک مسطح عمارت تھی جس میں چاروں طرف دو منزلہ محرابیں تھیں

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۳۹۶ [2] عالمگیر کے عہد میں اس مدرسہ کو ایک حادثہ سے سخت صدمہ پہنچا بارود کے ذخیرہ میں جو وہاں رکھا گیا تھا آگ لگ گئی اور عمارت کے بعض حصوں کو نقصان پہنچ گیا۔

Marfat.com

اور پیچھے کمرے، خاص عمارت کے سامنے کونوں پر سو سو فٹ سے زیادہ اونچے مینار تھے، اس کے سامنے کی دیوار پر چینی کے ٹائل تھے جن میں نیلی، انہدا اور سرخ زمین پر پھول بنے ہوتے تھے اور خط کوفی میں قرآن کی آیتیں تھیں ان سب کا مجموعی اثر نہایت عمدہ اور پاکیزہ ہوتا تھا[1]

مدرسہ کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی عمارت کا طول شرقاً غرباً پچھتر اور عرض شمالاً جنوباً پچپن گز تھا اس سے ملحق ایک وسیع مسجد بھی تھی اور چاروں طرف مدرسین وطلباء کے قیام کے لئے حجرے تھے جو طلباء یہاں قیام کرتے ان کے جملہ مصارف وقف سے دیئے جاتے تھے، مدرسہ کے کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں محمود گاواں کی دی ہوئی تھیں، غرض کہ یہ مدرسہ ہر لحاظ سے ایک یادگار اور تاریخی ادارہ کہا جا سکتا ہے اس کی تاریخ سامعی نے کہی ہے[2]:-

این مدرسہ رفیع محمود بنا ٭ چون کعبہ شدہ است قبلۂ اہل صفا

آثار قبول بین کہ شد تاریخش ٭ آیت ربنا تقبل منا

محمود شاہ کے بعد بہمنی سلطنت کا زوال شروع ہو جاتا ہے، اس کے جانشین محمود شاہ کے زمانہ میں سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے اور کئی سلطنتیں وجود میں آ گئیں، بہمنیوں کی علمی خدمات کے متعلق فرگسن کا بیان اس قابل ہے کہ اس کو نقل کر دیا جائے، ان سلاطین کے زمانہ میں

عربی فارسی کی تعلیم دیہاتوں کے مدرسوں کے ذریعہ پھیلی، یہ مدرسے مساجد سے ملحق ہوتے تھے اور ان کے اخراجات کے لئے زمینیں وقف کر دی جاتی تھیں ...... اس انتظام کی بدولت علوم کی بھی اشاعت ہوتی تھی اور حکمرانوں کے مذہب کی بھی، ان کوششوں کے نتائج آج بھی وسیع پیمانہ پر نظر آتے ہیں[3]

---

[1] ہسٹری آف انڈیا ص ۱۸۵
[2] فرشتہ جلد اول ص ۳۴۹
[3] فرگسن۔ آرکی ٹیکچر آف بیجاپور ص ۱۲

Marfat.com

مغلیہ حکومت کا ابتدائی دور

بابر اور ہمایوں کے علمی ذوق اور ان کی علوم و فنون کی سرپرستی کا حال بیان کیا جا چکا ہے، بابر کو برصغیر میں صرف چار سال رہنے کا موقع ملا اور اس مدت کا بیشتر حصہ جنگی فتوحات میں صرف ہوا، ان حالات میں یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ وہ بہت سے مدرسے قائم نہ کر سکا، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کو بڑے مدرسے قائم کرنے کی ضرورت کا احساس تھا اور یہاں وہ ان کی کمی محسوس کرتا تھا[1]، مگر حالات نے اس کو اس کی اجازت نہ دی کہ وہ اس کمی کو دور کرتا۔ نرندرناتھ لاہا نے پروفیسر شاستری کے ایک مضمون کے حوالہ سے لکھا ہے کہ محکمہ شہرت عامہ کے ذمہ ایک گزٹ کی اشاعت کے علاوہ مکتب اور مدرسے بنوانے اور قائم کرنے کا کام بھی تھا[2]۔

ہمایوں کے دور حکومت (۱۵۳۰–۱۵۴۰ء) کے دس سال جنگ اور پریشانی میں گزرے لیکن ان دشواریوں کے باوجود اس نے علوم و فنون کی سرپرستی کے لئے اقدامات کئے جن میں سے بعض کا ذکر کیا جا چکا ہے یہاں صرف یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ آئین اکبری میں ہمایوں کے بنائے ہوئے دہلی کے ایک مدرسہ کا ذکر ہے، جس میں شیخ حسین[3] بحیثیت مدرس کام کرتے تھے۔ اسی

---

[1] بابر کی خود نوشت سوانح حیات یعنی تزک بابری میں ہندو پاکستان میں بعض اشیاء کے نہ ہونے کا ذکر ہے وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان کے رہنے والوں کے پاس نہ اچھے گھوڑے ہیں نہ اچھا گوشت نہ انگور اور تربوز نہ دوسرے خوش ذائقہ پھل، نہ برف نہ سرد پانی، نہ ان کے بازاروں میں اچھا کھانا ملتا ہے اور نہ ہی حمام اور مدرسے ہیں، ان کے پاس قندیلیں، مشعلیں اور شمع بھی نہیں۔ اس اقتباس سے یہ ظاہر ہے کہ بابر نے بہت مبالغہ آمیز باتیں کہی ہیں اور ان کو صحیح نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ بڑے مدرسوں کی کمی کا اس کو احساس تھا۔

[2] دیکھو نرندرناتھ لاہا ص ۱۲۷

[3] دیکھو آئین اکبری (انگریزی ترجمہ) جلد اول ص ۵۳۸

Marfat.com

طرح بدایونی نے ضمناً شیخ زین الدین خافی کے ذکر میں لکھا ہے کہ چنار کے قریب انہوں نے وفات پائی اور ایک مدرسہ میں دفن کئے گئے ایک اور مدرسہ کا بھی ذکر ہے جو ان کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا[1] ان دونوں مدرسوں کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود لڑائیوں کے بادشاہ اور نیز دوسرے لوگ تعلیمی اداروں کے قائم کرنے کی طرف سے بے خبر نہ تھے، یہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مختلف مقامات اور مساجد میں بہت سے مدرسے اور مکتب پہلے ہی سے موجود تھے۔

شیر شاہ کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی تھی جو اس عہد کا بڑا علمی مرکز تھا، اس کو علما و فضلاء کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کا بہت شوق تھا، وہ اکثر مدارس دیکھنے کے لئے خود جایا کرتا تھا[2] خود شیر شاہ کے بنوائے ہوئے ایک مدرسہ کا ذکر بھی ملتا ہے، یہ مدرسہ نارنول میں ہے[3] شیر شاہ کا بیٹا اور جانشین بھی اپنے باپ کی روایات قائم رکھتے ہوئے علما و فضلاء کی سرپرستی کرتا تھا۔

اکبر کے عہد میں تعلیمی ترقی

اکبر اگرچہ خود پڑھا لکھا نہ تھا، لیکن اس کو علمی ذوق تھا، علما و فضلا کی صحبت پسند کرتا تھا اور کتابیں پڑھوا کر سننے سے اس نے اتنی معلومات حاصل کر لی تھیں کہ بقول جہانگیر اس کی گفتگو سے کوئی یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا تھا کہ وہ ناخواندہ شخص تھا، اکبر کے مذہبی عقائد اور علم دوستی کے متعلق اس کتاب میں کافی تفصیل سے بحث کی گئی ہے، یہاں صرف ان مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا مختصر ذکر کیا جائیگا جو اس کی سرپرستی میں یا اس کے حکم سے قائم کی گئیں، انیسویں صدی کے ایک مصنف لالہ سیل چند نے ایک مدرسہ کا ذکر اپنی کتاب تفریح العمارات میں ان الفاظ میں کیا ہے:-

---

[1] منتخب التواریخ (انگریزی ترجمہ) جلد اول ص ۵۳۰

[2] منتخب التواریخ۔ جلد اول ص ۴۶۶

[3] رپورٹ آثار قدیمہ۔ جلد ۲۳ ص ۲۷

Marfat.com

"در عہد جلال الدین محمد اکبر شاہ جابجا مدرسہ ہا بودند، استادان فارس و شیراز تعلیم می فرمودند چنانچہ تا حال مدرسہ عالی اساس کہ رونق افزائے بوستان سخنوری است، حسب الارشاد الخلافت عظمت اساس دارند بشاہدہ مکانانش تخم حیرت دمیدہ قریب می دارد۔"[1]

اس مدرسہ کے آثار اب باقی نہیں۔ لیکن وہ علاقہ جہاں یہ واقع تھا اب مدرسہ محلہ کہلاتا ہے اس کے علاوہ اکبر نے فتحپور سیکری میں ایک مدرسہ بنوایا۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع تھا اور بہت کم سیاح اس جیسے مدرسہ کا پتہ دے سکتے تھے۔ آئین اکبری کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"در بفرمان گیہان خدا مسجدے و مدرسہ و خانقاہے برفراز آن کوہ انجام یافت جہان دیدگان بدان نمط کم نشان دہند۔"

اس مدرسہ کے علاوہ اکبر کی سرپرستی میں یہاں اور مدرسے بھی قائم ہوئے۔ اکبر کے عہد کی ایک مشہور درس گاہ مدرسہ ماہم انگا تھا۔ ماہم انگا اکبر کی آیا تھی اور ایک زمانہ میں جوان العمر بادشاہ پر اس کا بہت اثر تھا۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ ماہم انگا نے ایک مدرسہ قائم کرکے اس پر اس قدر رقم خرچ کی۔ مدرسہ کے سامنے ایک نہایت خوبصورت مسجد بھی تھی۔ یہ مدرسہ دہلی میں دہلی دروازہ کے باہر پرانے قلعہ کے سامنے واقع ہے اور آج بھی اس کے آثار سیاحوں اور آثار قدیمہ کے طلباء کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ مدرسہ کی تاریخ خیر المنازل[2] سے نکلتی ہے۔ تخت نشینی کے آٹھ سال بعد ایک روز

---

[1] تفریح العمارات بحوالہ قدیم درس گاہیں ص ۲۹ - ۲۸

[2] مدرسہ پر یہ کتبہ ہے:۔

به دوران جلال الدین محمد ⁂ که باشد اکبر شاہان عادل
چو ماہم بیگم عصمت پناہی ⁂ بناکرد این بنا بہر افاضل
ملے شد ساعی این بقعہ خیر ⁂ شہاب الدین احمد خان باذل
زہے خیریت این خیر منزل ⁂ کہ شد تاریخ او خیر المنازل

Marfat.com

اکبر شکار سے واپس آرہا تھا کہ ایک شخص نے اس مدرسہ کی عمارت پر سے اس کے تیر مارا، لیکن خوش قسمتی سے زخم بہت معمولی آیا۔

جہانگیر

اکبر نے جہانگیر کی تعلیم کا بہت اچھا انتظام کیا تھا، خاندانی روایات کے مطابق اس کو بھی علم و ادب اور تعلیم سے دلچسپی تھی، اس کی زندگی کے ایک پہلو یعنی شراب نوشی کو بعض مورخوں نے اس قدر نمایاں کر کے دکھایا ہے کہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے کاموں میں وہ دخل ہی نہیں دیتا تھا، حقیقتاً اس کے متعلق یہ تصور کرنا قطعاً غلط ہے بالخصوص ابتدائی دور میں تو اس نے اپنے پیش رو کی بعض پالیسیوں میں موثر تبدیلیاں کیں، ان ہی تبدیلیوں میں ایک قابل ذکر اقدام تعلیم سے متعلق تھا، اکبر کے عہد میں دینی اور عربی تعلیم کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی، اور جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا تعلیمی نصاب میں لادینی عنصر کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی تھی، جہانگیر نے عربی مدرسوں کی طرف توجہ کی اور وہ بہت سے مدرسے جن میں تیس سال سے چوپایوں اور پرندوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا از سر نو درست کئے گئے اور مدرسین اور طلبہ سے ان کو آباد کیا گیا[1] اس سے بھی زیادہ دلچسپ وہ فرمان ہے جس کی رو سے ان تاجروں اور مسافروں کا مال جن کا کوئی وارث نہ ہوتا تھا، مدرسوں وغیرہ پر خرچ کیا جاتا تھا، خافی خان نے اس فرمان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"حکم شد ہر جا کہ مسافر تاجر و مقیم مال دار فوت شود و وارث او حاضر نہ باشد
مال او را امانت نگاہ دارند و در صورت مفقود الاثر بودن وارث مال ترکہ میت
را صرف تعمیر و احداث مساجد و پل و مدرسہ و سرائے نمایند"[2]

ان دو واقعات کے علاوہ اور بھی اشارے تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں جن میں جہانگیر کی

---

[1] نسخہ نامہ ص ۱۷۵، بحوالہ تاریخ جان جہاں (مخطوطہ)

[2] دیکھو خافی خان، منتخب اللباب، جلد اول ص ۲۴۹

Marfat.com

کوششوں کا ذکر ہے، ۱۶۲۳ء میں صوبہ گجرات کے دیوان محمد صفی نے قلعہ ارک کے پھاٹک کے سامنے ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا، اس کا نام مدرسۃ العلماء[1] تھا، اس کے ساتھ مسجد اور دارالشفاء بھی تھا، چنانچہ اس کی تاریخ یعنی ۱۰۳۲ھ، اس شعر سے نکلتی ہے۔

سال اتمام ز معمار قضا جستم و گفت
مسجد و مدرسہ و دار شفائے آباد

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی تعلیم کے سلسلہ میں ایک مدرسہ کا ذکر کیا ہے جس کو وہ مدرسہ دہلی کہتے ہیں، یہ مدرسہ ان کے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر تھا اور چونکہ ان کو دو مرتبہ یعنی صبح اور سہ پہر کو جانا پڑتا تھا اس لئے روزانہ آٹھ میل چلتے تھے[2] بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں تعلیم کی اشاعت بہت بڑھ گئی تھی اور شاید ہی کوئی قصبہ اور گاؤں ایسا ہوگا جہاں کوئی مکتب یا مدرسہ نہ ہو۔

شاہجہاں

مغلیہ سلطنت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ چھ عظیم شخصیتیں یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے ہر گوشہ میں ترقی کی رفتار بغیر کسی رکاوٹ کے بڑھتی ہی چلی گئی[3] شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد میں بھی غیر کی

---

[1] مراۃ احمدی جلد اول ص ۲۰۵

[2] اخبار الاخیار ص ۳۱۳

[3] اس میں شک نہیں کہ ہمایوں کو برصغیر چھوڑ کر باہر جانا پڑا اور پندرہ سال تک وہ جلاوطنی کی حالت میں رہا، لیکن خوش قسمتی سے اس کی عدم موجودگی میں پانچ سال شیر شاہ جیسے ذہین اور منتظم طبع حکمران کے ہاتھ میں عنان اقتدار رہی، صرف دس سال کے لئے یعنی ۱۵۴۵ء تا ۱۵۵۵ء تخت پر کمزور حکمران رہے لیکن اس زمانہ میں بھی علمی، ادبی زندگی کو کوئی خاص صدمہ نہیں پہنچا۔

Marfat.com

زندگی اپنے اوج کمال پر پہنچی ہے، اور ہند پاکستان میں اسلامی تہذیب اپنی اعلیٰ ترین منازل پر نظر آتی ہے، درس و تدریس کے لحاظ سے بھی یہ زمانہ یادگار دور کہا جاسکتا ہے[1]

شاہجہانی عہد کا ایک اہم تاریخی واقعہ سلطنت کے پایہ تخت کی تبدیلی ہے، شاہجہاں نے دہلی کو بہت شوق سے نئی شکل دے کر شاہجہاں آباد نام دیا، اس نئے شہر میں ایک نمایاں جگہ پر شاہجہاں کی بنوائی ہوئی خوبصورت جامع مسجد آج بھی سیاحوں اور عبادت گذار مسلمانوں کو اپنی طرف بلاتی ہے" اسی مسجد کے شمال میں شاہی شفاخانہ تھا اور جنوب کی طرف شاہی مدرسہ جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی غیر آباد ہو چکے تھے، اور اس کے فوراً بعد توڑ دیئے گئے[2]

سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں بیان کیا ہے کہ آخر میں یہ مدرسہ صدر الدین خاں آرزو کے سپرد کر دیا گیا تھا اور انہوں نے اس میں اضافہ کر کے اس کی حالت کو بہت بہتر بنا دیا تھا۔ دہلی کے علاوہ لاہور، احمد آباد اور جونپور بھی علمی زندگی اور درس و تدریس کے بڑے مرکز تھے اس دور کے مشہور عالم ملا محمد یوسف اور ملا جمال تھے، اول الذکر کو عبد الحمید لاہوری نے سرآمد اساتذہ زمان" کہا ہے، ملا جمال بھی عربی علوم میں دو یگانہ روزگار" سمجھے جاتے تھے، ملا یوسف کے طرز تعلیم کا ذکر

---

[1] مغربی مصنفین اور سیاحوں نے ہمارے تمدن کے مختلف پہلوؤں کی کس قدر غلط تصویریں پیش کی ہیں اور اس کے نقش و نگار پر کس حد تک تاریک پردے ڈالنے کی کوشش کی ہے، اس کا اندازہ برنیر کے اس بیان سے ہوتا ہے جو تعلیمی حالت کے متعلق اس کے سفرنامہ میں ملتا ہے اور جس میں اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہاں تعلیم کی اشاعت ممکن ہی نہیں اور نہ علمی اور تعلیمی اداروں کے لئے ماحول مناسب ہے دیکھو برنیر کا سفرنامہ انگریزی ترجمہ (لندن ۱۹۱۴ء) ص ۲۲۹، اس سیاح نے جس کا سفرنامہ اس عہد کی تاریخ کے لئے ایک مستند ماخذ خیال کیا جاتا ہے اس طرح جس غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے اس کے متعلق صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ تعصب انسان کی بصیرت اور بصارت دونوں پر پردہ ڈال دیتا ہے ابر نیر خود یہاں موجود ہے اور اس کو نہ مدرسے نظر آتے ہیں اور نہ اہل علم کی مجالس! [2] کار اسٹیفن۔ ارکیالوجی آف دہلی ص ۲۵۵

بادشاہ نامہ میں موجود ہے[1]، ایک اور مدرس ملا عبدالسلام تھے جو ساٹھ سال تک تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، لاہور کے ان سر برآوردہ اساتذہ کی بدولت بہت سے طلباء انتہائی مدارج تعلیم ادا کرنے کی غرض سے یہاں آتے تھے، بعض کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے، مثلاً ملا مبرک نوشہرات سے تکمیل تعلیم کی غرض سے لاہور آئے اور ملا عبدالسلام کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہوئے[2]، ایک اور عالم ملا خواجہ کا بھی ذکر بادشاہ نامہ میں ہے کہ وہ تکمیل کی غرض سے لاہور آئے[3] مسجد وزیر خاں کا ذکر ایک اور باب میں کیا جا چکا ہے، اس کے ساتھ بھی بانی مسجد نے مدرسہ بنوایا تھا[4] سیالکوٹ کے متعلق سجان رائے بٹالوی نے لکھا ہے :۔

"دراں شہر فیض آمود دارالعلوم جامع علماء و معدن فضل و مسکن فضلا است"

ملا عبدالحکیم کے مدرسہ کی وجہ سے یہ شہر بہت بڑا علمی مرکز بن گیا تھا "و طلبہ علم از ممالک دور و نزدیک در مدرسہ ایشان رسیدہ فیض یاب شدند" ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مدتے رونق افزائی مدرسہ و رہنمائی طلبۂ علم اشتغال ورزیدہ فضائل معنوی را با علوم صوری ہم دوش و درویشی را با فضیلت ہم آغوش گردانید[5]"

تھانیسر میں درگاہ شیخ چلی کے قریب مدرسہ تھا جو مدرسہ شیخ چلی کہلاتا تھا، سکھوں کے زمانہ اقتدار میں اس درگاہ کو گوردوارہ بنا یا گیا اور مدرسہ بھی ختم ہو گیا، یہ مدرسہ دارا شکوہ نے بنوایا تھا۔

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۴۳

[2] ایضاً ص ۳۴۴

[3] ایضاً ص ۳۴۳

[4] تحقیقات چشتی ص ۶۶۲

[5] خلاصۃ التواریخ ص ۷۳

Marfat.com

یہاں میں ملا محی الدین معروف بہ ملا موہن نے ملا عبداللہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ اور اسی مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، بعد میں انہوں نے شاہجہاں کی خواہش پر شہزادہ اورنگ زیب کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔[1]

ان مختصر بیانات کی بنا پر شاہجہانی دور میں علمی اور تدریسی زندگی کی ایک تصویر تیار کی جا سکتی ہے۔

عالمگیر مغل بادشاہوں میں تنہا نہیں بلکہ ہند و پاکستان کی تاریخ کے تمام حکمرانوں میں شاید ہی کوئی شہزادہ اورنگ زیب سے زیادہ پڑھا لکھا ہو گا، منجملہ اور شہادتوں کے جن سے اس کے تبحر علمی پر روشنی پڑتی ہے خود یہ واقعہ حیرت انگیز ہے کہ ایک ایسا حکمران جس کو اپنے دور حکومت کا معتدبہ حصہ معرکہ آرائیوں میں صرف کرنا پڑا، ہزارہا خطوط لکھنے کا وقت نکال سکا، دکن میں لڑائیوں کا سلسلہ جس وقت شروع ہوا تو عالمگیر اپنی عمر کے چونسٹھویں سال میں تھا، اس کے بعد چھبیس سال تک وہ میدان جنگ میں رہا، اس کی نجی زندگی بھی خاصی مصروف زندگی تھی اور پھر لڑائی کی اعلیٰ کمان بھی خود اسی کے ہاتھ میں تھی، باوجود ان مصروفیات کے اس نے اتنی بڑی تعداد میں خطوط لکھوائے، یہ معمولی کارنامہ نہیں اس کے اکثر خطوط سرکاری امور سے متعلق ہیں، لیکن ان کا طرز ادیبانہ بلکہ عالمانہ ہے، ان حالات میں یہ امر موجب حیرت نہیں کہ عالمگیر کو اشاعت علم اور ترقی تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی تھی، عالمگیر نامہ میں اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

> از آن جا توجہ خاطر دانش ماثر بہ ترویج مراتب فضل و تاسیس معالم علم درجہ قصویٰ دارد و در جمیع بلاد و قصبات این کشور وسیع، فضلاء و مدرسان بہ وظائف لائقہ ارزانیانہ و املاک موظف ساختہ بہ شغل تدریس و تعلم محصلان علوم گماشتہ

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۳۴

Marfat.com

اندو برائے طلبۂ علم در ہر معمورۂ و ناحیہ وجوہ معیشت در خور رتبہ و حالت و استعداد مقرر داشتہ و ہر سال بدین وجہ نیز از خزائن احسان بادشاہانہ مبلغ ہائے معتدبہ صرف می شود۔ از فیض مکرمت و افضال شہنشاہ ابر کف دریا نوال، طالبان علم و کمال سمت آذ و دنی پذیرفتہ، منشوح البال بمرفہ الحال بہ کسب و تحصیل علوم اشتغال می ورزند[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے عہد عالمگیری کی تعلیمی کوششوں میں حکومت نے جو حصہ لیا اس کے کئی گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ سب سے اہم پہلو جس پر ہماری نظر پڑتی ہے یہ ہے کہ عالمگیر نے جمیع بلاد و قصبات میں مدرسوں اور اہل علم حضرات کو وظائف دئے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ درس و تدریس میں مصروف رہیں۔ ایک اور قابل غور امر یہ ہے کہ طلبہ کی ”وجوہ معیشت“ کا انتظام کیا۔ یہ تو کہنا مشکل ہے کہ اس طرح آبادی کا کس قدر حصہ ان بلاد و قصبات میں زیر تعلیم آ گیا۔ لیکن محمد کاظم کا یہ بیان کہ اس مد پر سرکاری خزانہ سے مبلغہائے معتدبہ خرچ ہوتے تھے، یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ نظام بہت وسیع پیمانہ پر قائم کیا گیا تھا۔ ان سرکاری مکتبوں اور مدرسوں کے علاوہ جن کا سارا خرچ حکومت کی طرف سے مہیا ہوتا تھا۔ بہت بڑی تعداد ان مدارس کی تھی جن کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر تھی۔ عالمگیر کے زمانہ میں یہ شہادت مل جاتی ہے کہ شہنشاہ نے صوبائی حکومتوں پر یہ فرض عائد کر دیا تھا کہ وہ اپنے علاقہ میں تعلیم کی طرف توجہ کریں۔ مراۃ احمدی کا ایک مختصر بیان اس سلسلہ میں نہایت اہم اور تاریخی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

چون حکم مقدس معلی بہ جمیع صوبجات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ در ہر صوبہ مدرس تعین نمایند و طلبہ علم از میزان تا کشاف خوان با استصواب صدر صوبہ موافق تصدیق بہ ہر مدرسان وجہ علوفہ از تحویل خزانچی خزانہ آن صوبہ

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۵

"می دادہ باشد، دریں ولا سہ نفر مدرسین در احمد آباد و پٹن و سورت و چہل و پنج نفر طلبہ علم اضافہ در صوبہ احمد آباد مقرر شد۔"[1]

طلبہ کو جو وظیفہ دیا جاتا تھا اس کا اندازہ لگانے کے لئے محمد فیض بخش کا یہ بیان بہت مفید ہے کہ اورنگ زیب طلبہ کی مدد ان کی اہلیت کے لحاظ سے کرتا تھا مثلاً میزان پڑھنے والوں کو ایک آنہ یومیہ منشعب پڑھنے والوں کو دو آنہ اور شرح وقایہ اور فقہ کے طالب علموں کو آٹھ آنہ یومیہ ملتے تھے۔[2]

عالمگیر کے ایک اور مستحسن اقدام کا ذکر بوہروں کی تعلیم کے سلسلہ میں مرات احمدی میں موجود ہے بادشاہ نے اس طبقہ کے بچوں کی تعلیم کے لئے خاص طور پر انتظام کیا، مدرس مقرر کئے گئے اور امتحان کا سلسلہ جاری کیا گیا، عالمگیر کی دلچسپی کی یہ کیفیت تھی کہ امتحانات کے نتائج خود اس کو بھیجے جاتے تھے لیکن ان میں سے بعض کا رویہ نہایت قابل اعتراض تھا چنانچہ اس کی سزا ان کو یہ دی گئی کہ تعلیم کا خرچ جو جبری کر دی گئی تھی خود یہ طبقہ یعنی بوہرے لوگ برداشت کریں۔[3]

سرکاری مدارس کے علاوہ انفرادی کوشش کے نتیجہ میں جو ادارے وجود میں آئے تھے ان کی بھی عالمگیر بہت حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ ۱۶۷۸ء میں گجرات کے مدرسوں کی مرمت کے لئے اس نے ایک خاص رقم منظور کی۔[4] ۱۶۹۷ء میں اکرام الدین خان صدر کے مدرسے کے لئے سوندھرہ اور سیہا کے گاؤں وقف کئے۔[5] اسی طرح مدرسہ سیف خان کو ایک مرتبہ ۵۰۰ روپیہ بھجوائے ان چند

---

1. مراۃ احمدی جلد اول ص ۲۷۲
2. تاریخ فرح بخش بحوالہ نرندر ناتھ لا ص ۱۸۸ نوٹ نمبر ۳
3. مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۷۷،۷۸
4. مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۰۹
5. ایضاً " " ص ۳۶۳

Marfat.com

واقعات کا بعض مورخوں نے ضمناً ذکر کردیا ہے ورنہ اس قسم کی لاتعداد مثالیں ہوں گی جن کی یاد سے اب تاریخ محروم ہو چکی ہے۔

عالمگیر کے عہد کی دو عظیم درس گاہیں خاص اہمیت رکھتی ہیں ان دونوں نے برصغیر کی علمی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا ہے جس کے نتائج بہت دوررس ثابت ہوئے، دہلی میں شاہ عبدالرحیم نے اپنے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد اسی زمانہ میں رکھی اسی درسگاہ میں ان کے مشہور عالم بیٹے شاہ ولی اللہ نے تعلیم پائی اور پھر یہیں درس دیا اور ان کے بعد خود ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے بھی اسی مدرسہ میں پڑھا اور یہیں درس دیتے رہے، دوسرا عظیم الشان مدرسہ جو عالمگیر کے دور میں قائم ہوا اور جو دیر تک اس کی سرپرستی کا ممنون رہا ہے، فرنگی محل کا مدرسہ نظامیہ ہے اس مدرسہ سے ہزاروں علماء نکلے جن میں بعض نے بہت شہرت حاصل کی، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے نام علمی دنیا میں آفتاب کی طرح درخشاں ہیں۔

عالمگیر سے بہت پہلے ابتدائی تعلیم کے لئے بعض مدرسوں میں ہندو اور مسلم بچے ایک ہی استاد سے پڑھتے تھے اور بعد میں علیحدہ علیحدہ اپنے مخصوص مضامین پڑھنے چلے جاتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ اس عہد میں بھی جاری رہا، ہندوؤں کی اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنارس تھا اور ان کے علوم میں [illegible] سب سے زیادہ قابل اعتبار سمجھی جاتی تھی اس بات کا خافی خان نے ایک [illegible] طبیب پیشہ [illegible] کی روایت کی بنیاد پر کیا ہے جس سے اس کی ملاقات سورت میں ہوئی تھی۔[1]

تاریخ کے صفحات کا مسلسل مطالعہ کرنے سے ہم کو معلوم ہوگا کہ جس طرح تہذیب و تمدن کے لحاظ سے مغلیہ سلطنت عہد عالمگیر میں اوج کمال پر پہنچی اسی طرح اشاعت تعلیم کے معاملہ میں بھی یہ دور اس کا نقطہ عروج کہا جاسکتا ہے، مستعد خاں کے یہ الفاظ کہ جس قدر خیرات و مبرات اورنگ زیب کے عہد میں ہوتی اور جس قدر وظائف علماء، فقراء و دیگر اہل احتیاج کو عطا کئے گئے اس کا عشر عشیر بھی کسی سابقہ سلطنت میں [illegible] کسی طرح مبالغہ آمیز نہیں کہے جاسکتے، انگریز مورخ کین نے اس بیان کی [illegible] الفاظ میں تصدیق کی ہے وہ لکھتا ہے: [illegible] زیب نے [illegible] کو [illegible] حوصلہ افزائی کی اور [illegible]

[1] منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۲۱۶

اور اسکول قائم کئے اور باقاعدگی کے ساتھ سڑکیں اور پل بنوائے۔[1]

عالمگیر کے بعد مغلیہ سلطنت کے دور عروج میں علم وفن کی اشاعت اس قدر وسیع پیمانہ پر ہو چکی تھی اور تعلیمی زندگی کی بنیادیں اتنی مضبوط ہو گئی تھیں کہ اس کی وفات کے بعد سیاسی انحطاط کے باوجود تعلیمی درس گاہیں زندہ ہی نہیں رہیں بلکہ بعض نے اور ترقی کی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور مولانا بحر العلوم جیسی بلند پایہ شخصیتیں اسی دور انحطاط کی پیداوار ہیں سیاسی طور پر مرکز تو برابر کمزور ہوتا چلا گیا لیکن جو نئی سلطنتیں وجود میں آئیں ان میں اکثر حکمرانوں نے علم کی سرپرستی کی، انفرادی طور پر بھی بعض علماء نے انتہائی ایثار کر کے اپنی زندگیاں درس وتدریس کے لئے وقف کر دیں یہی سبب ہے کہ علمی زندگی پر سیاسی انحطاط کا اثر ہوا تو لیکن بہت زیادہ نہیں۔

ہمارا مقصد اس کتاب میں تعلیمی زندگی کے اس پہلو کو مختصر الفاظ میں پیش کرنا ہے جس سے اسلامی دور اقتدار کی ثقافتی تصویر مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے چنانچہ مدارس کے قیام وانتظام اور حکومت اور افراد کی ان کوششوں کی طرف جنہوں نے علم وفن کی مشعل کو روشن رکھنے اور اس کی روشنی میں اضافہ کرنے کے لئے کہیں اشارات کئے گئے ہیں، یہاں نہ ان مسائل پر تفصیلی مباحث کی گنجائش ہے اور نہ تعلیم سے متعلق تمام موضوعات کو زیر بحث لانے کی، مثلاً طریقہ تعلیم، نصاب، تقسیم جماعات وغیرہ اہم مسائل ہیں جن پر طلبہ تاریخ تحقیق کر سکتے ہیں۔[2] بہرحال ان مسائل کے اکثر اہم گوشوں پر یہاں بحث کی گئی جو مزید تحقیق میں مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

---

[1] کین۔ مغل ایمپائر ص ۲۳

[2] حال ہی میں سلمان اکیڈمی نے "تاریخ تعلیم" کے عنوان سے جو کتاب شائع کی ہے اس میں بہت مفید اور ضروری معلومات یکجا جمع کر دی گئی ہیں۔

Marfat.com